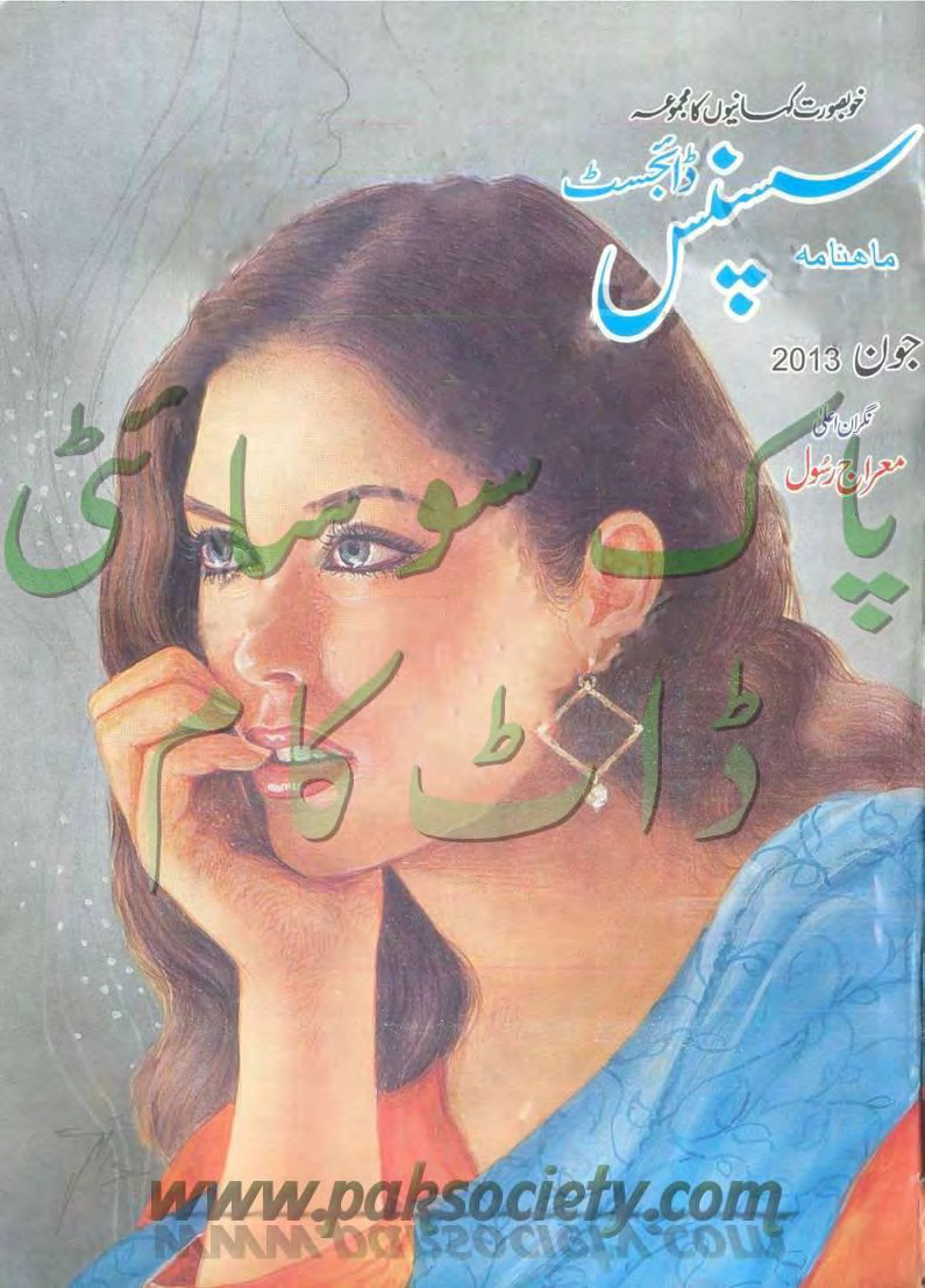
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماهنامه
جون 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرہ اعلیٰ عذرا رسول

11 — انشائیہ — جون ایلیا
اس کارگاہِ فریب میں چشمِ بینا و بصیرت کی ضرورت کا ماجرا..... یادگار تحریر

12 — آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 — امیر غلام — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

47 — سرپرائز — احمد اقبال
ماؤں کے عالمی دن پر دلوں میں چٹکی لیتی ایک پراثر کہانی

60 — کشکول — انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد و طویل سلسلہ

91 — فرض — کاشف زبیر
تہ در تہ اسرار کے پردوں میں چھپی ایک عجیب روداد

110 — انسان دشمن — ملک صفدر حیات
بے سبب گلے پڑنے والی ایک نیکی کا دلخراش ماجرا

137 — پاس ورڈ — بابر نعیم
وقت کی بساط پر برسرِ آزما حال اور ماضی کی دلچسپ معرکہ آرائی

CPNE | MEMBER APNS

146 — محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

149 — جیت کی ہار — مریم کے خان
رشتوں کی ڈور میں بندھے ایک لرزہ خیز واقعے کی منظر کشی

168 — مسافر — ناصر ملک
گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی روداد حیات

213 — مات — تنویر ریاض
انجانی گلیوں سے منزل کا نشاں پانے والے ایک نوسرباز کا ماجرا

227 — عارف کامل — ضیا تسنیم بلگرامی
علم کے سمندر میں غوطہ زن ایک کامل ولی کی روداد حیات

239 — ٹرکی کی چوری — نجمہ مودی
دانہ ڈال کر شکار کھیلنے والوں کی بے بسی کا دلچسپ تماشا

249 — ایضاً — فیاض الرحمن قادری
مغرب سے درآمدہ..... ایک مجرم کی کارگزاریاں

256 — دولت کے پاؤں — عائشہ فاطمہ
رمز بھری کائنات میں ایک ضمیر فروش..... خطاکار کی شوریدہ سری

جلد 43 • شمارہ 06 جون 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس: 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

انشائیہ

پہچان

جون ایلیا

میں نے دنیا کی ایک اعلیٰ حکمت سے خبر، خیال، خوش اندیشی، خیر طلبی اور خجستہ کاری کے رموز و اسرار اور راستی کے نہاں اور آشکار کا کچھ توشہ حاصل کیا ہے، تاکہ تمہاری شنوائیوں اور بینائیوں کے درمیان برابر برابر بانٹ دوں۔ میں نے اس حکمت سے معنی اور بیان کی وہ دولت پائی ہے جو ذہن کے دن اور رات کی بدحالی میں تمہارے کام آئے گی۔

اس توشے سے روح اور دماغ کی سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والی غذا کے حق دار قرار پاؤ اور اس دولت سے شعور اور شائستگی کی سب سے زیادہ بیش قیمت متاع کو اپنا حق ٹھہراؤ۔

میں نے اس نادر حکمت سے تمہارے وجود کے باطن اور ظاہر کے لیے جو کچھ کسب کیا ہے، وہ یہ ہے کہ صبح اور شام کی جس گام زنی میں راہ سے بے راہ ہو جانے کا ڈر ہو اس کے حق میں اپنے گھٹنوں کو شل جانو۔ دلدل کی طرف بڑھنے سے زندگی بھر ایک پتھر کی طرح بے جنبش رہنا کہیں بہتر ہے۔ اس بات کو مت جھٹلاؤ کہ تم اب تک، اس آن تک ایک نگل جانے والی دلدل کی طرف بڑی ترنگ کے ساتھ بڑھتے رہے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ بڑے دکھ کی بات ہے اور اسے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا اور سننا چاہیے کہ ایسا ہی تو ہے۔ تم جھوٹ کی اس دلدل کی طرف کب تک بڑھتے رہو گے، آخر کب تک؟

جھوٹ پر لعنت بھیجو اور سچ جہاں بھی ہو اس تک پہنچنے کے لیے دل اور جان سے گزر جاؤ۔ سچ کے سفر کا آغاز بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس میں مغز اذیت ناک سوزش سے دہکنے لگتا ہے۔ تلوے آبلے اگلنے لگتے ہیں اور ستانے کی ایک گھڑی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اگر مسافر نے اس دہکتی اور تپتی ہوئی اذیت کو سہار لیا تو جانو کہ وہ اسی لمحے انجام تک پہنچ گیا۔ ایک ایسے فرخندہ اور فیروز مندانہ انجام تک جسے دیکھنے والے اور اس کے بارے میں سننے والے وہ لوگ بھی جن کی زندگی پر ہمیشہ رشک کیا جاتا رہا ہو، اپنی ساری زندگی اس انجام پر رشک کرتے ہوئے گزار دیں۔

تم میں سے بہت سے لوگ شاید یہ جاننا چاہیں گے کہ سچ آخر ہے کیا؟ سچی بات یہ ہے کہ میں یہ بتانے سے یکسر قاصر اور عاجز ہوں کہ سچ کیا ہے؟ اس لیے کہ سچ کو شاید جانا نہیں جاسکتا پر ایک عجیب بات ہے کہ اسے ہر آن اور ہر ساعت پہچانا جاسکتا ہے اور پہچانا گیا ہے، پہچانا جاتا ہے۔

کیا یہاں میں ایک بات کہوں؟ کہو کہ ہاں...... وہ بات یہ ہے کہ جاننے میں اتنی بھلائی نہیں جتنی بھلائی پہچاننے میں ہے۔ پھر یہ کہ جاننے کی بہت سی شرطیں ہیں، بہت سی رسمی شرطیں۔ اس کے لیے دنیا کے بہت سے ہنر سیکھنا پڑتے ہیں اور بہت وقت لگانا پڑتا ہے جو ضائع بھی جاسکتا ہے۔ جاننا ایک پیشہ ہے اور پیشہ تو پیشہ ہی ہوتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے تو نہیں آجاتا۔

اب رہا پہچاننا تو وہ کوئی ''پیشہ'' نہیں ہے۔ وہ تو وجود کی معنی شناسی کا معاملہ ہے۔ سو میں تم سے جو بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے اندر انسانوں اور ''شیطانوں'' کی پہچان پیدا کرو کہ پہچان ہی دل اور دانائی کی جان ہے اور وہ انسانوں کے کچھ خاص گروہوں کی میراث نہیں ہے۔ تم ان زبردست لوگوں کو آخر کیوں نہیں پہچانتے جو تمہیں بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنا زیردست بنائے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے تو تمہیں جوتوں کی طرح پہن رکھا ہے۔ کیا یہ بات سچ نہیں ہے؟ اگر یہ سچ ہے اور تم اس سچ کو پہچانتے ہو تو پھر کس وجہ سے ان کے جھوٹ اور جھانسوں کو رعایت پر رعایت دیتے چلے آرہے ہو۔ آخر تم نے ان سے کیا پایا ہے؟ تم نے تو ان کی خاطر سب کچھ کھویا ہے، ڈبویا ہے۔

پہچان سے کام لو اور چوروں کو کوتوال سمجھنا چھوڑ دو۔ تم ان کے لگاتار جھوٹ اور جھانسوں کے مارے ہوئے ہو۔ اپنے آپ کو بری طرح ہارے ہوئے ہو۔ قزاقوں کو طعنے کے طور پر بھی سالار کارواں نہ کہو۔ یہ لوگ بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھا جانے والے درندے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے پر غراتے ہیں۔ توانا، ناتواں کو نگل رہا ہے اور بڑا چھوٹے کو (اپنے) پیروں تلے کچل رہا ہے۔ ان میں کچھ چوپائے بندھے ہوئے ہیں اور کچھ چھٹے ہوئے ہیں۔ دوسروں کے غلام بن کے نہ رہو جب کہ خدا نے تمہیں آزاد بنایا ہے۔ اس بھلائی میں کوئی بھلائی نہیں جو برائی کے وسیلے سے حاصل کی جائے اور اس آسودہ حالی میں کوئی بہتری نہیں جس کی خاطر سختیاں جھیلنا پڑیں۔ سب سے برا کھانا وہ ہے جو حرام ہو اور سب سے بڑا ظلم وہ ہے جو کسی ناتواں پر کیا جائے۔ ظالم چاہے اقتدار کی مسندوں پر بیٹھے ہوں یا ان پر بیٹھنے کی ہوس میں ہوں، وہ ہیں بہر حال ظالم ہی۔ ان سے کہو ''تم نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو تباہ کر دیا ہے۔ اپنی گمراہی سے انہیں دھوکا دیا ہے اور انہیں اپنے سمندر کی موجوں میں ڈال دیا ہے۔ ان پر اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔''

سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ پہچان سے کام لو۔ اور صیادوں کو باغ باں نہ سمجھو۔ یہ تمہاری آزادی کے بیری ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوا سب کو دل گیر اور اسیر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسی میں ان کا عیش اور ان کی آسائش ہے۔ سو پہچان سے کام لو اور ان میں سے کسی کے بھی دھوکے میں نہ آؤ۔

☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

عزیز قارئین

السلام علیکم!

جون 2013ء کا شمارہ ٹھنڈی چھاؤں کا احساس لیے حاضر ہے۔ اس بار تو جدھر نظر ڈالیے گرمی ہے یا گرما گرمی کا بھرپور منظر...... گزشتہ ماہ آنے اور آ کر گزر جانے والے زلزلے کے جھٹکوں نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا...... چند لمحوں نے انسان کو اپنے رب سے کس قدر قریب کر دیا اور پھر...... وہی معاملات، وہی حالات...... جب بھی ملکی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سول آمریت بھی رہی اور فوجی ڈکٹیٹرشپ کا بھی سکہ چلا...... لیکن بدقسمتی سے یہاں کسی نظام کو بھی دوام نہ مل سکا۔ کوئی سسٹم اپنی خوبیوں کو منوانے میں ناکام رہا لیکن تمام تر نظام ہائے حکومت کو دیکھتے ہوئے سب متفق ہیں کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود جمہوریت ایک بہترین نظام ہے یعنی عوام کی حکومت، عوام کے لیے...... ان سطور کے آنے تک انتخابات کا جمہوری عمل تمام مراحل طے کر چکا ہوگا اور سلیکشن کے خانے میں بہت کچھ فٹ اور ''مس'' فٹ ہو گا مگر جہاں ریاست اور سیاست ہو وہاں کوئی نہ کوئی حکومت بھی ہوتی ہے...... اقتدار کی اس جنگ میں فائدے کا تو اتنا احساس نہ ہو سکا البتہ تواتر سے دہشت گردی میں قیمتی جانوں کا زیاں ضرور ہوتا رہا۔ اور پھر موجودہ ملکی حالات ہوں یا ہماری ذاتی زندگیوں میں رونما ہونے والے واقعات...... مثبت رویے ہی ہمارے ملکی تحفظ اور کامیابیوں کا ضامن ہو سکتا ہے۔ سیاست کے میدان سے ہٹ کر ایک اچھی خبر کھیل کے میدان سے بھی آئی کہ پچھلے دنوں پاکستانی نژاد برطانوی باکسر عامر خان نے اپنے حریف کو ہرا کر اپنے اعزاز کا کامیابی سے دفاع کیا جبکہ اسکواش کے کھلاڑی عامر اطلس خان نے فائنل میں کویتی حریف کو شکست دے کر 14 سال بعد ایشین چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ یوں اسکواش کے میدان میں بقول شاعر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ آج کل تو خطوط کی محفل میں بھی ہر کھلاڑی بازی مارنے کی فکر میں ہے تو چلیے دیکھتے ہیں اس بار کون فاتح ٹھہرا۔

✠ **شیر علی خان**، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''سیاست کی فضا میں تبدیلی کے بادل چھانا شروع ہو گئے ہیں اور سب خوب گرج چمک کے ساتھ Stages پر بیٹھ کر برسنا شروع ہو گئے ہیں۔ دعوے، وعدے اور ہم ہی ہم کی صدائیں لگ رہی ہیں اور نیا شمارہ آنے تک سب کچھ پک کر ہنڈیا سے باہر آ چکا ہو گا سیاست سے جان چھڑا کر اور روتی دوشیزہ کو روتا چھوڑ کر بزم کو گلے لگایا۔ نووارد پانچ لفظی نام کے مالک ڈاکٹر صاحب کو کرسی صدارت مبارک۔ حبیب کزک۔ آپ کو شاید پتا نہیں کہ قدرت اللہ ویسے ہی استاد جی ہیں۔ سید محی الدین کے شہر فتح پور میں میری خالہ رہتی ہیں اب یہ علاقہ کافی سرسبز ہو گیا ہے۔ جاوید شبیر اگر روسی بھائیوں جیسی سوچ ہماری ہو جاتی ہے تو آپ یقین کریں ملک کی تقدیر بدل جائے گی۔ احسان سحر حقیقت یہ ہے کہ مسافر کی ہر قسط ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے لگتا ہے آپ شارٹ کٹ لگا کر مسافر کی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ طاہرہ یاسمین لالٹین تو UPS سے بھی مہنگا پڑتا ہے۔ ہمایوں سعید زہریلے تیروں کو صاف کرنے کی ناکام کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ عمار کشف برادر اگر آپ سرف کشف ہوتے تو مجھے بہت اچھے لگتے۔ اعجاز بھائی آپ کو ماہا ایمان کی حقیقت کا پتا نہیں ورنہ آپ کو سرورق پر مونچھیں لگانا پڑتیں۔ باقی طاہرہ کا لگتا ہے پشاور سے کراچی تبادلہ ہو گیا ہے۔ چراغ رفتہ کو سرسری انداز میں پڑھا ہے۔ ایسی زبردست تحریر تاریخی جذبات کو ابھارتی ہے۔ معصومہ نے بڑے معصومانہ انداز سے محبت کو تقسیم نہ ہونے دیا، بہرحال بے وفا لوگوں کے لیے یہ نصیحت ہے۔ بیگ صاحب اس دفعہ عدالتی کٹہرے میں تند و تیز اور موثر جملوں کے ساتھ موجود تھے۔ ستم گر انتخابی مہم کے شور شرابے پر پورا اتر رہی تھی۔ زندگی کے مسافر کی مسافر اس دفعہ چندو ماہی کے گرد گھومتی رہی، شہریار سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس کی میڈم کا خمیر کس علاقے سے اور کن حالات میں اٹھا ہے۔ اس دفعہ کشکول کے افق پر لیاقت حسین کا کردار چھایا رہا۔ بابر نعیم کی فوٹو البم نے مجھے یونیورسٹی دور کے لمحوں کی یاد تازہ کر دی ہے جن کو 2 سال گزر رہے ہیں مگر یادیں تازہ ہیں۔ محی الدین نواب کی تحریر ایک بھیڑ چال ہے جو کہ ایک غلط چال ہے کہ نوجوان اپنا قیمتی وقت پڑھائی کے بجائے غلط سرگرمیوں پر لگا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی تحریر واقعی ہمارے معاشرے کا ناسور ہے اور روایات رشتوں کو توڑنے کا باعث بنتی ہیں اور ہم لوگ مذہب کو چھوڑ کر روایات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ جون کا سسپنس آنے تک انشاء اللہ میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جاؤں گا۔'' (بہت مبارک۔ اسی خوشی میں اس بار صدارت آپ کے نام)

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ''مئی کا سسپنس دیدہ زیب رنگ لیے موصول ہوا۔ سرورق کے لیے یہ شعر کہ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ۔ دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ۔ اندر انشائیے میں علم و آگہی کے موتی جون ایلیا بکھیر رہے تھے۔ انشائیے سے سیر ہو کر اپنی محفل میں وارد ہوئے جہاں ڈاکٹر نذیر مغل صاحب سرفہرست تھے۔ موقع بھی ہے دستور بھی ہے، سو مبارکباد۔ اس کے بعد اندر مسافر کی روداد میں شامل ہوئے جہاں کہانیوں میں ایک نئی کہانی کا آغاز ہوا ہے اور شکیلہ کی کہانی شروع ہوئی ہے امید ہے آئندہ قسط میں کہانی اپنے نئے انداز میں ظہور پذیر ہوگی۔ شہریار کی اپنی بہن پروین کی کہانی کہیں بہت دور رہ گئی ہے۔ کشکول بھی آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ رفتہ پڑھی جہاں تاریخ کے بہت سے رازوں سے آشنائی ہوئی۔ کاشف زبیر کی برائے کاروبار پڑھی جو تحریر کی آخری سطر تک دلچسپی برقرار رکھتے ہیں۔ دوسرا رخ بھی اچھا تاثر لیے تھی۔ معصومہ میں جوش رقابت میں ایک عورت نے اپنی سوتن کو ہلاک کر دیا۔ نشان میں فرنچی نے ڈائمنڈ چرانے کا عجیب طریقہ سوچا مگر اپنے جال میں پھنس گیا۔ شعروں نے بھی مزہ دیا اور کترنوں نے بھی دلچسپی برقرار رکھی۔ ستم گر میں منظر امام نے سیاست دانوں اور سیاست کی حقیقت لکھی۔ فوٹو البم اور ہتکیل بھی حقیقت سے قریب تر لگیں۔ معصوم ولی اللہ کے دل سراپا کرامت ہی کرامت ہوتے ہیں جب اللہ ہی ولیوں کو اپنا دوست قرار دے تو ان کے عروج و کمال کا کیا کہنا۔ بھول میں چھوٹی سی غلطی نے مجرمہ کو پکڑوا دیا۔ شیر شاہ سید بھی ناسور بھی سماج کے ناسوروں سے روشناس کراتے ہیں غربت اور افلاس کی چکی میں پستے ہوئے عوام کی حقیقی منظرکشی کرتے ہیں۔ آخری صفحات کی خوبصورت کہانی ''گر قبول افتد'' محی الدین نواب کی بہترین کہانی تھی۔ معاشرے کے بگاڑ میں سب سے بڑا ہاتھ موبائل فون کا ہے اور یہ ایسا ہی ناسور ہے...... جس کا تدارک مشکل ترین ہے۔ اس کا واحد علاج اور حل صرف و صرف مذہب سے محبت ہے۔ انسانی قدروں میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ جہاں رشتوں کا احترام اور لحاظ ثانوی چیز بن گئی ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں جو اس سے متاثر نہ ہو۔ بلاشبہ یہ بھی سب سے بڑی حقیقت ہے کہ اس صدی کی بہت بڑی ایجاد ہے مگر اس کا استعمال مثبت ہونے کے متقی۔''

✠ **ابرار وارث**، درآباد سند بلیا نوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ٹائٹل بس ایویں سا تھا تبصرہ کرنے سے معذرت۔ خطوط کی محفل میں انٹری دی اور اپنا خط دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی، ان بیان ایبل ہے (بہت خوب زبان ہے) سارے ساتھیوں کے تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ڈاکٹر مرزا صاحب کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ بابر عباس کا تبصرہ پسند آیا۔ اس کے بعد جلدی سے مسافر کی طرف، پڑھنا شروع کیا اتنی شاندار قسط تھی کہ اس کے ختم ہونے کا پتا ہی نہیں چلا۔ واقعی چندو کے ساتھ تو شروع سے ہی ناانصافیاں ہوتی آ رہی ہیں۔ ایسے میں اب اس نے یہی کرنا ہے۔ اس کے بعد آخری صفحات کی طرف توجہ دی لیکن افسوس کہانی جتنی خوب صورتی سے شروع ہوئی تھی اس کا اختتام اتنا جاندار نہیں ہوا تھا مجھے نواب صاحب کی یہ کہانی انتہائی بورنگ لگی تھی۔ نواب صاحب سے گزارش ہے کہ پلیز رشتوں، محبتوں والی کوئی زبردست تحریر دیں۔ (آپ کی خواہش نواب صاحب تک پہنچا دی ہے) اس کے بعد ''معصومہ'' پڑھی۔ اسما قادری کی کاوش تھوڑی بہت دل کو لگی تھی۔ پلیز مریم کے خان، اسما قادری یا نجمہ مودی کو آخری صفحات پر لے آئیں۔''

✠ **زویا اعجاز**، لاہور سے آپ کی خدمت میں تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ ''پندرہ اپریل کو بالترتیب محمد اکبر سید شکیل حسین کاظمی اور سعدیہ بخاری سے اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ میرا تبصرہ سسپنس ڈائجسٹ میں شامل ہے مگر سسپنس کا دیدار سترہ اپریل کو نصیب ہوا۔ ٹائٹل پر براجمان حسینہ آنکھیں بند کیے شاید مستقبل کے سنہرے خواب بن رہی تھی۔ اداریہ دیکھا تو دل نے بے اختیار کہا جب تک ہم اپنے انفرادی اعمال نہیں سدھاریں گے بحیثیت قوم ہماری حالت ناگفتہ بہ رہے گی۔ محفل میں نظر ڈالی تو گھمسان کا رن جاری تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ طاہر جاوید مغل سے کوئی ناول شروع کروایا جائے۔ (فرمائش کرتے رہنے سے بھی خواہش پوری ہو ہی جاتی ہے) اس کے علاوہ ہر ماہ چند صفحات رائٹرز کے انٹرویوز اور خودنوشت کے لیے مخصوص کر دیے جائیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ آغاز محی الدین نواب کی گر قبول افتد سے کیا۔ موضوع گو پرانا تھا مگر نواب صاحب نے کمال لکھا۔ موبائل اور انٹرنیٹ سے پھیلنے والی وباؤں کی نواب صاحب نے خوب نشتر زنی کی اور معاشرے کے برہنہ حقائق واضح کیے۔ کیا خوب ہوتا اگر ثمینہ اور راضی کو ان کے کیے کا بدلہ ملتا۔ کشکول میں اس دفعہ کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ مسافر میں میڈم شکیلہ کے ماضی کا پردہ دھیرے دھیرے چاک ہو رہا ہے۔ چندو ماہی سے میڈم بننے کا سفر کافی دلچسپ محسوس ہو رہا ہے۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر کی برائے کاروبار پسند آئی۔ برف زاروں کی کاشف صاحب نے خوب منظرکشی کی۔ منظر امام نے ہماری ملکی سیاست کے بخیے ادھیڑے تو اسماء قادری نے بھی مرد و زن کی نفسیات پر عمدہ روشنی ڈالی۔ حبیب نے معصومہ کے ساتھ جو کچھ کیا اس نے انھی سکوں میں اسے واپس ادائیگی کر دی۔ مرزا امجد بیگ نے اس دفعہ کافی منفرد نوعیت کا کیس لڑا۔''

✠ **سعید عباسی**، بہاولپور سے شریک محفل ہیں ''ہمیشہ کی طرح ٹائٹل خوب صورت اور اچھا تھا۔ ابتدا کاشف زبیر کی برائے کاروبار سے کی۔ فیرن اور کلائیڈ نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ استومین بن کر سارہ جیکسن کو سارا معاملہ معلوم ہو گیا تھا پھر بھی پردے میں رکھ لی بات اس نے کہانی اچھی تھی۔ دوسری کہانی محی الدین نواب کی، گر قبول افتد پڑھی۔ نواب صاحب نے بڑے خوب صورت انداز میں اس ایشو پہ کہانی لکھی جب انسان کے لیے اسلام نے ایک صحیح طریقہ کار رکھا ہے کہ نکاح کر کے برے کاموں سے بچے اور نیک راہ پہ چلے تو پھر ہمیں کیا ضرورت الٹے طریقے سے گناہ کے راستے پر چلنے کی۔ اسما قادری کی معصومہ پڑھی، حبیب نے جو گڑھا معصومہ کے لیے کھودا تھا اس میں خود گر اروحی کی شکل میں اور معصومہ ایک بار پھر حبیب کی محبت کی اکیلی حق دار بن گئیں، کہانی بہترین تھی۔ منظر امام کی ستم گر پڑھی، کہانی اچھی تھی تو ید بھائی کا انجام برا ہوا۔ پھر مرزا امجد بیگ کی مرچ مسالا پڑھی۔ مسز سلمیٰ امین اور ناصر سے جنونی حد تک نفرت کرتی تھی اس لیے انھیں یعنی ناصر کو سیما کے ذریعے پھنسوانے کے چکر میں تھی لیکن جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے پھر سلیم انور کی نشان پڑھی، کہتے ہیں چور جتنا بھی چالاک ہو کہیں نہ کہیں مات کھا جاتا ہے اسی طرح فرنچی بھی اپنی غلطی کی وجہ سے پکڑا گیا۔ ثمر عباس کی دوسرا رخ بھی اچھی تحریر تھی۔ میکس گلوریا کی جان لینے آیا تھا لیکن اسے اپنی جان بنا کر ساتھ لے گیا۔ ش م جمیل کی بھول بھی اچھی کاوش تھی، فریزل کی ماں ہمیشہ اپنے بیٹے کو اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے فریزل جس لڑکی کو بھی چاہتا اس کی ماں اس کا کام تمام کر دیتی۔ باقی چھوٹی کہانیوں میں فوٹو البم، ہتکیل اینڈ ناسور بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ محفل شعر و سخن میں ماہین فاطمہ کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ اب آتے ہیں اپنی پیاری سی محفل کی طرف جہاں کرسی صدارت پر براجمان تھے فرید صاحب۔ خیر ہماری طرف سے مبارک باد محمد زبیر ساگرو جلم، بابر عباس سرورق کی لڑکی کو دیکھ کر آپ کا منہ کڑوا کیوں ہو گیا؟ کیا وہ آپ کو کھانسی والا شربت پلانے آ رہی تھی؟ زویا اعجاز خوش آمدید سسپنس کی محفل میں، احسان سحر اپنے پیارے سے تبصرے کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ طاہرہ یاسمین پھر تو خوشی کی بات ہے کہ آپ کو رسالہ جلدی مل جاتا ہے۔''

✠ **قیصر اقبال گجہ**، بکلول، ضلع بھکر سے چلے آ رہے ہیں ''مئی کا سسپنس ہاتھ میں ہے۔ سیدھا جون ایلیا کے انشائیہ میں قدم رکھا اور انشائیہ کا لب لباب یہ ہے کہ واقعی ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی غم اور احساس نہیں ہے۔ خطوط کی محفل میں سرغنہ کا روپ دھارنے والے ڈاکٹر مرزا صاحب! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اونٹ کو ہتک عزت کا دعویٰ کرنے دیتے۔ اپنے بیگ صاحب کے لیے یہ ایک انوکھا کیس ہوتا۔ حبیب میاں! جن کے منہ میں ابھی دودھ کے دانت ہوں وہ ہمیں بزرگ کہنے میں حق بجانب ہیں۔ بابر عباس صاحب، ارے جناب ذرا سنبھل کر، آپ اگر ذرا بھی لڑکھڑائے تو سعدیہ کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ زویا اعجاز کی صورت میں ایک نئے پھول کا اضافہ اور چونکہ موصوفہ تیرہ سال سے سسپنس پڑھ رہی ہیں تو پھول یقیناً گوبھی کا ہی ہوگا۔ طاہرہ یاسمین نے اپنی بزرگی کو تسلیم کرتے ہوئے محفل کے ساتھیوں کو سمجھانا اور وعظ و نصیحت کرنا شروع کر دیا ہے۔ توصیف بھیا! اپنے کشف صاحب حکیم خان سلامت پوری کے کشتے کھا کر اپنا تبصرہ لکھتے ہیں۔ ہمایوں سعید، ہمارے تیر کھا کر آپ اتنا خوش ہوتے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ تصویر العین، کیا بات ہے آپ کے خط میں وہ پہلے والا دم خم نظر نہیں آ رہا۔ اس دفعہ محفل کے نہلا دہلا (ماہا ایمان، تفسیر بابر) نظر نہیں آ رہے۔ مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر پارٹی ایجنڈا تیار کر رہے ہوں گے۔ کہانیوں میں آغاز پہلی کہانی سے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ رفتہ میں اورنگزیب عالمگیر اور دارا شکوہ کے درمیان

WWW.PAKSOCIETY.COM

اقتدار کی جنگ اور پھر آخر میں دارا شکوہ کا عبرت ناک انجام۔ کاشف زبیر کی برائے کاروبار میں فیرن اور کلائڈ نے اپنے گرتے کاروبار کو سنبھالا دینے کے لیے اسنو مین والا خوب آئیڈیا سوچا۔ انوار صدیقی کی کشکول میں ایک بار پھر لیاقت حسین نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ دوسری طرف شیخ حامد بھی اور نگزیب اور سراج کے لیے ابھی تک لوہے کا چنا ثابت ہو رہا ہے۔ ثمر عباس کی دوسرا رخ میں جوئے کا منفی روپ سامنے آیا۔ بہرحال میکس نے گلوریا کو اپنا کر اپنے اور گلوریا کے حق میں بہت ہی بہترین فیصلہ کیا۔ اسما قادری کی معصومہ میں حبیب اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں خود گر گیا۔ مرچ مسالہ میں مرزا امجد بیگ نے کامیابی کا سہرا اپنے سر پر سجاتے ہوئے ناصر کو باعزت بری کرا لیا۔ سلیم انور کی مختصر تحریر نشان میں فرینکی کو اس کے کان پر زخم کا نشان لے ڈوبا۔ ملکی حالات کا منظر نامہ پیش کرتی منظر امام کی تحریر ستم گر میں ہم اس بات سے متفق ہیں کہ آج ہمارے ملک میں موجود ہر پارٹی کا نام تباہ کن پارٹی ہونا چاہیے۔ مسافر کی اس قسط میں چند ماہی سے میڈم شکیلہ تک کا سفر کرنے والی میڈم شکیلہ کے ماضی سے آگاہی ہوئی۔ جہاں ایک کردار عمر حیات سامنے آیا وہاں ڈاکٹر شاہ جی کی پراسرار شخصیت کے منظر پر آنے کا انتظار ہے۔ تنویر ریاض کی تکمیل میں ایک نفسیاتی مریض سے ملاقات ہوئی جس نے شاہکار مکمل کرنے کے لیے جیتی جاگتی ایلس کی جان ہی لے لی۔ ضیا تسنیم بلگرامی صوفیا کے سلسلے کی کڑی معصوم ولی لے کر آئیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادے محمد معصومؒ کے ایمان افروز واقعات سے اپنے ایمان کو منور کیا۔ ش م جمیل کی بھول میں اچھا ہی ہوا کہ کورسنگ محبت کا اظہار کرتے واپس پلٹ آیا ورنہ گیری کی جان گئی تھی۔ حیرت ہوئی کہ قاتل فریزل کی ماں نکلی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ناسور ہمارے معاشرے کی ایک حقیقت۔ جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہوگا، زلیکا جیسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ محی الدین نواب کے قلم سے لکھی ہوئی آخری صفحات کی کہانی گرقبول افتد انٹرنیٹ، میڈیا اور سب سے بڑھ کر موبائل فون کے منفی استعمال پر لکھی گئی ایک نایاب تحریر، ایک تلخ حقیقت بہرحال کاشف کی راہ راست پر واپسی اچھی لگی۔ چٹکلے بھی زبردست تھے۔ محفل شعر و سخن میں اشعار اچھے تھے مگر عادل خان کا انتخاب پسند آیا۔“

✠ **ثمینہ حبیب،** کوئٹہ سے تبصرہ کر رہی ہیں ”مئی کا سسپنس 22 اپریل کو ملا، سب سے پہلے اپنا تبصرہ ڈھونڈا انہیں ملا صرف نام مل گیا۔ (اور اب خط بھی — یقیناً اب تو آپ خوش ہوں گی) سرورق پر رنگوں کا امتزاج بہت بھلا لگا۔ انشائیہ کی زبان ظاہر ہے جون ایلیا صاحب کے قلم سے نکلے موتیوں سے پرویا ہوا ایسا گلدستہ ہے جو سوچ کے نئے در وا تو کرتا ہی ہے مگر ساتھ ہی تاریخ شناسی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ انکل جی کی باتیں آپ کے خط سے پہلے پڑھیں واقعی اگر رنگ نسل، ذات برادری سے بالاتر ہو کر ووٹ جیسا اہم فریضہ انجام دیں اور نہ صرف ووٹ بلکہ عام روزمرہ زندگی میں اسی اصول پر عمل کیا جائے تو ہمارے بیشتر مسائل وجود میں ہی نہ آئیں اور جہاں تک تعلیم کی بات ہے تو پاکستان میں تعلیم پر بجٹ کا جتنا حصہ مختص کیا جاتا ہے وہ شرمناک حد تک کم ہے اس لیے بھی تعلیم کا معیار دگرگوں ہے (ہم پھر بھی سمجھتے ہیں کہ جو مختص کیا جائے وہ پوری ایمانداری سے صرف ہو تو بہتری آسکتی ہے) انکل جی ایک بات کی سمجھ نہیں آتی جب سسپنس ہر ماہ کی 17 تاریخ کو مارکیٹ میں آتا ہے تو بعض قارئین اپنے خط میں 16 تاریخ کو رسالہ ملنے کا ذکر کرتے ہیں ان کو ایک دن پہلے کیسے رسالہ مل جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے شہر کوئٹہ میں سسپنس 22 تاریخ اور جاسوسی 6 تاریخ کو دستیاب ہوتے ہیں۔ کہانیوں میں برائے کاروبار زیادہ متاثر نہ کر سکی اس لیے اس پر نو تبصرہ۔ دوسرا رخ ایک حقیقت کو آشکار کرتی کہانی تھی۔ معصومہ اسماء قادری کی طبع زاد کہانی بہت اچھی تھی۔ ویسے محبت تو انسان کے رویوں اور عادات سے کرنی چاہیے نہ کہ ظاہری صورت سے۔ حبیب اور معصومہ دونوں کی غلط نیتوں کی بھینٹ روحی اور اس کا بچہ چڑھ گئے حبیب جیسے 99 فیصد انسان معاشرے میں بستے ہیں جو صرف ظاہری حسن کو فوقیت دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ صورتیں تو خاک میں مل جاتی ہیں باقی تو صرف اچھے اعمال رہتے ہیں۔ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کی کہانی حسام بٹ کے قلم کی زبانی مرچ مسالا کے عنوان سے پڑھی ہمیشہ کی طرح دلچسپ موشگافیوں سے بھرپور رہی۔ ملکی بیگم تو کچھ زیادہ ہی تیز گام نکلیں۔ نشان گزارہ کر گئی۔ قونو ایم کی سمجھ نہیں آئی۔ تکمیل نفسیاتی تھی میں الجھے ایسے شخص کی کہانی تھی جس نے بجائے اپنے کردار کو سلجھانے کے دوسروں کے عیب تلاشنے میں اپنی زندگی کی راہیں کھوٹی کرلیں۔ ویسے ایک بات ہے اگر انسان اپنی خامیوں پر نظر ڈالے اور اپنے عیبوں کا شمار کرنے لگے تو اسے اپنے علاوہ دنیا کا ہر شخص بے عیب نظر آئے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ناسور پڑھ کر جھرجھری آگئی۔ کہانی اس ننگی حقیقت کو بھی بیان کرتی نظر آئی کہ پاکستان کے غربت زدہ علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے واقعی وہ کسی کو کیوں نظر نہیں آتا کہ حالات کے سدھار کی کوشش ہی کی جائے۔“

✠ **حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی،** نورنگ میانوال سے تشریف لائے ہیں ”خدا کرے کہ ملک کو ایسی قیادت میسر آئے جو ملک میں [illegible] مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کے مسائل سے بخوبی نمٹ سکے۔ سرورق کی حسینہ کسی کو دیکھ کر آنچل میں سر چھپا رہی ہے۔ آپ کے خطوط میں محبت نامے پڑھے۔ محمد تقی [illegible] آپ کی سزائے موت اللہ تعالیٰ ختم کرے (آمین) آپ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آغا فرید احمد خان، اختر عباس اور راجا ثاقب نواز ثاقب محفل [illegible] ہیں۔ ان کی حاضری ضروری ہے۔ چراغ رفتہ میں عظیم فرمانروا شاہجہاں کے بیٹے دارا شکوہ کے حالات زندگی پڑھے۔ درویش بادشاہ اورنگزیب عالمگیر جس نے تین سگے بھائیوں کو قتل کیا اور تخت نشین ہوا۔ پھر بھی تاریخ میں معتوب نہیں رہے۔ آخر اس کو بھی دو گز زمین میسر آئی۔ طویل سلسلہ کشکول میں انوار صدیقی کے کردار لیاقت حسین کی بدی کے خلاف جنگ جاری ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات کی اس میں عکاسی کی گئی ہے۔ مرچ مسالہ میں مرزا امجد بیگ کی عدالتی کارروائیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ مرزا صاحب عدالتی جنگ خوب لڑتے ہیں [illegible] بیگم صاحبہ کو ملازموں سے بچاتے ہیں۔ طویل سلسلہ ناصر ملک کی مسافر کی اٹھان اچھی ہے۔ قاری کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ چندو بی بی کی اپنی سرگزشت دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔ میڈم شکیلہ کیسے بن گئی؟ ایک دیہات کی معصوم چندو جو اپنے منہ بولے ابا کے ساتھ ایک سادہ زندگی گزار رہی تھی کہ بڑی تنظیم کی سربراہ کیسے بن گئی؟ آخری کہانی گرقبول افتد (محی الدین نواب) پڑھی۔ نواب صاحب کی کہانیوں کے لیے ایک ہی لفظ کافی ہے کہ جو کہانیاں نواب صاحب تحریر کرتے ہیں بس نام ہی کافی ہے۔ صدیقہ بی بی اور کاشف کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے نواب صاحب نے ایک نازک معاشرتی مسئلے کو ڈسکس کیا ہے۔ معاشرتی ناسور جو پک کر پیپ دینے لگے ہیں۔ عورت

کی ایک لغزش کو معاف نہیں کیا جاتا ہے اور مرد بے شمار گناہ اور غلطیوں کے بعد بھی پوتر ہوتا ہے۔ معاشرہ کے ایک موضوع کو زیر بحث لا کر نواب صاحب نے ایک معرکۃ الآرا تحریر پیش کی ہے۔“

✠ **ہارون رشید،** مردان سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”اب دوسری بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اور اس دفعہ مجھے قوی یقین ہے کہ اس بار اس ناچیز کا خط ضرور شامل ہوگا (جی ضرور) سب سے پہلے محفل یاراں کی طرف جاتا ہوں جہاں ہمایوں سعید اور دوسرے ساتھی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوتے ہیں۔ محمد عمار کشف کا تعلق مرزا غالب کے خاندان سے ہے۔ طاہرہ باجی وہ آپ کا بھائی شہزاد چودھری کدھر گیا ہوا ہے۔ توصیف صاحب کیا حال ہے، ہماری بھی یہی فرمائش ہے کہ ہمایوں اقبال بلگرامی صاحب تاریخ کے صفحات پر کیوں نہیں آتے۔ عمران حیدر بلوچ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں ہیں۔ حسنین عباس بلوچ رہا کیا ہوئے، پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ سعدیہ جی! سنو......! اگر تاریخ ایسی لکھی جاتی ہے جیسے واقعات پیش آئے ہوتے ہیں تو پھر انکل ابن خلدون یا محمد بن قاسم کی تاریخ کیوں نہیں چھپواتے (چھپ چکی ہیں لیکن شاید آپ نے نہیں پڑھیں) کہانیوں میں سلسلے وار کشکول اور مسافر بہت ہی شاندار انداز میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مارچ 2013ء کے مسافر کا وہی سین بہت پسند آیا جس میں شہریار اور پیرو ماچھی کے درمیان فائٹ ہو رہی تھی۔ ملک صاحب، بیگ صاحب، طاہر جاوید مغل اور ایچ اقبال صاحب میرے فیورٹ مصنفین ہیں۔ آخری بات۔ اس بار اگر سلسلے وار کہانی ایچ اقبال صاحب سے شروع کروا دیں تو بہتر ہوگا۔“

✠ **بابر عباس، مسز بابر عباس،** کھاریاں سے بھرپور تبصرہ کر رہے ہیں ”جناب عالی مودبانہ گزارش ہے کہ مئی 2013ء کا شمارہ سسپنس کی شکل میں فدوی کے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق دیکھ کر بے ساختہ منہ سے بھیانک چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ اسی وقت کھانسی شروع ہوگئی۔ اس بار ذاکر صاحب نے شاید حسینۂ دل نواز کو مرے ہوئے دکھایا ہے کیونکہ آنکھیں اور ہونٹ اتنی سختی سے بند ہیں جیسے کسی مردے کو گردن پر میل جمی ہوئی ہے۔ لگتا ہے غلطی سے ذاکر صاحب نے طاہرہ یاسمین آف سرگودھا کو اپنے برش کی نذر کر دیا ہے۔ ہاہاہا......... اشتہارات کو بالکل اسی طرح نظر انداز کیا جیسے شوہر اپنی بیوی کے سامنے اپنی بے بسی کو نظر انداز کر دیتا ہے یا پھر جیسے ہم ماہا ایمان کی بے تکی باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حسب معمول جون ایلیا مرحوم صاحب کا انشائیہ زبردست تھا لب مہران کے بارے میں بھلا کیا کہوں جون ایلیا مرحوم صاحب اپنے انشائیوں کے ساتھ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ سر جی شروع کے کلمات میں آپ حقیقت پسندانہ باتیں کرتے ہیں اس کے بارے میں دوسری کوئی اور رائے تو ہو ہی نہیں سکتی میں آپ کی ہر بات سے ایگری کرتا ہوں یہ ہمارا پیارا پاکستان بڑا ہی خوب صورت اور پیارا ملک ہے۔ مگر اس کے موجودہ حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اس بار کرسی صدارت پر ڈاکٹر مرزا انتظار تدبر مغل براجمان نظر آئے، ہیلو ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں آپ؟ حبیب احمد آف کرک بھیا سرورق کی حسینہ آپ کی بے وقوفی پر مسکرا رہی تھی۔ محمد زبیر ساگر صاحب ماہا ایمان کو زیادہ مسکانہ لگائیں۔ میرا خط دیکھ کر تو صنف نازک خاص طور پر منہ بناتی ہوں گی۔ ایک زمانہ تھا جب کبھی اریفہ بخاری کا نام محفل میں بڑا بولا کرتا تھا مگر وہ بھی ایسے ہی غائب ہوئی جیسے...... آنٹی بشریٰ افضل کا بھی یہی حال ہے۔ اپنا خط محفل میں پا کر اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی کہ ایک سیاست دان کو الیکشن جیت کر ہوتی ہے۔ زویا جی آپ میرے سسرال شہر لاہور سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے آپ کو کچھ بھی نہیں کہوں گا بس اتنا ہی کہوں گا بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔ محمد تقی عباس بیٹا خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ اپنے پیارے رسولؐ کے صدقے تمہیں اس اذیت ناک سزا سے رہائی دلائے۔ طاہرہ یاسمین عزیزہ کم روشنی میں ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے سے نظر بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔ پاشا بھائی کراچی کے تازہ ترین حالات پر آپ کا ہی نہیں بلکہ ہر دردمند پاکستانی کا دل افسردہ ہے۔ دہشت گرد کا کسی مسلک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ توصیف احمد صاحب بہت خوب، عقل تو آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اپنی نظر ضرور اتار لیں۔ محمد ہمایوں سعید بھایا اتنی تیز مرچیں مت چبائیں۔ آپ نے جو مشورہ عمار کو دیا ہے وہی مشورہ میں آپ کو بھی دیتا ہوں۔ ابرار وارث بھایا جی وہ بات مت کریں جو پوری نہ کی جا سکے۔ پرانی کہانیاں دوبارہ شائع نہیں کی جا سکتیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب آپ جو مرزا اکثر اپنے شاگردوں کو ڈنڈے کے ذریعے دیتے ہیں وہی مرزا اعجاز آف کوٹلہ ارب علی خان نے محفل کے دوستوں کو اوکھے اوکھے الفاظ لکھ کر دی تھی بعد میں یہ بھی کہہ دیا کہ کرلو جو کرنا ہے خدارا اعجاز بیٹا آئندہ خیال کرنا۔ تصویر العین صاحبہ ایک دفعہ جب کوئی معصوم صنف وجاہت کسی چڑیل کا شکار ہوتا ہے تو اس کا حال شہریار کی طرح ہی ہوتا ہے آپ تو خود بڑی عقل مند ہیں۔ حسب معمول سب سے پہلے مسافر پڑھی اس بار کی قسط میں میڈم شکیلہ اپنی کہانی شہریار کو سنا رہی تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مسافر بالکل صحیح جا رہی ہے۔ دوسرے نمبر پر بات کروں گا میں کہنہ مشق رائٹر انوار صدیقی کی کہانی کشکول کی، اصل میں دیکھا جائے تو کشکول اپنے پلاٹ سے ہٹ چکی ہے۔ انوار صدیقی صاحب اپنی کہانیوں کی پراسراریت کی وجہ سے مشہور ہیں مگر اس بار کشکول میں وہ بات نہیں۔ ساری کہانی جرائم پیشہ افراد کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایک اور بڑا نام اور سسپنس کا ستون محی الدین نواب، سر میں آپ کو اور آپ کی عظمت کو سلام عقیدت پیش کرتا ہوں۔ سسپنس کے آخری صفحات پر آپ کی تحریر کردہ زبردست تخلیق گرقبول افتد پڑھی۔ یقین کریں میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کو احاطہ تحریر میں لا کر کچھ کہہ سکوں۔ مرزا امجد بیگ کا کیس جس کو الفاظ کا روپ دیا حسام بٹ صاحب نے مرچ مسالا اور حسب معمول یہ کیس بھی بیگ صاحب نے جیت لیا، کاش میرے وکیل بھی بیگ صاحب ہوتے تو اب تک بری ہو گیا ہوتا۔ تاریخ کے جھروکوں سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اس بار چراغ رفتہ لے کر آئے اور کیا خوب آئے، چراغ رفتہ ایک زبردست تحریر تھی۔ باقی کی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔“

✠ **ساجدہ راجا،** ہندوال سرگودھا سے چلی آرہی ہیں ”اپنا خط شامل اشاعت دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی، پہلے تین مہینے نہیں چھپا ابھی بھی نہ چھپتا تو...... (یہ تو اچھی ناراضی ہے، چھپ جائے تو بھی اور نہ چھپے تب بھی) بہرحال ہم صابر و شاکر قوم ہیں ہمارے حکمرانوں کو سلام، جنھوں نے ہمیں دنیا میں صبر کی مثال بنا دیا۔ گرمیاں اسٹارٹ ہو رہی ہیں اور بدترین لوڈشیڈنگ ابھی سے جاری (آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا) ہم گاؤں والے تو بہرحال گزارہ کر لیتے ہیں، مگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

فضا اور کھلے گھروں میں لیکن بے چارے شہر والے جو فلیٹوں یا تنگ گھروں میں رہتے ہیں ان پر جو گزرتی ہوگی ہمیں بخوبی احساس ہے اور نہیں ہے تو حکمرانوں کو نہیں۔ ویسے ایک مبارک باد آپ کی طرف ادھار ہے۔ ایک ڈائجسٹ کی طرف سے میری کہانی کو پہلا انعام ملا ہے سو مبارک باد تو بنتی ہے نا؟ (جی بہت مبارک) سسپنس میں باری نہ آئے وہ اور بات ہے۔ 21 کو خط پوسٹ کروا رہی ہوں پتا نہیں پہنچا بھی ہے کہ نہیں (پہنچ گیا اور لگ بھی گیا) ہمارے علاقے کے ظفر اقبال کھوکھر بھائی...... آپ کا راضی نامہ 18 لاکھ میں...... بہت دکھ اور حیرانی ہوئی کہ بے گناہ ہونے کے باوجود آپ نے اتنے سال سزا بھگتی اور اب خون بہا کی مد میں اٹھارہ لاکھ...... میرے خدا اب پر اپنا رحم فرما۔ بھائی میری دعا ہے آپ جلد از جلد اپنے گاؤں آجائیں۔ سرگودھا والو عمران حیدر کی کوئی خیر خیریت؟ (ہم بھی فکر مند ہیں ان کی غیر حاضری سے) تمام قارئین کے تبصرے اچھے تھے ہمایوں سعید آپ کے خط ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مسافر میری پسندیدہ ترین اور جن کو نہیں پسند، ان کے بارے میں اب کیا کہوں......؟ کشکول تھوڑی سی بور ہوگئی ہے۔ چراغ رفتہ بہت زبردست...... باقی زیر مطالعہ...... خط لمبا ہو تو پھر بلیک لسٹ کا ڈر......''

✠ **سید محی الدین اشفاق**، فتح پور لیہ سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ''گزشتہ دنوں کوئٹہ (بلوچستان) اور ہمسایہ ملک ایران میں شدید زلزلہ آیا جس کے جھٹکے پورے پاکستان اور قریبی ہمسایہ ممالک میں محسوس کیے گئے۔ زلزلے کی شدت 2005ء کے زلزلے سے زیادہ تھی اور خیر سے ہمارے جہاندیدہ سیاستدان جو ہمارے نجات دہندہ ہونے کی بات کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور سونامی لانے سے کم بات نہیں کرتے، انہیں چاہیے کہ منہ اچھا نہ ہو تو بات اچھی کرلیا کریں۔ خدا سے رحمت مانگیں۔ سونامی کا لفظ بھول جائیں پلیز۔ خدا ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے (آمین) سسپنس جلدی مل گیا۔ اس بار ٹائٹل حسینہ کی تیاری پھیکی لگی۔ محفل میں ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل صدارت سنبھالے بیٹھے تھے۔ دلچسپ، جامع اور زبردست تبصرے کے ساتھ ویلڈن سر! زویا اعجاز کی آمد اور طاہر جاوید مغل صاحب کے ناول کی تجویز پسند آئی۔ اس کے علاوہ شکاری، دیوتا اور صدیوں کا بیٹا بھی شروع ہو جائیں تو بہت اچھا لگے گا۔ محمد تقی عباس بھائی آپ ٹائٹل حسینہ کی پریشانی دیکھ کر اپنی بھول گئے اچھی بات ہے۔ جون ایلیا کی سچی کھری باتیں پڑھیں۔ مسافر میں ناصر ملک صاحب نے میڈم کو شہرے کا دیوانہ کر دیا ہے۔ میڈم نے جو اپنی داستان دکھ سنائی تو اندازہ ہو گیا کہ بڑی حویلیوں کی بڑی کہانیاں ہوتی ہیں گا تمن اور تاجاں نے میڈم عرف چاند ماہی کو تھیلی کا پھپھولہ بنا کر پالا مگر چند ماہی اپنے باپ کو بچانے کے لیے عمر حیات کی جانب بڑھ گئی۔ ناصر ملک کے قلم نے یہ سب اچھوتے انداز میں پیش کیا۔ آخری صفحات پر محی الدین نواب نے زبردست تحریر لکھی جو ایک ہی نشست میں پڑھ لی۔ محی الدین انکل کی قسط وار کا شدت سے انتظار ہے۔ کشکول میں کچھ نیا نہ تھا لیکن اختتام پر جگا اور لوچن کا اکٹھے ایک عمارت میں دھماکے کروانا انوکھا اور دلچسپ لگا۔ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ مرچ مسالہ کے ساتھ آئے اور کیا خوب آئے۔ ضیا تسنیم بلگرامی معصوم ولی حضرت مجدد الف ثانی کے بیٹے محمد معصوم جو پیدائشی ولی اللہ تھے، جو شیر خواری میں روزہ رکھتے تھے، کا پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا، دراصل یہ کہانیاں سسپنس کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ یکم مئی کو میری امی جان مرحومہ کی برسی ہے ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔''

✠ **تصویر العین**، اوکاڑہ سٹی سے حاضر ہوئی ہیں۔ ''ٹائٹل اس بار کچھ خاص نہیں لگا۔ آپ کے خط میں پہلے نمبر پر ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب میں نے کب کریموں، پوڈروں کے اشتہارات کو پسند کیا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ آپ کے اندر کا چور ہے۔ حبیب احمد باہر کے موسم سے دل کا موسم متاثر نہیں ہوتا بلکہ دل کے موسم سے باہر کا موسم متاثر ہوتا ہے۔ محمد زبیر ساگر مبارک ہو، آپ کا خط شائع ہو گیا۔ بابر عباس آپ کا خط بہت اچھا تھا مگر کہانیوں پر کوئی تبصرہ نہیں تھا۔ بابر عباس کہیں سعدیہ بخاری کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہو جائے کہ ایک انار اور سو بیمار۔ سید محی الدین اشفاق صرف حسیناؤں کی آنکھیں ہی ہنستے ہوئے بند نہیں ہوتیں آدمیوں کی بھی بند ہوتی ہیں۔ محمد جاوید شبیر بربرہ میں آپ کی تمام تجاویز سے متفق ہوں۔ زویا اعجاز آپ کے لیے بس اتنا کہوں گی کہ بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔ ویسے بائی دا وے خوش آمدید۔ احسان سحر آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ محمد تقی عباس برادر اگر میں ویمپائر ہوں تو آپ کو مجھ سے ڈرنا چاہیے کیونکہ سب سے پہلے میں آپ کا ہی خون پیوں گی۔ طاہرہ یاسمین سسپنس کو لالٹین کے بجائے موبائل کی روشنی میں بھی تو پڑھ سکتی تھیں آپ۔ رمضان پاشا اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا۔ ماہا ایمان اپنی شادی کے لڈو کا ذکر کر رہی تھیں حالانکہ ان کی شادی تو اب قصۂ پارینہ بن گئی ہے۔ توصیف احمد لگتا ہے کہ ماہا ایمان کی عمر کا مسئلہ انٹرنیشنل معیار کا مسئلہ بن گیا ہے۔ محمد ہمایوں سعید آپ کا خط ہمیشہ ہی لاجواب ہوتا ہے۔ رضوان تنولی کریڑوی آپ کے تبصرے کے لیے بس ویلڈن۔ اعجاز احمد راحیل اس دفعہ دوستوں کے خطوط پڑھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ واقعی شادی کا سیزن آن ہے۔ ابرار وارث واقعی 80، 90 اور 2000ء کی کہانیوں اور آج کی کہانیوں میں بہت فرق آگیا ہے۔ محمد جاوید خان اتنے عرصے کہاں غائب رہے کہ خط بھی نہ لکھا۔ اپنا تبصرہ پڑھ کر اچھا لگا۔ مگر یہاں بھی قینچی کام دکھا ہی گئی۔ مسافر زبردست جا رہی ہے مگر مجھے میڈم ہیروئن کے روپ میں پسند نہیں۔ محی الدین نواب کی ''گر قبول افتد'' آج کی موجودہ صورت حال کے مطابق تھی واقعی موبائل فون ہماری نئی نسل کو خراب کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ موبائل فون کا نہیں بلکہ فون کے غلط استعمال کرنے کا قصور ہے۔ یہ فون استعمال کرنے والے پر انحصار کرتا ہے کہ وہ اسے کیسے استعمال کرے گا منفی یا مثبت۔ کاشف زبیر کی برائے کاروبار بھی اچھی کہانی تھی۔ مجھے ادارے سے گزارش کرنا ہے کہ آپ لوگ مجھے مجاہد کہانی کے رائٹر کا نام بتا دیں، پلیز۔'' (علی یار خان...... ویسے تبصرے کا شکریہ)

✠ **رضوان تنولی کریڑوی**، اورنگی ٹاؤن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مزدور کی نمائندگی کے مہینے کا شمارہ ہاتھ میں اور ہم اپنی کھاٹ پہ...... جون ایلیا سے کنی کترا کے محفل خطوط میں بریک لگائی...... ہماری اس منفرد محفل میں مثالی امن سکون، محبت و یگانگت سب کچھ ہے مگر چاچو جی آپ کبھی ایوب خان بن کے، کبھی ضیاالحق کے روپ میں، کبھی مشرف والا جلوہ دکھلا کے ہماری جمہوریت کے ایک ماہ کی صدارت کی سلطنت کا تختہ الٹ دیتے ہیں اس کے باوجود ہم احتجاج نہیں کرتے کستوری لگا کے...... حبیب برادر ماہا ایمان میری مریدنی ہے الیکشن میں جس کا مرضی ساتھ دے مگر سلیکشن میں میرے ساتھ ہے۔ محمد جاوید جیسے ہمارے

اعمال ویسے ہمارے حکمران پھر کا ہے کا رونا دھونا۔ سید محی الدین اشفاق حسینائیں ہنستے ہوئے صرف آنکھیں بند نہیں کرتیں بلکہ منہ کھول دیتی ہیں پوائنٹ نوٹ کیجیے۔ تصویر العین آپ اصلی والی قینچی کی بات کر رہی ہیں یا وہ قینچی جو آپ کے منہ میں دانتوں کے اندر زبان مبارک والی قینچی، براہ کرم قینچی کی وضاحت کیجیے کستوری لگا کے...... قیصر اقبال گچھ، جاوید بلوچ، آپی طاہرہ کو بلیک لسٹ دیکھ کے دکھ ہوا۔ کہانیوں کی ابتدا گوشۂ تصوف معصوم ولی سے کی۔ حضرت مجدد الف ثانی ولایت کے مقام کے بلند ولی اور ان کے لخت جگر محمد معصوم قطب ولایت پڑھ کے روح سرشار ہوگئی۔ محبوب و دل عزیز تحریر ڈاکٹر ساجد امجد کی چراغ رفتہ دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی تحریر دارا شکوہ کے انجام پہ دکھ ہوا۔ اورنگ زیب بادشاہ بیگم وغیرہ اور حضرت محمد معصوم والا زمانہ ایک ہی تھا بھی محمد معصوم گوشۂ ولایت میں اورنگ زیب کو بادشاہ ہونے کی خبر دیتے ہیں...... کاشف زبیر کی برائے کاروبار اس ماہ کے سسپنس کی سب سے اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ فیرن نے عمدہ ترکیب سوچ کے کلائنٹ کو اسنو مین بنا دیا۔ بیگ صاحب اس بار قتل کے کیس کے بجائے فحش حرکتوں کے مرتکب ملزم کا دفاع کرتے نظر آئے۔ سلیم انور کی نشانی ہمارے منہ پہ مغرب کا ایک طمانچہ ثابت ہوئی۔ مغرب میں یاقوت کا چور پکڑا جاتا ہے اور ہمارے ہاں قاتل آزاد پھرتے ہیں۔ منظر امام کی ستمگر اور بابر نعیم کی فوٹو البم بچوں کے رسائل کے لیے تھیں۔ تنویر ریاض کی تکمیل پڑھ کے لنگڑے آرٹسٹ پہ سخت غصہ آیا، مردود ملعون کو اپنی ٹانگ کا نقص نظر نہیں آیا۔ ش م جمیل کی بھول بے وجہ خون کی ہولی کھیلنے والی فریزل کی نفسیاتی سنگ دل بے رحم بڑھیا ماں بالآخر پکڑی گئی...... ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ناسور ہمارے ایشین سماج کے چہرے پر چیچک کا بدنام داغ ہے۔ سسپنس کی آخری کہانی محی الدین نواب کی سبق آموز کہانی رہی۔ نواب صاحب نے موبائل فون پہ کہانی لکھی ہے اور بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی کچھ نہ لکھا حقیقتاً اس سے زیادہ ہوتا ہے، ہر موبائل فون والا کوئی نہ کوئی کہانی بھگتا چکا ہے۔ محفل شعر و سخن میں عادل عاصی خٹک کا انتخاب پسند آیا، کترنیں اچھی رہیں۔ سسپنس کے دو قاری ذیشان بدر منیر اور چوہدری سرفراز کافی عرصہ پہلے خط لکھا کرتے تھے، عرصہ ہوا ان دونوں قاریوں کا کوئی خط شائع نہیں ہوا۔ جلد از جلد رابطہ کیجیے۔''

✠ **توصیف احمد**، پٹھان کالونی، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''عرض یہ ہے کہ اس سال وسط اپریل ہی میں شدید گرمی کا سامنا ہے۔ لیکن شمارہ ملتے ہی ٹھنڈک کا احساس دل سے لے کر دماغ تک ہوا۔ اس بار حسینۂ سرورق نے سر تو ڈھک لیا تھا، بس...... ایک کندھے کی ضرورت باقی رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر مغل صاحب عمار کشف کسی سیاسی پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے ہیں یا آزاد امیدوار کی حیثیت سے، جو آپ موصوف کے لیے زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ بابر عباس، ویدجی آپ نے مبنی بر مشکل الفاظ تبصرے کو سمجھنے کے لیے انوکھا نسخہ تجویز کیا ہے۔ ایک بار ضرور لڑائی کریں گے۔ محی الدین اشفاق صاحب حسینائیں ہنستے ہوئے آنکھیں کیوں بند کر لیتی ہیں؟ بھائی کم از کم مجھے تو ایسا کوئی تجربہ نہیں، اس کا جواب آپ کو قیصر اقبال صاحب دیں گے۔ احسان سحر لگتا ہے آپ نے عمار کشف کے فیڈر میں خواب آور گولیاں ملا دی ہیں، اس لیے اس بار محفل میں حاضری بھی نہیں دی۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ کیا آپ نے صرف ایک کہانی کی قیمت ادا کی، باقی شمارہ مفت میں پڑھا۔ ارے بھائی ہمایوں سعید...... ماہا ایمان کیا ہے اور کیا نہیں۔ اس بارے میں موصوفہ کو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے قدرت اللہ نیازی صاحب کا خط ملاحظہ فرمائیے۔ رضوان بھائی جب تک کشکول یا مسافر میں کوئی ایک سلسلہ انجام کو پہنچ نہ جائے تب تک تو کسی دوسرے مستقل سلسلے کی فرمائش نہ کیجیے، کستوری لگا کے۔ اعجاز احمد راحیل تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کو سب کچھ اچھا لگا، برا کچھ بھی نہیں لگا۔ واہ، کمال کے آدمی ہیں آپ۔ تصویر العین صاحبہ ابھی پرانی کہانیوں کی دوبارہ اشاعت کے بارے میں مشورہ ہی ہو رہا ہے اور آپ نے اپنی فرمائش بھی نوٹ کروا دی۔ واہ۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ حافظ محمد عرفان آپ کا خط شائع نہ ہو سکا۔ یقیناً آپ نے میرے سوال کا جواب دیا ہوگا لیکن خیر کوئی بات نہیں، آپ کے اگلے خط کا انتظار رہے گا۔ تاریخی کہانی چراغ رفتہ میں دارا شکوہ کے انجام سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کم از کم اورنگ زیب کو اپنے بھائی کی لاش کی اتنی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن شاید شاہوں کو اپنے جاہ و جلال کی بقا کے لیے یہ حیوانیت کا برتاؤ کرنا پڑتا تھا۔ مرچ مسالا میں سلمٰی نے جس کریہہ انداز میں بیگ صاحب کو خریدنے کی کوشش کی، وہ ہمارے معاشرے کا خاصہ بن چکا ہے۔ ستمگر میں منظر امام نے تصویر کا حقیقی رخ پیش کیا، اگر ایک لیڈر حکمران بننے کے لیے غلط راہوں کا انتخاب کرے گا، تو کیا حکمران بننے کے بعد وہ حکمرانی کا حق ادا کر سکے گا۔ بالکل ناممکن۔ صفحہ نمبر 31 کی مزاحیہ لکیروں نے بے ساختہ مسکراہٹ پر مجبور کر دیا جبکہ محفل شعر و سخن میں قدرت اللہ نیازی صاحب اور فوجی صابر علی صاحب کے انتخاب کا جواب نہیں تھا۔''

✠ **عدنان یوسف**، بنوں سے محفل یاراں میں شرکت کر رہے ہیں ''مئی کا شمارہ 16 اپریل کی نسبتاً ایک گرم شام میں موصول ہوا۔ سرورق پر موجودہ ٹائٹل گرل خواب خرگوش کا مزہ لے رہی تھی۔ اس دفعہ کے سرورق نے بالکل مایوس کر دیا۔ محفل دوستاں میں پہنچے تو کرسی صدارت ڈاکٹر مرزا کے نیچے، یعنی وہ کرسی کے اوپر موجود تھے، مبارک باد قبول فرمائیں۔ احسان سحر! ٹائٹل پر موجود صنف نازک کو اتنے غور سے بھی نہ دیکھو کہ وہ ڈر جائے اور پھر آپ کہتے ہو کہ وہ شرما گئی، یار شرمانے اور ڈر جانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بابر عباس اور توصیف احمد، عمار کشف کے مشکل الفاظوں کا رونا روتے ہیں۔ باقی تبصروں میں ہمایوں سعید، اعجاز احمد، ابرار وارث اور تصویر العین کے تبصرے شاندار تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی...... کہانی زبردست بھی ہے اور دکھی بھی...... اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا، اس کے بعد کشکول پڑھی۔ کشکول میں شیخ حامد کی بدمعاشیاں جاری ہیں اور قانون خاموش...... خیر کشکول ایک زبردست ناول ہے، ویلڈن۔ کاشف زبیر صاحب کی برائے کاروبار، ثمر عباس کی دوسرا رخ اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ناسور بھی بہترین کاوشیں تھیں، لیکن آخری صفحات پر جو محی الدین صاحب کی گر قبول افتد تھی، وہ بے حد پسند آئی۔ موبائل فون کے جو فوائد و نقصانات ہیں وہ محی الدین نواب صاحب نے بہت اچھی طرح اجاگر کیے تھے۔ آخر میں سب دوستوں کی پرزور فرمائش کے ساتھ ساتھ میری بھی ریکویسٹ ہے کہ پرانی کہانیاں پھر سے شائع کیجیے۔ محی الدین صاحب کا ایک ناول تھا ''ثابت قدم'' اس کی ایک قسط میں نے پڑھی تھی اور دوسری حصہ رہ گئی تھی، اگر ہو سکے تو اس کو سب سے پہلے شائع کیجیے۔''

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے بھرپور تبصرہ کر رہے ہیں ''بجلی کی لوڈشیڈنگ سے تنگ حسینہ آخر کار دوپٹا اوڑھ کے سو

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی گئی۔ گرمیاں شروع اور عوام جو پہلے سے ہی بے حال ہوئے پڑے ہیں بجلی کی لوڈشیڈنگ نے بالکل ہی مار گرایا ہے۔ اداریہ میں مختلف موضوعات کا تذکرہ ہے جس میں محکمۂ تعلیم بھی شامل ہے تو خوش ہو جائیں کہ اسکولوں کو چیک کرنے کے لیے بھی ججز کو ذمے داریاں سونپ دی گئی ہیں جس کی وجہ سے بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر مرزا طویل انتظار کے بعد کرسی صدارت پر براجمان ہو ہی گئے ہیں۔ مبارکاں، ملا جلا تبصرہ پسند آیا۔ حسیب احمد! آپ کو کاہے کی فکر؟ الیکشن میں کوئی کسی کے بھی ساتھ ہو؟ زبیر ساگر شکریہ جناب کہ تبصرہ آپ کو پسند آیا۔ بابر عباس!''چل پڑھا'' تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کر رہا ہے جو اساتذہ سے زیادتی ہے۔ محمد جاوید شبیر روس کا الیکشن نامہ بیان کر رہے تھے میرے بھائی! پاکستان میں بھائی تو کیا ہم برادری تک نہیں چھوڑتے اور پھر واویلا کرتے ہیں کہ یہ کیسے حکمران آ گئے۔ احسان سحر! ابھی نواب صاحب کو کون کہے وضاحت کریں آخر ''نواب'' ہیں مزاج برہم ہو گیا تو؟ محمد تقی عباس! آپ کو دیکھ کے ہی تو ٹائٹل گرل پریشان تھی اور آپ اس کو مزید پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ طاہرہ یاسمین! لائٹ کا انتظار کر لیا کریں یہ نہ ہو اس عمر میں لالٹین پر ڈائجسٹ پڑھنے سے بینائی بالکل ہی جاتی رہے آخر 90 سال تھوڑی عمر تو نہیں نا! رمضان پاشا! یہ عمار کشف کی چوتھی انٹری ہے پہلی نہیں۔ محمد ہمایوں سعید! بچے اتنا نہیں روتے اور اس قدر اوور کانفیڈنس ہونا بھی بری عادت ہے، جہاں تک سوال ہے ماہا ایمان کا تو بس یہی کہوں گا کہ جب خالی برتن پر ضرب پڑتی ہے تو وہ بہت شور کرتا ہے۔ رضوان تنولی اشاوا اشاوا آتے ہی بچھا دیا صنف چیں بہ جبیں کو، ویلڈن۔ ابرار وارث! میر جعفر کو جانتے ہیں نا؟ بس دھیان رکھنا کہ آپ کا طرز عمل آپ کو میر جعفر سے نہ ملا دے۔ تصویر العین! احسنین بلوچ کے بارے میں خبر بالکل پکی ہے۔ کشکول ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ لیاقت حسین، دشنو، جگا اور لوچن کے ایکشنز نے مزہ دوبالا کر دیا۔ مسافر تو کسی اور ہی ڈگر پر چل نکلی ہے۔ کہانی کے مرکزی واقعات کو آگے بڑھانے کے بجائے ادھر ادھر کے واقعات سے ٹائم پاس کیا جا رہا ہے۔ شہریار کو مشکل سے نکال کر ان کو پھر روانہ کر دیا جاتا ہے۔ گرقبول افتد محی الدین نواب کا ایک اور شاہکار ہے جس میں انسانی نفسیات کو جدید دور کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ نواب صاحب کا مشاہدہ زبردست ہے۔ نوجوان موبائل کی دنیا میں گم ہے اور اس سے چھٹکارا کسی صورت بھی ممکن دکھائی نہیں دے رہا۔ اسماء قادری کی معصومہ بہت ہی چالاک ثابت ہوئی۔ محبت میں ہر عمل جائز گردانتے ہوئے روحی اور اس کے بچے کی جان تک لے لی۔ ستم گر الیکشن کے اس موقع پر خوب جچی۔ منظر امام نے سیاسی پارٹیوں کے منشور کی خوب تشریح کی۔ تاہم ہوتا یہی ہے ''لوٹتے چھوٹو۔'' کاشف زبیر برائے کاروبار لے کر آئے کلائیڈ اور فیرن نے اپنا آف سیزن چمکانے کے لیے خوب ڈرامار چایا۔ مرزا امجد بیگ کی مرچ مسالا بھی خوب رہی۔ سلمٰی اینڈ گروپ کا تو بیگ صاحب نے وہی حال کیا کہ ''آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔'' سلیم انور کی مختصر کہانی نشان کچھ خاص نہ رہی۔ ہماری پولیس کو شک بھی ہو جائے تو وہ لمبا لٹا دیتے ہیں اور وہاں پولیس فرینکی کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے اتنا تردد کر رہی ہے؟ بابر نعیم کی فوٹو البم مختصر مگر حساس موضوع پر علامتی کہانی تھی۔ رانا رضوی، رزاق شاہد اور رحیمہ سرور کا انتخاب اچھا رہا۔ کترنوں میں ذیشان فیروز کا انتخاب بہترین تھا۔''

✠ **رمضان پاشا،** گلشن اقبال کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں ''اس بار ذاکر بھائی نے ایسا ٹائٹل بنایا کہ پچھلے ماہ کی کسر پوری کر دی، خوابوں کی دنیا میں پہنچی ہوئی حسینہ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر آنے والے ڈاکٹر، مرزا انتظار نذیر مغل صاحب کو مبارکباد، موصوف، اسم گرامی بہت طویل ہے، گھر والے پکارتے کیسے ہوں گے۔ بھائی بابر عباس کیا آپ نے اجنتا کے غاروں میں پرورش پائی تھی یا ہمالیہ کی چوٹی پر مقیم تھے، آپ تو کھاریاں کے کوہ میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ پر کس حوالے سے تبصرہ کروں؟ تصویر العین صاحبہ کالم آپ کے خط کہانیوں پر تبصرے کے لیے ہی ہوتا ہے نہ کہ دوستوں کی ٹانگ کھینچنے کے لیے ویسے اس بار بابر عباس میرے ہدف پر ہیں۔ جعفر علی کے مشورے پر عمل کریں گے تو یہ عمل جگالی کے مترادف ہوگا۔ کثرت رائے سے مجبور ہو کر آپ پرانی کہانیاں پھر سے شائع کریں گے تو قند مکرر کے طور پر قبول ہے۔ تاریخی کہانی چراغ رفتہ اس بار بہت اچھے طریقے سے تحریر کی ہے ساجد بھائی نے پچھلے پانچ ماہ کی بوریت کا ازالہ کر ہی دیا۔ برائے کاروبار کہانی بہت دبنگ تھی، لوگ کاروبار کے لیے بھی فراڈ کرتے ہیں۔ کشکول کی یہ قسط بہت ہی اچھی تھی۔ دوسرا رخ اس غیر ملکی کہانی میں کچھ اٹھا پٹک تو نہیں ہوئی پھر بھی لطف وہی آیا، ثمر عباس صاحب کا ترجمہ کرنے کا انداز بہت پسند آیا۔ معصومہ کہانی بہت ہی عمدہ تھی، مگر اسے پاکیزہ یا دلکش میں لگانا چاہیے تھا۔ امجد صاحب کی تازہ کہانی مرچ مسالا کا موضوع بالکل نیا ہے، اس کہانی میں ایک کردار میرا ہم نام ہے جسے تونگر ظاہر کیا ہے، جبکہ میں اس کے بالکل برعکس ہوں۔ نشان نہایت مختصر، نہایت دلچسپ کہانی، خوب لطف آیا۔ محفل شعر و سخن میں سعید عباسی کا انتخاب اچھا تھا، رشید بابا کا چناؤ بھی پسند آیا۔ اظہر حسین اور کمال انور کے اشعار بھی قابل داد تھے۔ سیاست کے پس منظر میں لکھی ہوئی منظر امام کی ستم گر تے خوب لطف بہم پہنچایا۔ فوٹو البم بالکل اچھی نہیں لگی۔ البتہ ناسور دل پر اثر کر گئی۔ مسافر میں میڈم شکیلہ اپنی سوانح عمری سناتی نظر آئیں۔ تکمیل، بے وقوف فنکار نے اتنی حسین اور پیاری لڑکی کو مار دیا، ایسے پاگل فنکار اور مصور کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا، البتہ کہانی مزیدار تھی۔ بھول کیسی غضب کی کہانی تھی، اختتام تو حیرت انگیز تھا، خوب لطف آیا۔ گرقبول افتد یہ تو آدھی رات کو پڑھنے کی چیز ہے، یہ کہانی نیم شب کو ہی پڑھنا چاہیے اور سرہانے موبائل فون رکھ لینا چاہیے۔ میں نے رکھ لیا ہے۔ اس طرح کی کہانی صرف نواب صاحب ہی لکھ سکتے ہیں مختصر یہ کہ اس ماہ کی بہترین کہانی ہے۔''

✠ **حسیب احمد چناہے،** الگڈی کرک سے چلے آ رہے ہیں ''مئی کا شمارہ کافی تاخیر سے 20 اپریل کو ملا۔ سرورق کی دوشیزہ کو شاید نیند آ رہی تھی اس لیے تو آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نذیر مغل صدارت کی کرسی پر براجمان تھے، نگران صدر بننے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ اپنا خط دوسرے نمبر پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ زبیر بھائی اتنا چھوٹا خط؟ بابر عباس صاحب آپ نے تو کہانیوں پر تبصرہ کیا ہی نہیں؟ تصویر العین صاحبہ آپ کو ابھی پتا چلا کہ بہار آ گئی؟ واہ بھئی! رمضان بھائی کیا واقعی میں آپ پرانے تبصرہ نگار ہیں، پھر آپ کی عمر کتنی ہے۔ ہمایوں سعید صاحب آپ ہاتھ دھو کے ہمارے پیچھے کیوں پڑ رہے ہیں۔ آپ محفل کے تمام دوستوں پر طنز کرتے رہتے ہیں۔ زویا اعجاز (لاہور) سسٹر محفل یاران میں خوش آمدید۔ طاہرہ یاسمین (سرگودھا) باجی آپ سسپنس کے ملنے پر کچھ زیادہ ہی خوش

ہوتی ہیں۔ کنول صاحب کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر دکھ ہوا۔ مدیرۂ اعلیٰ صاحبہ کیا سسپنس کے صفحات 300 نہیں ہو سکتے تاکہ بلیک لسٹ ختم ہو جائے بے شک قیمت بڑھا دیں (فی الحال تو یہ مشکل ہے) سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ اس ماہ کی قسط بہت زبردست رہی۔ مسافر میں میڈم عرف چندو ماہی کی ہسٹری پڑھی۔ واقعی میڈم کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا۔ لے پالک بچے تو گناہ گار نہیں ہوتے، گناہ گار تو ان کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ اگلی قسط میں میڈم کی گینگسٹر بننے کے بارے میں پتا چلے گا۔ بابر نعیم کی فوٹو البم نے بہت جھنجھوڑ دیا۔ منظر امام کی ستم گر بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ پرائے آدمی کو وہ مقام نہیں دینا چاہیے جو وہ چاہتا ہو۔ نواب صاحب کی گرقبول افتد پڑھی۔ نواب صاحب نے پھر محفل کو چار چاند لگا دیے۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو چھوٹی عمر موبائل فون نہیں دینا چاہیے۔ اس سے مسائل کم ہونے کے بجائے بڑھیں گے۔ کاشف کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لڑکیوں نے غلط پتا دے کر اسے دوسرے گھر پھنسانے کے لیے بھیج دیا۔ اسما قادری کی معصومہ بھی زبردست کہانی تھی۔ معصومہ حبیب کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اس کے برعکس معصومہ حبیب کی دوسری شادی کرانے پر رضامند ہو گئی۔ کاشف زبیر کی برائے کاروبار بھی پسند آ گئی۔ سارہ فیرن اور کلائڈ کے گیم کو جان گئی تھی۔ ثمر عباس کی دوسرا رخ نے حیران کر دیا۔ جوئے کا دوسرا چہرہ تو واقعی اندوہناک تھا۔ ڈاکٹر سجاد امجد کی کہانی تو ایک سنسنی خیز داستان تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی تو ہمیشہ ہی کوئی اچھا سا واقعہ پیش کر دیتی ہیں۔ اس دفعہ بھی بہت زبردست قصہ تھا۔ مرزا امجد بیگ کی مرچ مسالا ایک عمدہ تحریر تھی۔ واقعی میں ناصر کے ساتھ بہت ظلم ہوا تھا۔ سلیم انور کی داستان اچھی تحریر۔ کان پر زخم کے نشان کی وجہ سے فرینکی پھنس گیا۔''

✠ **عادل خان،** چارسدہ سے تشریف لائے ہیں ''مئی کا سسپنس اٹھارہ اپریل کو مل گیا۔ سب سے پہلے سرورق سے آمنا سامنا ہوا جو کہ منفرد نہ ہونے کے باوجود خاص لگا۔ محفل میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر مرزا صاحب صدارت کی کرسی پر اپنے شاندار تبصرے کے ساتھ سرفہرست تھے۔ مبارک ہو جی۔ اعمر تقی عباس صاحب! خدا آپ کو اور محفل کے تمام قیدی دوستوں کو آزاد فضائیں نصیب فرمائیں۔ اس دفعہ سارے تبصرے تقریباً سنجیدہ تھے۔ آخری صفحات پر محی الدین نواب کی کہانی ''گرقبول افتد'' ایک شر انگیز داستان تھی جو کہ ہمارے سب گھر والوں اور دوستوں نے پسند کی۔ موبائل فون کے فائدوں کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی بہت ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ موبائل فون کے نقصانات و فوائد آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ مسافر میں میڈم شکیلہ کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ اگلی قسط کا انتظار۔ کشکول اس دفعہ کافی تیز تھی۔ لیاقت پر پے در پے حملوں نے کہانی کو کافی دلچسپ کیا ہوا ہے۔ کاشف زبیر کی برائے کاروبار ایک کاروباری کہانی تھی۔ اسٹومین کا کردار دلچسپ رہا۔ دوسرا رخ اچھی کہانی تھی۔ میکس کو اچھی شریک حیات ملی۔ معصومہ ایک دلخراش داستان تھی۔ روحی تو مر گئی لیکن معصومہ نے اپنے پیار کو واپس پا لیا۔ ناسور بھی خوب رہی۔ بیگ صاحب کی مرچ مسالا کافی تیز تھی۔ سلمٰی ایک حاسد عورت تھی۔ اس کو ایک بہترین سبق مل گیا ہوگا۔ ستم گر حقیقت پر مبنی داستان تھی۔ ہمارے چچا بھی آنے والے انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں۔ میں اکثر ان کو کہتا ہوں کہ جلسے جلوسوں میں عوام سے اتنے وعدے نہ کریں۔ بعد میں تو آپ ویسے بھی وعدے پورے نہیں کرنے والے۔ وہ ہنس کر ٹال جاتے ہیں کہ بیٹا تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔'' (صحیح کہا آپ کے چچا نے۔ ایسا ہی ہے کہ ہمارے تمام سیاست دان عوام کو انتہائی بے وقوف سمجھتے ہیں اور لوٹ مار، جھوٹ، فریب اور اپنے آپ کو دوسروں سے افضل تصور کرنے کو سیاست کا نام دیتے ہیں۔ اللہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ آمین)

✠ **رائے قیصر عباس کھرل،** سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے چلے آ رہے ہیں ''اس ماہ کا شمارہ حسب معمول 18 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل پر حسینہ پریشان حال دکھائی دی، شاید وہ ملکی حالات کی وجہ سے پریشان تھی بہرحال اس کے بعد جون ایلیا کی باتیں پڑھنے کو ملیں جو بہت ہی اہم تھیں اس کے بعد سیدھے محفل یاراں میں پہنچے تو کرسی صدارت پر ڈاکٹر مرزا انتظار مغل صاحب ایک ماہ کے لیے قبضہ جمائے بیٹھے نظر آئے۔ مغل صاحب کی باتیں بہت ہی اچھی تھیں۔ بابر عباس صاحب سناؤ کیسے ہو آپ؟ قدرت اللہ نیازی صاحب اب محفل میں اکیڈمی بنانا چاہ رہے ہیں، چلو ہم ضرور داخلہ لیں گے۔ حسنین ہاشمی صاحب آپ کا خط دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ بھی ہمارے ساتھی بن گئے ہیں۔ زویا اعجاز اب آپ یقیناً بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں گی کیونکہ آپ کا خط شائع ہو گیا ہے (مبارک ہو) تصویر العین صاحبہ آپ میرے لیے بھی دعا کر دینا کہ اللہ مجھے بھی رہائی عطا فرمائے۔ حافظ شاہد اور حسنین ہاشمی کو آپ نے بہت دعائیں دیں۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کو ماہا ایمان کو بھینس تو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔ ویسے اگر کوئی دوست ایک یا دو ماہ حاضری نہ دے سکے تو لوگ بھول ہی جاتے ہیں۔ بلیک لسٹ اور سرگودھا جیل والے تمام دوستوں کو سلام۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی مسافر پر پہنچے۔ اس دفعہ کہانی کا موضوع میڈم شکیلہ خود تھی۔ بہرحال اس کی دکھ بھری داستان سن کر دل پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد کشکول پر پہنچے۔ کہانی ٹھیک جا رہی ہے۔ شیخ حامد اب پھر سرعام سامنے آ گیا ہے اور اس کے ساتھی اس کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔ اس کے بعد تاریخی کہانی چراغ رفتہ پر پہنچے، زبردست، بڑا مزہ آیا۔ فوٹو البم بھی اچھی تھی۔ مرچ مسالہ اور نشان بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ محفل شعر و سخن میں حافظ شاہد عمران، حسنین ہاشمی، عنصر محمود، عقیل چٹھہ کے اشعار پسند آئے۔ اس کے علاوہ باقی اشعار بھی بہت اچھے تھے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ملک سیف علی اعوان، نور پور اعواناں۔ سہرین ناز، حیدرآباد۔ حافظ شاہد عمران چدھڑ، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ ناصر حسین ہرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔ زیڈ۔ اے خان نیازی، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ ناصر حسین ہرل، پٹھان کوٹ، بھوانہ۔ محمد ہمایوں سعید، جتوں۔ محمد زبیر ساگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ رضوان احمد، کراچی۔ کرن ایوب، ملتان۔ نذیر احمد ڈاہا، طاہرہ گلزار، پشاور۔ ڈاکٹر مرزا انتظار نذیر مغل، تسووال کھوکھران۔ حسنین ہاشمی صاحب، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ فائزہ، راولپنڈی

❊ ❊ ❊

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعض اوقات حالات کی سنگینی کسی کے بچپن پر بھی رحم نہیں کرتی... وہ جو ابھی طفلِ مکتب تھا، بادشاہت کے اسرار و رموز اور اختیار و اقتدار کے نشے سے بے خبر ماں کی گود میں میٹھی نیند سونے کا عادی تھا کہ اچانک ایک شاہی فرمان نے اسے شعور کی کئی منزلیں طے کرا دیں۔ وہ کہ جو محل سے باہر کی دنیا سے بے خبر تھا کہ ناگہانی رستے سفر بن کر اس کے قدموں سے لپٹ گئے۔ بادشاہت سے دامن چھڑا کر غلامی اختیار کی اور بازار میں مثلِ یوسف فروخت ہوا۔ ابھی جانے والے کل کے غم سے فرصت نہیں ملی تھی کہ آنے والے کل میں وہ منظر نامہ لکھا دیکھا کہ قسطنطنیہ کا شہزادہ جب غلامی کا طوق گلے میں ڈال کر بازار، بازار فروخت ہوتے ہوئے ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تو تاج و تخت نے اسے کچھ اس طرح سرآنکھوں پر بٹھایا کہ تقدیر کی بازی گری پر ایک دنیا حیران تھی۔ وقت کے اس الٹ پھیر کو تاریخ دھیرے دھیرے اپنے دامن میں کچھ اس طرح سمیٹ رہی ہوتی ہے کہ آنے والی نسلیں سیکھنے اور سکھانے کا عمل جاری رکھ سکیں۔

امیر غلام

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

ڈاکٹر ساجد امجد

WWW.PAKSOCIETY.COM

حرم سرا میں اس وقت سوگ اور افسوس کی چادر تن گئی جب شاہی حکم یہ پہنچا کہ تمام شہزادوں کو قتل کر دیا جائے تاکہ ولی عہد کے سوا تاج و تخت کا دعویدار زندہ نہ رہے۔ فساد کا بازار گرم ہونے سے پہلے ہی فتنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

فرماں روائے سلطنت قسطنطنیہ سے اس فیصلے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کی علم دوستی اور ہنر پروری ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔

بادشاہوں کے دماغ تو حاشیہ بردار خراب کرتے ہیں۔ سلطان محمد نے ادھر تخت پر پاؤں رکھا ادھر خوشامدی ارکانِ دولت نے اسے گھیر لیا۔ ہر وہ مشورہ دیا جس سے اپنی کامل وفاداری کا یقین دلایا جائے خواہ وہ فیصلہ مفادِ عامہ کے کتنے ہی خلاف ہو۔ سلطان محمد ابھی تختِ حکومت پر نیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے ان مشوروں پر عمل کرنے لگا۔

خوشامدیوں نے خطرات سے اس طرح آگاہ کیا۔ نشیب و فراز کا مشاہدہ اس طرح کرایا کہ خود بادشاہ کو اقتدار کے تخت میں دراڑیں پڑتی صاف نظر آنے لگیں۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس نے اگر ان مشوروں پر عمل نہیں کیا تو اس کا اقتدار چند روزہ ہے۔ سب سے بھیانک مشورہ یہی تھا کہ تمام شہزادوں کو قتل کرا دیا جائے۔ اس قتلِ عام کی دلیل ماضی کے ایک واقعے کو بنایا گیا۔

بعض بزرگ ارکان نے اسے بتایا کہ سلطان مراد مرحوم کے عہدِ حکومت میں ایک شخص گزرا ہے جو سلطنت کا دعویدار تھا۔ وہ اپنے آپ کو یلدرم بایزید کا بیٹا بتا کر ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم کرنے کا خواہاں تھا۔ اس نے ایسا فساد برپا کیا کہ حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ بڑی مشکلوں سے اس فتنے کو فرو کیا گیا۔

''ان حالات کا علم مجھے بھی ہے۔'' سلطان محمد نے کہا۔ ''اگر پھر کسی نے جرأت کی تو میں اس جسارت کا سر کچلنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''اگر سر اٹھانے سے پہلے ہی سر کچل دیا جائے تو کیا زیادہ بہتر نہیں ہوگا؟'' مشیروں نے اسے اکسایا۔

''سانپ نظر نہ آئے تو کس کا سر کچلا جائے؟''

''سانپ تو آپ کے اردگرد ہیں۔ کون سا سانپ کس وقت سر اٹھائے، کس کو خبر۔ عقل مند وہ ہیں جو بارش سے پہلے اپنا سامان کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیتے ہیں۔''

''تم لوگ ہمارے مخالفوں کی نشاندہی کرو۔ ہم ضرور کارروائی کریں گے۔''

''آپ کے دشمن وہی ہوسکتے ہیں جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمام شہزادے؟''

''ان شہزادوں کے سوا کس کو تختِ شاہی کا دعویٰ ہوسکتا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ مخالفتوں کی آندھی کے بغیر اپنا سفر طے کریں؟''

''میں ان شہزادوں کو ملک بدر بھی تو کرسکتا ہوں۔''

''اس صورت میں بغاوت کی آندھیاں باہر سے اٹھیں گی۔ یہ جہاں جائیں گے مظلومیت کا لباس پہن کر جائیں گے۔ آپ ایسی تلوار تخلیق کر دیں گے جو ہمیشہ آپ کے سر پر لٹکی رہے گی۔''

''پھر ہم اور کیا کرسکتے ہیں؟''

''تمام شہزادوں کو تہ تیغ کرا دیجیے۔ یہ قتل آپ اپنے لیے نہیں بلکہ ملک کی سلامتی کے لیے کرائیں گے۔''

''ان شہزادوں میں تو میرا چھوٹا بھائی یوسف بھی شامل ہے۔''

''یہ فیصلہ ولی عہد کے سوا سب کے لیے ہونا چاہیے۔''

''یوسف بھی؟''

''یہ تو اور بھی ضروری ہے۔ شاہی انصاف کا تقاضا یہی ہے بلکہ جو جتنا قریب ہوتا ہے بادشاہوں کے لیے اتنا ہی زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یوسف کا قتل آپ کے دبدبے میں بھی اضافہ کرے گا۔''

سلطان محمد اور ارکانِ دولت کے درمیان ہونے والے مشوروں کی بازگشت ملکہ یعنی سلطان محمد اور یوسف کی والدہ تک بھی پہنچ گئی۔ ان مشوروں کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا لیکن انہی مشیروں میں کم از کم ایک ایسا بھی تھا جو یوسف کے خلاف تھا لیکن عتابِ شاہی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی زبان بند رکھی لیکن فوراً ہی ملکہ تک یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ وہ اگر یوسف کو بچا سکتی ہے تو بچا لے۔

سلطان محمد بادشاہ تھا لیکن تھا تو ملکہ کا بیٹا۔ ملکہ نے اسے بلا بھیجا۔ سلطان محمد کو معلوم تھا کہ اسے کس لیے بلایا جارہا ہے لیکن ماں کا کہنا بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ بادل ناخواستہ والدہ کے پاس پہنچ گیا۔

''سلطان محمد، یہ کیا دیوانگی تم پر سوار ہوئی ہے۔ میں نے سنا ہے تم نے تمام شہزادوں کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔''

''آپ نے درست سنا ہے، سلطنت کے استحکام کے لیے مجھے یہی ایک تدبیر نظر آئی۔''

''یہ تدبیر تمہیں نہیں سوجھی ہے، تمہارے نادان

مشیروں نے یہ بات تمہارے ذہن میں بٹھائی ہے۔''

''مجھے تو اب یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ میرے مشیروں میں کون ایسا ہے جس نے یہ بات آپ تک پہنچائی۔''

''یہ دیکھنے کے بجائے یہ سوچو کہ خلقِ خدا کو قتل کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ یہ کیسے خیرخواہ مشیر ہیں جو تمہیں خدا کے عذاب سے نہیں ڈراتے۔''

''خلقِ خدا کو بچانے کے لیے اگر چند لوگوں کا خون بہا دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔''

''تمہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ جن شہزادوں کو تم قتل کرو گے وہ تمہارے ہی خاندان کے ہیں۔''

''ان ہی سے خطرہ زیادہ ہے۔''

''کیا تم اپنے بھائی کے لیے بھی سفاک ہوگئے ہو۔ وہ تو ابھی بچہ ہے، اس سے تمہیں کیا خطرہ؟''

''یوسف کو قتل کر کے میں دنیا کو بتا سکوں گا کہ میں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔''

''تمہارے اس فعلِ بد سے مجھ پر کیا گزر جائے گی، تم نے سوچا؟''

''آپ کا ایک بیٹا تو زندہ ہے۔''

''ماں تو دونوں آنکھیں چاہتی ہے۔''

''میں اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں لے سکتا۔''

''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ یوسف کو حرم سرا سے باہر بھی نہیں نکلنے دوں گی۔ تم اسے میری آنکھوں کی روشنی کے لیے زندہ رہنے دو۔''

''آپ کو یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔'' سلطان محمد نے کہا اور مزید کسی بحث میں الجھے بغیر ماں کے پاس سے اٹھ گیا۔ اس کے اس طرح اٹھ جانے سے ملکہ کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنا ارادہ بدلنے والا نہیں۔

ملکہ نہایت دانش مند تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس معاملے میں مزاحمت نہیں تدبیر کام آسکتی ہے۔ یوسف سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ بے گناہ بھی تھا اور کم عمر بھی۔ خوب صورت بھی بے انتہا تھا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگی کہ یوسف کی جان بھی بچ جائے اور بادشاہ کی منشا بھی پوری ہو جائے۔ کئی تدبیریں ذہن میں آئیں اور گزر گئیں۔ سوچتے سوچتے اسے خواجہ عماد الدین گرجستانی کا خیال آیا۔ خواجہ عماد ایک مشہور سوداگر تھا جو ایران سے بیش قیمت اشیا لے کر عثمانی حرم سرا میں فروخت کیا کرتا تھا۔ ملکہ نے ایک قابلِ اعتماد ملازم کو اس کے وطن ''سادہ'' کی طرف بھیجا کہ خواجہ عماد سے کہنا جس طرح بن پڑے فوراً پہنچو۔

خواجہ عماد کو پیغام پہنچا تو اس کے ملازم کے ساتھ ہی بہ عجلت تمام قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ حرم سرا کی دیواریں اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں، نہ وہ کسی کے لیے نیا تھا۔ کسی روک ٹوک کے بغیر ملکہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ وہ حقیقت سے بے خبر تھا لیکن سہمی ہوئی خواتین کوئی کہانی کہنے کے لیے بے تاب نظر آرہی تھیں۔ انہیں خواجہ عماد کا آنا بھی برا لگ رہا تھا کہ یہاں یہ افتاد آن پڑی ہے اور سوداگر کو اشیا کی فروخت کی آپڑی ہے۔

خواجہ عماد ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے ہونٹوں پر پہلا سوال یہی تھا کہ حرم سرا میں کیا حادثہ پیش آیا ہے جو ہر شخص فکرمند نظر آرہا ہے۔

''ملکہ عالیہ، حرم سرا میں ایسا کیا پیش آیا ہے کہ ہر شخص فکرمند نظر آرہا ہے؟''

''یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ کیا آپ کے پاس چند ایسے غلام ہیں جو شہزادہ یوسف کے ہم عمر ہوں اور قابلِ فروخت ہوں؟''

''ملکۂ عالیہ خوش قسمتی سے اس وقت میرے پاس سات ایسے غلام ہیں۔''

''ان کو میرے پاس لے کر آؤ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ کام آج رات ہی کو ہونا چاہیے۔''

''آج رات ہی پہنچ جاؤں گا۔ حرم سرا تک پہنچنے میں آپ میری مدد کریں گی۔''

''اس کی تم پروا مت کرو۔ تمام لوگ میرے وفادار ہیں۔''

خواجہ عماد چلا گیا۔ ادھر تمام پہرے داروں کو ملکہ کا پیغام پہنچا دیا گیا کہ خواجہ عماد سوداگر جس وقت آنا چاہے اسے آنے دیا جائے۔

بادشاہ کو بھی ملکہ کی طرف سے کھٹکا لگ گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہ قصہ پاک کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے چند امرا کو جلاد اور سپاہیوں کے ساتھ روانہ کیا اور حکم دیا کہ حرم سرا ہی میں یوسف کو قتل کر دیا جائے اور عوام میں اس کی شہرت بھی کی جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ہم نے صرف دور دراز کے رشتے داروں کو ہی قتل نہیں کرایا بلکہ اپنے بھائی کے ساتھ بھی رعایت نہیں کی۔

امرا حرم سرا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ انہیں روکنے والا کون تھا۔ وہ ابھی اندر داخل ہی ہوئے تھے کہ ملکہ ان کے سامنے آگئی۔ امرا نے نہایت ادب سے سلطان محمد کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرضی اس پر واضح کی۔
''ہمیں حکم ہوا ہے کہ یوسف کو قتل کر دیا جائے۔''
''تمہیں اتنی جرأت ہوگئی کہ ایسے کریہہ الفاظ تم میرے سامنے ادا کرو۔''
''یہ الفاظ ہمارے نہیں سلطان محمد کے ہیں۔''
''میں پھر بھی یہ کہوں گی کہ کم سن اور معصوم یوسف کو قتل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر بھی اگر مصلحت اسی میں ہے تو میں بھی دل پر پتھر رکھ لیتی ہوں لیکن مجھے ایک دن کی مہلت دے دو۔ میں اپنے یوسف کو رات بھر جاگ کر دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔ بس میری یہ التجا قبول کرلو۔ کل بے شک اپنی منشا پوری کر لینا۔'' امرا کو ملکہ کی حالت پر رحم آگیا اور اسے ایک رات کی مہلت دے دی۔

خواجہ عماد نے رات کے اندھیرے میں حرم سرا میں قدم رکھا۔ ساتوں غلام اس کے ساتھ تھے۔ پہرے داروں کو پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا اس لیے کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔
''یہ غلام حاضر ہیں۔'' خواجہ عماد نے کہا۔ ''لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے۔ آپ نے وعدہ بھی کیا تھا کہ آپ مجھے بتائیں گی کہ حرم سرا پر کیا افتاد پڑی ہے۔''

ملکہ نے اسے تمام واقعہ سنایا اور اس کے بعد دل کی بات کہی۔
''اگر تمہیں حقوق نمک کا کچھ بھی پاس ہے تو تم میری مدد کرو۔''
''میری جان بھی حاضر ہے آپ حکم تو کریں۔''
''تم ایک غلام یہاں چھوڑ جاؤ اور اس کی جگہ یوسف کو غلاموں کے گروہ میں شامل کر کے بلاد عجم میں پہنچا دو۔ میں اس خدمت کے صلے میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔''

خواجہ عماد نے حق نمک ادا کیا یا مال و دولت کے خیال سے اس خدمت کو انجام دینے کی ہامی بھرلی۔

اس نے شہزادہ یوسف کو اپنے ہمراہ لیا اور راتوں رات بغداد کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے راستے میں منت مانی کہ اگر وہ صحیح سلامت بلاد عجم کی سرحد تک پہنچ جائے گا تو اپنے مال کا پانچواں حصہ حضرت شیخ صفی کے مزار اور خانقاہ کے مصارف کے لیے نذر کر دے گا۔

سلطان محمد کے امرا میں سے ایک ابوصارم بھی تھا جس پر ملکہ کے بہت احسانات تھے۔ وہ سلطان مراد کے زمانے سے چلا آرہا تھا اور تمام امرا میں نہایت قابل اعتبار اور بلند پایہ سمجھا جاتا تھا۔ ملکہ نے اپنی ایک خادمہ کو اس کے پاس بھیجا۔ وہ کسی بہانے سے ملکہ کے پاس آیا۔

''ابوصارم، کیا تم چاہو گے کہ میرے مرحوم شوہر کی نشانی یوسف یوں بے گناہ قتل کر دیا جائے؟''
''ملکہ محترم مجھے تو خود اس فیصلے سے اذیت پہنچی ہے لیکن یہ فیصلہ سلطان کا ہے۔ اس سے روگردانی کرنا بھی میری وفاداری کے خلاف ہوگا۔ تمام امرا بھی اس کے ساتھ ہیں۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔''
''سب کو چھوڑو۔ تم اپنی بات کرو، میں بڑی امیدوں کے ساتھ تمہاری مدد کی خواہاں ہوئی ہوں۔''
''جہاں تک میرا خیال ہے، میں کسی طرح یوسف کے قتل کو جائز نہیں سمجھتا لیکن یوسف کو بچانے کا کوئی طریقہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔''
''راستہ تو میں نے نکال لیا ہے لیکن تم وعدہ کرو کہ اس راز کو افشا نہیں کرو گے۔''
''میں وعدہ کرتا ہوں۔ اگر عمل نہ بھی کر سکا تو بھی کم از کم راز افشا نہیں کروں گا۔''
''بات یہ ہے کہ میں نے خواجہ عماد سوداگر سے ایک غلام خریدا ہے جو اپنی جسامت کے اعتبار سے یوسف کی طرح ہے۔ اگر یوسف کی جگہ اس غلام کو قتل کر دیا جائے تو سلطان یہی سمجھے گا کہ یوسف قتل ہوگیا۔ اس کے قتل کے بعد یہ راز ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا اگر تم کسی کو نہ بتاؤ تو۔''
''کبھی نہ کبھی یہ راز کھل جائے گا کہ یوسف حرم سرا میں ہے۔''
''یہ راز اس لیے نہیں کھل سکتا کہ یوسف حرم سرا میں نہیں ہے۔ میں نے اسے خواجہ عماد کے ساتھ بلاد عجم بھیج دیا ہے۔''
''اگر یہ بات ہے تو آپ اطمینان رکھیں۔ کل یوسف کی جگہ وہ غلام قتل کیا جائے گا۔''
''میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گی۔''
ابوصارم اٹھ کر چلا گیا۔ ملکہ کو ابھی بہت سے ضروری انتظامات کرنے تھے۔

بوجھل دن کی دھوپ نے حرم سرا کی دیواروں کو چمکایا تو سلطان نے یوسف کے قتل کے لیے امرا کو روانہ کیا۔ ان میں ابوصارم بھی شامل تھا۔ اس نے امرا سے کہا، سب کو ایک ساتھ اندر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں حرم سرا کے تقدس کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں جلاد کو اندر لے کر جاؤں گا اور بعد از قتل یوسف کی لاش کو باہر لے کر آجاؤں گا۔

سب نے اس پر اعتبار کیا اور اس کی بات مان لی۔
خواجہ عماد سے خریدے گئے غلام کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ملکہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا اور جلاد کے حوالے کر دیا۔
جلاد نے ابوصارم کی موجودگی میں اس غلام کو قتل کر دیا۔

لاش کو شاہی رسوم کے مطابق کفنا کر حرم سرا سے باہر لایا گیا۔ اس وقت بھی یہی ہوا کہ تمام امرا نے ابوصارم پر اعتبار کیا اور صورت حال کی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی اور غلام کی لاش کو شہزادے کی لاش سمجھ کر دفن کر دیا گیا۔

سلطان محمد کو اطلاع ہوئی تو اسے افسوس ضرور ہوا لیکن اقتدار کے نشے نے اس احساس کو زائل کر دیا۔ وہ اپنے بھائی کو قتل کر چکا تھا لہٰذا دوسرے شہزادوں کی اسے کیا پروا ہو سکتی تھی۔ اب کسی کے پاس اعتراض کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس نے حکم دیا کسی کو فرار کا موقع نہ دیا جائے۔ شاہی خاندان کے جتنے مرد ہیں انہیں فوراً قتل کر دیا جائے۔

❁❁❁

کمرے میں جلتی ہوئی شمع کی دھیمی روشنی عجیب پراسرار سا ماحول طاری کر رہی تھی۔ خواجہ عماد اپنی زوجہ کے ساتھ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر اس کی بیوی بھی چپ تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ خواجہ اپنے خیالوں سے باہر آئے تو وہ کچھ پوچھے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی خواجہ نے خود ہی اسے مخاطب کیا۔
''کلثوم، میں تمہیں اپنے ایک راز میں شریک کرنا چاہتا ہوں مگر وعدہ کرو کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کرو گی۔''
''میں آپ کی ہم راز ہوں۔ مجھے بتائیے ایسی کیا بات ہے جس نے آپ کو پریشان کر دیا ہے۔''
''میری بات غور سے سنو۔'' خواجہ عماد اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''یہ ایسا راز ہے کہ اگر افشا ہوگیا تو ہم سب مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''
اب وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ''یا اللہ خیر! ایسی کیا بات ہوگئی۔''
''ایک لڑکا یوسف میرے ساتھ آیا ہے۔''
''آپ تو غلام خریدتے اور بیچتے ہی رہتے ہیں۔''
''یہ لڑکا غلام نہیں بلکہ قسطنطنیہ کا شہزادہ ہے۔''
''شہزادہ اور ہمارے گھر میں؟''
اس کے بعد خواجہ عماد نے پورا واقعہ بیوی کے گوش گزار کیا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا کلثوم کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔ خوف کے سائے تھے کہ اس کے چہرے پر منڈلانے لگے تھے۔
''میں شہزادے کے لیے یہ مشہور کروں گا کہ میں نے ایک غلام خریدا ہے۔ وہ اتنا پاکیزہ صورت ہے کہ میں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمیں شہزادے کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کرنا ہے۔ یہ ہمارے بچوں کے ساتھ مکتب جایا کرے گا۔''
''میں تو خیر یہ راز اپنے سینے میں دفن کرلوں گی لیکن شہزادہ بچہ ہے، کہیں وہ خود ہی یہ راز نہ اگل دے، بچوں سے کہہ بیٹھے کہ وہ شہزادہ ہے۔''
''اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ میں یوسف کو بھی سمجھا دوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر حکمران تک بات پہنچ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''
''آپ فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''
خواجہ عماد نے یوسف کو بھی ان خطرات سے آگاہ کر دیا اور اسے سمجھا دیا کہ وہ اپنی حقیقت کسی پر ظاہر نہ کرے۔ اپنے بچوں کو بھی جتا دیا کہ یوسف ایک غلام ہے جسے اس نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔

اب یوسف اس کے بیٹوں کی طرح اس کے گھر میں رہنے لگا تھا۔ اسے اسی مکتب میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا جہاں خواجہ کے بیٹے زیر تعلیم تھے۔

شہر میں یوسف کے حسن کے چرچے ہو رہے تھے۔ مکتب کے استاد اس کی ذہانت پر نثار تھے۔ لوگ خواجہ عماد کو مبارک بادیں دینے آرہے تھے کہ اس نے ایسا غلام خریدا ہے۔

ملکۂ قسطنطنیہ کو بیٹے کی جدائی کا صدمہ سہتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یوسف کس حال میں ہے۔ اس ڈر سے کسی ملازم کو بھی یوسف کی خبر گیری کے لیے نہیں بھیجا کہ کہیں یہ راز کھل نہ جائے۔ خواجہ عماد اس دوران ایک مرتبہ آیا بھی تھا اور ملکہ کو یوسف کی خیریت سے آگاہ کیا تھا لیکن ملکہ کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ کسی با اعتبار ملازم کو بھیج کر یوسف کی خیریت معلوم کرائی جائے۔ بالآخر اس نے ایک ملازم کو ساوہ روانہ کیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے، یوسف کی صحت کیسی ہے اور اس کی تعلیم کا کیا بندوبست ہوا ہے۔
''تم خواجہ سے کچھ نہ پوچھنا بس وہاں رہ کر یوسف کے شب و روز پر نظر رکھنا۔ اس کی صحت دیکھنا۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ خواجہ کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے۔ جب تک تم آکر گواہی نہیں دو گے میرے دل کو چین نہیں آئے گا۔''

یہ ملازم ''ساوہ'' پہنچا۔ وہاں قیام کے دوران اس نے یوسف کو خوش و خرم دیکھا۔ اسے مکتب جاتے ہوئے بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا اور خواجہ عماد کو اس پر نثار ہوتے بھی دیکھا۔ ملازم کو یقین آگیا کہ خواجہ عماد، یوسف کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا ہے۔

ملازم یہ معلومات لے کر خوشی خوشی قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا لیکن اسکندریہ پہنچا تو ایک مرض میں مبتلا ہوگیا۔

مرض نے اتنا طول کھینچا کہ ڈیڑھ سال تک اسکندریہ میں رکنا پڑ گیا۔ کوئی اور ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ ملکہ تک اپنی بیماری کا حال پہنچاتا۔

جب غلام کو گئے ایک سال گزر گیا اور وہ واپس نہ آیا تو ملکہ کی فکر، تشویش میں بدل گئی۔ طرح طرح کے خیالات نے اسے گھیر لیا۔ مزید یہ ہوا کہ خواجہ عماد بھی اس دوران نہ آسکا۔ اب ملکہ کے لیے لازم ہوگیا تھا کہ وہ کسی اور کو یوسف کے پاس بھیجے، کسے بھیجا جائے؟ اس نے اس عورت کو بلایا جس نے یوسف کو دودھ پلایا تھا۔ اس عورت کو سارا ماجرا سنایا تو وہ "سادہ" جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ ملکہ نے گراں قدر تحائف اس کے ساتھ کیے کہ وہ انہیں یوسف تک پہنچا دے۔ اس عورت نے اپنے بیٹے غضنفر آقا اور بیٹی دلشاد کو بھی ساتھ لے لیا۔

یہ لوگ قیمتی تحائف کے ساتھ "سادہ" پہنچے۔ اتفاق بلکہ یوسف کے ساتھ برا یہ ہوا کہ خواجہ عماد وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ کسی تجارتی قافلے کے ساتھ ہندوستان گیا ہوا تھا۔ اس لیے راز کی حفاظت پوری طرح نہ ہوسکی۔ خواجہ کی بیوی نے بہت کوشش کی کہ گھر کے لوگوں سے ان تحائف کو چھپائے لیکن خواجہ کے بیٹوں نے یہ قیمتی تحائف دیکھ لیے اور آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

"یہ کیسا غلام ہے جس کے رشتہ دار اتنے امیر ہیں۔"

"رشتے دار اتنے امیر ہیں تو اس کے ماں باپ کتنے امیر ہوں گے۔"

"اگر اتنے ہی امیر ہیں تو انہوں نے اپنے بیٹے کو بیچ کیوں دیا۔"

"سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یوسف غلام ہے تو ابا جانی اسے اتنا عزیز کیوں رکھتے ہیں۔ اس کی تعلیم پر روپیہ کہاں سے خرچ کر رہے ہیں، ضرور اس کے ماں باپ دیتے ہوں گے۔"

"اسے کس مقصد سے یہاں رکھا ہوا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

یہ باتیں اگر گھر تک محدود رہتیں تو بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ خواجہ عماد کے بیٹوں نے مکتب جا کر دوسرے لڑکوں کو بتایا۔ ان لڑکوں نے اپنے گھروں میں جا کر بتایا۔ برسوں کا راز دنوں میں ظاہر ہوگیا اور پھر یہ ہوا کہ یہ راز اپنے پیروں پر چلتا ہوا حاکم سادہ تک پہنچ گیا۔ حاکم سادہ نے حقیقت حال جاننے کے لیے غضنفر آقا کو طلب کرلیا۔ اگر اس وقت خواجہ عماد موجود ہوتا تو ممکن ہے صورت حال کو سنبھال لیتا لیکن غضنفر آقا کی کیا مجال تھی کہ حقیقت حال زبان پر نہ لاتا۔ اس نے حاکم کے سامنے پوری بات اگل دی۔ حاکم نے یوسف کو سزا سے بچانے کے لیے چار سو تومان وصول کیے۔

غضنفر نے جرمانہ ادا کیا اور مزید کسی مصیبت سے بچنے کے لیے اپنی والدہ اور بہن کو لے کر "سادہ" سے نکل گیا۔

اب یہ راز خوشبو بن کر ہوا پر سوار ہوگیا تھا۔ گونگے کو جیسے زبان مل گئی ہو۔ پورے شہر میں باتیں ہونے لگیں کہ خواجہ عماد نے کسی شہزادے کو اپنے گھر میں پناہ دی ہوئی ہے اور وہ اسی شہزادے کے رشتہ داروں سے دولت سمیٹ رہا ہے۔ خواجہ کے لڑکے بھی اب یوسف سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہے تھے۔

یوسف کے لیے اب یہ خطرہ روز بہ روز بڑھتا جا رہا تھا کہ انعام کے لالچ میں کوئی شخص بھی اس کی موجودگی کی اطلاع قسطنطنیہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حاکم سادہ کے دل میں بے ایمانی آجائے اور وہ اسے گرفتار کر کے قسطنطنیہ پہنچا دے۔ یہ سوچتے ہی اسے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔ ایک روز خواجہ کی بیوی نے کسی بات پر اسے بری طرح ڈانٹا اور غصے میں یہ تک کہہ دیا کہ میری وجہ سے زندہ ہو۔ اگر میں آج تمہاری خبر سلطان قسطنطنیہ کو پہنچا دوں تو قتل کر دیے جاؤ۔

اس دن کے بعد سے وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ "سادہ" چھوڑ کر کہیں اور نکل جائے۔ اس نے خواجہ عماد کی واپسی کا بھی انتظار نہیں کیا اور گھر چھوڑ کر "قم" نامی شہر میں چلا گیا۔

وہ اس ارادے سے گیا تھا کہ جب تک موجودہ حکمران "سادہ" میں موجود ہے وہ واپس نہیں جائے گا۔ "قم" میں کچھ دن گزارنے کے بعد وہ کاشان چلا گیا اور پھر اصفہان کی سیر کرتا ہوا شیراز پہنچ گیا۔ اس کا مقصد وقت گزاری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اصفہان کے بعد وہ شیراز گیا۔ یہ شہر اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے یہاں قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ ابھی شیراز کے مناظر سے دل بہلا ہی رہا تھا کہ اسے "سادہ" کے حکمران کی معزولی کا علم ہوا۔ یہ بھی یقین تھا کہ اب خواجہ عماد بھی ہندوستان سے واپس آگیا ہوگا۔ اس

نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ اسے صبح ہوتے ہی شیراز سے نکل جانا تھا کہ اسی رات اس نے خواب میں حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا۔ وہ اسے ہدایت دے رہے تھے۔

"تم اپنے وطن جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ ابھی کچھ روز اور غریب الوطنی میں بسر کرو۔ اس کے بعد ہندوستان جانا۔ ہندوستان پہنچ کر تمہارے اچھے دن آئیں گے یہاں تک کہ تم تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوگے۔"

اس کی آنکھ کھلی تو وہ سخت حیران تھا۔ ایک اجنبی ملک میں وہ کس کے پاس جائے، کہاں جائے۔ اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے ہندوستان جانے کی جو ہدایت کی ہے اس میں ضرور کوئی بہتری ہوگی اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔

اس نے وطن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بحری راستے سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا جہاز ہندوستان کی ایک بندرگاہ پر رکا تو وہ جہاز سے اتر گیا۔ قریب ہی ایک سرائے تھی۔ وہ اس سرائے میں ٹھہر گیا۔

وہ روزانہ بندرگاہ کے سبزہ زار اور باغات میں گھوم پھر کر وقت گزارنے لگا۔ ایک روز وہ ایک باغ میں درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اس خوشگوار ماحول میں اسے نیند آگئی۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے "بیٹا" کہہ کر پکار رہا ہے اور نیند سے بیدار ہونے کے لیے کہہ رہا ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ عالم خواب میں ہے لیکن جب آواز دوبارہ آئی اور پھر تیسری بار آئی تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ پہلا خیال جو یوسف کے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ یہ شخص اس باغ کا مالک ہے اور یہ سرزنش کرنے آیا ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر باغ میں کیوں آیا اور سو بھی گیا۔ یہاں کی زبان سے بھی واقف نہیں تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بوڑھا شخص اسی کی زبان میں بات کر رہا ہے۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میرا نام یوسف ہے۔ میں قسطنطنیہ کا شہزادہ ہوں۔ میرا بڑا بھائی جو وہاں کا فرماں روا ہے میرے قتل کا حکم دے چکا ہے۔ میں اپنی جان بچا کر ہندوستان کی طرف آیا ہوں۔ اب اس سوچ میں ہوں کہ کہاں جاؤں۔ اسی خیال میں تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے باغ میں آگیا اور سو بھی گیا۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس باغ کا مالک نہیں ہوں۔ میں تو اس جگہ سے گزر رہا تھا۔ تمہیں سوتا ہوا دیکھا تو سوچا مزاج پرسی کرلوں اور اگر کسی کام آسکوں تو کام آجاؤں۔"

اس کے بعد نہ جانے شربت کا پیالہ کہاں سے آگیا۔ اس نے وہ پیالہ یوسف کی طرف بڑھا دیا۔

"تمہیں پیاس لگ رہی ہوگی۔ لو یہ شربت پی لو۔"

یوسف نے شربت کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ہندوستان میں ایک شہر ہے احمد آباد بیدر، تمہیں وہاں جانا چاہیے۔" بوڑھے نے کہا اور اچانک غائب ہوگیا۔ پیالہ یوسف کے ہاتھ میں رہ گیا۔

بزرگ کے اس طرح غائب ہوجانے سے یوسف کو یقین ہوگیا کہ یہ بزرگ یقیناً حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اس نے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں حضرت خضر علیہ السلام سے ہدایات وصول کرلی تھیں۔

اس نے بوڑھے کے مشورے پر عمل کیا اور احمد آباد بیدر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی۔ چہرے پر ڈاڑھی کے بال تک نہ نکلے تھے۔

وہ بتائے ہوئے شہر میں پہنچ کر پھر ایک سرائے میں ٹھہر گیا اور گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ ایک روز وہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اس نے چند آدمیوں کے ہمراہ خواجہ عماد کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ خواجہ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا ہوا ہے اس لیے شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور خواجہ سے جاملا۔ خواجہ نے اسے اپنے سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

"میں تو تمہیں "سادہ" میں چھوڑ کر آیا تھا یہاں کیسے آگئے۔ کیا تم واقعی یوسف ہو؟"

"یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا کہ یہاں کیسے آگیا لیکن یہ طے ہے کہ میں ہی یوسف ہوں۔"

"یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ایک قریبی سرائے میں۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔"

یوسف نے سرائے سے اپنا سامان اٹھایا اور اس مکان میں منتقل ہوگیا جہاں خواجہ ٹھہرا ہوا تھا۔

اس مکان پر پہنچ کر یوسف نے اس کی غیر موجودگی میں جو کچھ اس پر گزری تھی خواجہ کو اس داستان سے آگاہ کیا۔

جب خواجہ ہندوستان سے روانہ ہونے لگا تو اس نے یوسف کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا لیکن یوسف نے انکار کر دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہاں رہ کر تم کرو گے بھی کیا؟" خواجہ نے کہا۔

"آقائے مہربان، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کے حاکم پر ترکی غلاموں کا بہت اثر ہے۔ آپ مجھے بھی اس گروہ میں شامل کرا دیجیے۔"

"میں نے تمہیں بیٹا کہا ہے اور تم مجھ سے کہتے ہو میں تمہیں غلام بنا دوں جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ تم شہزادے ہو، میں پھر تم سے کہتا ہوں میرے ساتھ چلو۔"

"مجھے آپ کی جدائی گوارا نہیں لیکن میں ہندوستان سے جانا بھی نہیں چاہتا۔ میرے بخت کا ستارہ اگر چمکے گا تو یہیں چمکے گا۔ بلاد عجم میں میرا راز کھل گیا ہے۔ ممکن ہے میرے بھائی تک بھی یہ خبر پہنچ گئی ہو۔ اگر اس نے حاکم سادہ کے ذریعے مجھے طلب کر لیا تو مجھے قتل کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ ہندوستان میں میری جان محفوظ ہے اور یقیناً آپ بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ میں زندہ رہوں۔ میرا قسطنطنیہ تو مجھ سے چھوٹ ہی گیا ہے اب میں سادہ میں رہوں یا ہندوستان میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

خواجہ عماد اس کی دلیل سے قائل ہو گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے ترکی غلاموں میں شامل کر دے گا۔

خواجہ عماد چونکہ سوداگر تھا اور ہندوستان آتا جاتا رہتا تھا اس لیے بہت سے لوگ اس کے واقف کار تھے انہی میں ایک شخص محمود کاواں تھا جو شاہی حلقوں میں بڑا اثر رسوخ رکھتا تھا۔ خواجہ عماد نے اس سے یوسف کا ذکر کیا۔

اس کے بعد یوسف کو خواجہ عماد سے خرید ا گیا اور ترکی غلاموں میں شامل کر لیا گیا۔ دو تین ماہ نہیں گزرے تھے کہ محمود کاواں نے اس کی مزید ترقی کے لیے اسے ایک امیر عبدالعزیز خاں کے سپرد کر دیا۔ یہ امیر بہمنی بارگاہ کے ترکوں میں نہایت اعلیٰ مقام رکھتا تھا۔ وہ شاہی اصطبل کا داروغہ تھا۔

عبدالعزیز خاں خود بھی ترک تھا لہٰذا یوسف کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ خوشی اس وقت مستقل ہو گئی جب اس پر یوسف کے ہنر ظاہر ہوئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ یوسف تمام کام بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ اس نے بہ سبب ضعیف العمری تمام ذمے داریاں یوسف کو سونپ دیں اور خود آرام کرنے لگا۔ دوسرے لفظوں میں وہ عبدالعزیز خاں کی نیابت کے فرائض انجام دینے لگا۔

ایک روز بادشاہ محمد شاہ نے عبدالعزیز خاں کو طلب کیا۔ کچھ گھوڑے بارگاہ شاہی میں آئے تھے۔ محمد شاہ یہ مشورہ لینا چاہتا تھا کہ کون سے گھوڑے اصطبل کے لیے منتخب کیے جائیں۔ عبدالعزیز خاں نے اپنی جگہ یوسف کو بھیج دیا۔

یوسف جب محمد شاہ کے پاس پہنچا تو وہ سوداگر بھی وہاں موجود تھا جو گھوڑے لے کر آیا تھا۔

"کیا عبدالعزیز خاں کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اسے کتنے اہم کام کے لیے بلایا ہے۔"

"انہیں معلوم تھا لیکن وہ سخت بیمار ہیں۔"

"تم ناتجربہ کار ہو۔ گھوڑوں کی کیا پہچان رکھتے ہو گے۔"

"حضور اگر موقع دیں تو میرا تجربہ ظاہر ہو۔"

"تم گھوڑے دیکھ کر ان کی نسلوں کا اندازہ کرو اور مشورہ دو کہ کون سے گھوڑے اصطبل کے لائق ہیں۔"

وہ سوداگر کے ساتھ محل سے ملحق میدان میں چلا گیا۔ وہ ایک ایک گھوڑے کا جائزہ لے رہا تھا۔ انہیں چلا پھرا کر دیکھ رہا تھا۔ سوداگر کی آنکھیں یوسف پر جمی ہوئی تھیں۔ دل ہی دل میں اس کے تجربے کا قائل ہوتا جا رہا تھا۔ یوسف نے ایک ایک کر کے کئی ایسے گھوڑے الگ کر دیے جو اس کے مطلب کے نہیں تھے۔

اس نقصان کے باوجود کہ یوسف نے کئی گھوڑے خریدنے سے انکار کر دیا، وہ یوسف کی مہارت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جب دونوں محمد شاہ کے پاس آئے تو سوداگر نے یوسف کی بے حد تعریف کی۔

"مجھ جیسا تجربہ کار بھی ان گھوڑوں کے نقائص نہ جان سکا اور آپ کی خدمت میں لے آیا لیکن اس لڑکے کی باریک بینی کا میں قائل ہو گیا۔ اگر یہ لڑکا مجھے مل جائے تو میرے کاروبار میں بے حد ترقی ہو سکتی ہے۔"

محمد شاہ یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ وہ یوسف کے حسن و جمال سے تو پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا، سوداگر کی زبان سے اس کی تعریف سن کر بے حد خوش ہوا۔

سوداگر کو رخصت کرنے کے بعد وہ بڑی دیر تک یوسف سے باتیں کرتا رہا۔ اس دن کے بعد سے وہ بادشاہ سے براہ راست ملاقات کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ اس کا یہ اعزاز دوسرے غلاموں کے لیے قابل رشک ہی نہیں باعث حسد بھی بن گیا لیکن عبدالعزیز کی موجودگی میں کوئی اس سے دشمنی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لیے دلوں کی آگ دلوں میں رہی۔ اس آگ کو بھڑکنے کا موقع ملنے والا تھا۔

عبدالعزیز خاں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ محمود کاواں کی سفارش سے یوسف کو سہ صدی منصب دار اور

عبدالعزیز خاں کا جانشین مقرر کر دیا گیا۔ اس اعزاز نے دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ دل کی باتیں زبان پر آنے لگیں۔ کسی کو اس کے حسن و جمال پر حسد تھا، کوئی اس کی موسیقی دانی سے جل رہا تھا۔ کسی کو اس پر اعتراض تھا کہ وہ غلام ہوتے ہوئے بادشاہ کے محل میں آزادانہ آتا جاتا ہے۔ یہ دشمنیاں بڑھتی رہیں۔ بہمن نامی شخص سے تو اتنی کشیدگی بڑھی کہ یوسف بددل ہو گیا۔

ترکوں کا ایک امیر نظام الملک، اس کا بڑا قدردان تھا۔ وہ اپنے عہدے پر رہتے ہوئے بھی اس امیر سے برابر ملاقاتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے جب کوئی جائے پناہ نہ دیکھی تو امیر نظام الملک سے ملازمت کا طلب گار ہوا۔ نظام الملک نے اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہلے ہی پہچان لیا تھا۔ اس نے یوسف کو دلبرداشتہ دیکھا تو بادشاہ سے اجازت لے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔

یوسف نے اپنے حسن سلوک سے نظام الملک پر ایسا جادو کیا کہ وہ اسے اپنا بھائی کہنے لگا۔ ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھنے لگا۔

یوسف کو نظام الملک کے پاس آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ محمد شاہ نے نظام الملک کو برار کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ جو علاقہ کسی امیر کو سونپا جاتا تھا، اسے وہ علاقہ فتح کر کے اپنی جاگیر میں شامل کرنا ہوتا تھا۔ وہ جب برار جانے لگا تو یوسف کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ اس نے یوسف کے مرتبے میں اضافہ کیا اور یوسف کو عادل خاں کا خطاب بارگاہ شاہی سے عطا ہوا۔

نظام الملک برار روانہ ہوا تو یوسف اس کے ساتھ تھا۔

نظام الملک نے برار پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مزاحمت اتنی سخت تھی کہ ایک سال تک قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ اس دوران فتح کے لیے برابر کوششیں ہوتی رہیں۔ ایک سال گزر جانے کے بعد محصورین کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ راجپوتوں نے طے کیا کہ قلعے سے نکل کر مسلمانوں سے دوبدو لڑائی کی جائے۔

اس لڑائی کا آغاز ایک شب خون کی صورت میں ہوا۔ مسلمان اپنے پڑاؤ میں مطمئن ہو کر سو رہے تھے۔ محاصرے کو ایک سال گزر چکا تھا۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ محصورین باہر نکل آئیں گے۔ رات کے اندھیرے میں ہندوؤں کا ایک گروہ قلعے سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کے پڑاؤ کی طرف رینگنے لگا اور پھر یلغار کر دی۔ بھگدڑ سی مچ گئی۔ جب تک مسلمان سنبھلتے بہت سے قتل

چٹکلے

باپ بیٹے سے۔ "بیٹا آپ نے اس بار 95 فیصد نمبر لینے ہیں۔"

بیٹا۔ "نہیں ابو! میں اس بار 100 فیصد نمبر لوں گا۔"

باپ۔ "کیوں مذاق کر رہے ہو نالائق؟"

بیٹا۔ "ابو! پہل کس نے کی تھی؟"

☆☆☆

60 سالہ ارب پتی کافی دن بعد کلب میں اپنی اٹھارہ سالہ نئی نویلی بیوی کے ساتھ داخل ہوا تو ایک دوست نے علیحدہ کر کے پوچھا۔ "یہ کیسے تم سے شادی پر راضی ہو گئی؟"

آدمی نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی عمر کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔"

دوست۔ "کیا تم نے 40 سال بتائی تھی۔"

آدمی۔ "نہیں! نہیں! میں نے 90 سال بتائی تھی۔"

☆☆☆

شوہر بیوی سے۔ "ڈارلنگ تم مجھے ایک جگہ سے بہت پیاری لگتی ہو۔"

بیوی شرما کر۔ "کہاں سے ڈارلنگ؟"

شوہر۔ "دور دور سے۔"

☆☆☆

استاد سردار سے۔ "فزکس کی تعریف سناؤ۔"

سردار۔ "سر! آدھی آتی ہے سناؤں؟"

استاد۔ "ہاں آدھی ہی سنا دو۔"

سردار۔

"And it is called physics"

☆☆☆

بیوی۔ "کالج کے بارے میں آپ کا کوئی ڈراؤنا تجربہ ہے۔"

شوہر آہ بھرتے ہوئے۔ "ہاں ہاں تمہاری اور میری پہلی ملاقات کالج میں ہی تو ہوئی تھی۔"

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو گئے لیکن سنبھلتے ہی بھرپور جوابی حملہ کیا۔ ہندو تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد واپس بھاگے۔ یہاں بھی ایک غلطی ہو گئی۔ سوچے سمجھے بغیر مسلمانوں نے تعاقب شروع کر دیا اور قلعے کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ بہادر راجپوتوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔

تعاقب کرنے والوں میں یوسف شامل نہیں تھا۔ اس کا خیمہ اپنے مربی نظام الملک کے بالکل برابر میں تھا۔ جس وقت شب خون کی خبر پھیلی وہ اپنے خیمے سے نکل کر نظام الملک کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ امیر کے پاس بیٹھا تھا۔

''آقائے من! مسلمانوں کی مدد کے لیے تازہ کمک جلد بھیجیے۔''

''حملہ آور تھے کتنے جو ہمارے سپاہیوں کو دقت پیش آئی ہوگی۔''

''میرے خیال میں یہ شب خون نہیں تھا۔ ہندو باقاعدہ لڑائی کے لیے نکلے ہیں۔ قلعے کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے باقاعدہ لڑائی شروع کر دی ہوگی ورنہ ہمارے سپاہی اب تک واپس آ گئے ہوتے۔''

''تم نے یہ رائے مجھے پہلے کیوں نہیں دی۔'' نظام الملک کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر چلا گیا۔ ''یہ ہم نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔ فوجوں کو حملہ آور ہونے کا حکم دو۔''

اسی اثنا میں تعاقب کرنے والوں میں سے ایک سپاہی زخمی حالت میں آ گیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر اور چھپ کر نکل آیا تھا۔ اس نے آ کر اطلاع دی کہ ہندوؤں نے باقاعدہ لڑائی شروع کر دی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو تہ تیغ کر کے دوبارہ قلعے میں چلے جائیں لہٰذا قلعے میں چلے جانے سے پہلے ان کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔

اب سوچنے کی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ یوسف کا قیافہ درست ثابت ہوا تھا۔ نظام الملک اپنی فوج کو لے کر پہنچ گیا۔ یوسف اس کے ساتھ تھا۔ دونوں طرف کے جانباز گتھم گتھا ہو گئے۔ شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ نظام الملک گھوڑا دوڑاتا ہوا عین قلب میدان میں پہنچ گیا۔ یوسف یہاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرا رہی تھیں۔ ہر طرف شور برپا تھا۔ مسلمان برابر دباؤ ڈال رہے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ کچھ دیر میں قلعہ پر قبضہ ہو جائے گا۔ اچانک لشکر کا بایاں حصہ مغلوب ہونے لگا۔ نظام الملک نے یوسف کو اشارہ کیا کہ وہ اس طرف جائے۔ اس کے ہٹتے ہی ہندوؤں کو موقع مل گیا۔ نظام الملک یوسف کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں میدان سے ہٹ گئیں۔ ایک راجپوت گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اپنے گھوڑے پر کھڑے ہو کر نظام الملک پر حملہ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ بہمنی سپاہی نظام الملک کی مدد کو پہنچے نظام الملک گھوڑے سے گر چکا تھا۔

ہر طرف نظام الملک کے مارے جانے کا شور بلند ہو گیا۔

اس کے قتل ہوتے ہی سخت ابتری پھیل گئی۔ یوسف نے ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اپنے آدمیوں کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں لڑنے پر آمادہ کیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے دیکھا تو ان کا بھی حوصلہ بڑھا۔ دوسری طرف ہندوؤں نے یہ سوچ کر تن آسانی اختیار کر لی تھی کہ مسلمانوں میں افراتفری پھیل گئی ہے۔ وہ بہت جلد فرار پر مجبور ہو جائیں گے۔ ادھر یوسف اپنی فوج کے تن مردہ میں روح پھونک چکا تھا۔

شکست فتح میں بدل گئی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ بڑی تعداد میں ہندو قتل ہوئے کچھ فرار ہو گئے۔ قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

قلعے کو مستحکم کرنے کے بعد یوسف نے تمام مال غنیمت سمیٹا اور ہاتھی گھوڑے وغیرہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ محمد شاہ نے بھی اس کی قدر افزائی کی۔ اسے ایک ہزاری منصب پر فائز کیا اور بہمنی لشکر میں شامل کر کے ایک حصے کا سالار مقرر کیا۔

اس کے بعد یوسف کی قسمت کا ستارہ روز بہ روز درخشاں ہوتا چلا گیا۔ اس کا شمار خاص اراکین سلطنت میں ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اسے ''بےجاپور'' کا طرفدار مقرر کر دیا گیا۔

اس نے یہاں بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ملک کا انتظام اس خوبی سے چلایا کہ محمد شاہ اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے گرد ایک لشکر جرار بھی جمع کر لیا تاکہ انتظامات چلانے میں آسانی ہو۔

جس وقت وہ یہ لشکر جمع کر رہا تھا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا ایک مصرف یہ بھی ہو سکتا ہے جو بعد میں ظہور پذیر ہوا۔

محمد شاہ بہمنی کے اچانک انتقال نے بساط ہی الٹ دی۔ پایہ تخت میں سخت انتشار پھیل گیا۔ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوا تو یوسف کی دور اندیشی نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور

کر دیا۔ اس نے اپنے لشکر کو مزید منظم کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ترک اور مغل امرا کو احمد آباد بیدر سے اپنے پاس بلانے کے لیے اعلیٰ عہدوں اور آئندہ ترقی کے خواب دکھانے شروع کر دیے۔ ان امرا کو پایہ تخت میں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے یوسف کی دعوت قبول کی اور بیشتر امرا اپنی اپنی فوج کے ساتھ بیجاپور آ گئے۔ ان کے آ جانے سے یوسف کی فوجی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

اب یوسف نے وہ قدم اٹھایا جو اس کی تقدیر میں تھا جو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اپنی طاقت اور پایہ تخت کے انتشار کو دیکھتے ہوئے اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ محمد شاہ نے اسے عادل خاں کا خطاب دیا تھا اس نے ''خان'' کو ''شاہ'' سے تبدیل کیا اور یوسف عادل شاہ بن گیا۔

یوسف عادل شاہ، بےجاپور کا بانی حکمراں۔

ہندوستان میں ایک ریاست تھی احمد نگر۔ ایک اور وجود میں آ گئی، اس کا نام بیجاپور تھا۔

⊙⊙⊙

وہ ایک تاروں بھری رات تھی۔ یوسف عادل شاہ قیمتی ترین بستر پر استراحت کر رہا تھا کہ اچانک اس کا ذہن اسے اس بندرگاہ کی طرف لے گیا جہاں وہ ہندوستان کی زمین پر قدم رکھتے وقت ایک باغ میں درخت کے نیچے سو گیا تھا اور ایک بوڑھے آدمی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے اسے احمد آباد بیدر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر اسے اپنا خواب یاد آ گیا جو اس نے شیراز میں دیکھا تھا۔ اس کے خواب میں حضرت خضر علیہ السلام آئے تھے اور اس سے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے۔

''خدا کی رحمت پر بھروسا کرو۔ ہندوستان کا سفر اختیار کرو، تم تخت حکومت پر جلوہ افروز ہو گے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے شاندار محل کی آراستہ چھت کی طرف تکتا رہا۔ وہ غور کر رہا تھا، قتل ہونے سے بچ گیا۔ غلامی کی زندگی گزاری اور اب وہ بیجاپور کا حکمراں ہے۔ ہر آسائش میسر ہے۔ خدا جانے خواجہ عماد کہاں ہے۔ اسے میری ترقی کا علم بھی ہے یا نہیں۔ بہت دن سے وہ ہندوستان بھی نہیں آیا۔ مجھ سے ملتا تو ضرور۔ مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اسے اپنی ماں کا بھی خیال آیا جس سے وہ قسطنطنیہ سے نکلنے کے بعد کبھی نہیں مل سکا تھا۔ وہ اب بھی اپنی حقیقت کسی پر ظاہر کرنے کے حق میں نہیں تھا اس لیے کسی کو قسطنطنیہ نہیں بھیج سکتا تھا البتہ یہ کر سکتا تھا کہ خواجہ عماد کو بہ حیثیت سوداگر اپنے دربار میں طلب کرے اور اس کے ذریعے اپنی ماں

خلیفہ دوئم کی انکساری

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ ایک مرتبہ ایک تنگ گلی سے گزر رہے تھے کہ ان کا پاؤں ایک فقیر سے ٹکرا گیا وہ فقیر حضرت عمر فاروقؓ کو نہیں جانتا تھا اور ویسے بھی دکھی آدمی دوست دشمن میں تمیز نہیں کرتا۔ اس نے غصے میں آ کر کہا کہ تو اندھا ہے کہ دیکھ کر نہیں چلتا حضرت عمر فاروقؓ نے نہایت عاجزی اور انکساری سے فرمایا بھائی میں اندھا تو نہیں ہوں نادانستہ غلطی سرزد ہو گئی ہے خدا کے لیے مجھے معاف کر دے۔

یہ الفاظ وہ شخص ایک فقیر کے سامنے کہہ رہا ہے جو لاکھوں مربع زمین کا حاکم ہے جس کی فوجوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے تھے اور جس کے رعب و دبدبے سے شیروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔

نصیحت: ''میوہ کی بھری شاخ نیچے جھکی رہتی ہے۔''

انکسار

ایک دفعہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے کسی آدمی نے کوئی مسئلہ پیش کیا۔ آپ اس کا جواب دے رہے تھے کہ حاضرین مجلس میں سے ایک شخص بول پڑا۔ اے ابوالحسن آپ جو فرما رہے ہیں اس سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ حیدر کرار نے اس کی بات کو نہایت تحمل کے ساتھ سنا اور فرمایا کہ اچھا تیرے خیال میں اس مسئلہ کا کیا حل ہے۔

اس آدمی نے اپنی رائے ظاہر کی اور شاہ مرداں نے اس کا جواب پسند فرمایا اور فرمایا کہ ہاں اس کا یہی حل بہتر ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ باب علم تھے اور دین و دنیا کے بادشاہ تھے لیکن انہوں نے ایک دوسرے آدمی کا مشورہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کوئی اور بادشاہ ہوتا تو دھکے مار کر اپنی مجلس سے نکال دیتا۔ جس کے سر میں غرور ہے ہرگز خیال نہ کرو کہ وہ سچی بات سنے گا۔

نصیحت: ''کسی عام شخص کا مشورہ بھی قابل غور ہوتا ہے۔''

مرسلہ: یاسر علی راجپوت

WWW.PAKSOCIETY.COM

تک اپنی خیریت پہنچائے۔ اس نے ایک وفد بلادِ عجم کی طرف روانہ کیا۔ جب یہ وفد واپس آیا تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ خواجہ عماد کا انتقال ہو چکا تھا۔

وہ اپنی والدہ تک پہنچنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

یوسف کی بادشاہت کو پانچ ہزار سے زیادہ لشکریوں نے تسلیم کرلیا تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط ہوئے تو پاؤں پھیلانے کی سوجھی۔ بیجاپور اسے تنگ نظر آنے لگا۔ وہ ان قلعوں کی طرف بڑھا جو محمد شاہ نے فتح کر کے اپنے قبضے میں کرلیے تھے۔ ایک ایک کر کے یہ قلعے اس کے قبضے میں آگئے۔ اس کے علاوہ دریائے تنگ بھدرا سے بیجاپور اور دریائے کرشنا سے رائے پور تک کا علاقہ اس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

یوسف کی ان فتوحات کو دیکھ کر احمد آباد بیدر سے نامی گرامی امرا اس کے پاس چلے آئے تھے، جو نہیں آئے تھے وہ حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔ انہی میں ایک قاسم برید بھی تھا کیونکہ وہ خود بیجاپور پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یوسف نے اس کے خواب چکنا چور کردیے۔

وہ یوسف کی بربادی کی تجویزیں سوچنے لگا۔ اس کا ذہن پڑوس کی ہندو سلطنت بیجانگر کی طرف گیا، یہاں کا حاکم تمراج تھا۔ اس کے کچھ مضافات اور قلعوں پر یوسف نے قبضہ کرلیا تھا۔

بیجانگر کا حاکم ہندوؤں کا ایسا خاندان تھا جو تقریباً پچھلی ایک صدی سے بیجانگر کے علاقوں پر حکومت کرتا آیا تھا۔ جب اس خاندان کا حکمران انتقال کر گیا تو مرنے والے راجا کے فرزند نے عنانِ حکومت سنبھالی لیکن بدقسمتی سے وہ بھی جوانی کے دنوں ہی میں انتقال کر گیا۔ بعدازاں اس کے چھوٹے بھائی نے اس کی جگہ لی لیکن وہ بھی زیادہ دن زندہ نہ رہا اور چل بسا۔ اس کے بعد اس کے شیر خوار فرزند کو تخت پر راجا بنا کر بٹھایا گیا۔ ایک شخص تمراج کو اس کا مددگار بنادیا گیا۔

تمراج کا اقتدار ان دنوں بہت بڑھ گیا تھا چنانچہ جب وارثِ سلطنت سنِ شعور کو پہنچا تو تمراج نے اسے زہر دے کر مار ڈالا اور ایک لڑکے کو وارث بنا کر سلطنت کا حاکم مقرر کیا۔ اسی تمراج نے علاقے میں بڑی قوت حاصل کرلی تھی۔

امیر قاسم برید نے یوسف عادل شاہ پر حملہ آور ہونے کے لیے تمراج کو ابھارا۔

"سلطان بہمنی نے رائچور اور مدگل کا قلعہ مع اس کے مضافات تمہارے حوالے کر رکھا تھا۔ اب یوسف عادل شاہ نے ان پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ تم فوج کشی کرو اور ان علاقوں کو دوبارہ قبضے میں لے آؤ۔ میں تمہاری ہر مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

یہ خط لکھنے کے بعد قاسم برید نے بہادر گیلانی کو بھی یوسف کے خلاف بھڑکایا۔ بہادر ان دنوں کوہ اور دریا پار کے علاقے پر جسے اہلِ دکن "کوکن" کہتے ہیں، حکمران تھا۔

دونوں حکمران آگے بڑھے۔ تمراج نے رائچور اور مدگل کے قلعوں پر قبضہ کرلیا اور بڑی بے رحمی سے ان علاقوں کو تباہ و برباد کردیا۔

دوسری جانب سے بہادر گیلانی بڑھا اور جام کھنڈی کے قلعے پر قابض ہوگیا۔ ان فتنہ پروازیوں کی اطلاع بیجاپور پہنچی تو درباریوں کی ایک جماعت نے بادشاہ کو دشمن کے ناپاک ارادوں سے باخبر کیا۔

"بہادر گیلانی اور تمراج آپس میں مل گئے ہیں اور ہمارے علاقوں کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ اگر انہیں بروقت نہیں روکا گیا تو ان کی ہمتیں بڑھ جائیں گی۔ ان کی بیخ کنی ضروری ہے۔"

ایک اور امیر نے اطلاع دی۔ "امیر قاسم برید ان دونوں کا پورا پورا ساتھ دے رہا ہے بلکہ یہ آگ اسی کی لگائی ہوئی ہے۔ اسی نے انہیں ترغیب دی ہے۔ ہمارے دو نہیں تین دشمن ہیں۔"

ان سب کی باتیں سن کر یوسف عادل شاہ نے لب کشائی کی۔

"میں ہر معاملے میں بزرگانِ دین کی مقدس ارواح سے مدد کا طالب ہوتا ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آئمہ دین اور حضرت شیخ صفی کی برکات سے میں دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ رہوں گا۔"

"ان بزرگوں کی دعائیں اپنی جگہ لیکن ہمیں ظاہری اسباب پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ یہ بزرگ اسی وقت ہماری مدد کریں گے جب ہم اپنی مدد آپ کریں گے۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔"

یوسف کے دشمن تین طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف تمراج تھا، دوسری جانب بہادر گیلانی اور تیسری سمت قاسم برید۔ وہ ان تینوں سے بہ یک وقت نہیں لڑ سکتا۔

جہاں تلوار کام نہیں آتی وہاں دماغ کام آتا ہے۔ یوسف نے بھی دشمن کے اتحاد کو توڑنے کے لیے تلوار سے

نہیں دماغ سے کام لیا۔

اس نے ایک وفد ترتیب دیا اور اسے تمراج کے پاس صلح کے لیے بھیجا۔

"میں نے آپ کے جن علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا وہ آپ نے واپس لے لیے۔ اس کے علاوہ آپ کا ہم سے کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم ان علاقوں کو واپس لینے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بہ دستور آپ کے پاس رہیں گے۔ ہم آپ کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ بیجانگر لوٹ جائیں گے تاکہ خلقِ خدا خونریزی سے محفوظ رہے۔ آپ تاوان طلب کریں گے تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں۔"

یوسف کو یقین تھا کہ تمراج اس دعوتِ صلح کو قبول کرے گا۔ یہی ہوا بھی۔ اس نے دعوت قبول کی اور واپس چلا گیا۔ تمام شرائط اس کے حق میں جاتی تھیں اس لیے اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا جبکہ یوسف کا مقصد نقصان سے قطع نظر اتحاد کو توڑنا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

تمراج کے چلے جانے کے بعد بہادر گیلانی اکیلا رہ گیا۔ اس کی بساط اتنی نہیں تھی کہ یوسف سے تنہا مقابلہ کرتا۔ وہ مختصر سی فوج جام کھنڈی میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

یوسف نے جام کھنڈی کے قلعے کی واپسی کے لیے جدوجہد نہیں کی حالانکہ مختصر سی فوج کا مقابلہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ اپنی طاقت وہاں خرچ کرتا۔ شاخیں کاٹنے سے پہلے اسے جڑ کاٹنے کی فکر تھی۔ قاسم برید اس فتنے کا ذمے دار تھا اس کی سرکوبی ضروری تھی۔ وہ قاسم برید سے لڑنے کی تیاری کرنے لگا۔

قاسم برید اب تنہا رہ گیا تھا۔

یوسف تیاریوں میں مشغول تھا کہ اسے ایک عظیم خوشی ملی۔ اس کا رضاعی بھائی غضنفر آقا بیجاپور میں وارد ہوا اور اس وقت اس کے سامنے تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس کو یوسف کی والدہ نے اس وقت یوسف کی خبرگیری کے لیے "ساوہ" بھیجا تھا جب وہ خواجہ عماد کے گھر مقیم تھا۔ غضنفر آقا کے آنے کے بعد ہی یوسف کا راز کھل گیا تھا اور یوسف کو گھر چھوڑنا پڑا تھا۔

دونوں بھائی عرصہ دراز کے بعد ملے تھے۔ غضنفر آقا کی زبانی بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ یہ افسوسناک خبر بھی ملی کہ یوسف کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

"کیا مرنے سے پہلے انہیں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ان کا بیٹا بیجاپور کا حکمران بن گیا ہے؟" یوسف نے پوچھا۔

"ایک قافلہ تجارتی سامان لے کر قسطنطنیہ آیا تھا۔ اس قافلے میں شامل ایک تاجر سے آپ کے تمام حالات معلوم ہوئے تھے۔ وہ آپ کی ترقی کا سن کر جدائی کا صدمہ بھول گئی تھیں۔ وہ آپ کے پاس آنے کی تیاری بھی کر رہی تھیں کہ خدا نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے بھی امی جان ہی نے بتایا تھا کہ کوئی یوسف بیجاپور کا حکمراں بنا ہے۔ وہ یقیناً میرا یوسف ہوگا کیونکہ وہ ہندوستانی نہیں ترک ہے۔ اسی کی تصدیق کے لیے میں بیجاپور آیا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ آپ ہی ہیں۔"

"یہاں مجھے سب غلام زادہ سمجھتے ہیں۔ تم بھی فی الحال اس راز کو افشا مت کرنا۔"

"اس میں آخر مصلحت کیا ہے؟"

"میں ہندوستانیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ اے ہندوستانیو! تم اس قابل ہو کہ ایک غلام زادہ تم پر آقائی کرے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہاں جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ تم میرے لیے باعثِ تقویت ہوگے۔"

یوسف نے بڑی ہوشیاری سے تمراج اور بہادر گیلانی کو قاسم برید سے الگ کردیا تھا۔ اب وہ اکیلے قاسم برید سے بہ آسانی مقابلہ کرسکتا تھا۔ اس نے آٹھ ہزار ترک اور مغل سپاہیوں کا ایک لشکر ساتھ لیا اور احمد آباد بیدر کی طرف روانہ ہوگیا۔ قاسم برید کو اطلاع ملی تو اس نے احمد نظام الملک بحری (جنیر کا حاکم) سے مدد چاہی۔

احمد نظام الملک بحری نے قاسم برید کی درخواست منظور کی اور پرندہ کے حاکم خواجہ جہاں کو ہمراہ لے کر احمد آباد بیدر کی طرف روانہ ہوا۔

قاسم برید بھی بادشاہ محمود شاہ بہمنی کے ساتھ شہر سے نکلا اور اپنے مددگاروں سے جاملا۔

احمد آباد بیدر میں قاسم برید کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ کسی شخص کو بھی محمود شاہ کے پاس نہیں جانے دیتا تھا۔ آمدورفت کے راستے ایسے بند کردیے تھے کہ وہ حرم سے نکل نہیں سکتا

جملے

استاد شاگرد سے۔ "معمولی کو جملے میں استعمال کرو۔"

شاگرد۔ "میری ماں مولی بڑے شوق سے کھاتی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ قاسم برید تمام معاملات اپنے اختیارات سے طے کرتا اور سلطان کے لیے سوائے نام کے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس وقت معاملہ جنگ کا تھا لہٰذا قاسم برید بادشاہ کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ احمد نظام اور خواجہ جہاں بھی اس کے ساتھ مل گئے۔

یوسف عادل شاہ خود لشکر کے قلب میں موجود تھا اور اپنے رضاعی بھائی غضنفر آقا کو ایک ہزار مغل تیر اندازوں کے ساتھ ان کا سردار مقرر کر کے حکم دیا کہ لشکر کا جو حصہ دشمن سے مقابلہ کرتے وقت کمزور نظر آئے فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔

مولوی عادل نے اپنی مشہور مثنوی ''عادل نامہ'' میں یوسف عادل شاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں یوسف کو شکست ہوئی۔

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ نظام الملک اس لڑائی میں موجود نہیں تھا۔ فریقین میں صلح ہو گئی۔ صلح کے بعد یوسف عادل شاہ بیجاپور کی طرف روانہ ہوا۔

بیجاپور پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ بیجانگر کا پایہ تخت ہنگاموں کی زد میں ہے۔ تمراج نے چونکہ اپنے پیش رووٴں کو قتل کیا تھا اور راجا کے خاندان کے ایک کم سن لڑکے کو تخت پر بٹھا کر خود حکومت کر رہا تھا اس لیے رعایا اس سے ناراض تھی اور اب اپنا غصہ اتار رہی تھی۔

یوسف عادل شاہ نے بیجانگر کی اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے لشکر کو از سر نو ترتیب دیا اور بیجانگر کی طرف روانہ ہوا۔

تمراج اس کے لیے نرم دشمن تھا۔ اسے بیجانگر پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ سیر و شکار میں دن بسر کرتا ہوا نہایت سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ''دریائے کشنہ'' کے کنارے پہنچ کر اس کے قدم رک گئے، اسے یہ مقام اتنا پسند آیا کہ خیمے گاڑنے کا حکم دے دیا۔ مشہور گانے والے ہر وقت اس کے سامنے رہتے ہی تھے۔ انہیں حکم ہوا کہ سازوں پر ہاتھ رکھیں۔ جام شراب ہاتھ میں لیا اور عیش کی دیوی کو آواز دی۔

یہاں کی خوشگوار فضا نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ وہ یہ بھول ہی گیا کہ کس مہم کے لیے نکلا تھا۔ محفل عیش تھی کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے اس حد تک عیش پرستی کی کہ اس کی صحت پر برا اثر پڑا۔ اس بے اعتدالی کی وجہ سے اسے کھانسی نے پکڑ لیا۔ پھر بخار بھی ہو گیا۔

اس بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ دو ماہ تک خیمۂ شاہی میں قید ہو کر رہ گیا۔ جب طویل عرصے تک وہ خیمے سے باہر نہ آیا تو فوج میں یہ خبر پھیل گئی کہ یوسف اب اس دنیا میں نہیں رہا اور یہ کہ اس کی موت کو چھپایا جا رہا ہے۔

یہ افواہ خبر بن کر لشکر میں پھیلی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئی اور تمراج تک پہنچ گئی۔ خبر ایسی تھی کہ خوشی میں اوسان جاتے رہے۔ اس نے تحقیق کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور شادیانے بجوا دیے۔ اس نے یہی گمان کیا کہ میدان صاف ہے۔ بیس ہزار سوار اور پیادے اور ہزاروں ہاتھیوں کا لشکر لے کر ''رائچور'' کی طرف چل دیا۔

یوسف کے لشکر میں اس خبر نے گشت کیا تو کھلبلی مچ گئی۔ یوسف علیل تھا اور آفت ناگہانی سر پر منڈلا رہی تھی۔

وہ رات قیامت کی رات تھی۔ تمام امرا اور لشکری سجدہ ریز تھے۔ بادشاہ کی صحت یابی کے لیے دعا کی جا رہی تھی۔ مدینہ منورہ، کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کے علما اور سادات شاہی لشکر میں مقیم تھے اور اس کے لیے دعا گو تھے۔

بارگاہ خداوندی میں یہ دعائیں قبول ہوئیں۔ صبح ہوتے ہوتے یوسف کا بخار اتر گیا اور پھر چند روز میں مکمل صحت یاب ہو گیا۔

صحت یاب ہوتے ہی اس نے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ صرف علما کو بیس ہزار عنایت کیے۔ ایک امیر کو اپنے سابق وطن ''سادہ'' روانہ کیا کہ وہاں جا کر شہر میں ایک مسجد اور مینار تعمیر کرائے اور شہر کے بیچوں بیچ نہر کھدوائے جس کے نظارے سے اہل شہر کو فرحت ملے۔

ابھی وہ ان کاموں میں لگا ہوا تھا۔ لشکر کا دل جیتنے میں مشغول تھا کہ تمراج کی پیش قدمی کی اطلاع مل گئی۔ وہ دریا عبور کر کے شاہی لشکر کی طرف چل پڑا تھا۔ یوسف نے اپنی فوج کے افسروں کو حکم دیا کہ وہ مسلح ہو کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ شاہی حکم کی تعمیل ہوئی۔ یوسف عادل فوج کے معائنے کے لیے باہر نکلا تو معلوم ہوا فوج آٹھ ہزار سواروں اور دو سو ہاتھیوں پر مشتمل ہے۔ غضنفر آقا، جہانگیر، حیدر بیگ، داوٴد خاں اور دیگر امرا اس کے ساتھ تھے۔

''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ موجودہ لشکر دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کافی ہوگا؟'' یوسف نے پوچھا۔

''تمراج کے مقابلے میں ہمارے لشکر کی تعداد کم ضرور ہے لیکن جنگ تو جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ ہمارے سپاہی جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں۔ آپ بے خوف ہو کر روانگی کا حکم دیں۔''

یوسف عادل شاہ نے دشمن کے لشکر سے کچھ فاصلے پر اپنے خیمے گاڑے اور میدان جنگ کو اپنے امیروں میں تقسیم کر دیا تاکہ خندق کھودنے میں آسانی ہو۔

تمام لشکریوں نے بڑی احتیاط اور خوش اسلوبی سے بارہ روز اسی جگہ قیام کیا لیکن جب لڑائی کا موقع آیا تو مسلمان لشکری میدان جنگ سے منہ موڑنے لگے۔ ہزاروں سپاہی کٹ گئے اور فوج منتشر ہونے لگی۔ یوسف نے حکم دیا کہ نقارہ بجا کر بکھرے ہوئے سپاہیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ یوسف ایک ٹیلے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا تاکہ سب کو نظر آتا رہے۔

نقارے کی آواز سنتے ہی مرزا جہانگیر پانچ سو مغل سواروں کے ساتھ بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد داوٴد خاں بھی سات ہزار افغان اور راجپوت لشکریوں کے ساتھ آن پہنچا۔ ابھی یہ لشکر جمع ہو رہا تھا کہ یوسف کا ایک سردار جس کا نام ''سوئے چک'' تھا دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ ٹیلے کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے کودا اور بھاگتا ہوا یوسف کے قریب پہنچ گیا۔

''میں لڑائی کے دوران دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے قید سے نکل کر انہی کے گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ تک پہنچا ہوں۔ دشمن اس وقت اپنے آپ کو فاتح سمجھ کر غارت گری میں مصروف ہے۔ اگر آپ اس وقت ایک اور حملہ کر دیں تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔''

یوسف نے اس سردار کی اطلاع کو غور سے سنا اور اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اسی وقت چار ہزار سواروں کو ساتھ لیا اور تمراج پر جا پڑا۔ تمراج یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسلمان دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ تمراج کو فوج جمع کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ وہ سات آٹھ ہزار سواروں اور تین سو ہاتھیوں کے ساتھ یوسف کے مقابلے پر آنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ معرکہ آرائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے اگلے پچھلے سارے حساب برابر کر دیے۔ اس جانبازی سے لڑے کہ ہندو زیادہ دیر میدان میں نہ جم سکے۔

اس لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھوں بہت سا مال غنیمت لگا۔ یہ مال غنیمت دو سو ہاتھیوں، ایک ہزار گھوڑوں، تین کروڑ، جواہرات اور بہت سی گراں قدر اشیا پر مشتمل تھا۔

یوسف عادل شاہ نے رائچور اور مدگل کے قلعوں کو ہندووٴں کے قبضے سے نکال لیا۔ ان قلعوں کو فتح کرنے کے بعد وہ کامران و کامیاب بیجاپور آ گیا۔

سلطان محمود شاہ بہمنی کچھ عرصہ پہلے ہی اس سے مقابلے پر نکلا تھا لیکن یوسف کو معلوم تھا کہ وہ مجبور پرندہ ہے۔ قاسم برید کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہے اور مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ اس سے تعلقات بحال رکھے۔

اس نے مال غنیمت میں سے چند تحفے محمود شاہ کی خدمت میں روانہ کیے۔

ان تحائف کی ترسیل کا ایک مقصد یہ تھا کہ یوسف، تمراج سے نمٹنے کے بعد بہادر گیلانی کی سرزنش اور قلعہ جام کھنڈی پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ محمود بہمنی سے بہادر گیلانی کا کسی قسم کا اتحاد ہو۔

محمود بہمنی نے تحفے وصول کر کے یوسف کی طرف شکریہ کا پیغام روانہ کیا ہی تھا کہ اس کے ہم نام محمود گجراتی کا قاصد اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ یہ قاصد بہادر گیلانی کی شکایت لے کر آیا تھا۔

''بہادر گیلانی کے ملازموں نے گجرات کے ایک جہاز کو جو مکہ معظمہ کی طرف جا رہا تھا لوٹ لیا۔ اگر تم ان لٹیروں کو راہ راست پر نہیں لا سکتے تو پھر ہم سب سے درخواست کرو۔ ہم اپنے ایک سردار کو بھیج کر ان لٹیروں کا نام و نشان تک مٹا دیں گے۔''

محمود بہمنی نے بہت سوچا اور پھر اس کی نظر یوسف عادل شاہ پر پڑی۔ تحائف کی وصولی کا نشا اب تک طاری تھا۔ اس نے فوراً ایک قاصد بیجاپور کی طرف دوڑا دیا اور بہادر گیلانی کی سرزنش کے لیے اس سے مدد کی درخواست کی۔

اس میں قاسم برید کا مشورہ بھی شامل تھا۔ قاسم برید نے سوچا ہوگا وہ کیوں اس جھنجٹ میں پڑے۔ یوسف کو وہ کسی اور مہم میں الجھائے رکھنا چاہتا تھا۔

یوسف نے اس درخواست کو فوراً قبول کر لیا۔ وہ تو پہلے ہی یہ چاہتا تھا کہ بہادر گیلانی کا خاتمہ ہو جائے اور اب تو محمود بہمنی کے احسان مند ہونے کا پہلو بھی نکل آیا تھا۔

یوسف نے پانچ ہزار سواروں کو محمود بہمنی کی مدد کے لیے روانہ کر دیا۔ بہادر گیلانی کو پہلے ہی عادل شاہ کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا اس لیے وہ پہلے ہی جام کھنڈی کے قریب اپنے لشکر کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ وہ یوسف عادل شاہ کا منتظر تھا لیکن اس نے محمود بہمنی کی قیادت میں لشکر کو دریا پار کرتے ہوئے دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ محمود نے جام کھنڈی کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جب اس محاصرے کو دو تین ماہ گزر گئے تو اہل قلعہ نے تنگ آ کر پناہ مانگی۔

یہ قلعہ بہمنی حکومت کے قبضے میں آ گیا۔

محمود بہمنی نے یہ قلعہ اپنے پاس رکھنا چاہا لیکن قاسم برید نے اس کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ یوسف عادل شاہ کی خوشنودی اس کے لیے بہت ضروری تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہ قلعہ ہمیشہ یوسف عادل شاہ سے متعلق رہا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کی دلجوئی کے لیے اس قلعے کو عادل شاہ کے سپرد کیا جائے۔"

محمود اس کی رائے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی قلعہ عادل شاہ کے ایک سردار کمال دکنی کے حوالے کر دیا اور خود واپس ہو گیا۔

قدرت کھیل پر کھیل کھیلے جا رہی تھی۔ بہادر گیلانی، محمود بہمنی سے بچ گیا لیکن جلد ہی اپنی موت مر گیا۔

محمود بہمنی جام کھنڈی سے واپس ہوا تو احمد آباد بیدر جانے کے بجائے بیجاپور کی حدود میں پہنچ گیا۔ یوسف عادل شاہ کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے امرا کو استقبال کے لیے بھیجا۔

محمود شاہ بہمنی نے اپنے لشکر کو بیدر روانہ کیا اور خود ارا کین سلطنت کے ساتھ بیجاپور روانہ ہوا۔ یہاں یوسف اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ نہایت عزت و احترام کے ساتھ اسے مہمان بنایا۔

یوسف نے حال ہی میں ایک قلعہ بنوایا تھا۔ وہ محمود کو قلعہ دکھانے لے گیا۔ وہیں اس کے قیام کا بندوبست تھا۔ جب محمود روانہ ہونے لگا تو چلتے وقت بیس ہاتھی، پچاس گھوڑے اور بہت سے دوسرے قیمتی تحفے اس کی خدمت میں پیش کیے۔ محمود نے صرف ایک ہاتھی قبول کیا۔ باقی تمام چیزیں واپس کر دیں۔

یوسف کے دل میں گمان گزرا کہ بادشاہ کا دل اس کی طرف سے صاف نہیں۔ یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت بھی تھی کہ کوئی کسی کا دیا ہوا تحفہ واپس کر دے۔ اس نے اپنے ناگوار جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ سلطان محمود کو رخصت کرنے سرحد تک آیا۔ اس نے مصافحہ کرنے کے لیے سلطان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سلطان نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس رازداری سے رقعہ ہاتھ میں تھمانے کا مطلب ہی یہ تھا کہ یہ کوئی خفیہ پیغام ہے۔ یوسف نے بھی بند مٹھی نہیں کھولی۔

بیجاپور آنے کے بعد اس نے یہ رقعہ پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں تمہارے تحائف قبول کرتا ہوں لیکن ان کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ بیدر پہنچتے ہی قاسم برید ان پر قبضہ کر لے گا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم فی الحال ان تحفوں کو اپنے پاس رکھو اور مجھے قاسم برید کے پنجے سے نجات دلانے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد یہ چیزیں میں تم سے لے لوں گا۔"

بادشاہ کی بے بسی دیکھ کر یوسف کا دل بھر آیا۔ وہ چاہتا تو اسی وقت قاسم برید کو ختم کر سکتا تھا کیونکہ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا اور لشکر بھی اس کے ساتھ نہیں تھا لیکن مصلحت اس کا تقاضا نہیں کر رہی تھی۔ اس نے محمود شاہ کی طرف یہ پیغام بھیج دیا۔

"قاسم برید کو ختم کرنا بغیر فتح اللہ عماد الملک اور احمد نظام بحری کی مدد کے مشکل ہے۔ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ اس وقت تو اپنے پایہ تخت تشریف لے جائیں۔ میں ان دونوں امرا کو ہموار کر کے بیدر میں جلد حاضری دوں گا۔"

❁❁❁

دکن میں انتشار کی آندھی چل رہی تھی۔ بہمنی سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوتے ہی ملک کے صوبہ داروں نے خود مختاری کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ جو جہاں تھا وہیں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ خود مختار حاکم پیدا ہو گئے۔ فتح اللہ عماد الملک اور قطب الملک ہمدانی نے جو محمود کے قابلِ اعتماد امرا تھے بالترتیب برار اور تلنگانہ میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ بہادر گیلانی مر چکا تھا لیکن اس کا بیٹا بیجاپور کے مشرق میں دریائے شور کے کنارے تک مشہور پرگنوں اور مضبوط قلعوں کا مالک تھا۔

اس ماحول میں ایک خواجہ سرا دینار حبشی نے بھی حکمرانی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ جو قلعے اور پرگنے اس کے زیرِ اثر تھے ان پر مستقل طور پر قبضہ کر لیا۔ وہ چاہتا تھا اپنی خود مختاری اور بادشاہت کا اعلان کرے اور اپنا سکہ بھی جاری کرے۔ اس کے لیے اسے کسی مددگار کی ضرورت پڑی تاکہ مزاحمت ہو تو وہ اس کی مدد لے سکے۔ اس نے نظام الملک بحری کو پیغام بھیجا (نظام الملک بحری احمد نگر کا فرماں رواں تھا۔ احمد آباد بیدر الگ تھا، احمد نگر الگ)

"فتح اللہ عماد الملک نے یوسف عادل شاہ کی مدد سے برار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح اگر میں بھی اپنے علاقوں میں خود مختار حکومت قائم کروں تو حق بجانب ہوں گا لیکن محمود بہمنی اور قاسم برید سے مزاحمت کا خطرہ ہے۔ ان کا مقابلہ میں آپ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔ فتح اللہ عماد الملک کی مدد یوسف عادل شاہ نے کی۔ کیا آپ میری مدد نہیں کر سکتے جبکہ میں تو آپ کا منہ بولا بیٹا ہوں۔

میں آپ کا ہمیشہ وفادار رہوں گا۔"

نظام الملک نے دینار حبشی کو اپنا سکہ اور خطبہ جاری کرنے کی اجازت دے دی۔

دینار حبشی نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا اور ان

تمام قلعوں اور پرگنوں سے جو اس کے زیرِ اثر تھے، قاسم برید کے عاملوں کو نکال دیا اور بہت سے ایسے حصوں پر بھی قبضہ کر لیا جو بیدر کے زیرِ حکومت تھے۔

سلطان محمود بہمنی تو سلطان ہوتے ہوئے بھی قاسم برید کی قید میں زندگی گزار رہا تھا۔ امیر قاسم جو چاہتا تھا اس سے منوا لیتا تھا، اس مرتبہ بھی اس نے خود آگے بڑھنے کے بجائے محمود کو مجبور کیا کہ وہ یوسف عادل شاہ کو مدد کے لیے پیغام بھجوائے۔

محمود نے پیغام بھجوا دیا۔

یوسف کو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن بعض مجبوریاں تھیں۔ اس نے محمود کی خدمت میں پیغام بھجوایا۔

"اگر میں خود آیا تو نظام الملک بحری بھی دینار کی مدد کو پہنچے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ مجھے اس میں شامل نہ کریں۔ میری غیر حاضری کو میری سرکشی یا نافرمانی پر محمول نہ کیجیے گا۔"

وہ یہ پیغام بھیج کر مطمئن ہو گیا تھا لیکن جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ نظام الملک بحری نے خواجہ جہاں دکنی والی پرندہ کو دینار حبشی کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی فوج کا بہترین حصہ خواجہ جہاں کے ہمراہ کر دیا ہے اور خود بھی تیار بیٹھا ہے۔ کسی وقت بھی سوار ہو سکتا ہے۔ اب اس کا رکے رہنا اور محمود بہمنی کی مدد کو نہ پہنچنا بعید از مصلحت تھا۔ وہ بھی اپنا لشکر لے کر چلا۔ قاسم برید بھی اس سے آ کر ملا اور دونوں دینار حبشی کی سرزنش کے لیے روانہ ہوئے۔

دینار اس مشترکہ لشکر کو لے کر مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ فریقین میں زبردست جنگ ہوئی۔ دینار کی بہادری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن قسمت اس کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ گرفتار کر لیا گیا۔

قاسم برید اپنے اس بدترین دشمن کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے محمود بہمنی سے فرمان بھی لے لیا تھا لیکن یوسف عادل شاہ نے محمود سے سفارش کر کے اس کی جاں بخشی کرا دی اور اس کی جاگیر حسن آباد، گلبرگہ پر اسے بحال کرا دیا۔

دینار کو اس کی جاگیر مل گئی اور یوسف عازم بیجاپور ہوا۔

وہ ابھی بیجاپور پہنچا ہی تھا کہ شور مچا۔ سلطان محمود کا ایک نہایت اہم امیر اس سے ملاقات کے لیے بیجاپور آیا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ پیغام لے کر کوئی قاصد آتا تھا نہ کہ کوئی امیر۔ کسی امیر کا بذاتِ خود اور تحائف کے ساتھ آنا غیر معمولی بات تھی۔ یقیناً پیغام بھی غیر معمولی ہوگا۔

یہ عقدہ اس وقت کھلا جب یوسف نے اس امیر سے ملاقات کی۔ محمود بہمنی نے اپنے بیٹے احمد کے لیے یوسف کی بیٹی بی بی ستی کا رشتہ مانگا تھا۔

یوسف کے لیے یہ رشتہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا لہٰذا کچھ دن مزید اچھی طرح غور کرنے کے بعد اس نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔

شادی کا وقت آیا تو اس تقریب کے لیے گلبرگہ کا انتخاب کیا گیا۔

محمود شاہ اور یوسف دونوں اپنے اپنے علاقوں سے گلبرگہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں احمد اور بی بی ستی رشتۂ مناکحت میں بندھ گئے۔

احمد شاہ نے اسے ملکۂ جہاں کے لقب سے نوازا۔

❁❁❁

احمد آباد بیدر میں شادی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ بہمنی خاندان کی تمام شہزادیاں اس جشن میں شریک ہونے کے لیے پہنچی تھیں۔

بہمنوں میں رواج تھا کہ بادشاہ یا ولی عہد کی بیوی عیدین اور دیگر خوشی کے مواقع پر ایک خاص قسم کا زیور پہنا کرتی تھیں۔ اس زیور کی بناوٹ یہ تھی کہ موتیوں کی چند لڑیوں کو یکجا کر کے ان پر سونے کا ایک "قبہ" (گنبد نما) جس میں گراں قدر جواہرات جڑے ہوتے تھے، نصب کیا جاتا تھا۔

ملکہ جہاں بی بی ستی مجلس میں داخل ہوئی تو یہ زیور اس طرح پہنے ہوئے تھی کہ "قبہ" سر پر نصب تھا اور موتیوں کی لڑیاں ماتھے اور سر کے دونوں اطراف لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے ناز سے چلتے ہوئے آئی اور دوسری عورتوں سے الگ ایک ممتاز جگہ پر بیٹھ گئی جو خاص طور پر اس کے لیے بنائی گئی تھی۔

ایک بہمنی شہزادی اس کی شان دیکھ کر جل گئی۔ قدرے بلند آواز میں شاید بی بی ستی کو ستانے کے لیے دوسری عورتوں سے مخاطب ہوئی۔

"واہ بھئی واہ! یہ بھی خدا کی شان ہے۔ پاؤں کی دھول سر پر ہے۔ یوسف کی بیٹی کو ایسا بلند مرتبہ ملا کہ بہمنی شہزادیوں سے بھی بلند جگہ پر بیٹھی ہے۔"

ایک اور شہزادی نے بات آگے بڑھائی۔ "بہنو! قیامت قریب ہے کہ غلام اور آقا کا فرق ہی مٹ گیا۔"

یہ باتیں اس لیے کی جا رہی تھیں کہ یوسف عادل شاہ کو غلام زادہ سمجھا جاتا تھا اور شہزادیوں کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ ایک غلام زادی کو محمود شاہ نے اپنی بہو بنایا ہے۔

بی بی ستی بھی کیوں خاموش رہتی۔ اس نے یہ باتیں سنیں تو ان عورتوں سے مخاطب ہوئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہ طنزیہ گفتگو قطعی لایعنی ہے۔ اگر تمہیں یہ ناز ہے کہ تم شہزادیاں ہو تو میں تم سے بڑھ کر شہزادی ہوں۔ اگر تم سلطان دکن کی بیٹیاں ہو تو میں فرماں روائے روم کی پوتی ہوں۔"

"اگر تم فرماں روائے روم کی پوتی ہو تو یہاں کیا کر رہی ہو؟" ایک شہزادی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

بی بی ستی نے مختصر لفظوں میں وہ قصہ بیان کردیا کہ کس طرح یوسف قسطنطنیہ سے نکل کر بلادِ عجم پہنچا اور پھر وارد ہندوستان ہوا اور پھر اپنی محنت سے بیجاپور کا حاکم بن گیا۔

اس وقت کون تھا جو یقین کرتا۔ شہزادیوں نے اسے بھی بناوٹی داستان سمجھا لیکن بات آگے بڑھانے کا یہ کوئی موقع نہیں تھا۔ سب یہ کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

"ہاں بھئی، تم شہزادی ہو، چلتی زبان کون روک سکتا ہے۔"

یہ باتیں حرم سے باہر نکلیں تو قاسم برید کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ اسے ہنسی آگئی کہ یوسف نے کیسی من گھڑت کہانی سکھا کر بیٹی کو بھیجا ہے۔ شان و شوکت بڑھانے کے لیے اس نے اپنا نسب نامہ ہی بدل دیا۔ ایک غلام زادہ روم کا شہزادہ بن گیا۔ اس کا سازشی ذہن اس حقیقت کو آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سوچتا رہا کہ یوسف کی بیٹی کی اس من گھڑت کہانی کو کس طرح جھٹلایا جائے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر تحقیق سے ثابت ہوجائے کہ یوسف جھوٹا ہے تو اس کا مضحکہ اڑانے میں کیسی آسانی ہوگی۔

اس نے یوسف کے نسب نامے کی تحقیق کے لیے ایک شخص کو تجارت کے بہانے روم روانہ کیا۔ وہ شخص قسطنطنیہ پہنچا اور اس نے شاہی حرم کی ضعیف العمر عورتوں سے سلطان محمد کے بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ ان عورتوں نے جو کچھ بتایا اس سے بی بی ستی کے بیان کی لفظ بہ لفظ تصدیق ہوگئی۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ یوسف سلطان محمد کا بھائی ہے۔

یہ شخص واپس آیا اور سارا احوال قاسم برید کے گوش گزار کردیا۔

❖❖❖

محمود شاہ کی طرف سے یہ تقاضے بڑھتے جا رہے تھے کہ قاسم برید کو راستے سے ہٹایا جائے۔ بالآخر یوسف، بی بی ستی سے ملنے کے بہانے بیدر گیا اور محمود شاہ سے ملاقات کی۔ محمود شاہ نے قاسم برید کی زیادتیوں کی ایک لمبی فہرست اس کے سامنے رکھ دی۔

"تم مجھے سلطان سمجھتے ہو۔ میں تو قاسم برید کے ہاتھوں میں ایک قیدی ہوں۔ حرم سرا میں قید ہو کر رہ گیا ہوں، سلطنت کے تمام کام اس کے حکم سے ہوتے ہیں۔ وہ مجھ سے جو چاہتا ہے لکھوا لیتا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو میں فقیر وہ سلطان ہوجائے گا۔ اب تو تم میرے سمدھی ہو اور احمد شاہ تمہارا داماد۔ میرے بعد وہ احمد شاہ سے بھی یہی سلوک کرے گا۔ اسے جس طرح بھی ہو راستے سے ہٹاؤ۔"

یوسف اس کی باتیں سن کر سخت متاثر ہوا اور ارادہ کرلیا کہ وہ قاسم برید کو راستے سے ہٹا دے گا۔ اس نے محمود شاہ سے درخواست کی۔

"میرے اور آپ کے مقبوضات کے درمیان دینار حبشی کی جاگیر کا علاقہ ہے اس لیے میں امیر قاسم کا خاتمہ کرنے سے معذور ہوں۔ اگر آپ قاسم برید کے جال سے نکلنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ دینار کی جاگیر میرے حوالے کردیں تاکہ میں وہاں لائق سرداروں کو متعین کردوں اور پھر کسی وقت حملہ کر کے قاسم کو گرفتار کرلوں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ نظام الملک بحری اس کی مدد کو ضرور آئے گا۔ میں یہ کام اتنی سرعت اور خفیہ طریقے سے کرنا چاہتا ہوں کہ نظام الملک کو اطلاع ہی نہ ہو اور قاسم گرفتار ہوجائے۔ گرفتاری کے بعد اگر خبر ہوئی تو وہ کچھ نہیں کرسکے گا۔"

"میں قاسم برید سے پیچھا چھڑانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

محمود شاہ نے یوسف کی درخواست قبول کرلی۔

اجازت ملتے ہی یوسف نے دینار پر حملہ کردیا۔ دینار نے بھاگ کر قاسم برید کے دامن میں پناہ لی۔ امیر قطب الملک ہمدانی نے بھی یوسف کا ساتھ دیا تھا اس لیے قاسم برید خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے دینار اور دوسرے کئی امرا کو ساتھ لیا اور ایک مقام "النور" میں پناہ گزیں ہوگیا۔

دینار کی جاگیر اور خزانوں پر یوسف کا قبضہ ہوگیا۔ قاسم برید ہاتھ سے نکل گیا۔

یوسف نے قطب الملک کو ساتھ لیا اور "النور" پہنچ گیا۔ قاسم برید بھی اس کے مقابلے پر آگیا۔ دونوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ شاہی لشکر کو فتح نصیب ہوئی، ہر امیر کسی نہ کسی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

امیر قاسم پھر ہاتھ سے نکل گیا۔

یوسف عادل شاہ بیجاپور واپس آگیا تھا لیکن دکن کی بگڑتی ہوئی حالت پر برابر غور کر رہا تھا۔ اس سلطنت کو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے دیکھ کر اسے بھی خیال آیا کہ وہ بھی اپنی مملکت کو وسیع کرے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ طاقتور امرا اور حاکموں سے دوستانہ مراسم پیدا کرے تاکہ

اس کے حریفوں کے حلیف کم سے کم پیدا ہوں۔

اس نے نظام الملک بحری کو پیغام بھیجا۔

"اس وقت موقع ہے کہ تمام فرماں روان دکن کے مختلف حصوں پر قبضہ کر کے خود مختار حکومتیں قائم کریں۔ آپ دولت آباد پر قبضہ کرلیں۔ میں دینار اور عین الملک کے پرگنوں کو اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ قطب الملک تلنگانہ فتح کرلے گا۔ بیدر کا علاقہ قاسم برید کے قبضے میں رہے گا اور ہم لوگ باہمی اتحاد و اتفاق سے رہیں گے۔"

اس نے بڑی ہوشیاری سے نظام الملک کا غصہ ٹھنڈا کردیا تھا۔ دوسرے امرا کو بھی یہ موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ علاقے فتح کرنے کی کوشش میں لگ جائیں اور اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوں۔

نظام الملک سے دوستانہ مراسم پیدا ہوتے ہی وہ دینار حبشی سے مقابلے کی تیاری کرنے لگا۔ دینار کو جب اس کی اطلاع ملی اور نظام الملک سے دوستی کی خبر پہنچی تو اس نے امیر برید سے مدد طلب کی۔ اس نے دینار کی مدد کے لیے تین ہزار سوار روانہ کردیے۔ خواجہ جہاں دکنی بھی آگے بڑھ کر دینار کا حلیف ہوگیا۔

نظام الملک دولت آباد کی فتح میں مصروف تھا۔ خواجہ جہاں دکنی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے لشکر کے ساتھ دینار سے جاملا۔

دینار کی عسکری قوت میں بے پناہ اضافہ ہوچکا تھا لیکن یوسف عادل شاہ نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے ترغیب دینے کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ لشکر کو مالا مال کرنا شروع کردیا اور اپنا لشکر لے کر دینار سے مقابلے کے لیے نکلا۔ دشمن کے لشکر سے پانچ کوس کے فاصلے پر قیام کرنے کے بعد اس شان سے نکلا کہ غضنفر آقا کی سرداری میں تیر انداز اور نیزہ باز بہ طور مقدمہ آگے آگے تھے۔

غضنفر ایک کوس کے فاصلے پر پہنچا اور عادل شاہ کے فرمان کے مطابق دینار کے پاس اطاعت کا پیغام بھیجا۔

دینار نے طاقت کے گھمنڈ میں اس نصیحت کو ٹھکرا دیا اور چھ ہزار سواروں کو لے کر آگے بڑھا۔ دونوں فریق آمنے سامنے آئے اور جنگ کا بازار گرم ہوگیا۔

دینار کے غرور کا سر نیچا ہوا۔ اس کی شکست کی خبر یوسف کو پہنچی جو پانچ کوس کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا تھا۔ خبر سنتے ہی وہ بھی چلا اور مقدمہ لشکر سے جاملا۔ از سر نو فوج کو مرتب کیا۔ دینار نے میدان میں جگہ جگہ مست ہاتھی کھڑے کر دیے اور فوج کو مرتب کیا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مئی کی گرماہٹیں... جاسوسی کے جاں فزا شمارے کی آہٹیں

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● ناگہانی کسی بھی وقت لپیٹ میں لے سکتی ہے... ایک آفت کی نذر ہوجانے والے خاندان کا ماجرا مریم کے خان کا اندازِ بیان

دوسری کہانی ● جن پتوں پر تکیہ تھا وہی ہوا دینے لگے... سلیم فاروقی کا سنسنی خیز سرورق

واپسی کا سفر ● کوئی بھی خوش ضمیری اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے میں ناکام ہی رہتی ہے... زندگی کے پیمانے جو چھلک جانے پر تھے... احمد اقبال کے قلم کی جولانیاں

گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ

للکار ● محبت کی جلتی بجھتی شمعیں اور انتقام کے بھڑکتے شعلے طاہر جاوید مغل کی سنسنی خیز تحریر

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور بہت سی دلچسپ باتیں... کتھائیں

مغرب کے نرالے انداز

مغربی دنیا کی تہذیب و ماحول کی عکاسی کرتی محبت کی پروردہ ناقابل فراموش کہانیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اصل مقابلہ یہ تھا جو ہونے والا تھا۔ آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد جہانگیر بیگ تی قلب لشکر سے نکلا اور دشمن پر حملہ آور ہوا۔ اس کے بعد غضنفر آقا اور حیدر بیگ بہ یک وقت میمنہ اور میسرہ سے نکلے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر دشمن کے دانت کھٹے کرتے رہے۔ پھر ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ دوست دشمن کی پہچان ہی ختم ہوگئی۔

یوسف سب سے بے نیاز ہوکر دینار حبشی کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ وہ دشمن کے قلب میں داخل ہوگیا۔ یہ خطرناک قدم تھا لیکن وہ تو دینار کا خاتمہ کرنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اس کو اس وقت کسی خطرے کی پروانہیں تھی۔

دینار کو اس کے فوجی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ عادل شاہ نے بے پناہ جرأت کا مظاہرہ کیا اور محافظوں سے لڑتا بھڑتا دینار کے گھوڑے کے قریب پہنچ گیا۔ اسی وقت غضنفر آقا کے چند نیزہ بردار بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔ ایک نیزہ بردار نے دینار کی طرف نیزہ اچھالا جو اس کی زرہ کو توڑتا ہوا اس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ دینار نیزے کی ضرب سے ایک طرف کو جھکا اور اسی وقت یوسف کی تلوار نے اس کا سر قلم کردیا۔ یہ دیکھتے ہی اس کے محافظ بھاگ کھڑے ہوئے اور پھر اس کی پوری فوج حواس باختہ ہوکر بھاگ نکلی۔

اس افراتفری میں کسی نے خبر دی کہ غضنفر آقا زخمی ہوگیا ہے۔ اس کے ماتھے پر ایک پتھر لگا تھا۔ زخم کاری تھا لیکن اس نے زخم کی پروانہیں کی اور عادل شاہ کو مبارک باد دینے اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔

عادل شاہ نے بھائی کو گلے لگایا اور اپنے ہاتھ سے اس کی مرہم پٹی کی۔

غضنفر کا زخم بہت مہلک تھا۔ اطبا نے اس کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اور تیسرے روز اس کا انتقال ہوگیا۔ فتح کی خوشی کے پہلو میں چھپا ہوا یہ ایسا صدمہ تھا جس کا ماتم وہ بہت دن تک کرتا رہا۔ اس دوران امرا اسے سمجھاتے رہے کہ اگر آپ اسی طرح گوشہ نشینی اختیار کیے رہے تو امور سلطنت کا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔

امرا کے مسلسل سمجھانے پر اس نے سوگ کا لباس اتارا۔ گوشہ نشینی سے باہر آیا۔ بھائی کے غم کو بھلا کر فتح کا جشن منایا۔ دینار سے چھینے ہوئے پرگنوں پر امرا کا تقرر کیا۔ جشن فتح کی مجلس میں تقریر کرتے ہوئے اس نے اپنے ابتدائی دنوں کو یاد کیا اور آئندہ کے عزائم کا ذکر کیا۔

جس وقت وہ یہ تقریر کررہا تھا اس وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے گرد کن سازشوں کے جال پھیلائے جارہے ہیں۔ شاید اس نے اپنے بھائی غضنفر آقا کا سوگ مناتے ہوئے بہت دن گزار دیے تھے۔ اس نے یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ دشمن کی حاضر دماغی نے اس کی غیر حاضری کا کیسا فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قاسم برید نے ان پرگنوں کو اپنے قبضے میں لے لیا جو دینار کے پاس تھے اور عادل شاہ نے اپنے قبضے میں کرلیے تھے۔

احمد نظام الملک نے ایک قاصد بھیج کر قلعہ طلب کیا جو پہلے دینار کے قبضے میں تھا۔ عادل شاہ نے قاصد کو نہایت سخت جواب دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ آگے بڑھ کر نظام الملک کے کچھ علاقوں پر قبضہ بھی کرلیا۔

یوسف کا ستارہ اچانک گردش میں آگیا تھا۔ محمود شاہ نے سمدھی ہونے کا پاس بھی نہیں کیا۔ جتنے بڑے بڑے امرا تھے انہیں ترغیب دے کر یوسف پر حملہ آور ہونے پر اکسایا۔ اس کی شہ پاکر تمام امرا نے یوسف کے خلاف گٹھ جوڑ کرلیا۔ فوجیں بیدر میں جمع ہوگئیں۔

محمود شاہ امیر برید کو ساتھ لے کر پایۂ تخت سے روانہ ہوا۔ ایک وقت وہ تھا جب سلطان محمود نے یوسف سے درخواست کی تھی کہ وہ قاسم برید سے اس کا پیچھا چھڑائے۔ ایک یہ وقت آیا کہ دونوں مل کر یوسف کا خاتمہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ احمد نگر کی فوجیں بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آگے بڑھ رہی تھیں۔ یوسف کا پریشان ہونا لازمی تھا لیکن امیر فتح اللہ عمادی والی برار نے اسے راہ سجھائی۔

”تم احمد نظام الملک کی جاگیر کو نذر آتش کرنا شروع کردو۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”نتیجے سے میں تمہیں بعد میں آگاہ کروں گا بلکہ خود دیکھ لوگے اور خود برہانپور چلے جاؤ۔“

یوسف نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور احمد نظام الملک کی جاگیر کو نذر آتش کرنا شروع کردیا۔ احمد نظام الملک نے اپنی جاگیر کو بچانے کے لیے یوسف کا تعاقب شروع کردیا۔ اس طرح یوسف اسے سلطان محمود اور قاسم برید سے بہت دور لے آیا۔ قطب الملک بھی نظام الملک کے ساتھ ہی میدان چھوڑ گیا۔

اس امیر کی ترکیب کارگر ہوئی۔ دوسرے روز صبح میدان جنگ خالی نظر آیا۔ محمود شاہ اور امیر برید نے میدان جنگ خالی دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ جنگ کرتے تو کس سے کرتے اور کس کے سہارے کرتے۔ دونوں احمد آباد کی طرف لوٹ گئے۔

ابھی راستے میں تھے کہ ایک قاصد برق رفتاری سے جاتا ہوا نظر آیا۔ لشکر کے آدمیوں نے اسے روک لیا اور پکڑ کر محمود شاہ کے پاس لائے۔ اس سے پوچھ گچھ کی تو پہلے اس نے کچھ بتانے سے انکار کیا لیکن جب اس کی پگڑی سے خط نکلا تو وہ سب کچھ بتانے پر تیار ہوگیا۔

”میں برہان پور جارہا تھا۔“

”برہان پور کس کے پاس جارہے تھے؟“

”یوسف عادل شاہ کے پاس۔“

”کس کے حکم پر جارہے تھے؟“

”فتح اللہ عمادی کے حکم سے یہ خط یوسف عادل شاہ کو پہنچانے۔“

”تم سے کچھ زبانی بھی کہا گیا تھا؟“

”نہیں جو کچھ ہے اس خط میں ہے۔“

”اس خط میں کیا لکھا ہے؟“

”میں نے اسے پڑھا نہیں۔“

اس کے بعد خط کھول کر پڑھا گیا۔

”آپ نے میرے مشورے پر عمل کیا لہٰذا نتیجہ درست نکلا۔ نظام الملک اور قطب الملک فوجیں لے کر میدان خالی کرگئے۔ اب محمود شاہ اکیلا ہے جسے تم آسانی سے زیر کرسکتے ہو۔ امیر برید کو بھی انجام تک پہنچا سکتے ہو۔ اب تم برہان پور سے واپس آسکتے ہو۔ محمود شاہ نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم امیر برید کا کام تمام کرکے اس کی جان چھڑاؤ گے۔ اب یہ وعدہ پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔“

اس خط سے دو باتیں ظاہر ہوگئیں۔ ایک تو یہ فتح اللہ عمادی عادل شاہ سے ملا ہوا ہے۔ دوسرے امیر برید پر یہ راز افشا ہوگیا کہ محمود شاہ اس کی موت کے درپے ہے اور اندر ہی اندر عادل شاہ سے ساز باز کررہا ہے۔

امیر قاسم نے اسے بے عزت کرنے اور اپنی جان بچانے کے لیے محمود شاہ کو مجبور کیا کہ وہ ساز و سامان وہیں چھوڑے اور تیزی سے بیدر پہنچے۔

”ہمارے پاس اتنا لشکر نہیں کہ ہم فتح اللہ عمادی اور عادل شاہ کے مشترکہ لشکر سے مقابلہ کرسکیں۔“

محمود شاہ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ امیر برید کی بات ٹالتا۔

فتح اللہ عمادی نے اس خدشے کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا کہ قاصد پکڑا بھی جاسکتا ہے۔ اس نے دو قاصد دو مختلف راستوں سے روانہ کیے تھے۔ ایک قاصد پکڑا گیا، دوسرا وقت سے پہلے پہنچ گیا۔

یوسف عادل شاہ برہان پور سے روانہ ہوا۔ فتح اللہ عمادی سے راستے ہی میں مل گیا۔ دونوں نے دشمن کے لشکر کو تباہ کیا۔

یوسف عادل شاہ، فتح اللہ عمادی سے رخصت ہوکر بیجاپور واپس آیا۔

❁❁❁

قاسم برید پر یہ راز کھل گیا تھا کہ محمود شاہ اس کے قتل کے درپے ہے۔ اب اس سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ بیدر پہنچتے ہی وہ اس گستاخی سے محمود شاہ کے سامنے آیا جیسے وہ خود بادشاہ ہو۔

”آپ نے میرے قتل کا پورا سامان کرلیا تھا۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“

”فتح اللہ کا خط کیا کہہ رہا تھا۔“

”اس نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے ہیں۔ ایک طرف عادل شاہ کو ممنون احسان بنایا ہے، دوسری طرف اس مضمون کا خط لکھ کر ہم میں اختلاف ڈالنے کی کوشش کی ہے۔“

”اس کا فیصلہ اب میں نہیں میرا سلوک کرے گا۔ اب مجھے آپ پر اعتبار نہیں رہا۔ آپ حرم سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔ سلطنت کے تمام امور میں انجام دوں گا۔“

امیر برید یہ کہہ کر اٹھ گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہ معما بھی حل ہوگیا کہ اس نے کس سلوک کا ذکر کیا تھا۔ کچھ دیر بعد امیر برید کی ایک کنیز معمولی سے خوان پوش میں اس کے لیے کھانا لے کر آئی۔

”تم سے میرا کیا تعلق۔ تم کھانا لے کر کیوں آئی ہو؟“

”میرے امیر کا یہی حکم ہے۔ آج سے آپ کی خدمت میرے سپرد ہے۔“

”حکم اس کا چلے گا یا میرا؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ گستاخی معاف۔ میں جس کی کنیز ہوں اسی کا حکم مانوں گی۔“

”کھانا یہاں رکھ دے اور امیر کو بھیج۔“

کنیز کھانا رکھ کر چلی گئی۔ وہ امیر برید کا انتظار کرتا رہا۔

جب کنیز برتن سمیٹنے آئی تو بادشاہ نے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"امیر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا۔ کیا تو نے اسے بتایا نہیں تھا؟"

"میں نے آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے مجھے منع کر دیا ہے کہ آپ کو کوئی جواب نہ دوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیوں نہیں آئے۔"

محمود شاہ کسی مجبور پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

ایک سوار "کاویلی" کے بازار سے گزرتے ہوئے اس راستے پر چل دیا جو راستہ عماد الملک کے محل کی طرف جاتا تھا۔ سوار کے چلنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ضرور ہے لیکن راستوں سے ناواقف نہیں۔ اسے کہیں رک کر کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اس علاقے پر محمود شاہ کا ایک سابق امیر عماد الملک قابض تھا۔ یہ سوار اسی سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور اس وقت عماد الملک کے محل کے سامنے کھڑا تھا۔

دربانوں نے ضروری تعارف کے بعد اسے اندر جانے دیا۔

یہ سوار محمود شاہ کا ایک وفادار ملازم تھا جس نے دربانوں سے اپنا تعارف محمود شاہ کے ایک وزیر کے طور پر کرایا۔

وہ ایک وسیع ہال نما کمرے میں بیٹھا عماد الملک کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عماد الملک کمرے میں داخل ہوا لیکن درمیان ہی میں رک گیا اور آنے والے کو کچھ حیرت کچھ ناگواری سے دیکھنے لگا۔

"عنبر! یہ تم ہو۔ مجھے تو کچھ اور بتایا گیا تھا۔ تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"آقائے نعمت! معاملات ہی کچھ ایسے ہیں کہ مجھے سفر بھی اختیار کرنا پڑا اور جھوٹ بھی۔ آپ تشریف رکھیں تو میں کچھ عرض کروں۔"

"اگر تم سلطان محمود شاہ کے سفیر بن کر آئے ہو تو ان کے معاملات میں مجھے اب دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں بے شک ان کا سفیر بن کر آیا ہوں لیکن اب انہیں سلطان کہنا مناسب نہیں۔ میں ایک قیدی کی سفارش لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ ان کی والدہ ملکۂ جہاں کی اجازت بھی مجھے حاصل ہے۔"

"کیا تم اس قیدی کی بات تو نہیں کر رہے ہو جس کی اجازت سے دلاور حبشی نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا۔ وہ رات تو تمہیں یاد ہوگی جب میں اور قیام الملک، ملکۂ جہاں سے ملنے کے بعد باہر نکلے تھے۔ دلاور اور اس کے ساتھیوں نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ تو میری قسمت تھی کہ بچ نکلا۔ اس کے بعد میں سلطان کو چھوڑ کر چلا نہ آتا تو اور کیا کرتا۔"

"بیدر میں جو سازشیں پل بڑھ رہی ہیں ان کا کچھ اندازہ تو آپ کو بھی ہوگا۔ سلطان کے کان یہ کہہ کر بھرے گئے تھے کہ قیام الملک اور آپ انہیں یعنی سلطان کو بچہ سمجھتے ہیں اور تمام امور مملکت اپنی مرضی سے چلا رہے ہیں اور بھی جانے کیا کیا کہا ہوگا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کاویلی چلے آئے۔ قیام الملک "جنیر" چلے گئے۔ آپ کے چلے آنے سے تمام امرا منتشر ہو گئے اور نظام میں خرابی پیدا ہو گئی۔ امیر برید کا زور چل گیا۔ اب تو یہ حال ہے کہ امیر برید کی کنیزیں اسے کھانا پہنچا دیتی ہیں۔ سلطان باہر نکلنے سے بھی معذور ہے۔"

"ان سب باتوں کی بھنک میرے کانوں تک بھی پہنچی ہے۔ اس وقت تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

"میں خود نہیں آیا ہوں مجھے سلطان نے بھیجا ہے۔"

"صرف یہ بتانے کے لیے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے؟"

"نہیں بلکہ اس درخواست کے ساتھ بھیجا ہے کہ قاسم برید سے ان کی گلوخلاصی کرائی جائے۔"

"میں کاویلی میں بیٹھ کر ان کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں ادنیٰ سا آدمی کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ ہی کوئی حل نکالیں۔"

عماد الملک کچھ دیر سوچتا رہا پھر عنبر سے مخاطب ہوا۔

"سلطان نے میرے قتل کا حکم جاری کیا تھا لیکن میں انہیں معاف کرتا ہوں۔ انہیں اب دوست دشمن کی پہچان ہو گئی ہوگی۔ اگر وہ کاویلی آ جائیں تو میں ان کی خدمت کو حاضر ہوں۔ انہیں ساتھ لے کر بیدر پہنچوں گا اور قاسم برید کا کانٹا نکال دوں گا۔"

"آپ کو وہاں کا علم نہیں۔ سلطان محترم حرم سرا سے باہر قدم نہیں نکال سکتے کاویلی کیسے آئیں گے؟"

"انہیں کسی نہ کسی طرح کاویلی آنا ہوگا۔" عماد الملک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔ سلطان کو میری نیک تمنائیں پہنچا دینا۔"

یہ سوار کاویلی سے نکلا اور بیدر کی طرف چل دیا۔

عماد الملک کا پیغام سلطان تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات پر تیار تھا کہ کاویلی چلا جائے لیکن کس طرح چلا جائے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رات آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ عنبر اور قاسم برید کی کنیز نوشابہ سلطان محمود کے پاس بیٹھی تھی۔ نوشابہ کو عنبر نے اس بات پر رضامند کرلیا تھا کہ وہ بادشاہ کو حرم سرا سے باہر نکلنے میں مدد دے تو اسے بھاری رقم انعام میں مل سکتی ہے۔ وہ اس وقت بہت ڈری ہوئی تھی لیکن انعام کے لالچ نے اسے اس ناوقت سلطان کے پاس آنے پر مجبور کردیا تھا۔

''آپ کے چلے جانے کا راز امیر قاسم سے چھپا نہیں رہے گا۔ اس کے بعد کا ردِعمل کیا ہوگا۔ آپ اس پر بھی غور فرمالیں۔''

''میرے چلے جانے کے بعد یہاں کچھ بھی ہو مجھے اس سے سروکار نہیں۔''

''حضور میں یہ ڈرتی ہوں کہ کہیں مجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔''

کنیز نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ عنبر نے دخل دیا۔

''تم نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری ایک بہن کاویلی میں رہتی ہے۔''

''ہاں رہتی تو ہے۔''

''تم سلطان محترم کے ساتھ کاویلی چلی جاؤ۔ تمہیں اتنی دولت مل چکی ہوگی کہ آرام سے زندگی بسر کروگی۔ وہاں عماد الملک موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں ملازمت میں رکھ لیں گے۔''

اس پیشکش کو سن کر کنیز سوچ میں پڑ گئی۔ پھر جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔

''گستاخی معاف سلطان محترم۔ میرے ساتھ چلنے کے لیے آپ کو زنانہ کپڑے پہننے ہوں گے۔''

''وہ کس لیے؟''

''میں امیر قاسم سے کہوں گی میری بہن کاویلی سے آئی ہوئی تھی اسے چھوڑنے کاویلی جارہی ہوں۔ اسے چھوڑ کر، کچھ دن کاویلی میں گزار کر واپس آجاؤں گی۔ آپ میرے ساتھ میری بہن بن کر رتھ میں سوار ہوں گے تاکہ اگر پہرے داروں کی نظر پڑے تو انہیں شک نہ ہو۔''

سلطان کو تو کسی طرح یہاں سے نکلنا ہی تھا۔ اس نے اس تجویز کو تسلیم کرلیا۔ دوسرے دن کنیز کھانا دینے آئی تو زنانہ کپڑے ساتھ لیتی آئی۔

کنیز موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے امیر قاسم سے اجازت لی اور ایک رات سلطان کو زنانہ کپڑے پہنا کر حرم سرا سے باہر لے آئی۔ رتھ تیار کھڑا تھا۔ سلطان اس میں سوار ہوگیا۔ حرم سرا کے محافظوں نے احتیاط کے طور پر رتھ کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا اور مطمئن ہوکر پردہ گرادیا۔

یہ رتھ شہر سے باہر نکلا تو عنبر جو کسی جگہ چھپا ہوا تھا باہر نکل آیا۔ اندھیرا تو تھا۔ عنبر نے اپنے گھوڑے پر دوڑتے ہوئے رتھ بان کا سر اس کے تن سے جدا کردیا۔

''حضور میں اپنے ساتھ گھوڑے لے کر آیا ہوں۔'' عنبر نے کہا۔ ''آپ کسی ٹیلے کے پیچھے جاکر کپڑے تبدیل کرلیں۔ میں گھوڑے لے کر آتا ہوں۔''

سلطان اپنے کپڑے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایک ٹیلے کے پیچھے جاکر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ عنبر دو گھوڑے لے کر آگیا۔ ایک گھوڑا اس کا اپنا تھا جس پر وہ سوار تھا۔ تینوں گھوڑوں پر سوار ہوئے، رتھ اور رتھ بان کی لاش کو وہیں چھوڑا اور کاویلی کی طرف چل دیے۔

تینوں گھڑسوار ملک عماد الملک کے محل کے سامنے کھڑے تھے۔ دربان کچھ دن پہلے عنبر کو دیکھ چکے تھے اس لیے اندر جانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

عماد الملک نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ یہ قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ سلطان نے کبھی اس کے قتل کا سامان سجایا تھا لیکن سلطان کو ضرور پچھتاوا تھا۔

''ملک عماد الملک، تم وہ رات بھولے تو نہیں ہوگے جب دلاور حبشی نے تم پر حملہ کیا تھا۔''

''سلطان محترم، یہ وقت پرانی باتیں نکالنے کا نہیں۔ اس وقت تو یہ سوچنا ہے کہ قاسم برید سے کس طرح نمٹنا ہے۔ آپ کو یہاں بلانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ وہاں ہوتے اور میں بیدر پر حملہ آور ہوتا تو قاسم آپ کو ڈھال بنالیتا۔ آپ کی جان کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گا تو اردگرد کے حکمرانوں کو بھی اطمینان ہوگا ورنہ وہ تو یہی سمجھتے کہ میں بیدر پر قابض ہونے آیا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں میں فوجوں کا انتظام کرتا ہوں۔''

نوشابہ اپنی بہن کے گھر منتقل ہونا چاہتی تھی لیکن سلطان نے ملک عماد الملک کی خدمت میں پیش کردیا۔ عنبر بدستور سلطان کی خدمت میں مصروف رہا۔

ملک عماد الملک نے ایک بڑی فوج آراستہ کی اور محمود شاہ بہمنی کے ہمراہ قاسم برید سے مقابلے کے لیے نکلا۔

جب یہ لشکر بیدر کے نواح میں پہنچا اور قاسم برید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے بھی فوج کو منظم کیا اور عماد الملک سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔

جنگ کا وقت قریب آرہا تھا لیکن سلطان محمود ابھی

تک سوار ہوکر میدان میں نہیں آیا تھا۔ عماد الملک نے اپنے خاص غلام کو سلطان کے خیمے میں بھیجا۔

''حضور سوار ہوں کیونکہ جنگ کا وقت قریب ہے۔''

سلطان کی کنیزوں نے غلام کو بتایا کہ سلطان معظم اس وقت سر دھونے میں مشغول ہیں۔ سوار ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

غلام یہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔ جنگ کا وقت اور بادشاہ کو ایسا اطمینان۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

''جب جنگ کے وقت بادشاہ اتنا غافل ہو تو یہ بات یقیناً غفلت کی علامت ہے۔''

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا لیکن سلطان کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ گئی تھی۔ اسے ناگوار بھی لگا تھا۔ جب سوار ہوا تو اس نے وہ کیا جس کی اس سے توقع نہیں تھی۔ وہ عماد الملک کی طرف جانے کے بجائے قاسم برید کی فوج میں آگیا اور اس سے عماد الملک کے غلام کی شکایت کی۔

''مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں تمہیں چھوڑ کر عماد الملک کے پاس چلا گیا۔ وہ ابھی پچھلی باتیں بھولا نہیں ہے اس نے مجھے اپنے غلام کے ہاتھوں ذلیل کرایا۔ اس کا غلام مجھے وہ کچھ کہہ گیا جو کسی غلام کو زیب نہیں دیتا۔ وہ خود کچھ کہہ لیتا تو اس کا غصہ سمجھ کر مجھے قبول ہوتا لیکن اس نے غلام کو استعمال کیا۔ اب ہم دونوں مل کر عماد الملک کو مزہ چکھائیں گے۔''

عماد الملک نے اسے قاسم برید کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو سخت مایوس ہوا۔ اسی وقت اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دیا اور کاویلی کی طرف بڑھ گیا۔

اب وہ کس کے لیے لڑتا اور کیوں لڑتا۔

سلطان کا ملازم عنبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ بھی سلطان کا ساتھ چھوڑ کر عماد الملک کے ساتھ کاویلی چلا گیا۔

قاسم برید بھی اپنی فوجوں کو واپس لے آیا۔ کسی معرکہ آرائی کے بغیر یہ قضیہ طے ہوگیا۔

قاسم برید بیدر واپسی تک سلطان سے بڑی دلفریب باتیں کرتا رہا لیکن بیدر پہنچتے ہی اس نے سلطان کو اس کے مکان میں قید کردیا۔ اب اس پر پہلے سے بھی زیادہ کڑی پابندیاں تھیں۔

عماد الملک نے کاویلی پہنچ کر اپنے ایک عزیز کو احمد نظام الملک کے پاس بھیجا اور یہ پیغام دیا۔

''امیر برید کی اصل خواہش یہ ہے کہ یوسف عادل کو ختم کرکے بیجاپور پر خود قابض ہوجائے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک عادل اور برید ایک ہی جیسے ہیں لیکن برید کی نیت ہم پر واضح ہوچکی ہے۔

اس نے محمود شاہ کو شاہ شطرنج بنا کر بہمنی خزانے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ ہمارے خلاف جو چاہتا ہے کرتا ہے لیکن ہم اس کے سامنے کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر وہ بیجاپور پر قابض ہوگیا تو ہماری اولاد کا دکن میں رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ رہا یوسف عادل شاہ کا معاملہ۔ اس سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ آپ کو تو اب یہ چاہیے کہ برید کے سر سے ہاتھ اٹھالیں بلکہ اگر وہ بیجاپور کی طرف بڑھتا ہے تو ہمیں اس کی راہ میں مزاحم ہونا چاہیے۔

میں نے کوشش کی تھی کہ میں برید کا خاتمہ کردوں اور میں ایسا کر گزرتا لیکن محمود شاہ نے بزدلی دکھائی اور پھر وہ برید سے جا کر مل گیا۔ اسے بھی اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اگر برید آپ سے مدد کی درخواست کرے تو اسے مایوس کرنا آپ کا فرض ہے۔''

نظام البحری نے اس پیغام کا مثبت جواب دیا بلکہ عادل شاہ کو بھی خط لکھ دیا کہ وہ اس طرف سے مطمئن رہے۔

تمام حالات عادل شاہ کے حق میں جارہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائے گا۔ برید کا زور بھی ٹوٹ جائے گا کیونکہ اب کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔

جنگوں سے نجات ملی تو یوسف عادل شاہ نے ملک کی بہبود کی طرف توجہ دی۔ اس نے اپنے دربار کی آراستگی کے لیے ایران، توران، عرب اور روم جیسے ممالک میں خطوط بھیج کر وہاں کے علما، اہل ہنر، اہل سیف اور اعلیٰ قابلیتوں کے لوگوں کو بیجاپور بلوایا اور ایسی قدردانی کی کہ ان سب نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا۔

اس کا دربار موسیقی دانوں سے آراستہ ہوا۔ وہ خود موسیقی پر دسترس رکھتا تھا۔ عود کو بڑی اچھی طرح بجاتا تھا۔ عیش و عشرت پر جان چھڑکتا تھا لیکن ہمیشہ ایسے مشاغل میں کھویا نہ رہتا تھا بلکہ امورِ سلطنت کے فرائض انجام دینے میں بھی بڑی محنت کرتا تھا۔

دلیری اور سخاوت میں بے مثال تھا۔

آخری عمر میں وہ بیجاپور کا ہوکر رہ گیا تھا۔ انتقال تک وہ صرف دو مرتبہ بیجاپور سے باہر نکلا۔ ایک مرتبہ سیر و شکار کی غرض سے ''اندراپور'' گیا اور تین مہینے تک عیش و عشرت میں بسر کرکے بیجاپور واپس آگیا۔

915 ہجری کے آخر میں کچھ عیسائی اچانک بندر گوہ پہنچ گئے۔ انہوں نے بندرگاہ کے حاکم کو غافل پاکر وہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بے شمار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بندرگاہ پر قبضہ کرلیا۔

یوسف کو اطلاع ہوئی تو اس نے دو ہزار سواروں کو ساتھ لیا۔ پانچ روز کی مسافت طے کرکے بندرکوہ پہنچ گیا۔ عیسائیوں کو یقین نہیں تھا کہ مسلمانوں کے قتل کا بدلہ لینے کوئی آ بھی سکتا ہے۔ جشن فتح ابھی تک جاری تھا۔ رقص و سرود کی محفلیں سجی ہوئی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

یوسف نے جب یہ حال دیکھا تو رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رات کے ڈھلتے ڈھلتے یہ محفلیں مزید رنگ پر آگئیں۔ رقص کرتی ہوئی حسیناؤں نے سب کے حواس معطل کر دیے تھے۔ جب ہاتھوں میں جام اٹھانے کی طاقت بھی نہ رہی تو ادھر ادھر لڑھک گئے۔ حسینائیں ان کے پہلو میں تھیں۔ پھر انہیں کس چیز کی پروا ہوتی۔

جب قلعے میں برپا شور تھم گیا اور یوسف کو یقین ہوگیا کہ سب غافل ہیں تو اس نے قلعے پر حملے کا حکم دے دیا۔ دربانوں میں سے کچھ تو ناؤنوش میں مشغول تھے، کچھ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ مسلمانوں نے یلغار کی تو انہیں ہتھیار اٹھانے کا بھی موقع نہ مل سکا۔

دربانوں کو قتل کرنے کے بعد مسلمان قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ یہاں بھی حال کچھ مختلف نہیں تھا۔ عیسائی فوجی عشرت کی شب کاٹنے کے بعد ابھی سوئے تھے۔ لڑنے کا تو کوئی موقع ہی نہیں تھا، انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بھاگنے کون دیتا تھا۔ اکثر مارے گئے جو بچ گئے وہ پکڑے گئے۔ کچھ فرار بھی ہوگئے۔

یوسف عادل شاہ نے قلعے پر قبضہ کرلیا۔

یہ اس کی زندگی کی آخری مہم ثابت ہوئی۔ بندرکوہ سے واپس آیا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔ قیاس یہی کیا جارہا تھا کہ بندرکوہ کی مرطوب آب و ہوا نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا ہے۔ ابتدا میں کوئی توجہ نہیں کی لیکن جب بیماری نے طول پکڑا تو فکر لاحق ہوئی۔ علاج ہوتا رہا لیکن حالت روز بہ روز بگڑتی گئی۔

''میں نے کتنی تگ و دو کے بعد یہ سلطنت جمع کی ہے۔ میرے بعد اسے کون قائم رکھے گا؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جو اسے فکرمند کررہا تھا۔ اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ نظام سلطنت سنبھالنے کے لائق نہیں تھا۔ اس پرآشوب دور میں کسی امیر پر کامل بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ کئی نام ذہن میں آئے اور چلے گئے، بالآخر کمال خاں کے نام پر اس کے دل نے گواہی دی۔ یہ شخص ایک زمانے میں سلطان محمود شاہ بہمنی کے لائق ترین امرا میں شامل تھا۔ یوسف عادل شاہ نے اسے بیجاپور بلا کر اعلیٰ عہدوں پر متعین کیا۔ یہاں تک کہ اسے وکیل سلطنت مقرر کردیا۔ کمال خاں نے بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مختلف جنگوں میں اس نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اس کی عزت میں بے حد اضافہ کردیا تھا۔

یوسف عادل شاہ نے کمال خاں کو طلب کیا۔

''کمال خاں! اسمٰعیل عادل شاہ ابھی سلطنت سنبھالنے کے لائق نہیں اور میری زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں آپ کو وکیل سلطنت مقرر کردوں تاکہ اسمٰعیل کے جوان ہونے تک سلطنت کا کاروبار چلتا رہے۔ قدم قدم پر دشمن ہیں۔ سلطنت کی حفاظت کے لیے آپ جیسے دلیر آدمی کی ضرورت ہے۔ کیا میں آپ پر بھروسا کرسکتا ہوں؟''

''مجھے آپ کے حکم سے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی لیکن ضروری تو نہیں کہ آپ کے وزرا میرے احکام کی تعمیل کریں۔''

''اس کا بندوبست میں آپ کے سامنے کیے دیتا ہوں۔''

عادل شاہ نے اپنے وزرا اور دیگر امرا کو طلب کیا اور تاکید کی کہ وہ سب کمال خاں کے ساتھ مل جل کر کام کریں۔

''آپ لوگ اس حکم کو مرنے والے کی وصیت سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوں گے۔''

''خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اگر ایسا وقت آیا تو ہم آپ کی وصیت پر پوری طرح عمل کریں گے۔''

اس انتظام کے چند روز بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

اس کی وصیت کے مطابق اس کے جسد خاکی کو قصبہ کرگی میں شیخ چندا نامی بزرگ کے پہلو میں دفن کیا گیا، یوسف عادل کو ان بزرگ سے دلی عقیدت تھی۔

مورخین کے مطابق یوسف عادل شاہ نے بیس برس دو مہینے حکومت کرنے کے بعد 916 ہجری میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ماخذات
تاریخ فرشتہ، ترجمہ مشفق خواجہ۔ طبقات اکبری، ترجمہ ایوب قادری۔
بساتین السلاطین، مرزا ابراہیم زبیری

سرپرائز

احمد اقبال

ماں... بند مٹھی کے مانند قدم قدم پر اپنے بچوں کو سرپرائز دیتی ہے۔ کبھی انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتی ہے اور کبھی انگلی اٹھا کر دور کا رستہ دکھاتی ہے مگر... آخر میں جانے کیوں بے دست و پا تنہا رہ جاتی ہے کہ چاہتے ہوئے بھی وہ فاصلوں کو ختم نہیں کرسکتی۔ اس بار زندگی کے آخری موڑ پر اس نے بھی اپنی ماں کو سرپرائز دینا چاہا لیکن وہ ماں تھی جس نے اسے آگے بڑھنا سکھایا تھا پھر وہ خود کیسے پیچھے رہ جاتی۔

ماؤں کے عالمی دن پر دلوں میں چٹکی لیتی ایک پراثر کہانی

برطانوی شہری ہوجانے کی اطلاع جونی کے لیے ایک سرپرائز ہی تھی۔ ایک ایسا سرپرائز جو برسوں کی کوشش، امید اور انتظار کے بعد اپنی تمام تر سنسنی خیزی کھوچکا تھا۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا...... گیارہ سال تک اپنی تمام جائز و ناجائز جدوجہد کی ناکامی نے بالآخر جونی کو ناامیدی کی اس انتہا تک پہنچا دیا تھا جہاں مایوس ہوکے اس نے کوشش بھی ترک کردی تھی اور دعا مانگنا تک چھوڑ دیا تھا...... اس نے خود اپنے آپ سے بھی ایک سمجھوتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرلیا تھا کہ جانو پتر...... بس اب بھول جا سہالہ کو اور سہالہ میں اپنے اس پرانے آبائی دو کمروں والے چھوٹے سے کچے گھر کو جس میں اب اور کوئی نہیں...... سوائے ایک پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھی جھریوں زدہ چہرے والی عورت کے جواب مایوسی کے درد کو دل میں چھپائے اپنی بے نور ہوتی آنکھوں کے ساتھ اپنے مدفن کی سمت بڑھتی جارہی ہے لیکن مہینے میں ایک دو بار اسی حوصلہ دینے والی ماما بھری آواز میں اسے اُمید کی نوید سناتی رہتی ہے...... حوصلہ رکھ جانو پتر...... ہر نماز کے بعد میں تیرے لیے دعا کرتی ہوں...... اور کبھی کسی معصوم بے ضرر جھوٹ سے اس کو خوش کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی...... تیرا کام اب ہونے ہی والا ہے...... کل جمعرات تھی نا...... میں تیرے ابے کی قبر پر چراغ جلا کے لوٹی تو دیکھا، وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا...... کہنے لگا کہ نماز کے لیے جارہا ہوں مسجد...... مبارک ہو نیک بختے...... اس عید پر تیرا جانو گھر آرہا ہے، وہ غلط تو نہیں کہتا تھا۔

اور طویل صبر اور انتظار کے بعد بالآخر وہ دن آگیا تھا جب عید پر جانی اپنے گھر جاسکتا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا...... اس کے لیے برطانوی شہریت مل جانے کی خبر پر یقین کرنا مشکل تھا۔ امیگریشن والوں کی طرف سے فون کال موصول ہوجانے کے باوجود وہ بے یقینی میں گرفتار رہا تھا...... یہ مذاق بھی ہوسکتا تھا۔ ایسا مذاق گزشتہ گیارہ برسوں میں اس کے ساتھ اپنے پرائے سب ہی بڑی بے رحمی سے کرتے رہے تھے۔ اس کے خیالات کے جامد تالاب کی سطح پر ایک پتھر کے گرنے سے چند لہریں ضرور پھیلیں۔ کچھ دیر کے لیے وہ فرسودہ خوابوں کی تعبیر میں ہی گم رہا۔ پھر گورے باس کی کرخت آواز نے اسے حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا۔

''جونی یو ڈرٹی لیزی ڈاگ...... تم پھر وہی خواب دیکھ رہے ہو؟ پھر سے بہانہ کرو گے کہ رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکے تھے...... حرام خور پاکی......'' اور حسبِ معمول جونی نے احساسِ ذلت کے بغیر صرف ایک آہ بھر کے اپنی ساری توجہ پھر کام پر مرکوز کردی تھی۔

شام کو پب میں اس نے اپنے ایک دوست اور رازدار ہمت سنگھ کو بھی کچھ نہیں بتایا اور نہ اپنی ہم وطن ویٹرس عظمت النسا عرف ''ایزی'' کو جس کے ساتھ جونی کے مراسم ابھی تک صرف دوستانہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک تھے اور فرصت کے وقت میں...... محاورے کے مطابق، ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر رو لیتے تھے۔ انتہا یہ تھی کہ اس نے واپس گھر جا کے اس کال کے بارے میں فوراً اپنی برطانوی شریکِ حیات جینی سے بھی کوئی بات نہیں کی حالانکہ یہ اس سے شادی کا انعام ہی تھا کہ بالآخر وہ برطانوی شہری تسلیم کرلیا گیا تھا۔

جینی سے اس کی شادی کو بھی اب تیسرا سال تھا۔ ان کا پہلا بچہ ایڈی اب ڈیڑھ سال کا تھا۔ چابی کے گڈے کی طرح اپنے پیروں پر ادھر سے اُدھر لڑھکتا پھرتا تھا۔ اس کا رنگ روپ اور نین نقش سب اپنی ماں جیسے خالص ولایتی تھے اور جونی کو اس بارے میں ایک فیصد شبہ نہ تھا کہ ایڈی کا باپ وہ خود ہی ہے۔

کسی روایتی...... دل میں جھانک لینے والی خالص مشرقی بیوی کی طرح رات کے ایک پُرسکون لمحے میں جینی نے کہا۔ ''تم کسی سوچ میں گم ہو...... میں شام سے دیکھ رہی ہوں۔''

جونی نے سرسری انداز میں اسے ٹالنا چاہا۔ ''نہیں...... ایسی کوئی خاص بات نہیں۔''

''بات تو ہے نا...... مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو......؟''

''آج پھر کسی کا فون آیا تھا۔ کوئی عورت کہہ رہی تھی کہ برطانوی حکومت نے میری شہریت کی درخواست قبول کرلی ہے۔ میں تصدیق اور ضروری کاغذات کے ساتھ آجاؤں۔''

وہ اٹھ بیٹھی...... ''پھر؟ تم گئے تھے......؟''

''کسی نے مذاق کیا ہوگا جینی...... کچھ لوگوں کو اس میں بھی مزہ آتا ہے۔''

''دیکھو یہ ناممکن نہیں ہے...... تم کل جاؤ گے...... ورنہ میں معلوم کروں گی۔''

اگلے دن جب امیگریشن آفس سے تصدیق ہوگئی کہ اسے برطانوی شہری تسلیم کرلیا ہے تو جونی کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے راکٹ پر بٹھا کے خلا میں فائر کردیا ہے۔ جب اسے یقین آگیا کہ یہ مذاق ہے اور نہ فریب خیال تو وہ خواب میں چلنے والے کی طرح باہر آیا...... دنیا اس کے لیے ایک دم بدل گئی تھی۔ یہ دنیا وہ نہیں تھی جس میں اس کے گیارہ سال ایک طوق غلامی کے ساتھ گزرے تھے۔ اب وہ آزاد تھا، معزز تھا، ہر گوری چمڑی والے کے برابر شہری حقوق کا مالک تھا۔ وہ کسی احساس جرم یا خوف کے بغیر پولیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا تھا۔ کہیں بھی آجاسکتا تھا۔ انگریزی تو اس نے برسوں پہلے ہی ایسی سیکھ لی تھی کہ بہت سے گورے اس کے لب و لہجے سے حسد محسوس کرتے تھے۔ کالا وہ کبھی نہ تھا۔ اس کے صاف، گندمی رنگ پر حسینانِ افرنگ ہمیشہ فدا ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ

کچھ نہ تھا، صرف ایک غیر قانونی تارک وطن......

لیکن اب اس کے خوابوں کو تعبیر ملنے کا دن آگیا تھا...... وہ لوٹ کے گھر جاسکتا تھا۔

بچپن کا جانو پاسپورٹ میں جان محمد عباسی ہوگیا تھا اور سارے پاپڑ بیل کے ویزے کے بغیر ولایت پہنچنے میں کامیاب رہا تھا...... وہ سہالہ سے آیا تھا جو راولپنڈی کے مضافات کا ایک گاؤں تھا۔ ہر نووارد کی طرح وہ بھی بہت پُراُمید تھا کہ کچھ عرصہ لاکھوں ہم وطن پاکستانیوں کی آبادی میں خاموشی سے گم رہنے کے بعد وہ کوشش کرے گا تو کسی نہ کسی طرح برطانوی شہریت بھی حاصل کرہی لے گا۔ اس کے قیام کو قانون کی نظر سے اوجھل رکھنے میں وہ سب معاون تھے جو خود ہی اسی طرح برسوں پہلے وارد ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ اس غیر قانونی تارک وطن کی حیثیت کے اتنے عادی ہوگئے تھے کہ انہوں نے شہریت کے حصول کی کوشش اور امید بھی ترک کردی تھی۔ کچھ زیادہ مستقل مزاج تھے کہ ہر ذریعہ آزماتے رہتے تھے اور مایوس نہیں ہوئے تھے۔

قیام کے ابتدائی دور میں اسے بڑی مشکلات کا سامنا رہا...... پرانے پاپی اسے مشورے دیتے رہے۔ کام رات کو کرو...... دن سو کے گزارو...... اپنے پرائے کسی جھگڑے میں مت پڑو، کسی گورے سے مت الجھو، وہ سب کے مشورے پر عمل کرتا رہا۔ دن میں اسے جو کام ملتا تھا مشکل ہوتا تھا اور گندا...... وہ سارے کام ایشیائی ہم وطن کرتے تھے جو گوروں کے مزاج اور طبع نازک پر گراں گزرتے...... یہ جسمانی مشقت کے کام خطرناک بھی ہوتے تھے...... انہیں یہ کام اس لیے بھی مل جاتے تھے کہ قواعد و ضوابط کے مطابق ملنے والا معاوضہ لے کر بھی گورے یہ کام مجبوری میں کرتے تھے تو سو نخروں کے ساتھ...... گالیاں بالکل نہیں سنتے تھے اور ملازمت کی شرائط اور ماحول ذرا بھی خلاف ضابطہ ہوتا تو فوراً ہر جانے کا کیس بھی کردیتے تھے...... غیر ملکی تارکین مجبور تھے۔ ان کو نصف معاوضہ دیا جاسکتا تھا اور ان کا ہر طرح سے استحصال بھی ممکن تھا۔

برطانیہ کے ایک معزز قانونی شہری کا درجہ حاصل کرنا اب کتنا کٹھن مرحلہ بن گیا ہے اس کا اندازہ جانو کو رفتہ رفتہ ہوا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے بہت سی الف لیلوی داستانیں سن رکھی تھیں کہ اگر پاؤنڈ، ڈالر یا ریال کی سرزمین پر قدم رکھنے والوں پر دولت کی دیوی مہربان ہوتی تو جو یہاں دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے خوار تھے اور دھکے یا گالیاں کھانے کے سوا جن کے مقدر میں کچھ نہ تھا وہ قارون کے خزانے کے مالک ہوتے ایک ماں کے سوا کوئی نہ تھا جسے وہ اپنے پاس بلانے کے لیے تڑپتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کے قدم جم گئے اور اس نے حالات سے یا حالات نے اس سے سمجھوتا کرلیا۔ لندن میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو چٹے ان پڑھ تھے اور ان کی دوسری نسل تو خیر پڑھ لکھ گئی تھی مگر وہ آج بھی انگریزی نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھتے تھے۔ بولتے اتنی روانی سے تھے کہ بعض اوقات خود انگریز نہیں سمجھ پاتے تھے...... جانو خیر سے میٹرک پاس تھا لیکن کچھ تو اپنی عمر کے دوسرے نوجوانوں کے مقابلے میں زیادہ اونچی اڑان رکھتا تھا اور کچھ زمانہ شناس بھی تھا، اسے موقعے سے فائدہ اٹھانا اور لوگوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس میں وہ جائز ناجائز کو ملحوظ رکھنے کا قائل نہ تھا۔ وہ اچھا نقال یا ایکٹر بھی تھا۔

یہ صلاحیت لندن میں اس کے بہت کام آئی۔ وہ بالکل انگریزوں کے لب و لہجے میں بات کرسکتا تھا اور لوگوں کو متاثر کرسکتا تھا...... اسے ایک کے بعد دوسری بہتر ملازمت کا موقع ملتا رہا اور ایسی نوبت کبھی نہ آئی کہ اس کی قانونی حیثیت نے اس کے لیے مسئلہ کھڑا کیا ہو...... پولیس کا غیر قانونی تارکین وطن کے ٹھکانوں پر یا ان کی جائے ملازمت پر چھاپے مارنا ایک عام سی بات تھی لیکن وہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا چھٹی حس کہ کئی بار وہ بروقت بچ کے نکل گیا۔ پکڑے جانے والوں کو پولیس نے قانونی کارروائی کے بعد ڈی پورٹ کردیا اور وہ اپنی ساری حسرتیں اور سارے خواب ادھورے لیے جہاں سے آئے تھے وہیں لوٹ گئے۔

جانو نے کئی شہر بدلے اور کئی کام کیے۔ آہستہ آہستہ اس کی آمدنی میں اضافہ ہوا...... گویا کچھ خوش بختی کا سایہ بھی رہا...... دو بار اس نے ریس میں انعام جیتا جو لاکھوں پاؤنڈز تو نہیں تھا مگر ایک ہزار پاؤنڈز بھی معمولی رقم نہ تھی۔ تنہائی کا شکار وہ کبھی نہیں ہوا...... اپنی ہم وطن لڑکیاں تو اسے گھاس نہیں ڈالتی تھیں لیکن مکھن ملائی جیسی خالص ولایتی لڑکیوں اور افریقا کی کالے توے جیسے رنگ والی لڑکیوں کو جانو کا لائٹ براؤن گندمی رنگ بڑا پُرکشش محسوس ہوتا تھا۔ قد کاٹھ کا وہ پہلے بھی اچھا تھا، لندن میں وہ باڈی بلڈنگ کرتا رہا اور لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہوتی رہیں۔ یہ سب نچلے طبقے کی وہ لڑکیاں تھیں جو کسی پب میں ملتی تھیں یا ریسٹورنٹ میں ویٹرس ہوتی تھیں...... جانو نے چند خوشحال اور اچھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خاندانوں کی ناآسودہ خواتین پر بھی ڈورے ڈالے اور ان سے تھوڑی بہت رقم اینٹھنے میں بھی کامیاب رہا۔ تاہم اس نے بلیک میل کسی کو نہیں کیا۔ وہ اپنی خطرناک حد تک کمزور قانونی پوزیشن سے ڈرتا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ شہریت کے حصول سے پہلے ہی اسے بھی پیک کر کے واپس سہالہ ارسال کر دیا جائے۔

لیکن شہریت کے حصول کے لیے اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوتی رہیں۔ راستہ دکھانے والوں نے اسے مختلف راستے دکھائے اور اس سے اپنی فیسیں بھی وصول کیں لیکن ہر راستے کا انجام ناکامی کے کسی خطرناک موڑ پر ہوا...... ایک آخری طریقہ جو وہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا کسی سے پیپر میرج کا تھا، وہ کسی برطانوی عورت کا شوہر بن جائے۔ اوّل تو ایسی کوئی ملی نہیں جو اس کی محبت میں گرفتار ہو کے یہ کارِ خیر کرتی...... اس کے ساتھ شب و روز بتانے والی شادی کے نام پر ہی غائب ہو جاتی تھیں، اس معاشرے میں شادی کا روگ پالنے والے ویسے بھی کم ہوتے جا رہے تھے، شادی کے مزے لوٹنے پر کوئی قانونی معاشرتی یا اخلاقی پابندی نہیں تھی، پھر ذمے داریوں کا طوق گلے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی، بچے ضروری ہوں تو شادی کے بغیر بھی مل جاتے ہیں ورنہ یہ روگ پالنا اپنی خوشیوں کی قربانی دینے اور زندگی کو عذاب بنانے کے مترادف ہے...... نئی نسل میں یہ سوچ عام ہوتی جا رہی تھی اور اس کا اثر پورے معاشرے پر پڑ رہا تھا۔

تاہم کچھ پروفیشنل بیویاں ایک کاروباری مفاد میں سب کو دستیاب تھیں۔ وہ ہر ضرورت مند کی قانونی بیوی کا کردار ادا کرنے کا معاوضہ لیتی تھیں اور شوہر کو شہری حقوق دلوانے کے بعد طے شدہ معاوضہ وصول کر کے الگ ہو جاتی تھیں۔ برطانوی عدالت کی قانونی شادی میں عورت اور مرد کی باہمی رضامندی پہلی شرط ہے۔ نہ ان کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے اور نہ ہم عمر...... بس دونوں کی نبض چل رہی ہو...... چنانچہ صورت اور اعمال سے قطع نظر وہ صرف عورتیں تھیں جن کے لیے یہ ذریعۂ آمدنی تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرے کی زوجیت میں کتنی بار رہتی ہیں، اس پر بھی پابندی کوئی نہ تھی، وہ دس بیس یا اس سے زیادہ شادیاں کریں تو قانون اعتراض کرنے والا کون...... میاں بیوی کا ازدواجی تعلق بھی غیر ضروری تھا، لیکن اب ایسی پروفیشنل بیویاں خطرناک ہو گئی تھیں، شوہر کو شہریت دلوانے اور طے شدہ معاوضہ وصول کرنے کے بعد بھی وہ طلاق دینے سے انکار کر دیتی تھیں۔ وہاں طلاق لینا یا دینا یک طرفہ مردانہ معاملہ نہیں...... وجہ نہ ہو تو بیوی تمام عمر کے نان نفقے کی رقم اور نصف اثاثے وصول کر سکتی ہے...... اب بہت سے پیپر میرج کرنے والے پھنس جاتے تھے اور خوب بلیک میل ہوتے تھے۔

پرانے زخم خوردہ شوہروں نے جونی کو کسی خرانٹ دسیوں بار کی بیوی کے جال میں پھنسنے سے خبردار کر دیا تھا اور وہ خود بھی محتاط تھا لیکن اس کے باوجود اپنے ہی ہم وطن نے اسے ایک عورت سے ملوا دیا جو بہت شریف، ضرورت مند اور بااصول تھی اور اس کا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ ضرور اس شخص نے بھی شکار پھانس کرانے کی قیمت وصول کی ہوگی۔ دیکھنے میں بھی وہ عورت قابلِ برداشت تھی۔ جونی اس کے چکر میں پڑ جاتا تو انجام عبرت ناک ہوتا لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اس عورت کے ایک سابق شوہر نے کسی جان پہچان کے بغیر اسے اپنے عبرت ناک انجام سے آگاہ کر دیا، محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر...... اور اس کی داستانِ عبرت سن کے جونی روپوش ہو گیا، ایسی شوہریت سے ملنے والی شہریت کے مقابلے میں غیر قانونی تارکِ وطن رہنا لاکھ درجے بہتر تھا۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے اور جونی کے لیے برطانوی شہری کہلانے کی حسرت روزِ اوّل کی طرح حسرت ہی رہی...... پہلے سال کے اختتام پر وہ مالی طور پر کچھ مستحکم ہو گیا تھا۔ ماں کا فون مہینے میں ایک دو بار آ جاتا تھا، وہ اپنے اکیلے پن کے آزار کا اظہار کرتی تھی تو جانو کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ وہ اسے مسلسل تسلی دیتا رہا کہ بس اب تھوڑے دن کی بات ہے ماں...... پھر میں تمہیں بلا لوں گا۔ یہ ایک خواہش تھی جس کی خلش وہ سوتے جاگتے محسوس کرتا تھا۔

ایک سال بعد اس نے کہا۔ ”ماں...... میں تمہیں کچھ پیسے بھیج رہا ہوں۔“

”پیسے؟ کس لیے...... میں کیا کروں گی پیسوں کا جانو پتر۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”تم کیوں دعا دیتی تھیں کہ اللہ مجھے پٹواری بنائے، عیش کی زندگی کے لیے نا......“

”نہیں پتر...... مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ تو پیسے جوڑ کے رکھ...... اور اس عید پر آ جا......“

”عید پر......؟“ وہ کہتے کہتے رک گیا کہ یہ ناممکن ہے۔ ”اچھا...... کوشش کروں گا ماں...... وعدہ نہیں کرتا۔“

وقت جیسے جیسے گزرتا گیا جونی کے بہانے اور جھوٹی تسلی والے وعدے کھوکھلے ہوتے چلے گئے۔ ماں کو کسی نے اس کی مجبوری بتا دی یا اس نے خود ہی ماتا کی چھٹی حس کی

مدد سے جان لیا کہ اس کا جانو پتر جھوٹا نہیں مجبور ہے...... وہ آنا چاہتا ہے لیکن آ نہیں سکتا۔ اسے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے مگر بلا نہیں سکتا۔ اس کے فون باقاعدگی سے موصول ہوتے رہے لیکن اس کے اصرار میں کمی آتی چلی گئی۔ الٹا وہ اسے تسلی دینے لگی کہ پریشان نہ ہو، اللہ پر بھروسا رکھ...... بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی اپنی زندگی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ وہ پندرہ دن میں ایک بار ماں کو فون کرنے کا وعدہ بھی بھول جاتا تھا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ماں کو فون کرنے کے لیے اپنے رشتے کے ایک بھائی کے گھر جانا پڑتا تھا اور وہ ٹرنک کال کے پیسے تو نہیں لیتے تھے مگر یہ احسان بھی ناگواری سے اور بادلِ ناخواستہ کرتے تھے۔ بعد میں خود ماں نے کہہ دیا کہ وہ فون نہ کرے۔ اس کے مامے کی وہٹی کو ناگوار گزرتا ہے...... جانو کی ماں کو سندیسہ بھیجنا کہ اس کے ولایتی پتر کی کال آئے گی...... وہ آ جائے...... کال میں بعض اوقات دیر ہو جاتی تھی تو ان کے گھر میں بن بلائے مہمان کی طرح بیٹھے رہنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا، وہ خود ہی پندرہ بیس دن میں ایک بار خیر دین دی ہٹی جا کے اور نقد پیسے دے کر بات کر لے گی۔

ماں کی عمر کے ساتھ ساتھ امید کی روشنی بھی ختم ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے مایوسی کا اندھیرا اپھیل رہا تھا۔ جانو کو اب ایسا لگتا تھا کہ اسے کبھی برطانوی شہریت نہیں ملے گی۔ وہ کبھی لوٹ کے ماں کے پاس سہالہ نہیں جا سکے گا اور کبھی اسے اپنے پاس نہیں بلا سکے گا۔ اب وہ ایک جائز فخر کے ساتھ سب کو بتاتا تھا کہ پاکستان کے کیپٹل اسلام آباد کا رہنے والا ہے جہاں اس کا آبائی گھر بھی ہے۔ سہالہ جو راولپنڈی کے مضافات کا ایک پنڈ تھا اب فیڈرل کیپٹل کے علاقے میں شامل تھا اور ایک جدید ترقی یافتہ شہری علاقہ بن چکا تھا۔ اس نے دیکھا کچھ نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا گھر اب اسلام آباد ایکسپریس وے سے محض دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ وہاں چار پیٹرول پمپ ہیں۔ دو بینک، کئی تھری اسٹار ریسٹورنٹ اور ہوٹل...... وہ ایک ترقی یافتہ شہر کا حصہ نظر آتا ہے۔

راولپنڈی میں اسلام آباد سے آنے والے ہر دوست آشنا سے وہ کرید کرید کر اس علاقے کی خوب صورتی اور ترقی کی کہانیاں بڑے اشتیاق سے سنتا تھا۔ چھ سال قبل سہالہ سے آنے والا اس کا ایک دوست جونی کے گھر کی تصویر بھی لے آیا تھا جس میں اس کی ماں اور بہن ایک ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اس کی بڑی بہن بھی، اب جوانی کی سرحد سے کافی آگے نکل گئی تھی۔ اس کے اپنے بچے بلوغت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اب بہت زیادہ اپنی ماں جیسی نظر آنے لگی تھی۔ جونی نے اس تصویر کو انلارج کرا کے فریم میں دیوار پر ٹانگ رکھا تھا اور اپنے گھر آنے والوں کو ان کے بارے میں بتاتے ہوئے ہمیشہ جذباتی ہو جاتا تھا۔ پھر آنکھوں میں اشتیاق اور آنسوؤں کی چمک کے ساتھ وہ بڑے یقین سے کہتا تھا۔ ”یار بس تھوڑے دن کی بات ہے، انشاءاللہ میں آنے والی سردیوں کی عید اپنے گھر مناؤں گا۔ جنوری میں برف تو خیر ادھر نہیں پڑتی مگر گھاس پر شبنم جم جاتی ہے تو پیروں کے نیچے شیشے کی کرچیوں کی طرح بولتی ہے اور منہ سے دھواں نکلتا ہے...... اور یار جب خزاں کے بعد بہار آتی ہے نا تو مت پوچھو......“

بہت کم سننے والے اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اس علاقے کے رہنے والوں کے لیے نہ یہ باتیں نئی تھیں اور نہ دلچسپ۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے کوئی لندن کے موسم کے بارے میں لندن کے باسی کو بتانے لگے...... اس کی ماں کے فون اب بھی باقاعدگی سے موصول ہوتے تھے۔ بہن صرف عید بقرعید اسے یاد کرتی تھی۔ ان دونوں کی آوازیں اتنی ملتی تھیں کہ خود جونی دھوکا کھا جاتا تھا، دو چار سال کے بعد ماں نے اس خواہش کا اظہار ضرور کیا تھا کہ وہ آ جائے تو اس کی شادی کر دے اور مرنے سے پہلے پوتے پوتی کو کھلانے کی حسرت بھی پوری ہو جائے۔ اس کی نسبت کسی سے طے نہ تھی کیونکہ عزیز و اقارب سب جانو کی طرح ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ بہن بعد میں بھی کہتی رہی لیکن اسے جانو اپنی مجبوری بتاتا رہا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ ماں کو کچھ نہ بتائے...... بالآخر وہ بھی خاموش ہو گئی۔

جینی کے پُرکشش وجود سے لطف و انبساط کا آخری لمحہ کشید کر لینے کے بعد وہ سکون کی اس نیند میں گم ہو جاتا تھا جو بے ہوشی سے کم نہ ہوتی تھی لیکن آج وہ سو گئی تھی اور جونی پھر آنے والے وقت کی فلم کے مناظر میں گم تھا۔ اس وقت کو دیکھ رہا تھا جب اچانک وہ ماں کے سامنے پہنچ کے کہے گا۔

”ماں...... میں جانو ہوں...... اور یہ ہے تیری بہو...... جینی...... اور یہ تیرا پوتا...... ایڈی......“ اور ماں بے ہوش نہ ہوئی تو اس سرپرائز سے سکتے میں کھڑی پلکیں جھپکائے بغیر سب دیکھتی رہے گی۔ پھر جب اسے اعتبار آ جائے گا کہ جو کچھ اس کے سامنے ہے نہ خواب ہے نہ فریبِ نظر...... تو ...... ہاں...... اس کے بعد وہ رو رو کے بے ہوش ہو جائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گی۔اس کے لیے جانو کی اچانک آمد جتنا بڑا سرپرائز ہوگی اس سے بڑا یہ کہ اس نے ایک فرنگی میم سے شادی کرلی ہے جو مسلمان بھی نہیں ہوئی اور اس کا پوتا بھی کرسچن ہے، وہ اپنی مرضی سے کہیں بھی شادی کرتا، ماں کو منظور ہوتا مگر یہ صدمہ اس سے کیسے برداشت ہوگا اس کا یقین ایمان، سب خاک میں مل جائے گا......

جانو کے لیے یہ شاید ناممکن ہوگا کہ وہ ماں کو اور اپنی بہن کو قائل کرسکے کہ جینی ہمہ صفت لڑکی تھی...... ان تمام صفات سے مزین تھی جو ایک مثالی مشرقی بیوی کا حسن ہوتی ہیں...... شاید اس سے اچھی شریک حیات مل ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اس کا یقین تھا...... رہی ایمان کی...... تو وہ خدا اور بندے کا معاملہ ہے، اہل کتاب سے رشتہ حرام تو نہیں...... لیکن کون سنے گا اس کی دلیل...... اس علاقے میں وہ کئی پشتوں سے آباد تھے...... آباواجداد کی عزت کے منہ پر ایسی کالک آج تک کسی بیٹے نے نہیں ملی تھی۔

پھر؟...... کیا وہ اکیلا جائے......؟ یہ جینی کے ساتھ ظلم ہوگا اور وہ اسے جانے کہاں دے گی، کیا وہ ماں کو یہاں بلالے؟ لیکن اس کے لیے مزید نہ جانے کتنا عرصہ انتظار کرنا پڑے، نقل وطن کے قوانین روز بہ روز سخت سے سخت تر ہوتے جارہے تھے۔ اب تو ٹورسٹ ویزا پر آنے والوں کی بھی کڑی چھان بین ہوتی تھی اور تعلیم کے بہانے وارد ہونے والوں کے درپردہ عزائم تک دیکھ لیے جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ بڑھیا یہاں آکے سیدھی اسپتال میں جالیٹی تو مرنے تک سرکاری خزانے پر بوجھ ہوگی، یہ بھی عین ممکن تھا کہ خود ماں یہاں آنے سے صاف انکار کردے۔ اس عمر میں میری کیوں مٹی پلید کرتا ہے، اس نے تو اپنے مجازی خدا کے پہلو میں قبر کی جگہ تک لے رکھی ہے۔

جینی سے شادی کے فیصلے پر جونی کو آج بھی ندامت نہیں تھی۔ اس کا یہ یقین برقرار تھا کہ جینی سے اچھی بیوی نہ ہوسکتی تھی اور نہ ہے اور اس کے یقین کے پیچھے جذبات اور عقل کے دلائل کا توازن تھا۔ اس کے پاس اس سوال کا آج بھی کوئی جواب نہ تھا کہ آخر اس میں کیا ہے؟ کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ وہ کون سا شہزادہ گلفام یا ٹام کروز یا بل گیٹس ہے...... اور جینی...... مائی گاڈ...... اس کے پاس کیا نہیں ہے...... رنگ روپ اور حسن وشباب سے خالص ولایتی شجرۂ نسب تک سب کچھ...... تعلیم سے تہذیب اور سلیقے تک...... لاریب کہ شباب آتے ہی اس نے ہر طرف آگ لگا دی ہوگی۔ اس کی ہر ادائے ناز دلوں پر بجلیاں گراتی ہوں گی جہاں سے گزرتی ہوگی عشاق اس کی راہ میں دل وجان کے نذرانے لیے چشم براہ رہتے ہوں گے۔ کم سے کم جونی کا یہی خیال تھا اور بے شک حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے مگر وہ اندھا بھی نہیں تھا۔ اس میں حقیقت ہر نظر کے لیے تھی۔ برطانیہ یورپ میں ایک عام سی لڑکی جوان ہونے سے پہلے ہی چاہنے اور چاہے جانے کے سارے جذباتی اور جسمانی مراحل طے کرنے کی دوڑ میں شامل ہوجاتی تھی اور عجلت میں ہوتی تھی کہ سب پر بازی لے جائے، سوسائٹی اس کی راہ میں بالکل مزاحم نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔

اور جینی عام لڑکیوں سے یقیناً ہزار درجہ بہتر تھی چنانچہ اس کی جونی کے لیے ایسی محبت بالکل ناقابل فہم تھی۔ ولایت میں قیام کے سات سالوں میں خود اس نے بھی ایک سو ایک لڑکیوں سے سچی محبت کی ہوگی اور اس سے زیادہ لڑکیوں نے اسے اپنے پیار کا یقین دلایا تھا مگر جینی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور چار سال بعد وہ یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ آئے گی بھی نہیں۔ کوئی لیلیٰ کسی مجنوں کے لیے ناگزیر یا زندگی اور موت کا سوال ہوسکتی تھی۔ جینی وہ لیلیٰ تھی جس نے مجنوں کو مقصد حیات بنالیا تھا۔ ہر آزمائش سے گزر کے آج چار سال بعد بھی اس محبت کی قوت اور اسٹوری میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ یہی ناقابل یقین تھا۔ جونی کا دماغ گھوم جاتا تھا کہ خدایا...... ایسی محبت بھی ہوتی ہے...... آج کل...... یہاں......! جینی پہلی بار اسے ٹاور برج پر نظر آئی تھی جب وہ جونی کے ساتھ کھڑی ٹیمز میں رواں چھوٹی بڑی کشتیوں، لانچوں اور اسٹیمروں کو دیکھ رہی تھی۔ جونی نے ایک نظر اسے دیکھا اور فریفتہ ہوگیا۔ اس نے فوراً سابقہ تجربے کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں مس تو میں ایک ذاتی سا سوال کروں......؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

جینی نے اپنے ساتھ کھڑے خوش شکل اور خوش پوش مہذب ایشیائی کی طرف نظر اٹھائی۔

اجالا جونی کے دل میں اتر گیا۔ ''آخر آپ خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہیں؟''

وہ ہنس پڑی...... ''یہ تم نے کیسے فرض کرلیا؟''

''مجھے لگا کہ آپ دریا میں چھلانگ مارنے کا سوچ رہی ہیں، ہے تو آپ کا ذاتی مسئلہ......''

''جو تیرنا جانتے ہوں وہ ڈوب نہیں سکتے، مجھے مرنا ہوگا تو اس کے بہت سے آسان طریقے ہیں لیکن میں ایسا کیوں کروں گی۔''

''دراصل...... میں ایسا سوچ رہا تھا، مگر تیرنا تو مجھے بھی آتا ہے...... کیوں نہ ہم مل کے ایک کپ کافی پیتے ہوئے اس مسئلے پر بات کریں، اگر تم نے قائل کرلیا مجھے زندہ رہنے پر تو یہ کار ثواب ہوگا...... کسی اسٹیمر پر کیسا رہے گا؟''

''تم اس کو بنیاد بنائے بغیر ہی مجھے مدعو کرتے تو میں انکار نہ کرتی۔'' وہ ہنسی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔

حسب عادت اور حسب ضرورت جونی نے ٹیمز پر چلنے والے اسٹیمر ریسٹورنٹ کی ایک میز پر بیٹھ کے بہت سا جھوٹ بڑی مہارت سے بولا۔ وہ انتہائی پُراعتماد اور پُرسکون لڑکی تھی۔ اس نے سب کچھ خوش مزاجی سے سنا اور پھر اپنے بارے میں بتانے لگی۔ جونی کی تجربہ کار نظر نے تاڑ لیا تھا کہ لڑکی متاثر ہوگئی ہے۔ وہ ایک ''بروکن فیملی'' یعنی ٹوٹ جانے والے خاندان سے تھی۔ ماں اور باپ نے سات سال ایک ساتھ گزارے۔ پھر باپ ایک دولت مند بیوہ کے چکر میں پڑ گیا۔ ماں شاید موقعے کے انتظار میں تھی۔ اس کو ایک ٹریولنگ سیلز مین پسند آگیا تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے راستوں پر چلنے لگے۔ وہ کچھ عرصہ ماں کے پاس رہتی۔ پھر ماں اسے باپ کے حوالے کرجاتی...... اسکول لائف ایسے ہی گزری، پھر اس نے دونوں کو چھوڑ دیا کیونکہ دونوں ایک بار پھر شریک زندگی بدلنے کے چکر میں تھے۔ وہ ایک لاولد نرس کے ساتھ رہی جو شادی سے متنفر تھی اور بالآخر چرچ میں چلی گئی، گھر جانے سے پہلے اپنا لندن کے مضافات کا چھوٹا سا گھر جینی کو دے گئی۔ گزشتہ سال اس کا کینسر میں انتقال ہوگیا۔ جینی تعلیم مکمل کرکے ایک دوا ساز ادارے سے وابستہ ہوگئی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے اور اس کے گزارے کے لیے آمدنی بہت کافی ہے۔

ان کی لندن میں ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جونی ایسٹ اینڈ کے ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کو اپنے ایک ہم وطن کے ساتھ شیئر کرتا تھا...... ایک بیڈروم کو وہ دن رات میں الگ الگ استعمال کرتے تھے۔ دوسرا پارٹنر سکھ تھا مگر بہت فراخدل اور مخلص...... اب وہ رات کو آتا تھا تو جونی جاچکا ہوتا تھا اور وہ جاتا تھا تو جونی کا دن سوتے ہوئے گزرتا تھا۔ دونوں کی ملاقات عموماً ویک اینڈ پر ہوتی تھی، دونوں ایک دوسرے کے رازدار اور مددگار تھے۔ جونی اچھے کپڑے پہنتا تھا، اس کے پاس اچھی گاڑی تھی، یقیناً وہ بہت سے دوسرے ہم وطن تارکین کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھا اور گفتگو سے تعلیم یافتہ بھی لگتا تھا۔

جینی اس سے باہر لنچ پر بھی ملتی رہی اور ویک اینڈ پر اس کے ساتھ ڈنر بھی کرتی رہی۔ وہ اکٹھے گھومتے پھرتے رہے وہ جونی کو اپنے گھر بھی لے گئی اور اس کے اپارٹمنٹ میں بھی آئی لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے جونی کی پیش قدمی یا دست درازی کو ایک حد پر روک دیا۔ یہ جونی کے لیے بڑی حیرانی کی بات تھی۔

''کیا تمہارا ابھی وہی مسئلہ ہے جو تمہاری نن بن جانے والی نرس مدر کا تھا؟'' اس نے چڑ کے پوچھا۔

''نہیں...... یہ صرف ایک ذہنی رویہ ہے، میں رومن کیتھولک ہوں اور شادی سے پہلے کسی سیکس کی قائل نہیں......''

''اوہ کم آن...... تم جیسی لڑکی......''

''میرے جیسی لڑکی کے بارے میں یہ ردعمل نیا نہیں...... کئی نوجوان مایوس ہوکے مجھے چھوڑ گئے۔''

''جینی...... شادی تو آدمی ایک ہی بار کرتا ہے۔''

''میں بھی ایک ہی بار کروں گی......'' اس نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

جونی اتنی جلدی حوصلہ ہار جانے والا نہیں تھا۔ اس نے کنگ رابرٹ بروس کی مثال کو سامنے رکھا...... ٹرائی اگین...... وہ مکڑی کی طرح جال بنتا رہا اور کوشش کرتا رہا، جینی کی استقامت اس کے لیے ایک چیلنج بن گئی۔ جینی نے اسے کہہ دیا کہ تم بھی مجھے چھوڑ جاؤ گے تو مجھے افسوس ہوگا، حیرت نہیں ہوگی...... میرا خیال تھا کہ تم مختلف ہو...... مگر شاید نہیں......''

جونی نے بھی بارہا سوچا کہ وہ جینی پر لعنت بھیج دے...... اگر لندن میں بھی ایک خبطی نیک پروین سے واسطہ پڑ گیا ہے تو اسے خبط میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے، زبردستی اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتی اور نہ جانے کیوں زبردستی وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا...... مگر وہ جینی کو چھوڑ بھی نہ سکا...... وہ ملتے رہے اور ایک وقت آیا جب اس نے محسوس کیا کہ جینی کو چھوڑنا اس کے اختیار کی بات ہی نہیں رہی۔ اس میں کچھ ایسی طلسماتی کشش تھی جو لوہے اور مقناطیس میں بھی نظر نہیں آتی مگر اپنا وجود رکھتی ہے۔ ایک وقت ایسا آیا جب جونی کو اس سے شادی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ تقریباً آٹھ مہینے سے وہ جینی کے معمولات سے واقف تھا...... یہ محض اتفاق تھا کہ اسے جینی کا ایک سابق بوائے فرینڈ مل گیا، اس نے بڑے یقین سے کہا۔ ''وہ لڑکی تو پاگل ہے...... بھلا ایسا ہوتا ہے کہیں...... آدمی جس سے ملے شادی کرلے...... ایک دن تم بھی بھاگ جاؤ گے، وہ ساری عمر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسے ہی خوار پھرے گی۔"

مگر سہالہ کے جان محمد عباسی عرف جونی کے لیے وہ لڑکی پاگل نہیں تھی...... وہ خود اس کے لیے پاگل تھا، مصیبت یہ تھی کہ چاہت کے ساتھ عقل بھی جینی کے ساتھ کھڑی تھی...... وہ فرصت کے وقت میں بڑے ٹھنڈے دماغ سے صورت حال پر غور کرتا تھا تو ہر طرف سے گھوم پھر کے وہیں پہنچتا تھا...... لہٰذا فوراً سے پیشتر اسے جینی کو پروپوز کر دینا چاہیے ورنہ اچھا مال دنیا کے بازار میں ٹکتا کہاں ہے، بعد میں وہ ساری عمر پچھتاتا اور ہاتھ ملتا رہے گا...... پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت، دیکھ کر روتا پھرے گا۔

ایک دن جونی نے بڑی تیاری اور ریہرسل کے بعد رومانٹک ماحول بنایا...... اوپر چودھویں کا چاند تھا۔ نیچے وہی اسٹیمر ریسٹورنٹ جس میں وہ پہلی بار جینی سے ملا تھا۔ تیز کی گنگناتی لہریں...... ہوا کے دوش پر موسیقی بکھیرتی سازینہ...... کینڈل لائٹ اور ڈنر...... جونی نے جینی کا ہاتھ تھام کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اور لہجے کو انتہائی جذباتی بنا کے کہا۔ "جینی...... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ رہنا بھی نہیں چاہتا۔"

اس نے اعتراف کرلیا۔ "مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"پھر ہمیں شادی کر لینی چاہیے نا......؟"

"بالکل کر لینی چاہیے......" جینی نے اتفاق کیا۔

جونی نے جیب میں سے منگنی کی ڈائمنڈ رنگ نکالی...... "یہ میں تمہیں پہنانا چاہتا ہوں۔"

"پہنا دو......" جینی نے اپنا نازک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"ایک مسئلہ ہے میرے لیے...... جو درحقیقت کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے...... ہمارا مذہب......"

"اس کا شادی سے کیا تعلق؟"

"میرے لیے ہے...... تم اسلام قبول کرلو...... تاکہ ہمارا نکاح ہو سکے۔"

جینی نے کہا۔ "نکاح تو کورٹ میں بھی ہو جاتا ہے۔"

"ہاں...... مگر میرے گھر...... خاندان اور آبائی وطن میں اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔"

جینی نے دونوں ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ ٹکا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "مگر شادی تو مجھ سے تم کر رہے ہو۔"

"دیکھو...... میں پہلے بارہا تمہیں تفصیل سے بتا چکا ہوں۔"

"اس سے یہ حقیقت تو نہیں بدلی...... کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں...... ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس لیے شادی کرنا چاہتے ہیں...... ہماری راہ میں رکاوٹ کوئی نہیں...... اب تم یہ شرط تو نہیں رکھ رہے ہو؟"

"اگر ایسا ہے...... تو میری خاطر تم مان جاؤ۔"

جینی نے چاند کی طرف دیکھا۔ "اور یہی بات میں تم سے کہوں...... پھر......؟"

"کیا مطلب...... میں اپنا مذہب بدل لوں......؟"

جونی کا موڈ خراب ہو گیا۔

"اگر ہم مذہب ہونا تمہارے لیے ضروری ہے تو...... کوئی بھی کرلے...... چلو ٹاس کر لیتے ہیں۔"

جونی نے انگوٹھی ڈبیا میں ڈالی اور ڈبیا واپس جیب میں رکھ لی۔ "یہ ناممکن ہے میرے لیے......"

"یعنی یہ تم صرف میرے لیے ممکن سمجھتے ہو...... محبت میں ایسا نہیں ہونا چاہیے...... تمہیں لوٹ کے پاکستان بھی نہیں جانا ہے تو پھر پرابلم کیا ہے، ہم اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہ سکتے ہیں۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ نہ تم بنیاد پرست مسلمان ہو اور نہ میں سچی رومن کیتھولک ہوں...... رہنے دو اسے...... جیسے ایک مذہبی کتاب تمہارے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی ہے......"

اس دن بات بدمزگی پر ختم ہوئی...... جونی نے عمداً بحث سے گریز کیا ورنہ جینی کی دوسری دلیل یہ ہوتی کہ تم اپنے مرد ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو...... یہ Male Chauvinist رویہ تو محبت میں نہیں چل سکتا۔ دو ہفتے تک وہ جینی سے نہیں ملا۔ اس سے فون پر بھی بات نہیں کی۔ دوسرا ہفتہ مشکل تھا، جینی کا خیال اس کے اعصاب پر غالب آتا گیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے جینی کے بارے میں سوچنے لگا، پھر خود کو شراب کے نشے میں ڈبونے لگا۔ لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ خراب ہو گیا۔ آفس میں اس کی کارکردگی خراب ہونے پر اسے برطرفی کا نوٹس مل گیا۔ کوئی پرانی گرل فرینڈ ملی تو وہ اتفاق سے اس رات فارغ تھی اور جونی کے لیے جسمانی سہارا تک نہ بن سکی۔ الٹا اس کے اور جینی کے کردار کا فرق زیادہ نمایاں ہو کے سامنے آ گیا۔

غصہ اور جھنجلاہٹ اسے یہ بھی کہ جینی نے بھی اسے نہ فون کیا نہ اس سے ملنے آئی، بکواس کرتی تھی کہ میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی...... سارا مسئلہ آداب عاشقی کا تھا۔ یہ خاک مردوں کی حاکمیت والی دنیا ہے۔ وہ اظہار عشق کرے، وہ دوزانو ہو کے التجا کرے کہ مجھے اپنی غلامی میں قبول کرلو...... وہی منائے...... ذلت اٹھائے لیکن تیسرے ہفتے کے آغاز میں جونی نے سب کیا...... وہ رو یا گڑگڑایا۔

جینی نے بھی اعتراف کیا کہ وہ کتنی اپ سیٹ رہی، وہ جونی کے سینے سے لگ کے کچھ روئی بھی...... مگر پرنالہ وہیں رہا۔

سمجھوتا بالآخر جینی کی شرائط پر ہو گیا، وہ اپنے اپنے مذہبی عقیدے پر کاربند رہیں گے جس سے عملاً ان کی زندگی ذرا بھی متاثر نہیں ہو گی کیونکہ دونوں کی زندگی میں بھی مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ وہ بائی برتھ ایسے ہیں تو رہیں...... بعد میں بھی جس کا جو دل چاہے کرے، جونی عید منائے اور جینی کرسمس...... اب رہے بچے تو ان پر کوئی دباؤ نہ ہو...... بالغ ہو جانے کے بعد وہ جس راستے پر جانا چاہیں ان کی مرضی...... پہلے بچے کا نام لڑکا ہونے کی صورت میں ایڈورڈ عباسی ہوگا، جان ایڈورڈ عباسی...... لڑکی ہوئی تو مریم جان......

یہ چار سال پرانی بات تھی۔ شادی کورٹ میں ہوئی، یہ آخری مرحلہ آنے سے بہت پہلے ہی جونی نے اپنے سوشل اور لیگل اسٹیٹس کے بارے میں جینی کو سب سچ بتا دیا تھا۔ جینی نے بالکل برا نہیں مانا کہ اب تک وہ اتنا جھوٹ بولتا رہا، محبت میں یہ ہوتا ہے، پورا سچ یوں بھی کون بول سکتا ہے، ماضی کا چیپٹر کلوز...... مستقبل مشترک ہے۔ اس کی فکر کرنی چاہیے اور جونی بہت مطمئن تھا کہ اس نے بروقت کمپرومائز کرلیا، محبت اور اس کے بعد کی ازدواجی زندگی تو ہے ہی کمپرومائز کا نام...... وہ محبت کرنے والا ایک مثالی جوڑا تھا، صحیح معنوں میں شریک حیات، یک جان دو قالب...... عملاً اس وقت تک کے ساتھی جب تک موت انہیں جدا نہ کر دے۔ جونی اور جینی کا نام رومیو جیولیٹ کی طرح لیا جاتا تھا۔

جونی نے جینی کو بتا دیا تھا کہ شادی کے بعد جب اسے قانونی طور پر برطانیہ کی شہریت حاصل ہو جائے گی تو وہ سب سے پہلے اپنے گھر جائے گا۔ اپنی ماں کے پاس...... اور اسے یہاں لانے کی پوری کوشش کرے گا۔ جینی نے اس کی خواہش اور کوشش کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی اور اب وہ وقت آ گیا تھا۔

❀❀❀

جینی کروٹ لے کر کسمسائی اور اس کی آغوش میں سمٹ آئی۔ "کیوں جاگ رہے ہو سویٹ ہارٹ؟"

"میں بہت ایکسائیٹڈ ہوں......"

"مجھے معلوم ہے...... لیکن اب تو سب کچھ ہو گیا ہے...... ویزا، پاسپورٹ، ٹکٹ سب ہمارے پاس ہیں...... دو دن کی تو بات ہے۔"

"یہی دو دن گزارنا مجھے مشکل ہو رہا ہے...... گیارہ سال گزر گئے...... جھوٹ بول بول کے...... ماں کہتی تھی جو بچہ جھوٹ بولتا ہے اس کی زبان پر چھالے پڑ جاتے ہیں...... اور منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے، کیسے بات نکلے گی میری زبان سے...... اور کیسے پہچانے گی ماں اپنے ٹیڑھے منہ والے بیٹے کو......"

وہ ہنسی...... "مائیں صورت یا آواز سے نہیں...... اپنی چھٹی حس سے بچوں کو پہچانتی ہیں۔"

"مجھے دیکھ کر اسے جتنی خوشی ہوگی...... اتنا ہی تمہیں دیکھ کر صدمہ بھی ہوگا، اس کے لیے ایک ساتھ دو اتنے بڑے سرپرائز ہیں۔"

"میری فکر تم مت کرو...... میں اسی طرح انہیں منالوں گی، جیسے تمہیں منا رکھا ہے چار سال سے......"

جونی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا...... "مجھے یہ ناممکن لگتا ہے۔"

"جب وہ ہمارے ساتھ یہاں آ جائیں گی تو تم دیکھ لو گے...... وہ مجھ سے ناراض نہیں رہیں گی...... انہیں کیسے خوش رکھنا ہے، یہ تم مجھ پر چھوڑ دو لیکن اچھا ہوتا تم نے انہیں بتا دیا ہوتا۔"

"اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں جینی...... ابھی گزشتہ ہفتے جب ان کا فون آیا تھا تو میں نے سوچا تھا، انہوں نے کہا کہ جانو...... آخر کب تک اکیلا رہے گا، تیری عمر کے سب چار چار بچوں کے باپ ہو گئے۔"

"کسی لڑکی کا ذکر بھی تو کیا تھا انہوں نے......"

"لڑکیاں تو سب مائیں بچوں کے جوان یا برسر روزگار ہوتے ہی دیکھنے لگتی ہیں، گلی، محلہ، خاندان...... یہاں وہاں...... یہ ہمارے ملک کا عجیب دستور ہے، لڑکوں کی ماں کے لیے ساری دنیا ایک بہو مارکیٹ ہے جس میں وہ دن رات اپنی پسند تلاش کرتی پھرتی ہیں، جو جہاں لے جائے چلی جاتی ہیں...... لڑکی تو ہر گھر میں بیٹھی ہے، کوئی آئے، دیکھے پسند کرے اور لے جائے۔"

"یہ حق لڑکیوں کو حاصل نہیں......؟"

"بالکل نہیں...... شاید تمہیں یہ عجیب اور مضحکہ خیز لگے، وہاں پسند ناپسند کا سو فیصد حق لڑکے کو ہے یا اس کی ماں کو...... شادی کے لیے کنوارا ہونے کی شرط صرف لڑکی کے لیے...... لڑکا شادی سے پہلے ایک سو ایک تجربات کر چکا ہو...... چلتا ہے...... بہت ہی عیاش ہو تو کہا جاتا ہے شادی کے بعد سدھر جائے گا۔ لڑکی کے بارے میں ایک افواہ بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا مستقبل تاریک کرنے کے لیے کافی ہے...... سب ایسے ہی چل رہا ہے صدیوں سے...... اور چلتا رہے گا...... تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ یہ سرپرائز ان کے لیے کتنا بڑا شاک ہوگا۔ مجھے تو ڈر ہے ان کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔"

"ایسا ہے تو پھر رسک کیوں لیتے ہو...... اب بھی وقت ہے...... اب فون آئے تو کم سے کم اتنا کہہ دینا کہ تمہاری بہو بھی ساتھ آئے گی۔"

"اب کچھ نہیں ہوسکتا...... ساری عمر وہ مجھے سرپرائز دیتی رہی، میں کتنے سالوں سے ایک ہی سرپرائز پلان کر رہا تھا کہ کسی وقت اچانک اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوں گا۔ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ بس اب کام ہوگیا، شہریت ملنے والی ہے۔ جاب کے بارے میں وہی جھوٹ اس سے بھی بولتا رہا جو تم سے بولے......"

"بہت محبت کرتے ہو تم ماں سے......"

"میں خاک محبت کرتا ہوں...... جھوٹا، دغاباز...... اس کی محبت کا استحصال کرنے والا...... کبھی اس کی مانی نہیں...... باپ تو بہت پہلے ہی مر گیا تھا۔ جب میری بہن کی شادی ہوئی...... اس وقت میں بہت چھوٹا تھا، ہماری اچھی خاصی زمین تھی، میں کاشت کرتا تو گزارا اچھا ہوتا مگر نہ مجھے دیہات کی زندگی پسند تھی اور نہ یہ ہل چلانے کا جدی پشتی کام...... میں بڑے شہر جاتا تھا، راولپنڈی کے اسکول میں اس وقت انصاری صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ اب پتا نہیں ہوں گے کہ نہیں...... دسویں کے بعد میں کالج میں بھی داخل ہوا تھا۔ گورڈن کالج میں خواجہ مسعود پرنسپل تھے مگر میں فیسیں کھاتا رہا، کالج سے نام خارج ہوگیا۔ میں آوارہ گردی میں مصروف رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد بھی کام کوئی نہیں کیا۔ ماں بیچاری تھوڑی تھوڑی زمین بیچتی رہی اور میری ضروریات پوری کرتی رہی۔ وہ تو سمجھتی ہے میں بی اے پاس ہوں۔ سارے خاندان اور گاؤں میں اس نے مٹھائی بانٹی تھی کہ بیٹا گریجویٹ ہوگیا، کالج جا کے معلوم کرتا کوئی تو پتا چلتا کہ اس نام کا لڑکا فرسٹ ایئر میں بھی نہیں تھا۔"

"تم رو رہے ہو......؟"

"اپنی طرف سے بہت بڑا سرپرائز دیا تھا ماں کو میں نے...... بی اے پاس گاؤں کا پہلا نوجوان...... پرانے لوگ کہتے تھے کہ بس اب جانو ڈپٹی کمشنر لگ جائے گا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ بی اے پاس جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ کوئی کلرکی بھی نہیں دیتا۔ میٹرک تک تو میں بس سے جاتا رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد میں نے سائیکل کے لیے ضد کی۔ ماں سائیکل کہاں سے لاتی...... مگر ایک دن اس نے مجھے سرپرائز دیا۔ میں گھر گیا تو وہاں بالکل نئی چمکتی دمکتی سائیکل کھڑی تھی جس پر جگہ جگہ گتا لپٹا ہوا تھا...... ماں نے زمین کا ایک ٹکڑا بیچ کے رقم نکالی تھی...... بہت پہلے جب میں پانچویں میں تھا، میں نے باٹا کے لیدر شوز کے لیے ضد کی تھی اور بہت رویا تھا...... مجھے کینوس کے سفید جوتے پہننا منظور نہ تھا۔ باپ نے میری چھینٹی لگائی کہ منڈے نواب دے پتر...... اپنی اوقات میں رہنا سیکھ...... اور میں چپ ہوگیا...... لیکن جب میں پرائمری پاس کر کے چھٹی میں گیا تو ایک دن صبح مجھے اپنے سرہانے بالکل نئے چمکتے سیاہ لیدر شوز رکھے ملے۔ ماں نے باپ کو قائل کرلیا تھا یا اپنی بچائی ہوئی رقم میں سے جوتوں کے لیے پیسے دے دیے تھے...... اس سے میری عادت بگڑی......"

"جواب تک بگڑی ہوئی ہے......"

جونی ہنسا...... "تمام عمر وہ مجھے سرپرائز دیتی رہی...... سب سے بڑا سرپرائز اس نے مجھے گیارہ سال پہلے دیا تھا، سب میرے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ جانو کوئی کام کیوں نہیں کرتا...... میں نے ضد پکڑلی کہ باہر جانا ہے، ساری دنیا جارہی ہے...... پاؤنڈ ڈالر اور ریال کما کما کے محل کھڑے کر رہی ہے۔ کسی کے سمجھانے کا مجھ پر اثر نہیں ہوتا تھا کہ یہ سب خواب نہ دیکھ، باہر جا کے بندہ کتنا خوار ہوتا ہے۔ کیسی ذلت کے کام کرتا ہے...... یہاں کچھ کرلے، مگر میری ضد برقرار رہی...... قانونی طور پر یہ ممکن نہ ہوا...... ہنر ہاتھ میں کوئی نہیں...... ایک ایجنٹ نے غیر قانونی طور پر بھجوانے کے لیے دو لاکھ مانگے...... میں نے ماں سے مطالبہ کیا۔ سب نے مجھے سمجھایا بیچاری ایک بڑی بہن کو تو کچھ بھی نہیں ملا۔ اس کا شوہر صابر شاکر ہے ورنہ حصہ مانگتا...... پھر ایک دن وہ ہوا جو ناممکن لگتا تھا...... ماں نے دو لاکھ میرے ہاتھ پر رکھ دیے...... اس نے باپ کی رہی سہی زمین بھی بیچ دی تھی جو بے کار پڑی تھی، پتا نہیں مجھ سے چوری چھپے اس نے یہ کام کیسے کیا، بعد میں پتا چلا کہ میرے بہنوئی نے زمین خرید لی، جتنے مل سکتے تھے اس سے زیادہ ہی دے دیے...... میری بہن نے کہا اور اس نے مان لی...... وہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز تھا...... یہاں میں کیسے پہنچا، یہ میں بتا چکا ہوں...... باتیں...... صبح ہوگئی......"

جینی نے اٹھ کے اپنے کپڑے تلاش کیے...... "تم ساری رات بولتے رہے ہو......

"میرے دل میں اتنا غبار تھا۔"

"چلو اب اٹھو...... پرسوں جانے سے پہلے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی...... جانو نے ریسیور اٹھالیا...... "ماں......؟ اس وقت......؟ وہاں تو رات کے...... دو بجے ہوں گے؟ ہاں میں ٹھیک ہوں...... بالکل ٹھیک ہوں خدا کی قسم...... تمہاری قسم...... اور ایک خوش خبری دینی تھی تمہیں...... بس اب انتظار ختم...... یہ عید میں تمہارے ساتھ کروں گا...... تم دیکھ لینا، ہاں رمضان...... آج یہاں بھی شروع ہوئے ہیں...... صرف ایک مہینے کی بات اور ہے...... بلکہ اس سے بھی پہلے آجاؤں گا میں...... تمہاری قسم اس بار پکا وعدہ...... میں جھوٹ نہیں بول رہا......" پھر لائن کٹ گئی۔

پاکستان انٹرنیشنل ائرلائن کی پرواز نے اسے کراچی کے قائداعظم انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اتارا۔ اس نے چند منٹ پہلے جہاز سے اعلان سن کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو جہاز کی بلندی بادلوں سے اوپر تھی۔ نیچے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر جہاز نیچے آیا اور بادل پیچھے رہ گئے کہ اس نے اس کو سموپولیٹن شہر کی حیرت انگیز وسعت کو دیکھا جس کے بارے میں لندن تک پہنچنے والی تمام خبریں تشویش ناک ہوتی تھیں۔ اب دو کروڑ کے لگ بھگ آبادی رکھنے والے اس شہر میں اسٹریٹ کرائمز کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ بتائی جاتی تھی اور کچھ تجربہ رکھنے والوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ائرپورٹ سے باہر جائے تو محتاط رہے۔ ٹیکسی والے انجانے مسافر کو انجانے راستوں پر لے جا کے چور ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں جو پولیس کے ساتھ مل کر بڑی دیدہ دلیری سے سب کچھ لوٹ لیتے ہیں۔ ہوٹل سے باہر جائے تو پرس میں کم سے کم رقم رکھے۔ موبائل فون سڑک پر نہ نکالے اور ہاتھ پر گھڑی نہ باندھے۔ اس کا موبائل فون اور گھڑی دونوں متوجہ کرنے والے تھے اور شاہراہ عام پر بھی چھن سکتے تھے۔ آخری بات یہ اپنی ولایتی بیوی کو ان انتہا پسندوں سے بچانے جو ہر گورے کو امریکی سمجھتے ہیں۔

جونی کا باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ کنکٹ کرنے والی ڈومیسٹک فلائٹ ملنے تک کا وقت ڈیپارچر لاؤنج میں ہی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن کسٹمکلیئرنس کے پہلے مرحلے سے باعزت طور پر گزرنے کے لیے بھی اسے لالچی گدھ بن کر بیٹھے ہوئے کسٹم حکام کے آگے سو پاؤنڈ رشوت کے ڈالنے

اقتباس

میں نے فقط اسے دیکھا۔ جواب نہیں دیا۔ کچھ لمحوں کو گونگا رکھنے میں ہی ان کا حسن مضمر ہوتا ہے۔ میں بھی چمکتی دھوپ میں لہراتے بل کھاتے فضاؤں میں ناچتے اچھلتے ان لمحوں کو اپنے جذبات کی کوئی زبان دینا چاہتی تھی۔ پر یہ بھی حقیقت تھی۔

شمالی علاقے جات پر لکھنے کے لیے جب میں نے اس علاقے پر لکھا گیا لٹریچر پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ میں مرزا حسن خان بابر اور شاہ خان سے بہت متاثر ہوں۔ پر بابر کی تصویروں نے مجھے لوٹ لیا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے پھوٹتی چمک تصویروں سے باہر آرہی تھی۔ اس کی فراخ پیشانی پر رقم اس کا عزم اس کے چہرے کا بانکپن، ہونٹوں کے خوب صورت خم اور ان پر گھنیری مونچھیں وہ قرون اول کے ان ہیروں جیسا تھا جن پر نسیم حجازی نے معرکۃ الآرا ناول لکھے تھے۔ میری نظریں پہاڑوں، درختوں، راستوں اور گھروں پر تھیں، جن میں اس کا بچپن اور جوانی گزری تھی پتا نہیں کتنی دوشیزاؤں کے دل اس کے نام پر دھڑکتے ہوں گے۔ پر جانے ان میں وہ خوش نصیب کون ہوگی، جس نے اس کی روانگی کو نم آلود آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ جب وہ فوجی وردی پہن کر میان میں تلوار لٹکا کر اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر وادی سے جہاد کے لیے نکلا ہوگا۔

سلمٰی اعوان کے سفرنامے "میرا گلگت و ہنزہ" سے اقتباس

انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑے۔ اس کے لیے بھی جینی نے دھمکی دی کہ وہ ابھی برطانوی قونصلیٹ کے کسی افسر کو بلا لے گی۔ دوسرا تلخ تجربہ فلائٹ کے انتظار میں ہوا، ایک دو گھنٹے لیٹ ہونے والی اسلام آباد کی فلائٹ بالآخر کینسل ہوگئی، کچھ لوگوں نے ہنگامہ بھی کیا لیکن اس مرتبہ جینی کی دھمکی نے جونی کا مسئلہ حل کردیا۔ انہیں سفر کے یہ سب داؤ پیچ لندن ہی میں ان کے ٹریول ایجنٹ نے سکھا دیے تھے۔ جونی اور چند دوسرے مسافروں کو دوسری فلائٹ میں جگہ مل گئی۔

مختصر فلائٹ نے صرف دو گھنٹے بعد انہیں اسلام آباد کے بے نظیر انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتار دیا جو کسی گاؤں کے ائرپورٹ جتنا تھا مگر وہاں بدنظمی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ کیپٹل تھا اور اس فلائٹ میں کچھ وی آئی پی بھی سفر کر رہے تھے۔ جانو کو معلوم تھا کہ ائرپورٹ سے سہالہ تک ٹیکسی میں مشکل سے آدھے گھنٹے کا سفر ہوگا۔ زیڈ یو کیب نے اس سے صرف ایک ہزار روپے چارج کیے جو جانو کو حیرت انگیز طور پر کم لگے۔ ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی راولپنڈی کے پرانے سحر نے جونی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ دس منٹ بعد ٹیکسی اسلام آباد ایکسپریس وے پر آئی تو جانو کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ اب فاصلہ چند کلومیٹر کا تھا مگر یہ گیارہ برس کی مسافت تھی۔ سڑک پر ہیوی ٹریفک تھی لیکن قدرے منظم۔ آس پاس کا جنگل اور قدرتی ماحول وہی تھا جو اس کے بچپن کی یاد دلاتا تھا اور جونی کو یوں لگا جیسے یہ وہی درخت ہیں جو خوش آمدید کے انداز میں جھوم رہے ہیں اور اس سے پوچھ رہے ہیں کہ ہمیں پہچانا...... گیارہ سال پہلے ہم بھی چھوٹے تھے آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور تیز بجلیوں کی لہراتی چمک کے ساتھ بادلوں کی گرج جونی کے کانوں میں موسیقی بن کے اتر رہی تھی۔

جب ٹیکسی پل سے بائیں جانب گھوم کے نیچے اتری تو جونی ''صم بکم'' بیٹھا تھا۔ وہ اپنی ولایتی بیوی کو کسی کامیاب گائڈ کی طرح اس گاؤں سے متعارف کرانا بھی بھول گیا تھا جس کے ساتھ اس کے بچپن کی ساری یادیں وابستہ تھیں۔ وہ کانپ رہا تھا، اس لمحے کا تصور کرکے جب وہ اپنی ماں کے روبرو ہوگا۔ کیا اتنا بڑا سرپرائز وہ برداشت کرپائے گی۔ وہ اب بہت بوڑھی ہے، شاید وہ بے ہوش ہوجائے...... باہر اندھیرا تھا، وہ نیون سائن اور ٹریفک لائٹس میں دیکھ سکتا تھا کہ یہ علاقہ بالکل ہی ناقابل شناخت ہوگیا تھا۔ اسے گھر کا راستہ کیسے بھول سکتا تھا۔ لیکن اس کا یقین بے بنیاد ثابت ہوا جب ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

''کہاں روکوں سر......؟''

جونی نیچے اتر کر دیکھتا رہا۔ روڈ سائڈ پر بینک، ریسٹورنٹ اور پیٹرول پمپ تھے۔ ایک اسکول کے ساتھ اندر جانے والی گلی نے سڑک کی صورت اختیار کرلی تھی۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد اس نے دکانوں کی قطار کے بیچ میں ایک گلی دریافت کرلی۔ اس کا گھر بالکل پیچھے ہونا چاہیے...... دکانداروں میں اسے کوئی آشنا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ ان میں بڑے بڑے اسٹورز کے مالک اجنبی لوگ تھے۔ اس نے جینی کو ایک جنرل اسٹور کے سامنے سامان کے ساتھ چھوڑا اور خود گلی میں گھس گیا۔ وہاں کئی لوگ تھے جو دیدے پھاڑ پھاڑ کے اس ولایتی میم کو دیکھ رہے تھے مگر یہاں خطرے کی بات کوئی نہ تھی۔

چند منٹ میں جونی کو اپنے گھر کا دروازہ نظر آگیا۔ اب اس کے سامنے اور آگے پیچھے بھی گھر بن گئے تھے وہ پرانا دروازہ اپنی جگہ پر تھا جس پر سہالہ کے ایک ترکھان نے بڑی محنت سے اس کے باپ کا نام نقش ونگار کے درمیان بھدے حروف میں کھودا تھا۔ وہ لوٹ کے آیا اور جینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سامان پہنچایا اور ایک ہزار وصول کرکے رخصت ہوگیا تو اس نے کنڈی بجائی۔

آٹھ دس برس کا ایک اجنبی صورت بچہ باہر آیا اور اسے گھورنے لگا۔ ''کس کے گھر جانا ہے۔''

جونی نے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

''راجا زمرد خاں۔'' لڑکے نے بڑے فخر سے بتایا اور جینی کو دیکھتا رہا۔

اندر سے کسی نے پوچھا۔ ''کون ہے زمرد......'' پھر ایک موٹا سا باریش آدمی باہر نکلا۔ وہ اب کچھ گنجا ہوگیا تھا مگر جونی نے اپنے بہنوئی کو پہچان لیا۔ ڈاڑھی والے نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اوئے...... تو جانو ہے نا؟''

جانو اس سے لپٹ گیا۔ ''ہاں بھائی جی......'' اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اور یہ میری ووہٹی...... جینی......''

ایک لمحے کے لیے اس کے بہنوئی کا چہرہ پتھر کا ہوگیا۔ اس کا بھانجا اتنی دیر میں غائب ہوگیا تھا اور لندن والے مامے کی آمد کی بریکنگ نیوز اپنی ماں تک پہنچا چکا تھا۔ وہ دیوانہ وار باہر آگئی اور اس سے لپٹ گئی۔ ''جانو...... میرے ویر......'' کسی نوٹس کے بغیر اس نے رونا شروع کردیا...... روتے ہوئے جانو نے اسے سنبھالا اور اندر لے گیا۔ اس کی بہن مسلسل ہچکیوں میں پوچھ جارہی تھی۔ ''کیسے کی دسیاوی نئیں مرن جوگیا...... بن وی کی لوڑ سی آن دی......''

جینی دم سادھے مجرم بنی کمرے میں کھڑی تھی۔ ابھی تک کسی نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ گھر وہی تھا لیکن اس میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ ایک دروازے میں سترہ اٹھارہ سال کی صحت مند لڑکی سر پر دوپٹا ڈالے تصویر بنی کھڑی تھی اور اپنے ولایت سے آنے والے مامے کو اور اس کی خالص ولایتی بیوی کو دیکھ رہی تھی۔ زمرد کو خود جانو نے بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ ولایت گیا تھا تو اس کی بس ایک بھانجی تھی۔

جانو نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''ماں کدھر ہے......؟''

اس کی بہن نے ایک چیخ ماری اور پھر اس کے ایک دوہتڑ رسید کیا۔ اس نے ٹھیٹھ پوٹھوہاری میں اسے کوسا...... ''ماں نوں پچھنا ایں بے غیرتا...... اج خیال آیا اے تینوں ماں دا احراما...... اتنے سالاں دے باد......'' وہ زور زور سے بین کرنے لگی۔

جانو کا دل ڈوبنے لگا۔ ''کیا ہوا بہن...... ماں ٹھیک تو ہے نا......''

وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ لڑکی آگے بڑھی اور اس نے ماں کے پاس بیٹھ کے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کی لیکن وہ بہ آواز بلند رو رہی تھی۔ لڑکی نے پلٹ کے کہا۔ ''نانی کو گزرے پانچ برس ہوگئے ماما جی......''

٭٭٭

گھپ اندھیرے اور سر پر مسلسل برستی بارش میں جانو کسی چھتری کے بغیر قبرستان میں کھڑا تھا۔ آسمان پر بجلیاں کوند رہی تھیں اور جب بادل گرجتے تھے تو قبرستان کے نواح میں کچے مکانوں کی کھڑکیاں بج اٹھتی تھیں۔ ماں کی کچی قبر کے سرہانے گڑے سلیٹ جیسے پتھر پر کسی نے تارکول سے لکھ دیا تھا...... ریشم زوجہ بنارس خاں۔ اس کے نیچے پانچ سال پہلے کی تاریخ، دن...... درج تھا۔ ساتھ والی قبر پر نصب سنگ مرمر کا کتبہ اس نے خود لگوایا تھا اور جس پر بنارس خاں ولد لہراسب خاں لکھا تھا، اب موجود نہیں تھا۔

ایک چھتری کے نیچے اس کا بہنوئی ساکت کھڑا تھا۔ دوسری جانو کو دی گئی تھی۔ وہ اب اس کے بھانجے کے پاس تھی۔

''کیا ہوا تھا ماں کو......؟'' جان محمد نے پوچھا۔ آنسو خاموشی سے اس کے گالوں پر بارش کے ساتھ بہہ رہے تھے۔

''کیا ہونا تھا...... بیمار تو ہو جاتی تھی...... سردیوں میں...... کمزور ہڈیاں اتنی سردی کہاں برداشت کرسکتی ہیں...... ہم ادھر ہی آگئے تھے اس کی دیکھ بھال کے لیے......'' اس نے زمین کے حوالے سے گریز کیا۔ ''آخری بار تپ چڑھی تو دوائی بھی لائے ہم ڈاکٹر سے...... مگر نمونیہ ہوگیا...... چار دن بعد مرگئی۔''

''مجھے کسی نے نہیں بتایا......''

''کیسے بتاتے...... اس نے منع کر رکھا تھا۔ کہتی تھی کہ وہ پریشان ہوگا...... پردیس میں اکیلا ہے۔ قسم دے رکھی تھی تیری بہن کو بھی اور مجھے بھی کہ جانو کو کچھ پتا نہ چلے......''

''اس نے تو دو دن پہلے بھی بات کی تھی مجھ سے......''

اس کے بہنوئی نے اعتراف جرم کے انداز میں کہا...... ''پانچ سال سے تیری بہن ہی ماں کی آواز میں بات کر رہی تھی۔ تو جانتا ہے ان کی صورت اور آواز کتنی ملتی ہے...... فون پر تو ویسے بھی پتا نہیں چلتا...... جب اسے کوئی اُمید نہ رہی بچنے کی تو اس نے پھر اپنی قسم دی...... تیری بہن اس کے سرہانے بیٹھی سورۃ یٰسین کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ ہاتھ رکھ قرآن پر...... اور وعدہ کر جانو کو میرے مرنے کا نہیں بتائے گی...... وہ بہت دکھی ہوگا...... روئے گا...... تڑپے گا مگر آ نہیں سکے گا...... اتنے سالوں سے کوشش تو کر رہا ہے مگر یہ اس کے اختیار میں تو نہیں...... ورنہ وہ کب کا آجاتا اور لے جاتا مجھے...... تو اسے فون کرتی رہنا...... تیری آواز وہی ہے جو میری...... کئی بار تو نے فون کیا تو اسے میرا دھوکا ہوا...... اس کو یہی بتاتی رہنا کہ سب خیر ہے......''

''اسے معلوم تھا...... کہ میں آ نہیں سکتا......''

''ہاں...... ایک بندہ آیا تھا ادھر سے...... اس نے سب بتایا تھا...... اس نے تو تیری شادی کے بارے میں بھی بتا دیا تھا......''

وہ بت بنا روتا رہا۔ بادل اس پر روتے رہے...... اس کی ماں کو ایک ساتھ دو سرپرائز دینے کا خیال خود اس کے منہ پر ایک طمانچہ بن گیا تھا۔ یہ آخری سرپرائز بھی اسے ماں نے ہی دے دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

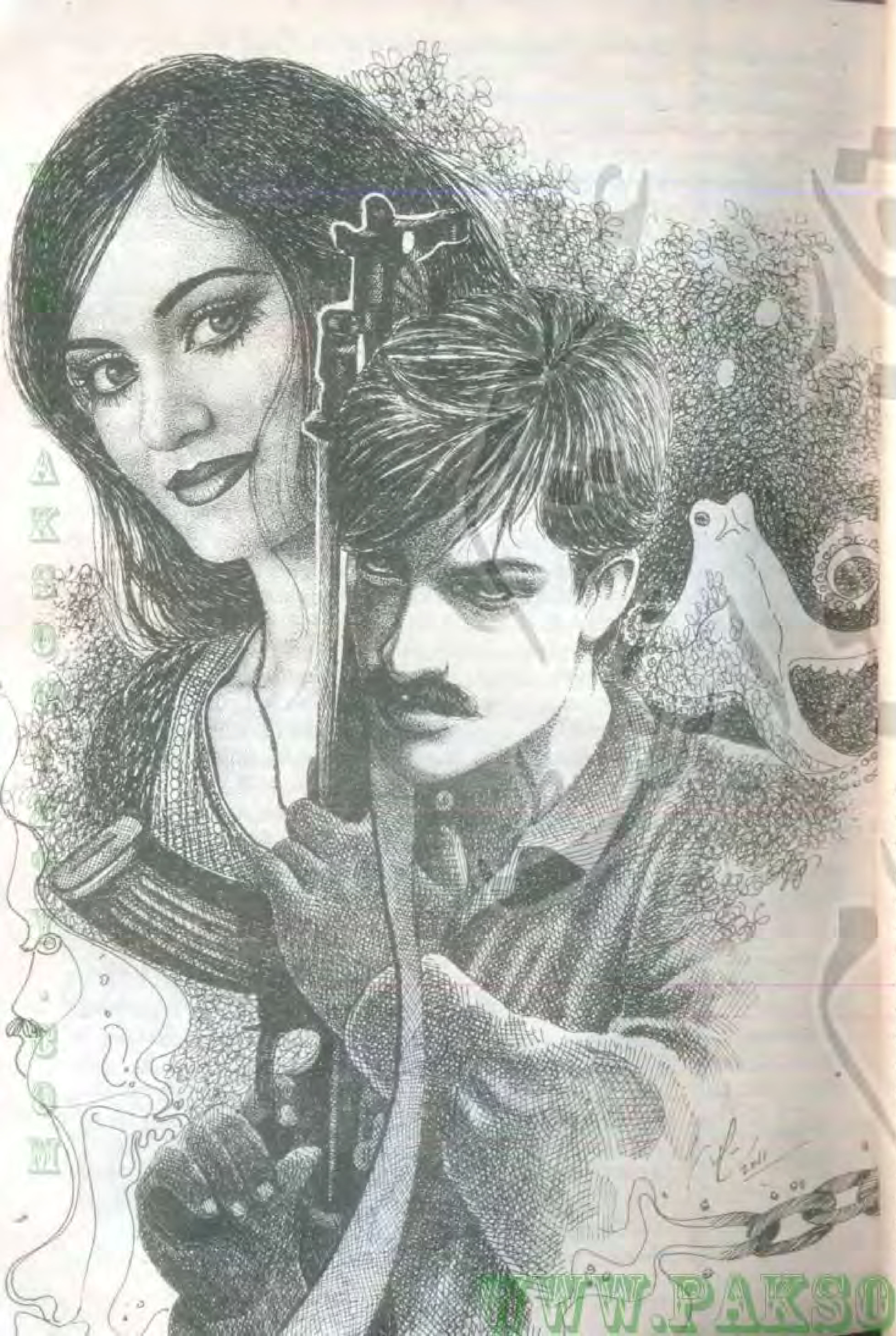

قسط نمبر : 23

کشکول

انوار صدیقی

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا۔ اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی مگر اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں گم تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈرورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی ''بلیک ٹائیگر'' تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈرورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کرلیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کرلیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرالیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچالیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرالیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کرلیتا ہے۔ اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کرلی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب طرمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کرلیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائشی گاؤں پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا

سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچالیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے پر آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہوسکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کرلیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار تھا۔ شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہوگیا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہوگیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہوگئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہوگیا۔ حملہ کرانے والے کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہوجاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہوگئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معمائی ہوئی تھی۔ سب اس کی موت پر مطمئن تھے جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کرلیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ وشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوگئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کر دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنادی۔ وشنو انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہوگیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری ثریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شہلا اور ما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہی ہے اور شہلا ورما اور جوئی نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

آئی جی اپنے آفس میں بیٹھا کسی سوچ میں غرق تھا۔ جب سے اس نے چارج لیا تھا اسے ہر وقت اپنے استعفیٰ کے منظور ہونے کا انتظار رہتا تھا، نئی پوسٹنگ کے بعد ہونے والے واقعات کے سلسلوں نے ذہنی طور پر اسے اور الجھا دیا تھا۔ لیاقت حسین سے مل کر اسے یقیناً خوشی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں دور دراز کے مختصر وقفے کے دوران جو قتل ہوئے تھے اس میں سامنے آنے والی لاشوں کی فائلیں بھی سرد خانے سے نکلوائی گئی تھیں۔ یہ سب محض اتفاق ہی نہیں قابل غور بھی تھا۔ اس نے پولیس کو مطلوب مجرموں کی تمام رپورٹس بذات خود پڑھی تھیں، لیکن ان کی موت کسی نہ کسی انداز میں لیاقت حسین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کی اطلاع کے مطابق لیاقت حسین کے وجود میں کسی بزرگ کی دعا سے کچھ ایسی خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں جو اسے قبل از وقت خطروں سے آگاہ کر دیتی تھیں، کبھی کبھی وہ بات کہہ جاتا تھا جو بعد میں درست ثابت ہوتی تھی لیکن خود اسے یاد نہیں رہتا تھا کہ اس نے کیا کہا تھا۔

اسپتال سے واپسی کے بعد اس نے اورنگ زیب کو بلا کر خاصی دیر اس سے لیاقت حسین کے بارے میں گفت و شنید کی تھی۔ آئی جی کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی کہتا تھا کہ لیاقت حسین ایک کھرا اور نیک آدمی ہے۔

خاصی دیر تک وہ ان ہی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اس نے اپنے ڈائریکٹ فون کا ریسیور اٹھا کر مرکز میں اپنے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

واقف کار سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اس کے دیرینہ دوستوں میں سے تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”تم نے ابھی تک میری فائل کے قریب ہوتے ہوئے بھی کوئی موثر کام نہیں کیا۔“

”مجھے خود بھی تعجب ہے۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”تمہارا کام جس کے پاس ہے اس پر میرے کچھ احسان بھی ہیں، ہر بار وہ وعدہ کرتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی دشواری اس کے سامنے آجاتی ہے۔“

”میری اطلاع کے مطابق ایک سے زیادہ آفیسر میری کرسی کی خاطر دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کے بھی اثرورسوخ ہوں گے۔“

”یہی بات میری سمجھ میں بھی اب تک نہیں آسکی۔ جس کے ہاتھ میں تمہاری فائل ہے خود وہ بھی حیران ہے کہ ہر بار تمہاری فائل فائنل، اتھارٹی تک جاتی ہے لیکن نہ جانے کیوں پھر واپس آجاتی ہے۔ کیا تم اس کی کوئی خاص وجہ بتاسکو گے؟“

”سوری...... میں خود کو بدنصیب کہنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“ آئی جی نے یکلخت رابطہ منقطع کردیا۔

اس کے چہرے پر کسی گہری تشویش کے تاثرات نمایاں ہورہے تھے، کوئی بات ضرور تھی جو اس کو روحانی طور پر ابھار رہی تھی۔ وہ خلا میں دیکھ رہا تھا جب ڈائریکٹ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے فون سیٹ کو حقارت سے گھورا پھر انٹرکام ریسیور اٹھالیا۔

”یس سر......“ دوسری جانب سے مہذب انداز میں جواب ملا۔

”کوئی میرے ڈائریکٹ نمبروں پر کال کررہا ہے۔ میں اس کی لائن باہر دے رہا ہوں...... کہہ دو کہ میں ایک منٹ پہلے کسی کام سے باہر جاچکا ہوں۔“ آئی جی نے سنجیدگی سے کہا پھر فون سیٹ میں لگا ہوا سوئچ ”آوٹ“ پر کردیا۔ ایسا وہ اسی وقت کرتا تھا جب دفتر میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کال اسی دوست نے کی ہوگی جس کے سوال کے جواب میں اس نے صرف ”سوری“ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا تھا۔ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پرسنل سیکریٹری سے بات کرنے کے بعد اس نے ایک فائل اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کردی، چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ محض وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی گرہ ایسی ضرور تھی جو اسے ابھار رہی تھی۔

دس منٹ میں فائل کے اوراق الٹتا پلٹتا رہا پھر انٹرکام کے بزر نے اسے چونکا دیا۔

”یس......“ اس نے ریسیور اٹھا کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

”سر...... مرکزی وزارتِ داخلہ کے آفس کی کال ہے۔“

”کون بات کرے گا؟“

”میں نے پوچھا تھا سر...... لیکن یہی جواب ملا کہ بات کراؤ۔“

”او۔ کے۔“ آئی جی نے فائل بند کرکے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی پھر پرسنل سیکریٹری نے کال اندر ٹرانسفر کرکے کچھ کہا تو اس نے ریسیور اٹھالیا۔

”آئی۔ جی اسپیکنگ!“

”آپ کو اپنے ریزگنیشن منظور کیے جانے کی کیا جلدی ہے؟“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اپنی کچھ نجی پریشانیوں کے سبب اپنے کام کو پوری توجہ سے انجام نہیں دے پارہا ہوں۔“ آئی جی نے سنبھل کر جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن مرکزی وزرا کے لیے دوسرے کام آپ کے استعفے سے زیادہ اہم ہیں اس لیے فی الحال آپ کو کچھ عرصہ......“

”میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا......“ آئی جی نے بے دھڑک کہا۔ ”دوسرا آپشن بھی ہے میرے پاس۔ میں میڈیکل گراؤنڈ پر دوبارہ لمبی چھٹی پر چلا جاؤں۔“

”تم...... ایسا نہیں کرسکو گے......“ اس بار دوسری جانب سے تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ”اس وقت تک...... جب تک میں تمہارے حال پر ترس نہ کھاؤں۔“

”کون بول رہا ہے......؟“ آئی جی نے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا، اس کی پیشانی بھی شکن آلود ہونے لگی۔

”کوبرا!“ حقارت اور درشت لہجے میں جواب ملا۔ ”تم کو زندگی کی آخری سانسوں تک میرے اشارے پر چلنا ہوگا۔“

”اب میرے پاس کیا باقی رہ گیا ہے؟“ آئی جی کے چہرے سے بیبسی برسنے لگی۔ ”سب کچھ تو تم برباد کرچکے ہو۔“

”اسی وجہ سے میں نے تمہیں صاحب اختیار بنوادیا ہے۔“ اسی بازاری انداز میں کہا گیا۔ ”اب تمہارے اختیارات میرے کام آئیں گے۔“

”نہیں...... شاید اب میں تمہارے لیے صرف ایک کام کرسکتا ہوں۔“ آئی جی نے جھلا کر کہا۔ ”کوئی ایسا سریع الاثر زہر کھالوں جس پر تمہارا اختیار نہ ہو......“

”ایسی صورت میں تمہاری روح تم سے زیادہ کرب میں رہے گی......“ سرد مہری سے کہا گیا۔ ”جو دستاویز اور تصویری ثبوت میرے پاس محفوظ ہیں۔ اگر وہ منظرِ عام پر آگئیں تو تمہاری بیوی کی روح بھی تڑپ اٹھے گی جسے تم نے طبعی موت ظاہر کرکے دفنا دیا تھا۔“

”اس میں بھی تمہاری کمینگی کو دخل تھا۔“ آئی جی نے تلملا کر کہا۔ ”مرنے والی میری زندگی کی آخری خوشی تھی جسے تم نے چھین لیا تھا۔“

”میں انکار نہیں کروں گا...... ہوسکتا ہے تمہارے انکار کی صورت میں مجھے کمینگی کے بعد اب گھٹیا پن بھی اختیار کرنا پڑے۔“ دوسری جانب سے ڈھیٹ بن کر کہا گیا۔ ”تم کیا پسند کروگے؟“

”کیا کام چاہتے ہو......؟“ آئی جی نے اپنی نشست پر بیزاری سے کسمساتے ہوئے سوال کیا۔

”اس بار میں نے تمہارے ساتھ رعایت کا خیال بھی رکھا ہے۔“ بہ دستور جھلسا دینے والا جواب ملا۔ ”آپشن تمہارے اختیار میں ہے...... یا تو لیاقت حسین کو پندرہ روز کے لیے کسی بھی جرم کی پاداش میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دو یا...... پھر فوری طور پر اورنگ زیب کو اس کی موجودہ سیٹ سے ہٹادو......“

”ان دونوں سے تمہیں کیا دشمنی لاحق ہوگئی؟“ آئی جی نے حیرت سے سوال کیا۔

”دشمنی کے بھی دو رخ ہوتے ہیں...... بلاواسطہ یا پھر بالواسطہ لیکن میں نے تمہیں سوال کرنے کا حق نہیں دیا تھا۔“ اس بار بھی مضحکہ اڑانے والا انداز تھا۔ ”تم صرف آپشن کا حق استعمال کرسکتے ہو...... میرے پاس وقت کم ہے۔“

”اگر میں آپشن استعمال کرنے کے بجائے تم سے ایک نام پوچھوں تو تم کیا جواب دوگے......“

”میرا جواب تصاویری شکل کی ایک قسط کے طور پر کل کے اخبار میں بھی آسکتا ہے۔“

”نہیں...... پلیز۔“ آئی جی نے عاجزی سے کہا۔ ”ایسا مت کرنا......“

”آج کا کام کل پر مت ٹالنا...... دیٹ از آل۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

آئی جی ریسیور رکھ کر ہونٹ چبانے لگا...... یہ بات سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے تمام کاموں کی بھنک اس فرضی نام ”کوبرا“ تک کسی نہ کسی طور پہنچ جاتی ہیں

جس کا اصلی نام خود اسے بھی نہیں معلوم تھا لیکن کچھ نجی معاملات اتنے نازک اور اہم تھے جس کی وجہ سے وہ کوبرا کے کسی حکم سے انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔

تادیر آئی جی اس نئی صورتِ حال سے اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتا رہا پھر اس نے اپنے پی اے کو بلا کر ایس پی اورنگ زیب کے ہیڈکوارٹر میں فوری تبدیلی کے آرڈر ڈکٹیٹ کرائے اس کے ساتھ یہ بھی کہا۔

”ان آرڈر پر میرے فائنل دستخط ہونے کے بعد آپ مسٹر اورنگ زیب کو بھی کال کرکے بلالیں۔ یہ آرڈر میں اسے براہِ راست دینا پسند کروں گا۔“

پی اے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آئی جی کے لب ولہجے کی سختی کو محسوس کرکے اس نے خاموشی سے باہر چلے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے ٹائپ شدہ فائنل آرڈر پر آئی جی کے دستخط ہونے کے بعد اسی کے حکم پر اسے وہیں بیٹھ کر لفافے میں بند کیا پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ایس پی اورنگ زیب سے آئی جی سے فوری ملاقات کرنے کا فون بھی کردیا۔

پی اے کے جانے کے بعد آئی جی پھر کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کررہے تھے کہ اس نے جو بھی قدم اٹھایا ہے اس میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔

ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس نے بیرونی دروازے کی سرخ لائٹ بھی آن کردی تھی۔

”اس وقت کیسے یاد کیا سر......“ اورنگ زیب نے گفتگو کا آغاز کیا۔

آئی جی نے جواب میں ہاتھوں سے ایک مخصوص اشارہ کیا پھر سخت لہجے میں بولا۔

”آپ کے بارے میں ایک دو ایسی رپورٹ موصول ہوئی ہیں جس کے بعد فوری طور پر آپ کو ہیڈکوارٹر میں پوسٹ کیا جارہا ہے۔ آپ اپنا چارج ڈی ایس پی سراج کو عارضی طور پر دے کر آج ہی آفٹرنون (After noon) میں یہاں رپورٹ کریں۔“

”میں نے احکامات کی پیروی سے کبھی انکار نہیں کیا سر لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ میرے خلاف......“

”نو۔ آرگومنٹس (No arguments) پلیز۔“ آئی جی نے الٹی آنکھ کی پلک جھپکا کر افسرانہ انداز میں کہا۔ ”شکایت کی تفتیش کے بعد آپ کے فائنل آرڈرز بھی کردیے جائیں گے۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

اورنگ زیب کے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی، وہ آئی جی کے اشاروں سے سمجھ رہا تھا کہ اس نے کسی مجبوری کی بنا پر ایک عارضی قدم اٹھایا ہوگا لیکن...... وہ مجبوری کیا تھی؟...... ایسے حالات اچانک کیسے پیدا ہوگئے تھے جس نے آئی جی کو بھی وقتی طور پر عضوِ معطل بنا دیا تھا؟

''تھینک یو سر......'' اورنگ زیب نے بھی وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خشک لہجہ اختیار کیا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا آئی جی کے کمرے سے باہر نکل گیا لیکن...... کچھ باتیں تھیں جو اس کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر ابھر رہی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ آئی جی نے اپنی پہلی کانفرنس کے دوران بھی کہا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں ملازمت سے باعزت مستعفی ہونے کا منتظر ہے۔ اس کا ریزگنیشن کسی وجہ سے منظور نہیں ہو رہا تھا۔ کانفرنس کے دوران اس نے تمام افسران سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ کچھ دنوں بعد اس نے اورنگ زیب کو براہِ راست آفس بلا کر یہ بھی کہا تھا۔

''جب تک میں اس کرسی پر ہوں، آپ کو موجودہ سیٹ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا، دِس اِز مائی کمٹمنٹ (This is my Commitment)'' اور اب اسی نے کسی دباؤ میں آکر اورنگ زیب کا تبادلہ کر دیا تھا۔ اشاروں سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اس قدم کو اٹھانے پر مجبور تھا...... وہ دباؤ کس قسم کا تھا؟...... آئی جی ہوتے ہوئے اگر وہ کسی کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا تھا تو وہ شخصیت کس کی تھی......؟

اورنگ زیب اسی معمے کو حل کرنے میں الجھ رہا تھا۔

☠☠☠

شیلا ورما اس وقت بھی حسبِ معمول نائٹ سوٹ میں تھی جب جونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر شیلا ورما کے گداز جسم پر ڈالی، ورزش اور خوش خوراکی نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو صنفِ مخالف کے لیے اپنے خوب صورت ترین سانچوں میں ڈھال رکھا تھا، اس کے پرستاروں میں شہر کے بڑے بڑے لوگ شامل تھے لیکن وہ ان کی نظروں کو سینکنے کی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھی تھی، شاید یہی وجہ تھی جوان پرستاروں کی صف میں کچھ ذاتی دشمنیاں بھی سر ابھارنے لگی تھیں لیکن شیلا ورما صرف جونی کی پرستار تھی جس نے اس کی خواہشات کے ساتھ اس کے بزنس کو بھی چمکا رکھا تھا۔

جونی کو دیکھ کر اس نے ایک تو بہ شکن انگڑائی لی پھر دیوان پر نیم دراز ہو کر اس نے خلافِ توقع جونی کے چہرے پر طاری سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے مدھم مگر نشیلی آواز میں پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ آج تم کس خیال میں گم ہو؟''

''ایک مشورہ دوں...... مانو گی؟'' جونی نے سنجیدگی سے کہا۔

''مشورہ نہیں۔ تم مجھے حکم بھی دے سکتے ہو۔'' شیلا ورما نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ کچھ عرصے کے لیے ہمیں اپنے روزمرہ روٹین سے ہٹ کر کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''میں سمجھی نہیں......''

''مجھے شبہ ہے کہ کسی نہ کسی ایجنسی کے کچھ سادہ لباس والے میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔''

''تم صرف ایک نام بتا دو...... باقی بندوبست میں کر دوں گی۔'' شیلا ورما نے بڑے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''اپنے اور تمہارے راستے کے پتھروں کو ٹھوکر مار کر ہٹانا میرے لیے کچھ دشوار بھی نہیں ہوگا......''

''جانتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں اس وقت تمہاری بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔''

شیلا ورما نے جونی کے خشک لب و لہجے کو محسوس کیا تو کسی آدم خور شیرنی کی طرح اٹھ کر خواب گاہ میں ٹہلنے لگی، وہ محسوس کر رہی تھی کہ مس ڈکسن سے ملاقات کرنے کے بعد ہی جونی کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہوگئی تھیں، اس کے ذاتی مخبر دوسروں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جونی کی نقل و حرکت کو بھی واچ کرتے تھے...... اسی ذریعہ سے اسے جونی اور مس ڈکسن کی ملاقات کا علم ہوا تھا مگر اس نے ابھی تک جونی پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ جونی اس سونے کی کان کی کنجی تھا جسے وہ نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''ڈونٹ بی سنٹی منٹل شیلا......'' جونی نے اس بار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ ''میں نے اس وقت جو مشورہ دیا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو...... ہمیں مل بیٹھ کر بدلتے حالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔''

''تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے......؟'' شیلا ورما قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی گئی۔

''ہر اس فردِ واحد پر جواب تک ہمارے کاروبار سے منسلک رہا ہے۔'' جونی نے اسے رام کرنے کی خاطر ہاتھ تھام کر قریب بٹھا لیا۔

''کوئی سرفہرست بھی ضرور ہوگا؟'' شیلا نے جونی کی کمر کے گرد اپنی بانہوں کا حصار کر لیا۔ لگاوٹ بھرے انداز میں بولی۔ ''میں محسوس کر رہی ہوں پچھلے کچھ دنوں سے تم نے میری ذات میں دلچسپی لینی بھی کم کر دی ہے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے......''

''پھر......'' شیلا ورما کے اندر کی عورت تلملا اٹھی۔ ''حقیقت کیا ہے؟''

''جذبات سے کام نہیں چلے گا ڈارلنگ!'' جونی اس کا ہاتھ تھام کر ڈبل بیڈ پر لے گیا۔ بے تکلفی کی فضا قائم کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم واقف ہو کہ جو لڑکیاں میرے ساتھ بھیجی جاتی ہیں ان کی آخری منزل کیا ہوتی ہے؟''

''نہیں...... مجھے صرف آم کھانے سے غرض ہوتی ہے، پیڑ گننے کی ضرورت میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔''

''اب کرنی ہوگی......''

''کیوں؟...... تمہیں کس بات کا خوف ہے؟'' وہ پھر الجھنے لگی۔ ''اس وقت تمہارے ذہن میں کیا گونج رہا ہے؟...... مجھے کھل کر بتاؤ، میں پہیلیاں بوجھنے کی عادی نہیں ہوں۔''

''ہمارے پارلر سے صرف وہ لڑکیاں طلب کی جاتی ہیں جن کا تعلق پوش علاقوں اور اثر و رسوخ رکھنے والوں سے ہوتا ہے۔ ایسے گھرانوں کو اپنی عزت اور شہرت بھی عزیز ہوتی ہے۔ ماڈرن اور خوب صورت لڑکیاں بھی اس کی اہمیت سے واقف ہیں، اسی لیے وہ پہلی بار برباد ہونے کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولتیں...... ضرورت پڑنے پر ان کے والدین خاموشی سے ان کا علاج بھی کہیں نہ کہیں سے مختلف انداز میں تلاش کر لیتے ہیں۔''

''اسی وجہ سے ان کی ڈیمانڈ بھی زیادہ ہے جس کے عوض ہم منہ مانگی قیمت بھی وصول کر لیتے ہیں۔''

''ان لڑکیوں کی آنکھوں پر پٹی بھی نہیں ہوتی اس لیے وہ شکاری کی شکل و صورت بھی ضرور یاد رکھتی ہوں گی؟''

''تم ایک بات بھول رہے ہو جونی۔'' شیلا نے اس کے اور قریب ہو کر سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ''کسی نشے کا ذائقہ اگر ایک بار منہ کو لگ جائے تو پھر وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز وہی نشہ ختم کر دیتا ہے...... اس کی ایک جیتی جاگتی مثال تمہارے پہلو میں بھی میری شکل میں موجود ہے۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکو گے؟''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' جونی نے اپنے ہاتھوں کا حلقہ مزید تنگ کر لیا۔ ''میرے لیے تمہارے علاوہ خود اپنی مثال بھی موجود ہے، میں نے جان محمد سے جونی بننے تک جو منزلیں طے کی ہیں، تم بھی ان سے ناواقف نہیں ہو۔ یہی تجربات زندگی کا نچوڑ ہوتے ہیں، ہماری مختلف ایجنسیوں کے افسران بھی ان باتوں سے لاعلم نہیں ہوں گے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک اور مثال بھی ہماری زندگی کے لیے بہت اہم ہے۔''

''کیا......''

''پانچوں انگلیاں برابر بھی نہیں ہوتیں۔'' جونی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ''جس وقت میں یتیم خانے میں تھا اس وقت تیرہ سال کا ہونے کے باوجود مجھے اس کے تقدس کا احترام تھا۔ بے سہارا بچوں کی پرورش کی آڑ میں جو مذموم کاروبار ہو رہا تھا اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب کسی ایک فرض شناس افسر نے وہاں ریڈ (Raid) کی تھی، اسی بھگدڑ میں شامل ہو کر میں بھی فرار ہو گیا۔ میرے پاس سر چھپانے کا کوئی کمزور سہارا بھی نہیں تھا لیکن وقت کی رفتار نے آج مجھے تمہارے اس بیڈ روم تک پہنچا دیا جہاں کل تک کوئی اپنا جائز حق استعمال کر رہا تھا۔ اب اس کی جگہ جو ہو رہا ہے کیا تم اسے جائز ثابت کر سکو گی؟''

''وہاٹ نان سنس!'' شیلا جونی کے ہاتھوں کے حصار سے تڑپ کر باہر نکل گئی، اسے گھورتے ہوئے بڑے تلخ انداز میں بولی۔ ''اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی تمہاری مردانہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ کیا یہ غلط ہے......؟''

''میں نے کب انکار کیا مائی سوئٹ ہنی۔'' جونی نے اس کا ہاتھ تھام کر دوبارہ اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا، خواہشات کے نازک ساز کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے اس نے اپنی بات بھی کہہ ڈالی۔ ''یتیم خانے پر ریڈ کرنے والا ایماندار افسر دنیا میں تنہا نہیں تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی ہم خیال، اب بھی کہیں نہ کہیں سانس لے رہا ہوگا......''

''اوہ...... آئی سی۔'' شیلا نے اس بار جونی کے کشادہ سینے میں سر چھپا کر پہلی بار سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں اب تمہاری باتوں کی گہرائی تک پہنچ رہی ہوں لیکن اس وقت نہیں جونی پلیز...... روشنی کی باتیں اندھیروں میں اچھی بھی نہیں لگتیں......''

''ایز یو وِش شیلا......''

جونی نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔

☠☠☠

''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے کمرے میں پارٹیشن بنا کر اپنی میز بھی یہیں شفٹ کر لوں۔'' سراج نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اورنگ زیب کے کمرے میں داخل ہوکر رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔ حسبِ معمول وہ اورنگ زیب کا فون ملتے ہی سارے کام چھوڑ کر آگیا تھا۔

”تم اس وقت کوئی اور دعا مانگتے تو شاید وہ بھی قبول ہوجاتی......“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”قبولیت کی گھڑیاں بار بار نہیں آتیں......“

”کیا مطلب......؟“

”مجھ پر بھروسا ہو تو اس چارج رپورٹ پر آنکھ بند کر کے دستخط کردو۔“ اورنگ زیب نے جو چارج رپورٹ تیار کرا رکھی تھی اس کی فائل سراج کے سامنے رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”میرا فوری تبادلہ ہیڈ کوارٹر میں کر دیا گیا ہے۔“

”یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ سراج نے حیرت کا اظہار کیا۔

”جو کہوں گا سچ کہوں گا...... سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔“ اورنگ زیب نے اس بار عدالتوں میں حلف لینے والا انداز اختیار کیا۔ ”کچھ نامعلوم رپورٹس کی بنا پر آئی جی نے جو آرڈرز کیے ہیں اس کی نقل بھی فائل میں موجود ہے۔“

”لیکن......“ سراج سٹپٹا گیا۔ ”یہ سب کچھ اس قدر اچانک کیسے ہوگیا......؟“

”گردشیں انوی ٹیشن دے کر نہیں آتیں۔ اسی طرح اچانک آتی ہیں اس لیے پریشان مت ہو۔ چارج رپورٹ پر دستخط کر کے میری کرسی سنبھالو۔ مجھے آج ہی آفٹر نون میں ڈیوٹی میں رپورٹ کرنے کا حکم ملا ہے۔“

”کیا اس اچانک تبدیلی میں بھی آکٹوپس کا ہاتھ ہوگا جو مر کر دوبارہ زندہ ہوگیا ہے؟“

”اور بھی بہت کچھ ممکن ہے۔“ اس بار اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس موضوع پر رات تمہارے ڈرائنگ روم میں بات ہوگی۔ تم فکر مت کرو، جو آرڈر کہیں اوپر سے آئے ہیں وہ میری ایک فون کال پر کسی کی وساطت سے فوری منسوخ بھی ہوسکتے تھے لیکن فی الحال میں نئے آئی جی کے آرڈرز کی تکمیل کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔“

”اس میں کیا مصلحت ہے؟“ سراج نے اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا۔

”دو تین روز اور ذہنی جمناسٹک کرلو...... اس کے بعد جو بھی ہوگا، سب کے سامنے آجائے گا۔“

سراج جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔ فائل دیکھنے کے بعد اس نے اورنگ زیب کے اصرار پر دستخط کرنے سے گریز نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اورنگ زیب اچانک تبادلے نے اسے اندر سے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

”اب ایک سلسلے میں وقتی طور پر رسماً ہی سہی لیکن تمہاری آفیشل اجازت بھی درکار ہے۔“ اورنگ زیب سراج کی دلی کیفیت محسوس کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”جو فائل تم نے فراہم کی تھی اسے میں اپنے ساتھ لے جایا کروں گا تاکہ کل تک اس کا تفصیلی مطالعہ بھی کرلوں۔“

”کیا آپ کو اجازت کی ضرورت ہے......؟“ سراج کی آواز بھرانے لگی تو اورنگ زیب نے اسے بڑی اپنائیت سے ڈانٹا۔ ”حماقت نہیں، میں واپسی کے آرڈر کرانے میں تین روز سے زیادہ نہیں لوں گا۔ ایس پی کے عہدے سے زیادہ مجھے ان مجرموں کی فکر ہے جو اندر ہی اندر اپنی سازشیں جاری رکھنے کی خاطر گھٹیا چال چل رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے آخری سانس تک گھٹنے نہیں ٹیکوں گا۔“

کچھ دفتری امور کی ضروری باتیں سمجھانے کے بعد اورنگ زیب چارج رپورٹ کی کاپیاں لینے کے بعد سراج کے ساتھ ہی باہر نکلا...... اس نے سراج کو بھی منع کر دیا تھا کہ دفتری اسٹاف سے فوری طور پر اس تبادلے کے بارے میں گفتگو نہ کرے۔

”او۔ کے سراج۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”الماس سے کہنا رات کے کھانے پر اپنی پسند کی کوئی سوئٹ ڈش ضرور تیار کرلے، کھانے کے بعد تم سے تفصیلی باتیں ہوں گی۔“

اورنگ زیب کی کار پھاٹک سے گزر جانے کے بعد بھی سراج دو چار منٹ اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر دوبارہ کمرے میں آگیا لیکن...... اس نے عارضی طور پر بھی اورنگ زیب کی خالی کرسی پر بیٹھنا گوارا نہیں کیا۔

☠☠☠

افضل خان واش روم سے باہر نکلا تو شبنم اسے دیکھ کر چونکی۔ وہ اس وقت افضل خان کے بجائے کوئی لاابالی اینگلو انڈین لگ رہا تھا، شبنم اٹھ کر تیزی سے اس کے قریب چلی گئی۔

”تم...... اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں اپنائیت کے ساتھ تشویش بھی تھی۔

”وقت اور حالات سے جہاد کرنے۔“ افضل خان نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

”میری بات ٹھنڈے دل سے سنو۔“ وہ شبنم کو لے کر صوفے پر آگیا۔ ”بگ باس کے دوبارہ زندہ ہونے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد ہمارے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی کی خاطر اب یہ زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم ایس پی اورنگ زیب اور مسٹر سراج کا ساتھ دیں۔ مرگئے تو شہید...... زندہ رہے تو غازی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں کہ اس وقت ہم نہایت نازک سچویشن سے گزر رہے ہیں لیکن اس وقت تم اس حلیے میں کہاں جارہے ہو؟" شبنم نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس سوال کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ہم دونوں ہی کبھی بگ باس کی بساط کے اہم ترین مہرے رہ چکے ہیں، اس کے آدمی ہماری نقل وحرکت سے بے خبر بھی نہیں ہوں گے۔"

"میں تمہارے خیال سے صد فیصد متفق ہوں لیکن تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ مسٹر سراج نے اگر ہمیں یہاں رکھا ہے تو اس کے کچھ سادہ لباس والے بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔"

"جانتی ہوں لیکن تھریسا کے ساتھ جو صورتِ حال پیش آچکی ہے اس میں میڈم روبی جیسی محتاط خاتون کی تمام احتیاط کا حصار بھی ٹوٹ کر بکھر گیا تھا......" شبنم نے ہونٹ چباتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ "ہم دونوں کے غم مشترک ہیں اس لیے تھریسا والی بات کا ذکر بھی اس نے میرے علاوہ صرف الماس سے کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ الماس نے مسٹر سراج سے بھی اس خبر کو پوشیدہ رکھا ہو۔"

"پھر الماس کو بھی درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میڈم نے براہِ راست ایس پی اورنگ زیب کو فون کرنا کسی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا تھا۔" شبنم نے جملہ مکمل کر کے پھر اپنا سوال دہرایا۔ "کیا تم بھی کسی خاص وجہ سے نہیں بتانا چاہتے کہ اس وقت......"

"ایسا دوبارہ کبھی نہ سوچنا۔" افضل خان نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، جیے تو بھی ساتھ ساتھ اور اگر ڈوبنے لگے تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم اس سوال کو اب تک کئی انداز میں دہرا چکے ہو افضل۔" شبنم نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ "کچھ دنوں اور انتظار کرلو، صرف دو چار دن، اس کے بعد جب تم کہو گے میں تم سے کورٹ میرج کرلوں گی۔"

"دو چار دن میں کیا ہوجائے گا......؟"

"میں اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔ گزرے ہوئے نشیب وفراز نے ذہن کو الجھا دیا ہے۔"

جواب میں افضل خان نے شبنم کو شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کرلیا، اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں کل بھی تمہارا تھا...... آج بھی تمہارا ہوں اور کل بھی تمہارا ہی رہوں گا۔"

"لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس وقت کہاں جارہا ہوں۔" شبنم نے اس بار ایسے خوب صورت انداز میں اپنا سوال کیا کہ افضل خان اس سے بے اختیار لپٹ گیا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

"تم نے وشنو کا نام کبھی سنا ہے......؟"

"ہاں...... تم نے لوچن کے معاملے میں اس کا بھی ذکر کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ وہ اور لوچن ملٹری انٹیلی جنس کے پہرے میں کسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔"

"اپنی معلومات میں ایک بات کا اضافہ اور کرلو......" افضل خان نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وشنو جب اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد بارڈر کراس کر کے یہاں آیا تھا تو کسی نہ کسی طرح بلیک ٹائیگر کے ذریعہ اس کی رسائی بگ باس تک ہوگئی تھی پھر...... بلیک ٹائیگر کی موت کے بعد بگ باس صرف اسی کو خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا رہا...... بعد میں جیل میں لوچن اور وشنو کی ملاقات کسی وجہ سے اورنگ زیب کی وساطت سے ہوئی۔ دونوں ایک ساتھ ہی جیل سے فرار بھی ہوئے تھے۔ وشنو آج بھی انٹرپول کو مطلوب ہے لیکن میک اپ کی مہارت اور اپنی صلاحیت کی بنا پر ابھی تک بچتا رہا۔ ایس پی اورنگ زیب کے اشارے پر ان دونوں کو اس وقت فرار کا موقع فراہم کیا گیا جب ملٹری کا ایک ٹرک انہیں اپنے ہیڈکوارٹر لے جارہا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا وشنو کو ایک زینہ بنا کر بگ باس کو جکڑا جاسکے۔ لیکن کل رات وشنو تمام پہرے داروں کو ڈاج دے کر نکل گیا۔ نگرانی کرنے والوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وشنو پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے بھی چھلانگ لگا کر نکل جائے گا...... صبح سے مختلف ایجنسی کے افراد کونا کونا جھانک رہے ہیں۔"

"پھر...... تم بھی کیا کرلو گے؟" شبنم نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"تم ماسٹر مجید اور جبرو کو کیوں بھول رہی ہو۔" افضل خان نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ "مجھے بھی کسی ذریعے سے بھنک ملی ہے کہ وشنو اس وقت کہاں اور کس بھیس میں بیٹھا سکون کے سانس لے رہا ہے۔"

"اوہ......" شبنم چونکی۔ "کیا تم نے ایس پی اورنگ زیب کو اطلاع کردی ہے؟"

"ابھی نہیں......" اس بار افضل خان نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "وشنو کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے بعد میں بھی ایجنسی والوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلانا پسند کروں گا۔ شاید اس طرح ہمیں زیادہ آسانیاں بھی مل جائیں۔"

"اس میں خطرہ بھی زیادہ ہے۔"

"فکر مت کرو، میں نے بھی اسی دشت کی سیاحی کی ہے...... کام آگیا تو گناہوں کا کفارہ بھی ادا ہوجائے گا۔"

"میں تمہیں روکوں گی نہیں لیکن...... ایک درخواست ضرور کروں گی۔" شبنم نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "وشنو سے نمٹ لو تو جبرو کو بھی معاف نہ کرنا......"

"تم نہ بھی کہتیں تو بھی جبرو میری فہرست پر پہلے نمبر پر ہی رہتا...... اسلم ڈنکا کی قسمت اچھی تھی جو وہ اسپتال ہی میں زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا لیکن جبرو...... میں اسے سسکا سسکا کر بڑی اذیت ناک موت ماروں گا۔" افضل خان اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد رکا نہیں تیزی سے اٹھا پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☠☠☠

ہیڈکوارٹر میں ڈیوٹی رپورٹ کرتے وقت اورنگ زیب پھر آئی جی کے سامنے موجود تھا، اس نے چارج رپورٹ کی ایک کاپی آئی جی کے سامنے رکھ دی جس کے اوپر ایک تحریری چٹ بھی موجود تھی۔

"وقت پر ہمیشہ وہی کام آتے ہیں جن پر انسان اعتماد کرے۔ میں ہر حال میں آپ کی خاطر کوئی بھی خطرہ مول لے سکتا ہوں۔ جب چاہے آزما کر دیکھ لیں۔"

آئی جی نے چٹ پڑھنے کے بعد اسے گولی بنا کر جیب میں ڈال لیا تو اورنگ زیب نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ کے آرڈر کی تعمیل میں، میں آج ہی رپورٹ کررہا ہوں لیکن ہوسکتا ہے کہ میں یہاں زیادہ وقت نہ دے سکوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو......؟" آئی جی کا لہجہ بھی روکھا تھا۔

"یہاں کام کرنے کی صورت میں، میں یہ جاننا چاہوں گا سر...... کہ میرے خلاف کس نے اور کس قسم کی رپورٹ کی ہے؟"

"ضروری نہیں کہ ہر کیس میں چارج شیٹ ایشو کی جائے۔" آئی جی نے تیزی سے جواب دیا۔ "آپ کے خلاف جو رپورٹس ہیں ان کی انکوائری میں ذاتی طور پر بھی کرسکتا ہوں۔"

"ایز یو وش سر......" اورنگ زیب نے بدستور سرد انداز میں کہا...... "میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ہر پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔"

"تم......" آئی جی قدرے اونچی آواز میں بولا۔ "مجھے چیلنج کررہے ہو؟"

"جی نہیں......" جواب میں اورنگ زیب کی آواز بھی تیز ہوگئی۔ "میں نے ڈسپلن کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی مگر دوسروں کی طرح مجھے بھی اپنی عزت عزیز ہے۔ آپ نے جس انداز میں میرا تبادلہ کیا وہ آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ میں اب اسے جاننے کی کوشش بھی نہیں کروں گا لیکن جو ذمے داریاں مجھے سونپی جاچکی ہیں ان کو پورا کرنے سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میں شیخ حامد کی بات کررہا ہوں...... جس کو میں اپنی زبان میں آکٹوپس کہتا ہوں۔"

"میں اسے مداخلت بے جا سمجھوں گا۔" آئی جی نے درشت لہجے میں کہا۔ "آپ جو کرسی چھوڑ چکے ہیں اب اس سے متعلق کسی فائل کو ہاتھ لگانا بھی آپ کے اختیار میں باقی نہیں رہا۔"

"یو آر رائٹ سر۔" اورنگ زیب نے طنزیہ آواز میں کہا۔ "اسی لیے میں بھی اسی سیٹ پر واپس جانے کی کوشش کروں گا۔"

"او۔ کے، گیٹ لاسٹ......" آئی جی نے غصے سے کہا پھر مسکرانے لگا۔ اورنگ زیب نے اسے سلام کیا۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کیے باہر آگیا۔

☠☠☠

فائیو اسٹار ہوٹل کے رجسٹر میں ضروری کوائف درج کراتے وقت اس غیر ملکی سیاح نے اپنا انٹرنیشنل پاسپورٹ کاؤنٹر کلرک کے سامنے رکھ دیا تھا جس پر اس کی تصویر بھی چسپاں تھی۔ اس کا نام ہنری براؤن تھا، تعلق نارتھ امریکا سے تھا، وہ سیاحی کی غرض سے آیا تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد ہوٹل کے پورٹر نے اس کو لفٹ کے ذریعے دوسرے فلور کے روم نمبر دو سو اکیس تک پہنچا دیا تھا، بعد میں اس کا مختصر سامان رکھ کر جانے لگا تو ہنری براؤن نے اسے ڈالر کی شکل میں انعام بھی دیا...... پورٹر کے جانے کے بعد اس نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا جو ہر اعتبار سے آرام دہ تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے روم سروس کو کال کر کے اپنے لیے کلب سینڈوچ اور بلیک کافی کا آرڈر دیا پھر ایک صوفے پر بیٹھ کر اس نے ٹی وی کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوئچ آن کر کے اینمل پلینٹ کا چینل لگا لیا تھا۔

روم سروس کو آرڈر دینے کے بیس منٹ بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنری نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک خوب صورت ہوسٹیس ٹرے لیے اس کے سامنے موجود تھی۔ ہنری ایک طرف ہوگیا۔ ہوسٹیس نے ٹرے درمیانی میز پر رکھی پھر اس نے بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے ہنری سے کہا۔

''آپ کو اپنے لیے جس چیز کی ضرورت ہو آپ روم سروس کو آرڈر کر دیں، ہم آپ کی مطلوبہ فرمائش پوری کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ یہ ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے۔''

''اگر میں تم سے کچھ دیر کمپنی دینے کو کہوں تو......؟'' ہنری نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''سوری سر......'' ہوسٹیس نے بہ دستور مسکرا کر نفی میں جواب دیا۔ ''اس ہوٹل میں یہ کام نہیں ہوتا......''

''بھری ہوئی سگریٹ؟ جو عام طور پر سیاحوں کو مرغوب ہوتی ہے......'' اس بار ہنری نے مدھم آواز میں کہا۔

''میں اب اجازت چاہوں گی سر۔'' ہوسٹیس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی پھر الٹے قدموں کمرے سے نکل گئی۔

ہنری نے اس کے جاتے وقت ہلکی سی سیٹی بجائی پھر وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے دیے ہوئے آرڈر سے لطف اندوز ہونے لگا، اس کی نظریں اب ٹی وی اسکرین پر تھیں جہاں ایک چیتا گھاس کے درمیان آہستہ آہستہ حرکت کرتا اس ہرن کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا جو ستانے کی غرض سے ایک درخت کے تنے کے قریب بیٹھا تھا، چیتے کی حرکت جاری تھی جب ہرن چونکا۔ کسی خطرے کو محسوس کر کے تیزی سے اٹھا پھر چیتے کو دیکھتے ہی حسب عادت موت سے فرار حاصل کرنے کی خاطر تیز تیز دوڑنے کے درمیان لمبی لمبی قلانچیں بھرنے لگا۔ دونوں کا ایکشن جاری تھا جب ہنری نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر پُرجوش انداز میں کہا۔ ''کم آن...... گٹ دی ڈیئر۔'' وہ بار بار اسی جملے کو دہرا رہا تھا جب چیتے نے بالآخر ایک لمبی جست لگا کر ہرن کو دبوچ لیا، اس کے نرخرے کو منہ میں دبائے رہا، ہرن کچھ دیر موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار رہا پھر اس کا بدن ساکت ہوگیا۔ دو چار منٹ اپنا سانس درست کرنے کے بعد چیتا بڑی بے دردی سے اس کا مردہ جسم جھنجھوڑ رہا تھا۔

''یس، دس شڈ بی دی ریل اٹیک (حملہ اسی انداز میں ہونا چاہیے)'' ہنری نے ایک قہقہہ لگا کر کہا، اس کے بعد اس نے چینل بدل دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ٹرے ایک طرف رکھی۔ ٹی وی بند کیا پھر بستر پر آگیا، اب وہ تکیے پشت پر رکھ کر اس پر ٹیک لگائے اپنے خیالوں میں کہیں گم تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنری چونکا۔ ''روم سروس کی خوب صورت میزبان کو اتنی جلدی نہیں آنا چاہیے تھا۔'' اس نے سوچا پھر وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتا دروازے تک آگیا، دروازہ پورا نہ کھل سکے اس لیے اس نے پیتل کی مضبوط سیفٹی چین کو دروازے کے ساتھ لگایا پھر چوکھٹ اور پلڑے کے درمیان پیدا ہونے والے تین چار انچ کے خلا سے اس نے باہر کھڑے ہوئے اینگلو انڈین کو سرتاپا دیکھ کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''دشمن نہیں ہوں ورنہ...... اتنی جگہ ہوتے ہی کسی سائلنسر لگے پستول سے تمہارا جسم چھلنی کر دیتا۔''

''تم شاید غلط روم پر آگئے ہو دوست......'' ہنری نے مہذب انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں نہیں جانتا۔''

''میں...... باس کا پیغام لے کر آیا ہوں۔'' اس بار اینگلو انڈین نے دیسی زبان میں جواب دیا۔ ''اسے خوشی ہے کہ تم نے اپنی موجودہ حیثیت میں ایک اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا ہے۔''

ہنری ایک لمحے کو خاموش رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت بے جگری سے اپنا جرمن ساخت اعشاریہ دو پانچ کا پستول رومال سمیت جیب سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اینگلو انڈین نے ایک نظر کمرے کے اندرونی حصے پر ڈالی پھر وہ آگے بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد ہنری بھی اس کے سیدھے ہاتھ پر آگیا، رومال کے ساتھ ہی اس نے پستول بھی اپنے کولہے سے لگا کر رکھ لیا تاکہ بروقت بہ آسانی استعمال کر سکے۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہم اپنی اپنی زبان میں بات کریں۔'' اینگلو انڈین نے مسکرا کر کہا۔ ''انگریزی بولتے وقت مجھے ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی نے ہماری آزادی ہم سے چھین لی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے......؟'' ہنری نے روانی سے دیسی زبان میں سوال کیا۔

''باس تم سے بہت خوش ہے مائی ڈیئر لیکن...... اس کے خیال میں تم نے ایک اور سنہری موقع ہاتھ سے ضائع کر دیا۔''

''اوہ......'' ہنری نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں اسے غلطی نہیں بلکہ دانش مندی سمجھتا ہوں۔ باس نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں پہلی فرصت میں اس چینی کی چھٹی کر دوں...... اس وقت بھی میں نے باس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا...... بہرحال تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔''

''اتنی جلدی کیا ہے تمہیں......''

''جب تک مکمل تعارف نہ ہو جائے میں کسی پر بھروسا بھی نہیں کرتا اور...... تم اس وقت میک اپ میں ہو اس لیے میں یہی کہوں گا کہ میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

اینگلو انڈین نے جواب میں ہنری کو سنجیدگی سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ''کنول نے زہر کھانے کے بعد میڈیا والوں کے پاس جا کر جو حماقت کی اس نے باس کو بہت زیادہ محتاط کر دیا ہے ورنہ شاید اس وقت وہ تمہارے پاس خود ہی آتا......''

''اسی احتیاط کے پیش نظر میں نے کسی کو کریان سے چھلنی کر کے اوپر پہنچا دیا تھا، اس کا غم مجھے آج بھی ہے مگر اب اس کے علاوہ کوئی میری کھوج میں نہیں رہتا......'' ہنری نے اپنا جملہ مکمل کر کے پھر اینگلو انڈین کو تیز نظروں سے دیکھا۔ ''ویسے میرا خیال ہے کہ تم باس کو زیادہ نہیں جانتے...... وہ خود سے کسی کے پاس چل کر کبھی نہیں جاتا......''

''تم نے کبھی لیاقت حسین کا نام سنا ہے؟'' اینگلو انڈین جو افضل خان کے سوا کوئی اور نہیں تھا اپنی دستی گھڑی پر ایک بار پھر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''وہ کئی بار باس کا راستہ کاٹ چکا ہے۔''

''پھر......؟'' ہنری نے بھی جو وشنو کا نیا روپ تھا مختصراً سوال کیا۔

''باس چاہتا ہے کہ لیاقت حسین کا پتا کچھ دنوں کے لیے صاف ہو جائے تو مناسب رہے گا۔''

''اس سے کیا خطرہ ہے؟'' ہنری نے منہ بنا کر دریافت کیا۔

''کچھ نادیدہ قوتیں اس پر مہربان ہیں جو وہ خطرے کی بو بھانپ لیتا ہے۔''

''اگر تمہیں میرا نام معلوم ہے تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ ہماری طاما تھالوجی میں سب سے اونچا استھان بھی وشنو دیوتا کو حاصل ہے۔ کیا تمہارے ہاں بھی لیاقت حسین کا کوئی نام......''

''کام کی بات کرو......'' اینگلو انڈین نے اس بار اپنی اہمیت جتانے کی خاطر کہا پھر دوبارہ دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''باس نے جو کہا تھا وہ کام میں نے تمہارے کان میں ڈال دیا۔''

''وقت کی کیا کمی ہے تمہارے پاس جو تم بار بار گھڑی دیکھ رہے ہو؟'' وشنو نے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی نہایت سرعت سے پستول اٹھا کر برابر بیٹھے ہوئے اینگلو انڈین پر تان لیا۔ خونخوار انداز میں پھنکار کر بولا۔ ''دو منٹ میں سب کچھ اگل دو ورنہ میرے نکل جانے کے بعد پھر روم سروس کو تمہاری لاش اٹھانے کے ساتھ ساتھ پورے کمرے کی صفائی بھی کرنی پڑے گی۔''

''میں افضل خان ہوں......''

''اوہ......'' وشنو زہرخند لہجے میں بولا۔ ''افضل خان...... لیکن میری اطلاع کے مطابق باس نے تمہیں کسی ناکارہ پرزے کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔ اب تم کس مقصد سے آئے ہو......؟''

''ناکارہ ہونے کے باوجود میں نے تمہیں ملٹری انٹیلی جنس یا پولیس فورس سے پہلے تلاش کر لیا۔'' افضل خان نے بے جگری سے جواب دیا۔ ''کیا تم بھی اس بات کا اعتراف نہیں کرو گے کہ ابھی تک انٹرپول والے بھی تمہاری تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔''

''گڈ...... تمہاری معلومات انتہائی خطرناک حد تک درست ہیں۔'' وشنو کی انگلی ٹریگر تک رینگ گئی۔ ''میں تمہاری تعریف ضرور کروں گا لیکن اب تمہیں مارنا بھی میری ترجیحات میں پہلا نمبر اختیار کر گیا ہے۔''

''یہ شوق بھی پورا کر لو لیکن...... اب تم یہاں سے فرار نہیں ہو سکو گے۔''

کمرے میں ہلکی سی ''کلک'' کی آواز ابھری لیکن...... یہ آواز وشنو کے پستول کے ٹریگر کی نہیں تھی، وشنو نے بھی تیزی سے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جو تین مسلح افراد برق رفتاری سے اندر داخل ہوئے وہ وشنو کے لیے ملٹری انٹیلی جنس کے دیکھے بھالے چہرے تھے۔ انہوں نے یقیناً ہوٹل مینجمنٹ سے کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی حاصل کی تھی ورنہ وشنو نے افضل خان کے اندر آنے کے بعد دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا۔ ایک لمحے کو اس نے اپنی شعلہ بار نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر مسکرا کر اپنا پستول فرشی قالین پر اچھال کر بڑی دیدہ دلیری سے افضل

WWW.PAKSOCIETY.COM

خان سے بولا۔

''تم ذہین ہی نہیں...... چالاک اور دور اندیش بھی ہو میری جان لیکن...... وشنو کو دھوکا دے کر تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''تمہاری طرح میں بھی دشمن کو للکار کر مارنے کا عادی ہوں وشنو مہاراج...... ورنہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تمہیں ختم کرسکتا تھا۔'' افضل خان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تم بھی کسی اگلی ملاقات کے وقت میری اس کرپا (مہربانی) کو بھول نہ جانا۔''

جواب میں وشنو کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ کھیلنے لگی پھر اس نے خود کو ملٹری انٹیلی جنس والوں کے حوالے کرنے میں کسی حیل وحجت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

⁂

اورنگ زیب ٹھیک آٹھ بجے سراج کے گھر پہنچا تو الماس نے بتایا کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

''ایسا کیا کام پیش آگیا......؟''

''انہیں آپ کے سیٹ چھوڑنے کا غم بھی لاحق ہے۔'' الماس نے کہا۔ ''ہونا بھی چاہیے، آپ نے جو پیار ہمیں دیا ہے وہ پہلے کبھی کسی پولیس آفیسر سے نہیں ملا۔''

''جتنی دیر میں تم نے یہ جملہ کہہ کر وقت ضائع کیا اتنی دیر میں ایک گلاس ٹھنڈا پانی بھی لاسکتی تھیں۔'' اورنگ زیب نے اس کی رسمی باتوں سے بچنے کی خاطر کہا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ سراج کے دل میں اس کی کس قدر عزت واحترام ہے۔ خود اورنگ زیب بھی ان دونوں سے بہت جلد مانوس ہوگیا تھا۔ پھر جتنی دیر میں الماس پانی لائی سراج بھی آگیا۔ اس وقت وہ سادہ لباس ہی میں تھا اس لیے سیدھا اورنگ زیب کے قریب آگیا۔ ''کیا ڈبل ڈیوٹی سے ایک دن میں ہی......''

''جی نہیں......'' سراج نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ''آپ کے جانے کے بعد میں بھی وہاں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں رکا تھا۔''

''پھر اتنی دیر کہاں ہوگئی......؟''

''ڈی آئی جی نے اپنی دم میں باندھ رکھا تھا۔ وہ آپ کے تبادلے کو ایک معما سمجھ رہا ہے۔ جن دوسرے افسروں کو بھنک ملی ہے وہ بھی چہ میگوئیاں کررہے ہیں۔ دیر سے آنے کی ایک اہم وجہ اور بھی ہے جس نے مجھے الجھا دیا ہے۔'' سراج نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ میں بھی کل کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرکے چار روز کی چھٹی......''

''ایسی حماقت بھول کر بھی مت کرنا۔'' اورنگ زیب نے اسے محبت سے سمجھایا۔ ''میں دوسروں کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔''

''میں بھی آئی جی کی باتوں پر خون کے گھونٹ پی کر چپ ہوگیا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' اورنگ زیب آئی جی کا نام سن کر چونکا۔ ''کیا اس نے تمہیں بلایا تھا؟''

''جی ہاں...... صرف یہ ہدایت دینے کی خاطر کہ فی الوقت جو بھی چارج میرے پاس ہے اس کی کسی فائل کو آپ کے حوالے نہ کروں...... اور ہاتھ بھی لگانے کی اجازت نہ دوں۔''

''گڈ......'' اورنگ زیب نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئی جی اب حالات کے پیشِ نظر دور اندیشی سے کام لے رہا ہے۔''

''اس میں دور اندیشی کیا خاک ہے۔'' الماس نے درمیان میں اپنے جذبات کا اظہار بھی ضروری سمجھا۔ ''اتنی جلدی کوئی پالتو جانور بھی منہ نہیں پھیرتا جتنا یہ نیا آئی جی......''

''ون منٹ پلیز......'' اورنگ زیب نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''آئی جی نے جو بھی کیا ٹھیک ہی کیا ہے، موجودہ صورتِ حال میں سچویشن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میں اور آئی جی دونوں ایک دوسرے سے ظاہری طور پر برسرِپیکار رہیں۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔'' سراج نے وضاحت چاہی۔ ''کیا جو کچھ ہورہا ہے یہ سب ڈراما کشتی ہے؟''

''یہی سمجھ لو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس کی بھنک بھی گھر سے باہر نہ جانے پائے۔'' اورنگ زیب نے دبی زبان میں کہا۔ ''تم دونوں جذباتی نہ ہوتے تو شاید اس وقت میں تم دونوں کو یہ بات نہ بتاتا۔''

''اچھا ہوا آپ نے یہ بات میرے کان میں ڈال دی ورنہ......''

''خود کو میری طرح ٹھنڈا رکھو......'' اورنگ زیب نے اس بار معنی خیز انداز میں الماس کی طرف دیکھتے ہوئے سراج سے کہا۔ ''بہت سی باتیں ایسی ہیں جو الماس نے مجھ پر اعتماد کرکے بتائی ہیں لیکن میں تمہیں ان باتوں سے بھی بے خبر ہی رکھتا ہوں۔''

''یہ آپ دونوں کا ذاتی معاملہ ہے۔'' سراج نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آپ دونوں حضرات اٹھ کر منہ ہاتھ دھولیں، میں کھانا لگانے جارہی ہوں۔'' الماس نے وہاں سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی، اورنگ زیب نے جو جملہ اس کے متعلق کہا تھا وہ اسے سن کر صرف مسکرا دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تھریسا کے اغوا اور واپسی کی جو بات اس نے اورنگ زیب کو اعتماد میں لے کر بتائی تھی اس کا ذکر بھی اس نے سراج سے نہیں کیا ہوگا۔ خود میڈم روبی نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کا ذکر اورنگ زیب کے سوا اور کسی سے نہ کیا جائے۔

کھانے کے دوران زیادہ تر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، الماس نے میٹھے میں اورنگ زیب کی پسند کی ڈش خوبانی کا میٹھا، تیار کیا تھا۔ سراج نے اسے کھانا شروع ہونے سے پیشتر ہی اٹھا کر اورنگ زیب کے سیدھے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ کھانے کے بعد جتنی دیر میں الماس کافی تیار کرنے گئی۔ اورنگ زیب لاؤنج میں بیٹھا سراج کو دبی زبان میں حالات کی اونچ نیچ سمجھانے کے ساتھ کچھ ضروری ہدایات دیتا رہا پھر کافی ختم کرنے کے بعد وہ اس شاپنگ بیگ کو لے کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا جس میں سکندر علی شاہ کی فائل موجود تھی۔ کمرا بند کرنے کے بعد اس نے ایک سرسری نظر پوری فائل پر ڈالی پھر وہ بادامی لفافہ فائل سے الگ کرلیا جس پر ''مائی فائنڈنگس'' (My Findings) کے ساتھ سب انسپکٹر رانا حمید کا نام درج تھا۔ یہ رپورٹ تقریباً ساڑھے تین صفحے پر مشتمل تھی جس کی پہلی ہی لائن نے اورنگ زیب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ پوری توجہ سے رپورٹ پڑھنے لگا۔ سب انسپکٹر رانا حمید نے لکھا تھا۔

''جس روز سکندر علی شاہ کی فائل ایس پی اینٹی کرپشن نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر میرے حوالے کی میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا کہ اب میری بدقسمتی کے دن زیادہ دور نہیں ہیں۔ میری کیفیت فائل لیتے وقت اس بچے سے مختلف نہیں تھی جس کی عمر آٹھ نو سالہ رہی ہو...... جو کسی پارک میں بیٹھا ماحول سے خوش ہورہا ہو پھر جب کپڑے جھاڑ کر اٹھے تو اپنی پشت پر کسی خوفناک قد آور ایسے ریچھ کو دیکھ لے جو دو ٹانگوں پر سیدھا کھڑا اس بچے کو دبوچ لینے کے لیے تیار ہو۔

''جب فائل مجھے ملی اس وقت اس کا نام صرف سکندر علی تھا۔ شاہ کا اضافہ اس نے دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کی خاطر بعد میں کیا تھا۔ اس کا تعلق ایک درمیانہ درجے سے تھا، اس کا باپ بچوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کا کاروبار کرتا تھا۔ بعد میں کسی کی مہربانی سے وہ انہیں ایک قریبی ملک کو بھی ایکسپورٹ کرنے لگا۔ اس کا نام دلدار علی تھا جو ایمانداری سے کام کرتا تھا۔ نیک آدمی تھا اس لیے قدرت نے اسے برائی میں پڑنے سے پیشتر ہی اوپر بلالیا۔

''باپ کی وفات کے بعد سکندر علی نے اس کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ شروع سے جس رنگ ڈھنگ کا عادی تھا اس کی وجہ سے اس میں سمجھ بوجھ کا فقدان بھی شامل تھا، ایک دو ماہ تک وہ گھاٹے کا سودا کرتا رہا پھر کسی نے ترس کھا کر یا اپنی کسی ضرورت کے پیشِ نظر اسے ہر طرح سے اتنا سپورٹ کیا کہ وہ جو درمیانہ درجے کے ایک مکان میں رہتا تھا، پوش علاقے کے بنگلے تک پہنچ گیا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ خود سکندر علی بھی اس کی اصل شخصیت تک رسائی حاصل نہیں کرسکا جس کے آدمی اسے سپورٹ کررہے تھے۔ بہرحال، وہ تیزی سے کاروبار میں ہونے والی ترقی اور پھیلاؤ کے سبب کروڑ پتی کے بعد ارب پتی بن گیا، اس کی نجی زندگی کی مصروفیات جو اخلاق سے گری ہوئی تھیں، دولت کی فراوانی کے ساتھ بڑھتی گئیں۔ بدنامی سے بچنے کی خاطر اس نے شہر کے مضافاتی علاقے میں بہت بڑی زمین خرید کر وہاں اپنا فارم ہاؤس بنالیا۔ اس کے اطراف ایسی خاردار باڑھ بھی تعمیر کرادی جس سے کوئی جانور بھی گزر کر اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا، فارم ہاؤس کے اندر دو ریسٹ ہاؤس تھے، ایک سکندر علی کے لیے مخصوص تھا دوسرا...... ان اثر رسوخ رکھنے والے افراد اور سرکاری افسروں کے لیے تھا جو سکندر علی کی پشت پناہی کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ فارم ہاؤس میں ایک ہی داخلی راستہ تھا جہاں سکندر علی کے خاص اعتماد کے نمک حلال ملازم پہرا دیتے تھے۔ بعد میں اندرونی ریسٹ ہاؤس اور داخلی دروازے پر پہرا دینے والوں کا انچارج اس گونگے کو بنا دیا گیا جو صرف سن سکتا تھا لیکن قوتِ گویائی سے یکسر محروم تھا۔

''گونگے کی بھی ایک الگ کہانی ہے۔ فارم ہاؤس کا انچارج بنائے جانے سے قبل وہ سکندر علی کے ڈرائیور کی حیثیت میں خدمات انجام دیتا رہا تھا، سکندر علی کے بیان کے مطابق وہ گونگا اس کے کسی عزیز کا لاوارث تھا جس کی پرورش سکندر علی نے ترس کھا کر کی تھی...... جو کیس فائل میرے حوالے کی گئی وہ سکندر علی کے ایک ملازم کی نوبیاہتا بیوی سے متعلق تھی جسے پہلی ہی رات مردہ حالت میں اس کے کوارٹر سے پایا گیا۔ سکندر علی نے پولیس پر یہی شبہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی موت میں ملازم کا ہاتھ تھا۔ اس بیان کی وجہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بتاتے ہوئے سکندر علی نے کہا تھا کہ ملازم نے ایک موقع پر اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس شادی کو رکوا دے اس لیے کہ وہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ سکندر علی نے ملازم کو جھڑک کر ٹال دیا۔ یہ بیان ملازم (جسے پولیس نے گرفتار کرلیا تھا) کے بیان سے قطعی مختلف تھا، قتل کے جرم میں گلے گلے پھنسنے کے بعد ملازم نے چیخ چیخ کر پولیس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے خلاف کسی دشمن نے سازش کی ہے...... اس نے کہا تھا کہ سہاگ رات منانے سے قبل وہ کوٹھی کے کسی کام کو نمٹا رہا تھا جب دو آدمیوں نے اسے اچانک پیچھے سے نہ صرف دبوچ لیا بلکہ اس کے سر پر گلے تک کوئی سیاہ غلاف ڈال دیا جس کے سبب وہ کچھ نہیں دیکھ سکا، اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر زبان بند رکھنے کا حکم دیا گیا...... دو گھنٹے بعد اسے سیاہ غلاف سمیت اس کے کوارٹر میں دھکیل دیا گیا جہاں اس کی نو بیاہتا دلہن مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کا عروسی جوڑا مہکا مہکا نظر آرہا تھا۔ ملازم نے شور مچایا تو اس کے ساتھ کام کرنے والوں نے اسے پکڑ کر سکندر علی کے روبرو پیش کیا جس نے پولیس کو طلب کرکے اپنے مندرجہ بالا بیان کے ساتھ ملازم کو پولیس کی تحویل میں دے دیا...... ملازم کا احتجاج نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گیا۔ ملازم پر تین سو دو کی دفعہ عائد کی گئی اس لیے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی یہی درج تھا کہ مقتولہ کو گلا گھونٹ کا مارا گیا ہے۔

"کیس عدالت کے روبرو گیا تو ملازم کے سرکاری وکیل نے بھی سکندر علی اور ایک بڑے بیرسٹر کے آگے زیادہ بولنے کی حماقت نہیں کی چنانچہ اندھے قانون نے ملازم کو وکیلوں کی بحث اور سکندر علی کے بیان کی روشنی میں مجرم قرار دے کر عمر قید کی سزا سنا دی...... میری ذاتی تحقیقات کی روشنی میں مقتولہ اور ملازم دونوں مظلوم تھے جن کو ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت کسی نے ٹریپ کیا تھا...... کس نے؟...... میں یہ کھل کر نہیں کہہ سکتا۔

"جس روز میں پہلی بار سکندر علی کی کوٹھی پر تفتیش کے ارادے سے گیا، اسی روز میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خود میری حیثیت بھی اس تنکے سے مختلف نہیں تھی جو سمندر کے درمیان بپھری ہوئی سرکش موجوں کی زد میں آکر قطعی بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے خلافِ توقع بڑی آسانی سے کوٹھی کے ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا گیا، شاید سرکاری وردی کا کرشمہ تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا لیکن زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ ڈرائنگ روم میں میرے بیٹھنے کے بعد سکندر علی بھی آگیا۔ میرا تجربہ گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت بھی وہ نشے میں تھا، اس نے مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھا پھر...... اس سے پیشتر کہ میں مقتولہ کے سلسلے میں سوال جواب کا آغاز کرتا، ایک بھی ہوئی نوخیز کلی بھی ڈرائنگ روم میں آکر سکندر علی کا پہلو گرمانے لگی، یہ میری سرکاری وردی کے ساتھ سکندر علی کا پہلا حربہ تھا...... میں نے خود کو سنبھال کر ایک تفتیشی آفیسر کی حیثیت میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن پہل سکندر علی نے کی۔

"کس لیے وقت برباد کرنے یہاں تک آگئے......؟" یہ سکندر علی کی طرف سے گفتگو کا آغاز تھا جو اس نے پہلو میں بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی کو خود سے قریب تر کرتے ہوئے کیا تھا۔

"میں آپ کے ملازم کی بیوی کے قتل کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنے کی غرض سے......"

"میرے پاس بہت کم فالتو وقت ہوتا ہے سب انسپکٹر!" اس نے خشک لہجے میں بھویں سکیڑ کر کہا۔ "میں اپنا بیان پہلے ہی دے چکا ہوں، جب کیس عدالت کے روبرو جائے گا تو میرے وکیل عدالت سے بھی نمٹ لیں گے...... اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟"

"میرے لیے کاغذات کی خانہ پُری ضروری ہے جناب۔" میں نے مرعوب ہوتے ہوئے مدھم لہجے میں درخواست کی۔

"جاتے وقت تمہیں میرا منشی واپسی کا کرایہ بھی دے گا...... کبھی کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وقت لے کر آجانا، میں تمہیں دھتکاروں گا بھی نہیں۔"

پھر سکندر علی حسینہ کو پہلو میں لیے لیے ڈرائنگ روم سے واپس چلا گیا۔ میں اپنا سا منہ بنا کر فائل سمیٹتا باہر نکلا تو ایک منشی نے سامنے آکر ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنی اہمیت کا بھی احساس دلایا۔

"اس میں مالک کی طرف سے کرائے کے ہزار روپے موجود ہیں...... پہلے وزٹ پر کسی باوردی آفیسر کی یہی فیس ادا کی جاتی ہے۔"

میرا دل چاہا کہ جواب میں منشی کے منہ پر نفرت سے تھوک دوں لیکن میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرکے خاموشی سے لفافہ لیا اور کوٹھی سے باہر نکل کر سکون کا سانس لیا...... اس کے بعد مجھے ایس پی اینٹی کرپشن نے بھی اپنے دفتر بلا کر دبی زبان میں ایک غیر متوقع مشورہ دیا تھا...... "کاغذات کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی ایسی ہی

رپورٹ لکھنا جو حالات کی روشنی میں تم اپنے لیے بھی مناسب سمجھو......" میں نے حالات کا رخ بھانپ لینے کے بعد اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ سرکش موجوں کے ساتھ تیرنے کی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کروں۔ اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ شام کے اخبارات کچھ دنوں تک سکندر علی کے کیس کی سرخیاں لگاتے رہے...... جب انہیں بھی فیس مل گئی تو وہ بھی خاموش ہوگئے۔ عدالتی فیصلہ آنے کے بعد مجھے یہ فائل داخل دفتر کرانے کے آرڈر بھی مل گئے، جس کی تعمیل کے ساتھ میں اپنی فائنڈنگس بھی علیحدہ سے لگا رہا ہوں۔ لیکن کیس بند ہو جانے کے بعد بھی میرے ذہن میں ایک انجانے خوف کا احساس ہر وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ کسی دن اندھیرے میں سنسناتی ہوئی کوئی انجان گولی مجھے بھی ختم نہ کردے......"

"آخر میں یہ بھی لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدالت کا فیصلہ حق میں آجانے کے بعد سکندر علی نے بزرگوں کے مزار پر پابندی سے حاضری دینی شروع کردی تھی جس کی خبریں خاص طور سے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں، سکندر علی نے خود کو ایک نئے خول میں روپوش کرنے کی خاطر اپنی نجی مصروفیات بھی فارم ہاؤس تک محدود کردیں۔ اپنے نام کے ساتھ "شاہ" کا اضافہ کرکے وہ سکندر علی سے سکندر علی شاہ بن گیا، دنیا دکھاوے کے لیے کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ گونگے کو بھی ڈرائیور کی ذمے داریوں سے ہٹا کر فارم ہاؤس بھیج دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ ان پڑھ ہے۔ سب کچھ سن سکتا ہے، دیکھ بھی سکتا ہے لیکن کچھ کہنے کی صلاحیتوں سے یکسر محروم تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ گونگے کے پیچھے بھی کوئی ایسی ہی ملتی جلتی کہانی ہوگی جیسی اس بدنصیب ملازم کی قسمت میں لکھ دی گئی جو مظلوم ہونے کے باوجود مجرم اور قاتل ثابت ہوگیا تھا......"

اورنگ زیب نے پوری وجہ سے سب انسپکٹر کی پرسنل فائنڈنگس کو پڑھا پھر اس نے دوسرے کاغذات کا مطالعہ شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک سن کر فائل تکیے کے نیچے رکھ کر اٹھنا پڑا۔ دروازے پر سراج موجود تھا۔ اس نے اپنا ایک موبائل اورنگ زیب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کرنل احتشام کی کال ہے۔"

"ہیلو کرنل......" اورنگ زیب نے موبائل لے کر کہا۔ "اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"کچھ اہم اور ضروری اطلاع دینی ہے۔" کرنل نے اپنا جملہ جاری رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے افضل خان کی صلاحیتوں کے بارے میں جو خیال ظاہر کیا تھا...... وہ اس سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔"

"کوئی خاص بات؟"

"یس مائی ڈیئر...... اس نے وشنو کو دوبارہ ہمارے حوالے کرنے کی خاطر جو جال بنا تھا میں اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ اس کی طے شدہ ساری ٹائمنگس بھی ایک دم پرفیکٹ تھیں، تیس سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید وشنو باسٹرڈ ایک کارآمد آدمی کو شوٹ کر چکا ہوتا......" پھر کرنل نے ساری تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ "ایک اطلاع اس سے زیادہ اہم ہے جو آپ کو بھی کچھ دیر میں مل جائے گی......"

"وہ بھی بیان کردیں......" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کا لگژری اپارٹمنٹ اس وقت کسی کھنڈر کا نقشہ پیش کررہا ہے، وہاں سے آکٹوپس کا علامتی نشان بھی ملا ہے۔"

"اوہ......" اورنگ زیب چونکا۔ "آپ وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"افضل خان کی کارکردگی سنانے کی خاطر میں نے پہلے آپ کو اپارٹمنٹ کے نمبروں پر ٹرائی کیا تھا۔ جب لائن زیادہ دیر تک مصروف ملی تو محض ایک شبے کی بنا پر کچھ آدمی ادھر بھیج دیے۔ ان کی رپورٹس کے مطابق جو سادہ لباس والے وہاں نگرانی پر تعینات تھے وہ بھی مدہوشی کی حالت میں پائے گئے ہیں۔"

"یہ خبر میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔" اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے آپ سے ایک ذاتی شکایت ہے۔" کرنل نے شکوہ کیا۔ "ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنے سے پیشتر اگر آپ نے صرف ایک کال کردی ہوتی تو آئی جی کے فورفادرس...... تک بھی کوئی ایسا قدم اٹھانے کی جرأت نہ کرتے...... اب بھی دیر نہیں ہوئی، میری ذاتی کوشش یہی ہوگی کہ کل شام تک آپ کو دوبارہ اپنی سیٹ پر منتقل کردیا جائے۔"

"ابھی مناسب نہیں ہوگا کرنل......" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے جان بوجھ کر اس کے آرڈر کی تکمیل ضروری سمجھی تھی۔"

"اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے......؟"

"یہ میں آپ کو تفصیل سے بتانا چاہوں گا۔"

"او۔کے۔ آپ کل شام کی چائے میرے ساتھ پئیں۔" دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراج کے ذریعے اپارٹمنٹ کی تباہی کی خبر الماس کو ملی تو وہ بھی آگئی، بڑی دیر تک پھر ان کے درمیان گفتگو کا ایک ہی موزوں رہا...... ''آکٹوپس......''

دوسری شام اورنگ زیب کرنل احتشام کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا، دروازے کی ریڈ لائٹ روشن ہونے کے بعد کسی کے اندر آنے کے امکانات بھی ختم کردیے گئے تھے۔ دونوں کے درمیان سنجیدگی سے اہم ترین گفتگو ہورہی تھی، اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کی مکمل فائل کی ورق گردانی بھی کرلی تھی۔ اس کے اہم نکات بھی اس کے ذہن میں تھے لیکن سب سے پہلے اس نے اپنا تبادلے اور آئی جی کی پوزیشن کا ذکر مناسب سمجھا۔

کرنل اس کی بات کو توجہ سے سن رہا تھا۔ مکمل تفصیل سننے کے بعد اس نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئی جی کا تبادلہ بھی اس صوبے میں کسی مقصد کے تحت ہی کیا یا کرایا گیا ہوگا۔''

''آئی ایگری ودیو......'' اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ''ہمارے ملک میں کالی بھیڑوں کی تعداد بھی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہیں۔''

''جانتا ہوں مسٹر اورنگ زیب لیکن حالات کے پیش نظر میں بھی آپ کو ایک دوستانہ حکم دینا چاہوں گا۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟''

''جو قدم ملک کی بہتری کے لیے ہو، اس میں خود بھی اپنے آپ کو حالات کا پابند ہی سمجھتا ہوں۔'' اورنگ زیب نے کرنل احتشام کا اشارہ بھانپ کر کہا۔ ''تبادلے کے بعد بھی میں کسی صورت بھی آکٹوپس کو زندہ یا مردہ قانون کے حوالے کرنے کی ذمے داری سے خود کو سبکدوش نہیں سمجھوں گا۔''

''میں بھی یہی درخواست کرنا چاہتا تھا۔'' کرنل احتشام نے پہلو بدل کر کہا۔ ''ایک بات اب اور بھی ہمارے لیے اہم ہوگئی ہے...... یہ معلوم کرنا کہ آئی جی کس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔''

''میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اپنے دفتر میں زبان کھولنے کی حماقت نہیں کرے گا...... غالباً اس کی تمام کالوں کو کہیں سنا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے بھی قابلِ اعتماد سمجھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد ہی سخت لہجے میں گفتگو کی تھی۔''

''پھر...... آپ کے ذہن میں اس کی زبان کھلوانے کا کیا طریقہ ممکن ہوسکتا ہے؟''

''آپ کسی اہم آفیشل کال کے ذریعے اسے اپنے ہیڈ کوارٹر طلب کرسکتے ہیں۔ گفتگو کے دوران سرسری طور پر میرے تبادلے کا ذکر چھیڑ دیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ازخود اپنی پوزیشن واضح کردے۔''

''گڈ...... یہی مناسب ہوگا......''

اورنگ زیب نے آئی جی کے سلسلے میں گفتگو ختم ہونے کے بعد محتاط لہجے میں کہا۔

''ایک اہم نام اور کھر سامنے آیا ہے...... سکندر علی شاہ۔''

''میری فائل پر بھی اس کا نام ہے لیکن یہ رپورٹ بھی موجود ہے کہ کسی قتل میں ملوث ہونے کے شبہے میں عدالت کی طرف سے بے گناہ قرار دیے جانے کے بعد اس نے خود کو محدود کرلیا ہے......''

''بہ ظاہر ایسا ہی ہے۔'' اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''میں نے فائل کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ اب بھی قانون کی توجہ کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نام بھی میری فہرست پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔''

''اوہ......'' کرنل چونکا۔ ''آپ کو میرے علاوہ اوپر سے بھی فری ہینڈ ملا ہوا ہے۔ پھر رکاوٹ کس بات کی ہے؟''

''وقت کی نزاکت بہت اہم ہے کرنل...... اگر میں دشمنوں کا شکار ہوگیا تو سارے کانفیڈنشلز بھی میرے ساتھ دفن ہوجائیں گے اس لیے میں گزارش کروں گا کہ آپ کے کمانڈوز بھی آپ کے اشارے پر میرا کچھ ہاتھ بٹائیں تو آکٹوپس کو تلملا کر سمندر کی سطح پر اوپر بھی لایا جاسکتا ہے۔''

''مجھے آپ کا یہ جملہ سن کر دکھ ہوا مائی ڈیئر......'' کرنل کا لہجہ حد درجہ دوستانہ تھا۔ ''قوم کے دشمنوں کو بے نقاب کرنے کی خاطر ایسی گزارشات کیا ہمیں زیب دیتی ہیں؟...... آپ مجھے حکم دیں...... کیا کرنا ہے۔''

اس کے بعد اورنگ زیب نے زبان نہیں ہلائی۔ سامنے رکھے پیڈ کو اٹھا کر اس پر کچھ لکھتا رہا پھر اسے کرنل کی طرف بڑھا دیا۔ کرنل احتشام نے اس کی لکھی ہوئی عبارت غور سے پڑھی۔ پہلے اس کاغذ کو ضائع کیا پھر مسکرا کر بولا۔

''آپ کی خاموشی بتارہی ہے کہ شاید آپ کو میرے دفتر کے فون بھی ٹیپ کیے جانے یا کہیں سنے جانے کا اندیشہ لاحق ہے؟''

''یہ بھی احتیاط کا ایک انداز ہے۔'' اورنگ زیب نے بھی اشاروں میں جواب دیا پھر وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ اسے خوشی تھی کہ کرنل احتشام نے نہ صرف اس کی تحریر کردہ گزارشات پر عمل کرنے کا اشارہ دیا تھا بلکہ اس نے

اورنگ زیب کے علاوہ سراج، افضل خان، میڈم روبی اور لیاقت حسین وغیرہ کی نگرانی پر اپنے خاص دستے کے سادہ لباس والے تعینات کرکے انہیں مکمل اختیار کے علاوہ...... فوری اور بروقت ایکشن لینے کا حکم نامہ بھی جاری کردیا تھا۔

☠☠☠

ہنی مون بیوٹی پارلر کی پک اینڈ ڈراپ وین میں اس وقت جونی تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کی خوب صورت معصوم اور بھرے ہوئے خدوخال کی لڑکی بھی تھی۔ جونی ایک بار اسے پہلے بھی پوش علاقے کے بنگلے سے لاچکا تھا، اس بار بھی لڑکی کو وین میں اس کے بنگلے پر بھیجا گیا تھا لیکن اس وقت اسے شیلا ورما نے جونی کو واپسی سے قبل اپنے آفس میں بلا کر مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟''

''میں نے یہ جاننے کی کوشش پہلے بھی نہیں کی۔'' جونی نے بے پروائی سے کہا۔ ''صرف کام سے کام رکھتا ہوں۔''

''اس کی مالیت میرے لیے دو لاکھ ہے۔'' شیلا نے کاروباری انداز میں جواب دیا۔ ''تمہارا کمیشن بھی اسی اعتبار سے ملے گا۔''

''کہاں پہنچانا ہے؟''

''یہ بات مجھے بھی نہیں معلوم بہرحال، اس کی پہلی منزل کے سلسلے میں جو حوالہ دیا گیا ہے وہ میرے لیے بھی حیران کن ہے۔''

''جو بات تم مجھ سے کہتی رہی ہو...... آج خود سے بھی کہہ ڈالو...... آم کھانے سے غرض رکھو، پیڑ گننے سے کیا فائدہ؟''

''یو آر رائٹ۔'' شیلا نے شانے اچکا کر کہا۔ ''تم اسے لے کر پوش علاقے جاتے ہوئے، راستے میں پڑنے والے جم سپر اسٹور کی پارکنگ میں رکو گے، لڑکی سے یہی کہنا کہ تمہیں کوئی ضروری چیز خریدنی ہے...... جس نے سپلائی کا آرڈر دیا ہے اس کے آدمی خود ہی لڑکی کو وین سے اٹھا لے جائیں گے...... یہ تمہارے لیے بھی سیف (Safe) رہے گا، اس قسم کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔''

''جانتا ہوں۔'' جونی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر باہر آکر وین میں بیٹھ گیا۔

لڑکی جس کا نام بینا تھا وہ پچھلی نشست پر بیٹھی ایک فیشن میگزین کے اوراق میں گم تھی، یہ پہلا موقع تھا جب جونی کو وہ لڑکی پسند آئی تھی، اس کی نظریں بار بار بیک ویو مرر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے کئی بار سوچا کہ لڑکی کو

بات ہے سمجھ کی

☆دادو یہ اخروٹ آپ کے پاس چھپا رہا ہوں کیونکہ آپ کے منہ میں دانت نہیں ہیں ناں۔

☆''ارے گڑیا! آنکھیں بند کرکے املی کیوں کھا رہی ہو؟''

''دادو میں نے وعدہ کیا تھا کہ املی کی طرف نہیں دیکھوں گی۔''

☆مس گدھے اور زیبرے میں صرف لباس کا فرق ہے۔

☆چاقو دیکھ کر بچے نے کہا یہ آری کا بچہ ہے جس کے دانت نہیں نکلے۔

☆''امی وہ دیکھیں اس آدمی کے سر پر بال نہیں ہیں۔''

''چپ کرو بیٹا وہ سن لے گا۔''

''کیا اسے یہ بات معلوم نہیں۔''

☆گھر داماد سے تین سالہ بیٹی نے پوچھا آپ کی ممی کدھر ہیں یہ تو میری دادو ہیں آپ کی ممی؟

☆امی آپی کے بعد آپ نے بھیا کی بھی شادی کردی ہے لیکن ابو بوڑھے ہورہے ہیں ان کی شادی کب کریں گی؟

☆مس کمپیوٹر کے مدر بورڈ کا آپ کو معلوم ہے لیکن فادر بورڈ؟

☆''تمہارے بھائی نے بولنا شروع کیا؟''

''اسے بولنے کی کیا ضرورت ہے وہ روتا ہے تو اسے ہر چیز دے دی جاتی ہے۔''

☆پاپا بڑوں کا علم زیادہ ہوتا ہے نا تو ٹیلی فون گراہم بیل نے ایجاد کیا اس کے پاپا نے کیوں نہ کیا۔

مرسلہ: مقبول حسین، خوشاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

مخاطب کرے مگر...... اس نے دل پر جبر کر کے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ یہ محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ بینا نے ازخود اسے مخاطب کیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟......''

''جونی......'' اس نے مختصراً کہا۔

''کرسچن ہو......؟'' بینا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''لگتے تو نہیں......!''

''مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ کبھی میرا نام جان محمد تھا پھر حالات نے کئی تبدیلیوں کے بعد مجھے جونی بنا دیا۔''

''انٹرسٹنگ'' بینا نے معصومیت سے کہا پھر بولی۔ ''وین سپر اسٹور پر ایک منٹ کے لیے روک لینا، مجھے ایک چیز لینی ہے، زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

جونی مسکرا دیا، اسے جس ہدایت پر عمل کرنا تھا اسے بینا نے ازخود آسان بنا دیا تھا۔ اس نے وین سپر اسٹور کے باہر پارکنگ سے ذرا ہٹ کر روک دی، بینا نے اپنا پرس اٹھا کر شانے پر ڈالا پھر اتر کر سپر اسٹور میں چلی گئی۔ جونی کی نظریں بہ دستور بینا پر مرکوز تھیں جب اس کے ذہن میں اچانک مس ڈکسن کا کہا ہوا ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونجا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو شیلا ورما کی دنیا سے کہیں دور چلے جاؤ...... کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو......''

جونی نے اس جملے کو ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن پھر سپر اسٹور کے اندر اور باہر ہونے والی ہلچل نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، تین افراد آپس میں دست و گریبان ہو کر سپر اسٹور سے باہر نکلے تھے، ان کے پیچھے کچھ تماشائی بھی تھے، باہر کھڑے لوگ بھی لڑنے والوں کے قریب جمع ہو رہے تھے جب جونی کی نگاہ بینا پر پڑی، وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ دو سوٹڈ بوٹڈ جوان بھی تھے، جو دائیں بائیں چل رہے تھے۔

جونی، بینا کے چہرے پر نظر آنے والی بے بسی دیکھ کر بھانپ گیا کہ وہ کسی مخصوص دھمکی کے بعد ہی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ جونی کی نظریں بینا اور دونوں جوان افراد پر جمی رہیں، وہ تیز تیز قدم اٹھاتے باہر آئے پھر ایک گاڑی کا دروازہ کھول کر آگے پیچھے عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی بینا کو درمیان میں رکھا گیا تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی بھی تیزی سے حرکت میں آگئی۔

شیلا ورما کے بیان کے عین مطابق دو لاکھ آفر کرنے والے فرد کے ہرکارے بینا کی ڈیلیوری سپر اسٹور سے لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ جونی ایک لمحے تک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بینا کے بارے میں سوچتا رہا جو کسی معصوم کبوتری کی طرح عقابوں کے چنگل میں پھنس چکی تھی پھر...... اس نے وین کو گیئر میں ڈال کر واپس جانے میں دیر بھی نہیں لگائی لیکن کوئی احساس تھا...... کسی نادیدہ خطرے کا الارم تھا جو اس کے وجود میں پہلی بار گونج رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد......

سلور کلر کی وہ نسان سیلون اس وقت ملٹری انٹیلی جنس کے احاطے میں کھڑی تھی۔ سوٹڈ بوٹڈ دونوں جوان اور بینا انٹروگیشن روم کے ساؤنڈ پروف کمرے میں علیحدہ علیحدہ کرسیوں پر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے، ان کے سامنے کرنل احتشام اپنی مخصوص نشست پر موجود تھا، اس کے برابر ایک اور شخص تھا جس کے چہرے سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ میک اپ میں ہے، اس میک اپ میں وہ بہ ظاہر کوئی غیر ملکی ہی لگ رہا تھا۔ بیرونی دروازے پر دو مسلح افراد اٹینشن پوزیشن میں موجود تھے۔

کرنل احتشام کی تیز نظریں باری باری سامنے موجود دونوں جوانوں اور بینا کے چہرے کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔ بینا بری طرح سہمی اور گھبرائی گھبرائی نظر آرہی تھی، اس کے برعکس دونوں جوان کرنل احتشام کو وضاحتی نظروں سے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ ان دونوں کو کسی جرم کی پاداش میں وہاں لایا گیا ہے۔

انٹروگیشن روم میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر کرنل احتشام نے بینا کو مخاطب کیا۔

''تمہارا نام......؟''

''بینا......'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں مختصر جواب دیا، اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی خوف اور آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔

''گھبراؤ مت......'' کرنل نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ ''تم اب محفوظ ہاتھوں میں ہو لیکن موجودہ حالات کے پیشِ نظر مجھے تمہارے بارے میں ضروری معلومات اور بے خوف بیان کی ضرورت ہے۔ ایک بات اور ذہن نشین کر لو، تم میرے لیے بیٹی ہی کی طرح ہو، ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بھی سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہے۔''

بینا کے لیے کرنل کی بات تازہ زخم پر مرہم ثابت ہوئی۔ اس نے ایک بار کرنل کے چہرے کو تشکرانہ نظروں سے دیکھا پھر نظریں جھکا کر بنا کم و کاست پوری تفصیل سناتی چلی گئی۔ وہ خاموش ہوئی تو کرنل نے ایک جوان کی طرف دیکھا۔

''تم کیا کہو گے......؟''

''یہ لڑکی جھوٹی ہے۔'' جوان نے تلملا کر جواب دیا۔ ''ہمیں پھنسانے کی خاطر اپنی معصومیت کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔''

''پھر...... سچ کیا ہے؟''

''اس نے ہم سے لفٹ مانگی تھی۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم نے اسے معصوم سمجھا اور ترس کھا کر لفٹ دے دی۔''

''تم بھی کچھ کہنا پسند کرو گے؟'' کرنل نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

''میں اپنے پارٹنر کی بات کی تائید کروں گا۔'' دوسرے نے بھی ڈھٹائی سے کہا۔ ''ہم بزنس مین ہیں، حکومت کو باقاعدہ ٹیکس ادا کرتے ہیں، جس سپر اسٹور پر سب کچھ ہوا اس کا مالک بھی ہم سے واقف ہے۔ آپ اس سے بھی ہمارے بارے میں دریافت کر سکتے ہیں۔''

کرنل کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اس نے قریب بیٹھے ہوئے ساتھی کی طرف دیکھا جس نے زبان کھولنے کے بجائے صرف مسکرا کر یہ اظہار کیا کہ دونوں جوان دروغ گوئی کر رہے ہیں۔ کرنل نے دوبارہ باری باری دونوں جوان کو دیکھا پھر اس کے لہجے میں تناؤ آگیا۔

''کیا تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے؟''

''یہ سراسر زیادتی ہے کرنل صاحب۔'' ایک نے احتجاج کیا۔ ''آپ کو اگر ہم پر شبہ ہے تو معاملہ عدالت کے حوالے کر دیں، ہمارا وکیل......''

''شٹ اپ......'' کرنل نے کرخت آواز میں کہا۔ ''ہم جو کیس ہاتھ میں لیتے ہیں اس کا فیصلہ بھی خود کرتے ہیں۔ کیا سچ ہے، کیا جھوٹ، ہمیں اس کو اگلوانا بھی آتا ہے۔''

''پلیز، سر......'' بینا نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ میرے گھر بھیج دیں......''

کرنل نے ساتھ بیٹھے ہوئے فرد کو دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھا۔ اس کے اشارے پر بینا بھی اٹھی پھر وہ دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔

''یہ بھی یک طرفہ کارروائی ہے۔'' ایک جوان نے جھلا کر کہا۔ ''جو فساد کی جڑ تھی آپ نے اسے جانے دیا۔ اب ہمیں کس مقصد سے روکا گیا ہے......؟''

''ہم فوجی لوگ ضرور ہیں مائی ڈیئر لیکن اتنے بے مروت بھی نہیں کہ گھر آئے مہمانوں کو کسی خاطر و مدارت کے بغیر جانے دیں۔'' کرنل نے زہرخند سے کہا پھر اس نے دروازے پر موجود مسلح جوانوں کو اشارہ کیا تو وہ ان دونوں کو ان کی چیخ و پکار کے باوجود گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ کرنل نے ان کے جانے کے بعد گاڑی کے ڈرائیور کو طلب کیا۔

''تم ان جوانوں کے پاس کب سے ملازم ہو......؟''

''آج تیسرا دن ہے جناب۔''

''اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے......؟''

ڈرائیور نے جو حوالہ دیا کرنل نے فون پر فوری طور پر اس کے بیان کی تصدیق بھی کر لی۔ ڈرائیور نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا۔ ''اس لڑکی کو سپر اسٹور سے اٹھانے کے سلسلے میں تم کیا کہو گے......؟'' کرنل نے دوستانہ لہجے میں اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

''میں خود بھی کچھ نہیں سمجھ سکا بڑے صاحب۔'' ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ ''مجھ سے یہی کہا گیا تھا ان کی بہن گھر سے بھاگ کر اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہے جسے وہ واپس گھر لانا چاہتے تھے لیکن راستے میں ان دونوں نے لڑکی سے جو باتیں کیں وہ کوئی بھائی اپنی بہن سے نہیں کر سکتا...... میں غریب آدمی ہوں جناب، جھوٹ نہیں بولوں گا، آپ کو اپنا تحریری بیان بھی دینے کو تیار ہوں...... یہاں نہ لایا گیا ہوتا تب بھی میں پہلی فرصت میں ملازمت چھوڑنے کا عہد کر چکا تھا۔''

''گڈ......'' کرنل نے ڈرائیور کو ستائشی نظروں سے دیکھا پھر اپنے اسٹینو کو بلا کر اس کا بیان لکھوایا جس پر ڈرائیور نے اپنے ٹوٹے پھوٹے دستخط کے علاوہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات بھی بہ خوشی لگا دیے۔

چالیس منٹ بعد دونوں جوانوں کو ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد کرنل کے روبرو پیش کیا گیا تو ان کا سارا ''کلف'' بھی اتر چکا تھا، ان دونوں نے تسلیم کیا کہ ان کی خدمات صرف اسی غرض سے حاصل کی گئی تھیں کہ وہ لڑکی کو سپر اسٹور سے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے ایک مطلوبہ کوٹھی تک پہنچا دیں۔ اس کام کے لیے انہیں دس ہزار فی کس دینے کا معاوضہ طے ہوا تھا۔

کرنل نے ان کے تحریری بیان حاصل کرنے کے بعد انہیں تمام ضروری دستاویز اور اسلحہ جات کے ساتھ سول پولیس کے حوالے کر دیا۔ یہ ہدایت بھی کر دی کہ اسے تمام کارروائی اور اس کے نتائج سے بھی باخبر رکھا جائے۔

❀❀❀

سکندر علی شاہ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم سے ملحقہ حجرے میں بیٹھا تین چار عقیدت مندوں سے گفتگو میں مصروف تھا جب اس کے موبائل کی ٹیون کی آواز ابھری،

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے روشن اسکرین پر نمبر دیکھے پھر لائن کاٹ دی، وہ نمبر اس کے جانے پہچانے نہیں تھے۔ موبائل اس نے گاؤ تکیے کے ساتھ تخت پر بچھے قیمتی قالین پر واپس رکھ دیا۔ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ اس شخص کی جانب دیکھا جو بہ دستور سامنے فرش پر بیٹھا بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے سکندر علی شاہ کو دیکھ رہا تھا۔

''کون تھا حضرت؟'' اس نے دبی زبان میں دریافت کیا۔

''ہوگا کوئی اللہ کا ضرورت مند بندہ۔'' سکندر علی شاہ نے تسبیح کے دانوں پر انگلیاں گھماتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم نے ابھی جو دکھڑا سنایا تھا...... اس کی وجہ جانتے ہو......؟''

''جانتا ہوتا تو آپ کو کیوں زحمت دیتا حضرت؟''

''میں تمہارے جواب کو بھی عقیدے کی کمزوری کہوں گا...... انسان جب خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستوں کو بھول کر اپنی من مانی شروع کردے تو پھر اسے بلائے ناگہانی سے واسطہ تو پڑتا ہے، سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

''آپ بجا فرما رہے ہیں حضرت۔'' عقیدت مند نے انکساری سے کہا۔ ''یہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے لیکن...... اب آپ ہی میری پریشانیوں کا...... کوئی حل بھی بتا دیں، میں بڑی عقیدت سے آپ کے قدموں میں حاضر ہوا ہوں۔''

''تم...... مجھے گناہ گار کر رہے ہو۔'' سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر پاٹ دار آواز میں جواب دیا۔ ''سوائے اللہ کے کوئی دوسری طاقت بندے کی مشکل حل نہیں کرسکتی...... اس قادر مطلق کے ننانوے ناموں میں بھی بڑی برکت ہے۔ تم باقاعدگی سے اس کے حضور سجدہ کرو۔ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو اور صبح وشام نمازوں کی پابندی کرتے رہو۔ انشاء اللہ اسی کے کرم سے تمہاری پریشانیاں بھی دور ہوجائیں گی۔''

''بڑی مہربانی حضرت۔''

ایک عقیدت مند کے جانے کے بعد سکندر علی شاہ نے دوسرے کی طرف توجہ دی، اسی وقت موبائل پر دوبارہ ٹیون سنائی دی، اس بار بھی وہی نمبر تھے جو پہلے نظر آئے تھے۔ سکندر علی شاہ نے منہ بنا کر موبائل آن کرلیا، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کی تعریف؟''

''اپنے ماضی میں جھانک کر دیکھو......'' دوسری جانب سے رعب دار آواز ابھری۔ ''ہوسکتا ہے کہ تم کو اپنی اوقات بھی نظر آجائے۔''

''بجا ارشاد لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں......'' سکندر علی شاہ نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

''تمہارے سامنے آجاؤں تب بھی نہیں پہچان سکو گے۔'' اس بار بولنے والے کا لہجہ درشت ہوگیا۔ ''ویسے اپنی شناخت کے لیے تمہیں صرف ایک حوالہ دے سکتا ہوں...... شکرہ۔''

''اوہ...... آپ!'' سکندر علی شاہ، شکرہ کے حوالے پر چونکا، اس کے چہرے کا کھنچاؤ ایک لمحے میں ختم ہوگیا۔ ''میں حجرے سے اٹھ کر اندر تخلیے میں جا رہا ہوں، وہیں سے بات ہوسکے گی۔''

اس نے حجرے میں موجود باقی عقیدت مندوں سے معذرت کی پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ شکرے کے حوالے کے بعد اس کے ذہن میں ماضی کے بہت سارے پردے یکے بعد دیگرے سرکتے چلے گئے۔ ڈرائنگ روم میں آکر اس نے پہلی فرصت میں آنے والی کال کے نمبروں کو آزمایا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی بڑی عاجزی سے بولا۔

''آپ نے بڑے طویل عرصے کے بعد یاد کیا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں آپ ہی کی وجہ سے ہوں لیکن افسوس کہ آپ نے کبھی مجھے قریب آنے کی اجازت نہیں دی۔''

''اب بھی نہیں دوں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا سکندر علی...... تم کل بھی...... ہر لمحہ میری نظروں کے سامنے تھے اور آج بھی تمہارا ایک ایک لمحہ میری عقابی نظروں سے اوجھل نہیں ہے......'' اس بار تحکمانہ لہجے میں جواب ملا پھر بات جاری رکھی گئی۔ ''اس وقت میں تم سے اس لڑکی کے بارے میں دریافت کروں گا جو تمہارے شکاری کتوں کے ہاتھ آکر نکل گئی۔''

''مجھے اس کی اطلاع مل چکی ہے جناب اور میں......''

''بکواس نہیں سننا چاہتا......'' دوسری جانب سے اس کی بات کاٹ کر حقارت سے سوال کیا گیا۔ ''جس طرح سپر اسٹور پر کچھ آدمیوں نے جھگڑے کا ڈراما رچا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرلی تھی اسی طرح تمہارے شکاری کتوں کو بھی پکڑے جانے کے بعد اپنی زندگی ختم کرلینی چاہیے تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر تک جانے کی نوبت کیوں آئی؟''

''حکم ابھی ان دونوں تک پہنچا دیا جائے گا۔''

سکندر علی شاہ نے عاجزی سے دریافت کیا۔ ''لڑکی کے لیے کیا حکم ہے؟''

''معلوم کرو کہ اس نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے؟ ایک بات اور گرہ سے باندھ لو، میں دوبارہ اس قسم کی غفلت برداشت نہیں کروں گا...... یہ بھی یاد رکھنا تم خود بھی بارود کے اس ڈھیر پر بیٹھے ہو جس کو اڑا دینے کا ریموٹ میرے پاس ہے۔''

''جج...... جانتا ہوں۔'' سکندر علی شاہ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''نگینہ کو بھی نکیل ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس کا بیوٹی پارلر آنا جانا فوری بند کرو...... یہ بھی کہہ دینا کہ اب وہ کبھی کسی دوسری جگہ بھی جونی سے ملاقات کرنے کی غلطی نہ کرے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں......''

''جن نمبروں پر تم نے اس وقت کال کیا ہے اس کو بھول جاؤ...... میں ایک نمبر کو بار بار استعمال کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہوں گا؟''

''کہو......''

''بیوٹی پارلر اور خوب صورت لڑکیوں کا معاملہ میں نے جس کے سپرد کر رکھا ہے وہ بھی مجھے نہیں جانتا۔ اس کو ہدایت بھی کوئی اور دیتا ہے۔ یہ احتیاط بھی آپ کے اشاروں کی روشنی میں کی گئی تھی۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو......؟'' سرد اور سپاٹ لہجے میں دریافت کیا گیا۔

''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کچھ عرصے کے لیے......''

''کس بات سے خوف زدہ ہو......؟'' اس کی بات کاٹ کر سوال کیا گیا۔

''میں نے محض احتیاط کی خاطر......''

''نہیں......'' دوسری جانب سے بہ دستور جھڑک کر کہا گیا۔ ''کیا صحیح ہے...... کیا غلط۔ یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔''

سکندر علی شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''جو دو آدمی اس وقت پولیس کی تحویل میں ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟''

''وہ...... وہ...... میرا خیال ہے کہ اس خطرے کو جڑ سے ختم کرا دوں۔''

''گڈ...... تم نے اس وقت وہی جواب دیا جو میں چاہتا تھا۔''

''اور کوئی حکم......!''

''میرا ایک ہیرا کہیں پھنس گیا ہے لیکن وہاں تک جانا

سنہرے اقوال

☆ انسان علم کو سیکھتا ہے جب کہ علم انسان کو سکھاتا ہے۔

☆ علم اور عمل کا رشتہ ایسا ہے جیسے جسم اور روح کا۔

☆ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں دیتا۔

☆ نہ کسی کا حق کھاؤ نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔

☆ اولاد کی والدین سے محبت کا امتحان والدین کی بیماری، بڑھاپے اور اولاد کی شادی کے بعد ہوتا ہے۔

☆ کسی کے ساتھ اچھائی یا برائی کرنا دراصل اپنے ساتھ اچھائی یا برائی کرنا ہے۔

☆ اگر بیتے ہوئے وقت کے تاثرات سدا ذہن پر روزِ اوّل کی طرح ثبت رہیں تو دوست کبھی دشمن نہ بنتے اور دشمن کبھی دوست نہ بنتے۔

☆ دیکھنے والی نگاہ حسین ہے تو ہر چہرہ حسین نظر آتا ہے۔

☆ انسان کے دو مشیر اس کے دل اور دماغ ہیں۔

☆ دوست کی محبت کی پرکھ اس کے غصے کے وقت ہوتی ہے۔

☆ ہر شہر ہر گاؤں میں ایک نہ ایک فتنہ ضرور موجود ہوتا ہے۔

☆ گالی تو جاہلوں کی زبان ہے۔

☆ شیطان کے بعد انسان کا دوسرا بڑا دشمن اس کا نفس ہے۔

☆ ضرورت سے زیادہ کھانا بھی نفس کی سرکشی کی دلیل ہے۔

☆ جس کا کوئی نہ ہو اس کا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، علی پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھیں...... سکندر علی...... ایک بار صرف اس وقت مایوس ہوا تھا جب اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھا تھا، اس کے بعد آپ نے جو قوت بخشی اس نے مجھے کسی معاملے میں ہارنے نہیں دیا۔"

"جانتا ہوں...... اور یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری اڑان کہاں تک ہے......بس، وہیں تک محدود رہو۔"

"میں انکار یا اصرار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" سکندر علی شاہ نے بڑی چرب زبانی سے کہا۔ "آپ کا ایک تصوراتی عکس ہے جو میرے ذہن میں پارے کے مانند مچلتا رہتا ہے، کبھی کبھی تشنگی کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔"

"مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے...... جو کہا گیا ہے اس پر فوری عمل ضروری ہے۔ جو نہیں کہا...... اس پر غور کرنے کی حماقت نہ کرنا۔" دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔

سکندر علی نے سکون کا سانس لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی کمتری کا احساس بھی بڑی شدت سے ہوا تھا، ایک لڑکی کے سلسلے میں اس کے غلاموں کے زرخرید کتوں سے جو غلطی ہوئی اس نے اسے آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر منہ کے بل زمین پر پھینک دیا تھا۔ پہلے کی تمام خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا مگر...... وہ مجبور تھا، ذہن میں متحرک کسی خیالی ہیولے سے ٹکرانا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ سامنے ہوتا تو بھی شاید وہ اس کی جرأت نہ کر سکتا جو سوچ رہا تھا۔ اس نے ملازم کو بلا کر کہا کہ جو مرید باقی رہ گئے ہیں انہیں کوئی معقول بہانہ کر کے رخصت کر دیا جائے۔ ملازم کو ہدایت دینے کے بعد اس نے موبائل پر ایک نمبر ملایا۔ اس عمل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیشانی پر ابھرنے والی شکنیں بھی دوچند ہو گئی تھیں۔

"خادم بول رہا ہوں سر......" دوسری جانب سے کال ریسیو کرنے والے نے نہایت عاجزی سے دریافت کیا۔ "کوئی نئی خدمت؟"

"نہیں......" سکندر علی شاہ نے بدلی ہوئی آواز...... اور کرخت لہجے میں کہا۔ "ان کتوں کا کیا ہوا جو فی الوقت پولیس کی حراست میں ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ انہیں ان کی غلطی کی سزا ملنا ضروری ہے۔"

"بکواس مت کرو...... میں نے تم سے کوئی تجویز نہیں مانگی۔"

"سوری سر......"

"میرا حکم غور سے سنو۔" سکندر علی شاہ نے غرا کر کہا۔ "پہلی فرصت میں انہیں اوپر پہنچا دو۔ دیٹ از آل۔" اس حکم کے ساتھ اس نے موبائل کو آف کر دیا پھر وہ اس خواب گاہ میں آ گیا جہاں اس کی دوسری بیوی نگینہ ابھی تک ڈریسنگ گاؤن پہنے لیٹی کسی فلمی رسالے کے اوراق الٹ پلٹ رہی تھی۔ اس نے سکندر علی شاہ کو دروازے پر کھڑا دیکھا تو ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر اٹھی۔ خراماں خراماں چلتی اس کے قریب آ گئی، آنکھوں سے بجلیاں گراتے مترنم آواز میں پوچھا۔

"آج مریدوں سے اتنی جلدی چھٹی مل گئی؟"

"تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ضروری بات اور...... اس وقت۔" اس نے پھر بازاری انداز میں سکندر علی شاہ کی نظروں میں جھانکا۔ "کیا دروازہ بند کروں؟"

"ہاں...... لیکن خواب گاہ کا نہیں۔" سکندر علی نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اس دروازے کی بات کر رہا ہوں جو تم نے جونی کے لیے کھول رکھا ہے، آئندہ تم جونی سے کہیں ملنے کی حماقت نہیں کرو گی۔ بیوٹی پارلر جانا بھی بند کر دو...... میرا اشارہ شیلا کے بیوٹی پارلر کی طرف ہے۔"

"جونی شیلا ورما کے ہاں منیجر کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس لیے کبھی کبھی اس سے آمنا سامنا بھی ہو جاتا ہے۔" نگینہ نے سنبھل کر جواب دیا۔ "کسی نے آپ کے کان بھر دیے ہیں...... کون ہے وہ؟"

"وہی جس کے کہنے پر میں نے تمہیں داشتہ سے بیوی بنا لیا تھا۔" سکندر علی شاہ نے نگینہ کو زبان کھولنے سے پیشتر اس کی حیثیت کا احساس بھی دلا دیا۔ "یہ بھی مت بھولو کہ تم اسی کے اشارے پر جھونپڑے سے نکل کر محلوں تک آ گئیں۔ اسی کے اشارے پر تمہاری واپسی کا سفر بھی ناممکن نہیں ہوگا۔"

"میں نے جونی کے سلسلے میں صرف وضاحت کی تھی ڈارلنگ۔" نگینہ نے موقع کی نزاکت بھانپ کر چولا بدلا۔ "تمہاری خاطر تو میں جونی اور شیلا ورما کیا...... پوری دنیا کو لات مار سکتی ہوں۔"

"اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"

"تم اس وقت تھکے تھکے لگ رہے ہو۔" اس نے سکندر علی شاہ کے قریب جا کر اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ "تمہیں صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے جو میرے پاس ہے۔ پلیز اس وقت میری خاطر انکار نہ کرنا۔"

سکندر علی شاہ جواب دینے کے بجائے قدم بڑھاتا قیمتی دیوان پر جا کر نیم دراز ہو گیا۔ نادیدہ محسن کی کال نے اسے اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا...... نگینہ نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کیا پھر...... ڈریسنگ ٹیبل کی ایک خفیہ دراز کو چور میکنزم سے کھول کر پلاسٹک کی گول ڈبیا نکالی، لہراتی بل کھاتی سکندر علی شاہ کے قریب آ گئی۔ ڈبیا کھول کر اس نے اندر موجود پاؤڈر کی ایک چٹکی نکالی، اسے سکندر علی شاہ کی پیشانی پر رکھ کر اسے پھیلانے لگی۔ سکندر علی شاہ کی نظریں نگینہ پر مرکوز تھیں۔ پاؤڈر کا اثر فی الفور ہوا۔ دو منٹ بعد ہی اس کا ذہن کسی تیز نشے کی وجہ سے ہواؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ نگینہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ڈبیا ایک طرف رکھ کر اس نے سکندر علی شاہ کے سر کو اپنے سینے میں چھپا لیا...... دو چار منٹ تک سکندر علی کا ہاتھ نگینہ کے جسم کو ٹٹولتا رہا پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا...... نگینہ نے آہستہ سے اس کے حصار سے خود کو آزاد کیا۔ کھڑے ہو کر اس کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا پھر مسکراتی ہوئی دوبارہ اپنے بستر پر آ گئی...... خود اس کے ذہن میں بھی اس وقت کسی مرد کی بہکی بہکی سانسیں گونج رہی تھیں جس نے اپنے آدمیوں سے اسے اغوا کرا کے پہلی بار گھپ اندھیرے میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔

☠☠☠

وشنو اس وقت بھی پرسکون ہی نظر آ رہا تھا۔

گرفتاری کے بعد اسے دوبارہ ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر لا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا، دو مسلح افراد اس پر تعینات کر دیے گئے تھے...... نہ کیے گئے ہوتے تب بھی وہ سنگین پہروں سے نکل کر فرار ہوتے وقت کسی گولی کا نشانہ بننا کبھی پسند نہ کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ کس وقت کیا قدم اٹھانا اس کے لیے زیادہ مناسب ہوگا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن لینے کے بعد بھی وہ دیوار سے ٹیک لگائے ننگے فرش پر بیٹھا رہا۔ آنے والے دو مسلح افراد تھے، ایک ہاتھ میں دبی کرسی رکھ کر چلا گیا۔ دوسرا پوزیشن سنبھال کر کھڑا ہو گیا...... پانچ منٹ بعد کرنل احتشام خالی کرسی پر بیٹھا اسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ جواب میں وشنو نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ کرنل پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ دوبارہ اس کے جال میں پھنس جانے کے باوجود وہ مرنے سے بھی خوفزدہ نہیں ہے۔

"تم...... بالآخر دوبارہ یہاں آ گئے۔" کرنل نے کرخت لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ "اب کیا کہو گے؟"

"جو سفر میں نے بارڈر کراس کرنے کے بعد کیا تھا وہ زندگی کی آخری سانسوں تک شاید کبھی ختم نہ ہو......" وشنو نے بے پروائی سے کہا۔

"تمہارا یہ سفر پھانسی کے پھندے پر بھی ختم ہو سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ تم اب بھی انٹرپول کو مطلوب ہو۔" کرنل نے اسے مرعوب کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ "بچت کی ایک ہی صورت ہے...... تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ اس کا نام اور تفصیل کھل کر بتا دو جو تمہاری پشت پر ہے۔"

"کسی کو وچن دے کر اس کے ساتھ دھوکا کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" کرنل کے تیور بدلنے لگے۔

"تمہاری قید میں ہوں...... جو چاہو سوچ لو لیکن ایک بات میری بھی سن لو۔"

"کہو......"

"تم مسلمان اور میں ہندو......" وشنو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "تم آواگون کو نہیں مانتے۔ ہمارے دھرم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ منش مر کر دوبارہ جنم لیتا ہے...... مجھے بھی اس پر وشواس ہے۔" وشنو نے ٹھنڈی سانس لے کر بات جاری رکھی۔ "جو وشنو کا جیون تھی جسے میں نے مار ڈالا...... وہ بھی وشواس رکھتی تھی، میں مر کر نیا جنم لوں گا تو وہ بھی کسی نہ کسی روپ میں آنکھ کھولے گی...... میں دوبارہ اپنی کلونت کے ساتھ اگنی کے پھیرے لگا کر دنیا بنا لوں گا...... تمہارا پھانسی کا پھندا ابھی ہمارا راستہ نہیں......"

"بکو مت......" کرنل نے گرج کر کہا۔ "میں اس وقت تم سے دھرم کرم کی بات کرنے نہیں آیا......"

"میں بھی کوئی کہانی نہیں سناؤں گا کرنل......" وشنو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "جو بیان پہلے دے چکا ہوں، اسی کو بار بار دہراتا رہوں گا۔ تمہیں جس کی کھوج ہے...... میں نے بھی اس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا، صرف اس آواز سے پہچانتا ہوں جو میں نے پہلی بار سنی تھی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے بھی ایک بار مر کر دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ سب کی نیندیں بھی حرام ہو گئی ہیں۔"

"وہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔" کرنل نے تلملا کر کہا۔ "جس طرح تم پچاس فٹ سے چھلانگ لگا کر فرار ہونے کے بعد اس وقت دوبارہ میرے سامنے ہو، اسی طرح ایک دن وہ بھی ہماری گرفت میں ہوگا۔"

جواب میں وشنو نے صرف شانے اچکانے پر اکتفا کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم جن چہروں سے واقف ہو اس کے بارے میں ہمیں تفصیل بتا دو......" کرنل نے کہا۔ "آخری سرا ہمیشہ پہلا سرا ہاتھ آنے کے بعد ہی ملتا ہے...... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"میں تمہیں اس چینی کی مثال دوں گا کرنل جسے تم لوچن کے نام سے جانتے ہو...... وہ جس کے لیے کام کر رہا ہے، اس کی شکل اس نے کبھی نہیں دیکھی...... ایک پاس ورڈ پر عمل کرنے کا پابند ہے...... جو چھوٹے موٹے لوگ اس کی راہ میں آتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی مجبوری کا شکار ہوتے ہیں۔ ان پر ہاتھ ڈال کر تم بھی اپنا سے برباد کر چکے ہو۔ پھر میں کسی مجبور کا نام کیوں لوں؟"

کرنل نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، کوئی فیصلہ کر کے اٹھا۔ وشنو کو قہر آلود نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد وشنو کو کرنل کے ماتحت ایک بار پھر اسی ٹارچر سیل میں لے گئے جو وشنو کے لیے نیا بھی نہیں تھا۔

٭٭٭

پرتاب بھوشن اس وقت مندر کی سیڑھیوں کے اوپر چبوترے پر بیٹھا لیاقت حسین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے جب دنیا کو چھوڑ کر بھوانی سے ناتا قائم کیا تھا اسے کبھی کسی کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکنے پڑے تھے لیکن ایک لیاقت حسین تھا جو کئی بار اس کی شکتیوں کے جال میں پھنستے پھنستے نکل گیا تھا۔ آخری بار لیاقت حسین پر مہربان کسی قوت نے اس وقت اسے مندر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا جب اس کو پورا وشواس تھا کہ بھوانی ہی اسے کھینچ کر پرتاب بھوشن کے چرنوں تک لائی ہوگی، لیکن پانسا پلٹ گیا تھا۔

پچھلی باتیں اس کے ذہن میں کسی بچھو کے ڈنک کے مانند چبھ رہی تھیں لیکن وہ دھن کا پکا تھا۔ جب سے اس نے گندا علم سیکھا تھا وہ خود کو سب سے مہان سمجھتا رہا، کالی اور بھوانی کو راضی رکھنے کی خاطر کسی سچے سیوک کی طرح اس نے برف پوش پہاڑوں کی گپھاؤں، خطرناک جنگلوں اور پرانے شمشان گھاٹوں پر بیٹھ کر لمبے لمبے جاپ کیے تھے۔ بھوانی نے ہر بار اسے دشمنوں کے مقابلے میں جیت سے ہمکنار کیا تھا، مندر کے بڑے بڑے پجاری بھی اس کی آؤ بھگت کرتے تھے لیکن سب سے پہلے اسے لیاقت حسین نے اس کے ایک خطرناک جنتر منتر کا توڑ کر کے اس کی شکتی کو للکارا تھا۔

نیبو کا وہ قصہ پرتاب بھوشن کو آج بھی یاد تھا جو اس نے کسی کے دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کی خاطر اکیس روز تک ایک ویران علاقے کے گندے جوہڑ میں صرف ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر تیار کیا تھا۔ ہر تین روز بعد وہ ایک نئی سوئی پہ منتر پھونکتا تھا، ان سات سوئیوں کو اس نے ایک نیبو میں بھوانی کا نام لے لے کر پوری طرح آر پار کر دیا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ ایک مہاجن سے منہ مانگی رقم لے کر اس کے دشمن کو مارنے کے کارن کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو بار بھوانی کا شبھ نام لے کر اس پر جان لیوا عمل کو کر چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے گندے عمل سے پھونکی گئی سوئیاں دشمن کے دل کو چھلنی کرتی رہیں گی پھر وہ خون تھوک تھوک کر مر جائے گا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ ان سوئیوں کو نیبو سے نکالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن لیاقت حسین نے ان سوئیوں کو کسی کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے نکال دیا تھا، ان خون آلود سوئیوں کے نکلنے کے بعد پرتاب بھوشن کا شکار بھی شمشان گھاٹ جانے سے بچ گیا تھا۔ لیاقت حسین نے بھی نیبو کو جوتے تلے کچل کر پھینک دیا تھا۔

پرتاب بھوشن نے بھوانی کے نام پر سوگند اٹھائی تھی کہ جب تک وہ لیاقت حسین کو چت پٹ...... نہ کر دے سکون کا سانس نہیں لے گا مگر...... بار بار اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ وہ صرف یہی جان سکا تھا کہ کوئی پرچھائیں ہے جو لیاقت حسین کی مدد کر رہی ہے، اس جنگ میں پرتاب بھوشن کو مدھو پجارن سے بھی ہاتھ دھونا پڑے جو اسے دیوی نے دان کی تھی۔

مندر میں آنے جانے والے پجاری قریب سے گزرتے وقت پرتاب بھوشن سے "رام...... رام...... جے رام۔" کرتے رہے لیکن وہ صرف لیاقت حسین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں کیول ایک ہی بات رہ رہ کر کھٹک رہی تھی۔ "بھوانی کے جاپ میں کہیں کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ گئی تھی جو وہ ابھی تک ایک مسلے کے مقابلے میں سپھل (کامیاب) نہیں ہو سکا تھا۔" خاصی دیر تک وہ اسی ایک پہلو پر دھیان جمائے رہا پھر اس نے دوبارہ کسی ویرانے میں جا کر بھوانی کے لیے ایک اور کٹھن جاپ کرنے کی ٹھان لی تھی، مدن چند کو بھی بتا دیا تھا۔

وہ سیڑھیوں کے چبوترے سے اٹھ کر اپنی کٹی میں آ گیا، اپنے سامان کی پوٹلی تیار کرنے میں جت گیا۔ اس وقت اس کے من میں مدھو پجارن کا دھیان بھی مچل رہا تھا جو پورے تن، من، دھن سے اس کی سیوا کرتی تھی۔ وہ پجارن تھی جس نے کبھی کسی بات سے منہ نہیں موڑا تھا، اسی کے اشارے پر وہ کبھی کبھی لیاقت حسین کے گھر تک چلی گئی تھی جہاں اس کا سندر شریر جل کر راکھ ہوا پھر ایک تیز ہوا کا جھونکا اس راکھ کو سمیٹ کر شاید دوبارہ بھوانی کے چرنوں میں واپس لے گیا تھا۔ پرتاب اپنے خیالوں میں گم تھا جب شہد میں ڈوبی ایک آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے چونک کر کٹی کے دروازے کی طرف دیکھا پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس نئی اور کمسن پجارن کو اس نے مدن چند کے کمرے سے چنک منک کر کے نکلتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی کٹی کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس وقت بھی وہ سر سے پاؤں تک قیامت نظر آ رہی تھی۔

پرتاب بھوشن جب دو دن پہلے بڑے پجاری مدن چند سے ملنے گیا تھا اس وقت مدن چند کے خاص سیوک نے بھی سلونی کا نام سن کر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ اب ہنڈیا نہیں رہی مہاراج...... آج کل تو اندر سبھا کی ایک اپسرا نے اپنا جادو جگا رکھا ہے۔ کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ تتیا مرچ کے انوسار پورے مندر میں کولہے مٹکاتی پھرتی ہے۔ سب ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔"

خود پرتاب بھوشن نے بھی مدن چند سے دبی زبان میں کہا تھا۔ "جب یہ ہرنی تمہارے جال میں پھنس جائے تو میرا دھیان بھی رکھنا...... اکیلے اکیلے ہڑپ نہ کرنا۔"

اس وقت...... وہی تتیا مرچ اپنی بھرپور طرح سے ابھرتی، مچلتی جوانی اور اپنے قدموں کو سنبھالے پرتاب بھوشن کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے......؟" پرتاب بھوشن نے دل میں لڈو پھوٹنے کے باوجود اپنا بڑا پن جتانے کے کارن نئی پجارن کو سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔ "اس سمے ادھر کیا کرتے آ گئی......؟ کون ہے تو؟"

"وہی پجارن ہوں مہاراج جس کو تم نے بڑے چاؤ سے بڑے پجاری کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔" پجارن نے معصومیت سے کہا۔ "اتنی جلدی بھول گئے......؟"

"نئی جان پڑتی ہے......" پرتاب بھوشن کے لہجے میں نرمی آنے لگی۔ "کیا نام ہے تیرا......؟"

"ماتا پتا نے بڑے چاؤ سے چکوری کا نام دیا تھا، پرنتو یہاں مندر میں جس کا من چاہتا ہے ایک نیا نام لے کر کھسر پھسر کرتا ہے۔"

"مجھ سے کچھ کام تھا......؟" پرتاب نے نگاہوں نگاہوں میں اس کے بھید بھاؤ کو اپنی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے پوچھا۔

"مدن چند مہاراج نے بتایا تھا کہ تم پھر دیوی کے لیے کوئی جاپ کرنے کو جا رہے ہو۔"

پشت پر

گاہک۔ "ایک زنانہ چپل دیجیے۔"
دکاندار: کس ناپ کی جناب؟"
گاہک۔ "ناپ تو مجھے یاد نہیں رہا خیر آپ میری پشت پر دیکھ لیں۔"

بچے ہمارے عہد کے

استاد نے کلاس سے سوال کیا۔ "کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا میں کتنے بر اعظم ہیں؟"
ایک لڑکا جھٹ کھڑا ہوا اور بولا۔ "تین بر اعظم ہیں۔"
استاد۔ "شاباش، اب بتاؤ کون کون سے؟"
شاگرد۔ "فضل اعظم، قائد اعظم اور میرا چھوٹا بھائی محمد اعظم۔"

الیکشن

الیکشن کے زمانے میں ایک امیدوار جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بڑے مغرور اور بد دماغ ہیں۔ اسٹیج پر تقریر کرنے آئے تو کہنے لگے۔ "دوستو، بزرگوار اور میرے بھائیو! میں آج پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں۔ میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں بڑا مغرور اور بد دماغ ہوں۔ آپ خود سوچیے اگر میں واقعی ایسا ہوتا تو آپ جیسے دو ٹکے کے لوگوں کے پاس ووٹ لینے آتا۔"

ایک خط

اکیسویں صدی کے ایک عاشق نے اپنی گرل فرینڈ یا محبوبہ کے نام یہ خط لکھا۔

"ڈیئرسٹ!

میں تمہارے قرب کے لیے وسیع و عریض سمندروں کو پار کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے صحرائے گوبی کو عبور کر سکتا ہوں۔ آسمان سے تمہارے لیے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتا ہوں۔

نوٹ: اگر کل بارش نہ ہوئی تو تم سے ملنے آؤں گا۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

WWW.PAKSOCIETY.COM

''ہاں...... تو؟'' پرتاب بھوشن نے حیرت سے دریافت کیا۔ ''تو کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''مجھے بھی اپنے سنگ لے چلو مہاراج...... ادھر مندر میں بھانت بھانت کے پجاری اپنی اپنی بولیاں سناتے ہیں۔ تمہاری سیوا کروں گی تو شاید تمہاری وجہ سے مجھے بھی من کی شانتی مل جائے۔''

''کچھ پانے کے کارن منش جات کو کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ جانتی ہے؟'' پرتاب بھوشن نے اسے کھنگالنے کی خاطر کہا۔

''تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی مہاراج...... کسی بات سے منہ نہیں موڑوں گی۔'' چکوری نے معصومیت سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... رات کو اپنی پوٹلی لے کر ادھر آجانا...... بھور ہوتے ہی نکل چلیں گے۔''

''تن ڈھانکنے کے لیے دو تین جوڑے ہیں مہاراج...... اور کوئی بوجھ نہیں۔'' چکوری نے اس بار نظریں جھکا کر دبی زبان میں کہا۔ ''من کا کچھ بوجھ تمہارا راستہ دکھانے کا مول سمجھ کر بڑے پجاری نے اتار دیا تھا۔ اب صرف تمہاری سیوا کرنا کچھ مشکل بھی نہیں ہوگا۔''

چکوری اپنا جملہ مکمل کر کے چلی گئی تو پرتاب بھوشن کے اندر لڈو پھوٹنے لگے۔ دل ہی دل میں اس نے مدن چند کو پیار سے ایک موٹی گالی بھی سنا دی۔

☆☆☆

سکندر علی شاہ کے فارم پر اس کے اپنے گیسٹ ہاؤس کے خوب صورت وارنڈے میں جو لڑکی ساحل پر استعمال کی جانے والی لانگ رنگ برنگی فولڈنگ چیئر پر نیم دراز تھی وہ یقیناً خوب صورت خدوخال کی مالک تھی، بھرا بھرا گداز جسم اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سے کچھ کم ہی نظر آرہی تھی۔ اس کا نام ماروی تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے فارم ہاؤس پر کس مقصد کے لیے لایا گیا تھا۔

ایک بار زبردستی لٹ جانے کے بعد دوسری بار بیس ہزار کی رقم اس کے لیے خاصی پرکشش آفر تھی۔ اسے ماں کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت بھی تھی، باپ کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ اتنی کافی نہیں تھی کہ گھر کا خرچ چلانے کے ساتھ ساتھ وہ ایک موذی مرض کے علاج کی خاطر کسی بڑے ڈاکٹر کی فیسیں ادا کر سکتا۔

وہ کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی جہاں اس کی کلاس فیلو نے دوست بن کر اس کے وجود میں زہر گھول دیا تھا۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی کلاس فیلو کے ایک گھناؤنے جرم کو تصویروں کی شکل میں دیکھ چکی تھی۔ وہ محض ایک اتفاق تھا، اس نے اپنی کلاس فیلو سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی زبان بند رکھے گی اس لیے کہ کلاس فیلو نے اسے اس تصویر کے پس منظر میں اپنی بے بسی کی بڑی دردناک کہانی سنائی تھی جو محض ایک جھوٹ تھا۔ وقتی طور پر اس لڑکی نے جس کا تعلق ایک ماڈرن گھرانے سے تھا، ماروی کی بات مان لی تھی لیکن اس کے بعد اس نے ماروی کو اپنے جال میں پھنسا کر اس طرح اپنے بوائے فرینڈ کے ہاتھوں برباد کرایا کہ ماروی زبان کھولنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ وہ لڑکی ایک دو بار ماروی کے گھر آچکی تھی، اس کی ماں کے مرض سے بھی واقف ہوگئی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ ماروی کے باپ کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ علاج کے اخراجات برداشت کر سکے۔ اسی نے ماروی کی پہلی بکنگ بھی کی تھی۔ آدھی رقم بھی قبل از وقت ادا کر دی تھی۔ یہ بھی یقین دلایا تھا کہ ماروی اگر کسی آڑے وقت سے دوچار ہوئی تو وہ اسے بھی اپنی واقف لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گی جو سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ کرنے کی ماہر تھی۔ ماروی کے ہچکچانے پر اس نے ماروی کی بھی جب اپنی جیسی حیا سوز تصویر دکھائی تو ماروی اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔ وہ تصویر کب کھینچی گئی اسے یاد نہیں تھا اس لیے کہ پہلی بار وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کلاس فیلو کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسی تھی۔ اسی کیفیت میں اس کی بے بسی کو روندا گیا تھا۔

تصویر دیکھنے کے بعد ماروی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ کلاس فیلو کی بات مان لے۔ اسے یہ بھی شبہ تھا کہ جو رقم اس کے عوض حاصل کی گئی، وہ بھی اسے بتائی جانے والی رقم سے یقیناً زیادہ ہی ہوگی۔ کلاس فیلو نے اس کی ایک مشکل اور آسان کر دی تھی، اس نے کہا تھا وہ اس کے والدین کو یہی کہے گی کہ وہ رقم اس نے اپنے ذاتی جیب خرچ سے ایک سہیلی کی ماں کو اپنی ماں سمجھ کر دی ہے۔

بہرحال...... ماروی اس وقت اپنی ڈگمگاتی کیفیت کو سنبھالنے کی کوشش میں خود کو فارم ہاؤس کے ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی جب ایک ادھیڑ عمر کا ہٹا کٹا ملازم اس کے قریب آکر بڑے ادب سے بولا۔

''آپ اس وقت کیا پینا پسند کریں گی......؟''

''کولڈ ڈرنک......'' اس نے ملازم سے کہا پھر دوبارہ نظریں پھیر لیں۔

''ایک بات اور عرض کرنی تھی۔'' ملازم دبی زبان میں نظریں جھکا کر بولا۔ ''یقینی بات ابھی نہیں کی جاسکتی لیکن...... ہوسکتا ہے کہ مالک رات کو نہ آسکیں، اس لیے آپ رات کے کھانے کے لیے بھی اپنی پسند بتا دیں اور...... ایک گزارش بھی کروں گا۔ رات کو خواب گاہ کا دروازہ اندر سے مالک کے سوا کوئی دوسرا بند نہیں کرتا۔''

''کھانے میں میری کوئی خاص پسند نہیں ہے۔ جو بھی یہاں کا دستور ہو تم بھی اسی پر عمل کرنا۔''

ماروی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو ملازم ہاتھ باندھ کر الٹے قدموں چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی ایک دوسرا شخص سوئمنگ پول کے دوسری سمت والے گیسٹ ہاؤس سے نکل کر سامنے آیا۔ اس نے ایک بگی پتلون اور پوری آستین والی اسپورٹنگ شرٹ پہن رکھی تھی، وہ بھی ادھیڑ عمر اور صحت مند جسم کا مالک تھا لیکن اس کی ظاہری حیثیت ملازموں سے کچھ مختلف نظر آرہی تھی، گیسٹ ہاؤس سے نکلتے وقت اس کی نظر بھی ماروی پر پڑی تھی۔ ایک لمحے تک وہ اسے نفرت بھری نظروں سے گھورتا رہا پھر ٹہلتا ہوا گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ماروی نے اس کی نظروں میں ابھرنے والی نفرت کو دور سے ہی بھانپ لیا تھا۔ اس نے اپنی خاموش نفرت کا اظہار کیوں کیا تھا؟ کچھ دیر وہ اس پر غور کرتی رہی پھر دوبارہ اپنا ذہن بٹانے کی خاطر ماحول میں گم ہوگئی۔

دس منٹ بعد ملازم اس کے لیے کولڈ ڈرنک اور اس کے ساتھ میوہ جات کی دو تین پلیٹیں رکھ کر چلا گیا۔ ماروی کو اس مہمان نوازی پر ہنسی آگئی۔ فارم ہاؤس کے ملازموں کو بھی یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ وہ وہاں کس مقصد کے لیے لائی گئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کا احترام کر رہے تھے...... سوسائٹی کے اس رکھ رکھاؤ کا انداز بھی اس کے لیے انوکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی حیثیت اور ملازموں کے اخلاق کے بارے میں سوچا پھر سالٹش بادام کے چار چھ پیس لینے کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا خوب صورت اور قیمتی گلاس بھی اٹھا لیا۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ اس کے بعد وہی شخص پھر اس کے سامنے سے سر جھکائے گزرتا نظر آیا جس نے پہلی نگاہ میں اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔

''ون منٹ پلیز......'' ماروی نے غیر ارادی طور پر

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ جون 2013ء کی جھلکیاں

مفکر

اس مایہ ناز مفکر کا احوال جس نے ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا تھا

تسخیر دل

ایک ایسی روداد جسے پڑھنا آپ ضروری سمجھیں گے

فنکار

پاکستان کے ایک نامور مصور کی داستانِ حیات

لے پالک

اس عورت کے حالاتِ زیست جس کی عمر بھر کی پونجی جعل سازی کھا گئی

ان کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ''ترکی نمی دانم''، لہو رنگ سرگزشت ''سراب''، فلم نگری کی ان کہی روداد ''فلمی الف لیلہ'' اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں!

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود سرگزشت کے گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے مخاطب کیا تو رک گیا۔ ایک بار پھر اس نے ناگوار انداز میں ماروی کو دیکھا پھر قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا۔ روبرو کھڑا ماروی کو سپاٹ نظروں سے گھورتا رہا۔

"کون ہو تم؟..." ماروی نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

"غو...... غاں...... غو...... غو...... غا...... غا" جواب میں اس نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر ماروی سے اشاروں اشاروں میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ "تم...... اپنے کام سے...... کام رکھو۔"

پھر...... وہ الٹے قدموں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا چلا گیا۔ ماروی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شخص گونگا تھا لیکن وہ اس کی حیثیت کا اندازہ پھر بھی نہ لگا سکی...... رات کے کھانے کے وقت پہلا ملازم ٹرالی لے کر کمرے میں آیا تو اس نے اپنے تجسس کو دور کرنے کی خاطر پوچھ لیا۔

"کیا یہاں کوئی گونگا مہمان بھی موجود ہے؟"

"وہ......" ملازم نے دائیں بائیں دیکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔ "وہ ملازم نہیں...... مالک کا دور پرے کا کوئی عزیز ہے۔ یہاں اس کی حیثیت نگران اعلیٰ کی ہے...... کوئی بھی اس کے حکم سے انکار کی جرأت نہیں کرتا...... مالک بھی اس کا خیال رکھتے ہیں۔"

"اوہ......" ماروی نے لمبی سانس لے کر بات بدل دی۔ "تمہارے مالک کے آنے کا کیا پروگرام ہے؟"

"مالکوں کی بات مالک ہی جانتے ہیں...... آپ ساڑھے دس تک انتظار کرلیں پھر چاہے تو سو جائیں لیکن دروازہ نہ بند کرنے والی بات یاد رکھیے گا......" ملازم نے تھوڑے توقف سے نظریں جھکا کر کہا۔ "ساتھ والے کمرے میں کھانے پینے کی اور بھی ضروری چیزیں موجود ہیں۔ آپ جو استعمال کرتی ہوں بلا تکلف پی سکتی ہیں...... ہم کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے...... ادھر ایک الماری ضروری لباس کی بھی موجود ہے۔ سونے کے لیے کسی لباس کی پسند بھی آپ کی مرضی پر ہے۔"

ملازم چلا گیا تو ماروی کو ہنسی آگئی۔ اس نے ایک خلاف توقع قیمت کے عوض جو سودا زبردستی قبول کیا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ بھی اس کے لیے ایک معما ہی تھا۔ "طلسم ہوشربا" کی داستان کی طرح......

کھانا کھانے کے بعد اس نے دوسرے کمرے میں جا کر جو بھی دیکھا وہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا، شیشے کی ایک الماری میں شراب کی مختلف اعلیٰ اقسام بوتلیں اور قسم قسم کے خوبصورت اور نازک پیمانے موجود تھے، دوسری الماری میں شب خوابی کے بے شمار جوڑے تھے۔ اس نے نفرت سے ایک پاجامہ اور ڈریسنگ اٹھا لیا پھر اس کو پہن کر اس نے خود کو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو شرما کر نظریں جھکالیں۔ خواب گاہ میں واپس آکر اس نے دروازہ اندر سے بھیڑ لیا۔ رات ساڑھے دس تک وہ جاگتی رہی پھر اس نے لائٹس آف کر دیں، نرم گرم مسہری پر لیٹ کر اس نے ایک شال اپنے جسم پر ڈال لی پھر سہمی سہمی لیٹی رہی۔ کب اس کی آنکھ لگی؟ اس کو وقت کا اندازہ نہیں ہوا پھر...... دوبارہ اس کی نیند اسی وقت اچاٹ ہوئی جب کسی کے ناگوار قرب نے اسے ہوشیار کیا تھا۔

بیس ہزار کی رقم کی ادائیگی کے کھیل کا آغاز کب ہوا۔ ماروی کو اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب کسی نے اس کے جسم کو دوسری بار ٹٹولا تھا۔ وہ نفرت سے دل پر جبر کیے اندھیرے میں کلبلاتی رہی۔ ایک ذرا سی غلطی نے اسے جس راستے پر ڈال دیا تھا، اب وہ اس پر چلنے پر مجبور تھی۔ ماں سے کسی سہیلی کے ساتھ رات بھر اسٹڈی کرنے کا بہانہ کر کے آئی تھی۔ آدھی رات کے بعد واپسی کا راستہ اختیار کرنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ گیسٹ ہاؤس پر ملازموں اور کسی گونگے کی موجودگی میں وہ بھاگنا چاہتی تو بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاص طور سے گونگے نے اسے پہلی نظر دیکھ کر جس نفرت اور حقارت کا اظہار کیا...... جس انداز میں اس کو جواب دیا وہی اس کو خوفزدہ کرنے کے لیے بہت تھا۔ وہ آنکھ کھول کر اس کی صورت دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی جو اپنی رقم وصول کر رہا تھا۔

دم سادھے وہ دانت پر دانت جمائے خاموش پڑی رہی...... طوفان کی شدت جوں جوں زور پکڑتی رہی، اس کا کمزور وجود بھی اس کی سرکش موجوں پر ڈوبتا ابھرتا رہا...... دبی دبی سسکیاں بھی اس کے اپنے وجود کی نفرت انگیز گہرائیوں میں بتدریج دفن ہوتی رہیں...... طوفان گزر گیا تو کسی نے اس سے جدا ہوتے وقت بے حد سرد اور سفاک لہجے میں کہا تھا۔

"کسی سے کچھ نہ کہنا...... زبان کھولنے کی حماقت بھی نہ کرنا ورنہ تمہاری موت بھی بڑی عبرتناک ہوگی۔ کون آیا؟ کون گیا؟ اسے یاد کرنے کی غلطی کی تو پوری بند لاش کسی گٹر کنڈی ہی سے دریافت ہوگی...... ڈو یو انڈر اسٹینڈ؟"

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

فرض

کاشف زبیر

دل سے قریب رشتے جب دسترس سے دور نکل جائیں تو مانو دل سے دھڑکن کا ناتا ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے مگر جسم پے کہ سانس کی ڈوری سے روح کو جکڑے رہتا ہے... کچھ ایسا ہی نازک رشتہ ان کے درمیان بھی تھا جسے نبھانے کی خاطر اس نے ایک لمبا مگر پُراسرار سفر اختیار کیا اور ایک ایسا فرض ادا کرنے کی کوشش کی جسے کسی نے عائد تو نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے اپنے دل سے بوجھ اتارنا ہی تھا۔

دورِ اسرار کے پردوں میں چھپی ایک عجیب روداد

ایرک نے اس ویران لیکن خوب صورت جگہ کو دیکھا۔ یہاں سے اسے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ اس کا سامان پشت پر بڑے سے بیگ میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کی گرم جیکٹ اور سیاہ گرم پتلون تھی۔ ہاتھ میں واکنگ اسٹک اور سر پر نیلی ٹریکر کیپ تھی۔ اس نے ایک طویل سانس کھینچا اور چل پڑا۔ شمال کی طرف سے تیز سرد ہوا چل رہی تھی، درجۂ حرارت یقیناً دس ڈگری سینٹی گریڈ سے نیچے تھا۔ ٹریکر ٹور ایجنسی کے مطابق انہیں صبح سات بجے روانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتا تھا اور اس وقت نو بج رہے تھے یعنی گروپ روانہ ہو چکا تھا۔ اب اسے اکیلے سفر کرنا تھا۔ کم سے کم رات تک۔ ٹریکر ٹور ایجنسی کی خاتون منیجر نے اس کی مدد کی تھی اور اسے راستہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا، اس نے اہم نشانیوں کا پرنٹ نکلوا کر اسے دیدیا تھا کہ وہ کہیں نقشے سے مدد نہ لے سکے تو نشانیوں کی مدد سے اپنا سفر جاری رکھے۔ ایرک نے کچھ دیر بعد مڑ کر دیکھا اس کا خیال تھا کہ وہ سڑک سے کچھ ہی دور آیا ہوگا۔ مگر وہ حیران رہ گیا جب اس نے چٹان کو بہت دور پایا۔ جب وہ اس طرف آرہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ کیا وہ پیدل چل سکے گا۔ بیشک وہ ہفتے میں تین بار چار میل دوڑتا تھا لیکن دوڑنے اور تقریباً بیس کلوگرام وزن کے ساتھ سارا دن چلنے میں فرق ہوتا ہے۔ وہ بھی ساٹھ سال کی عمر میں۔

اس نے بغیر تھکے پہلا مرحلہ طے کر لیا تھا۔ ان کی پہلی منزل ایک ٹریکر ہاسٹل تھا جو تقریباً تیس کلومیٹرز کی دوری پر تھا۔ انہیں روزانہ تیس سے پینتیس کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرنا تھا اور فرانس سے نکل جانے کے بعد انہیں اپنا سفر اور منزلیں خود طے کرنا تھیں۔ ایک گھنٹے بعد ایرک کا سانس پھولنے لگا مگر اس نے سفر جاری رکھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ہر دو گھنٹے بعد وہ صرف پندرہ منٹ کے لیے آرام کرے گا۔ پانچ کلومیٹرز فی گھنٹا کی رفتار سے وہ یہ فاصلہ چھ گھنٹے میں طے کر سکتا تھا۔ آرام کا وقت ایک گھنٹا ہوتا تو وہ شام چار بجے تک اس ہاسٹل تک پہنچ سکتا تھا۔ دوسرے دور کے خاتمے پر اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ وہ رکا تو کھڑا نہ رہ سکا بلکہ گر گیا۔

اوپر نیلا آسمان تھا اور دھوپ بہت نکھری ہوئی تھی، اس میں بہت نامحسوس قسم کی حدت تھی جسے وہ صرف اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ آس پاس جنگلی نباتات اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر پندرہ منٹ بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے چلنا شروع کیا۔ اب تک وہ اس جگہ اکیلا ہی سفر کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک پکی سڑک آ گئی اور اب اسے اس پر چلنا تھا، یہاں اسے ٹریفک ملنے لگا۔ اس کا رک سیک اور مخصوص جیکٹ دیکھ کر کسی نے اسے روکنے یا لفٹ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہموار سڑک پر سفر کرنا آسان تھا لیکن بار بار گزرتی گاڑیاں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں اور یہ چیز اسے ناگوار گزر رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد وہ پھر رکا، اس بار وہ پندرہ منٹ بعد نہیں اٹھ سکا تھا، اس کا سانس قابو میں نہیں آیا تھا اور گھٹنے بدستور کانپ رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس قابل ہوا کہ دوبارہ سفر پر آمادہ ہو سکے۔ اس کی پانی اور جوس کی بوتلیں خالی ہونے کے قریب تھیں اور ابھی اسے مزید دس کلومیٹرز کا سفر طے کرنا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ احتیاط کرے گا اور صرف اشد ضرورت کے وقت ایک گھونٹ لے گا۔ سڑک کا سفر چند منٹ بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ وہ دوبارہ ایک ویران پتھریلے علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ کچا راستہ گاڑیوں کی آمد و رفت سے بنا تھا مگر اس پر کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ ایک جگہ ایرک کو چند چھوٹی چٹانوں کے اوپر سرخ پھول کھلے دکھائی دیے۔ وہ راستے سے ہٹ کر ان چٹانوں کی طرف بڑھا۔ اس نے رک سیک اتارا اور کوشش کر کے اوپر چڑھا۔ یہ بہت انوکھے اور تر و تازہ پھول تھے۔ اس نے اپنی جیکٹ سے پلاسٹک کا لفافہ نکالا۔ اس میں سنہری بالوں کا ایک گچھا تھا۔ ایرک نے بہت احتیاط سے ان میں سے چند بال چنے اور انہیں پھولوں کی جڑ میں رکھ دیا۔ لفافہ احتیاط سے اندر کی جیب میں رکھ کر وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر نیچے اتر آیا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے، سورج غروب ہونے والا تھا اور ابھی تک اس ہاسٹل کا پتا نہیں تھا جہاں اسے رات گزارنا تھی۔ منیجر خاتون نے اسے خبردار کیا تھا کہ کہیں رات گزارنا پڑے تو لازمی آگ جلائیں اور پورے لباس میں سوئیں کیونکہ رات کو درجۂ حرارت منفی میں چلا جاتا تھا۔ اگر کچھ دیر میں اسے ہاسٹل نہ ملتا تو اسے رکنا پڑتا کیونکہ تاریکی میں سفر خطرناک ہو سکتا تھا۔ کسی پتھر یا گڑھے میں پڑنے والا ایک قدم اس کے سفر کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ مگر سورج ڈوبنے تک اسے ہاسٹل کی عمارت نظر آ گئی تھی۔ یہ قدیم گوتھک اسٹائل کی پتھریلی عمارت تھی جس کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ دروازے پر ایک بدصورت لیکن خوش اخلاق عورت نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اس ہاسٹل کی مالکہ تھی۔ اندر لکڑی کی بنچوں پر دو درجن سے زیادہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ کافی پی رہے تھے اور کچھ بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ ماحول خوشگوار تھا لیکن جب ہاسٹل کی مالکن نے اس سے ایک رات کے قیام، رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کے تیس ڈالرز طلب کیے تو اسے حیرت ہوئی تھی۔ ڈنر میں سبزیوں اور گوشت سے بنی ہوئی ڈش تھی، ساتھ میں فرانسیسی روٹی تھی۔ سونے کے لیے انہیں اوپر تلے بنے بھدے بیڈز ملے تھے۔ مگر بیڈز صاف ستھرے اور کمبل بو سے پاک تھے۔

سامنے والے بیڈ پر ایک عورت سگریٹ نوشی کر رہی تھی۔ اس کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔ دبلا چہرہ اور سنہری

بالوں کی وجہ سے وہ کم عمر لگ رہی تھی۔ نقوش مناسب تھے۔ البتہ جسم مضبوط تھا جیسا کہ ایک خاتون ٹریکر کا ہونا چاہیے۔ اس نے اچانک پوچھا۔ ”تم خوش نہیں ہو یہاں کے انتظام سے؟“

ایرک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تیس ڈالرز... ان سب کے لیے بہت زیادہ ہیں۔“

”بہت مناسب ہیں۔“ عورت نے کہا۔ ”سوری میں نے تعارف نہیں کرایا۔ میں لوور ہوں، پیرس سے آئی ہوں۔“

”ایرک روزمین۔“ اس نے اپنی جیکٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ”یہ رقم کم کیسے ہے؟“

”یہ ہاسٹل ہے اور یہاں صرف ٹریکرز آتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ پھر یہاں ہر چیز مہنگی آتی ہے۔ اگر اس کے ریٹ نارمل ہوٹل جتنے ہوں تو ہاسٹل کتنے دن چلے گا اور یہ بند ہو گیا تو ٹریکرز کہاں رکیں گے؟“ وہ رکی پھر اس نے پوچھا۔ ”تم ہمارے گروپ کا حصہ ہو نا؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ ایرک نے کہا اور بیڈ پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو بیشتر بیڈز خالی تھے۔ وہ تیار ہو کر میس میں آیا تو وہاں بھی چند ایک افراد تھے گویا اکثر لوگ جا چکے تھے۔ وہ ناشتا کر کے باہر آیا تو سورج بلند ہو چکا تھا۔ گزشتہ دن کی تھکن سے وہ بے خبر سویا تھا اور اسے آج کا سفر بھی اکیلے کرنا تھا مگر وہ اس سے خوش تھا۔ آج وہ کم تھکا تھا، دو دفعہ وہ آرام کے لیے پندرہ منٹ رکا تھا اور شام پانچ بجے سے پہلے وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا فرانسیسی قصبہ تھا جو سرحد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں کئی موٹلز تھے۔ اس وجہ سے ایرک کو صرف دس ڈالرز میں ایک چھوٹا سا کمرا مل گیا۔ ڈنر اس نے ریستوران میں کیا تھا جہاں بار بھی تھا۔ ایرک کے سامنے میز پر ایک جسیم ڈچ مین بیٹھا تھا۔ ساڑھے چھ فٹ قامت کے اس شخص کا وزن کم سے کم ڈھائی سو پونڈز تھا۔ بڑے سر پر گھنے بالوں کے ساتھ تین چار دن کی بڑھی ہوئی شیو تھی۔ وہ بلند آواز سے بولتے ہوئے بیئر پی رہا تھا اور سامنے رکھے گوشت کے پارچے بلاتکلف حلق سے اتار رہا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ٹریکر نہیں لگ رہا تھا مگر وہ ٹریکر ہی تھا ورنہ اس دور دراز فرانسیسی قصبے میں اس کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ایرک کو خیال آیا کہ شاید وہ بھی اس کے گروپ میں شامل تھا۔

اس رات ایرک سکون سے سویا، اگرچہ نہ بیڈ آرام دہ تھا اور کمبل سے بھی ہلکی سی بو آ رہی تھی مگر یہاں اسے پرائیویسی میسر تھی۔ رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی، عجیب سا شور ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر سنتا رہا پھر اسے پتا چلا کہ باہر بارش ہو رہی تھی۔ صبح اس کی آنکھ جلد کھل گئی اور وہ سورج نکلنے سے پہلے تیار ہو گیا۔ ناشتا اسی ریستوران میں کیا۔ وہاں لوور بھی تھی اور اس بار وہ ڈچ مین کے ساتھ بیٹھی تھی جو ناشتے میں ابلے ہوئے انڈے کھا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نصف درجن انڈے صاف کر دیے تھے۔ لوور نے اس سے ہیلو ہائے کی اور اسے بتایا کہ وہ دونوں اسی گروپ کا حصہ تھے۔ ایرک نے دو ابلے انڈوں کے ساتھ کافی اور شہد لگے دو سلائس لیے تھے۔ پھر وہ سرحدی چوکی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے اسے اسپین میں داخلے کا پروانہ ملتا۔ ایرک نے چوکی پر موجود آفیسر کو اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ دکھایا۔ اس نے غور کیا اور بولا۔ ”تم ایرک روزمین ہو؟“

”ہاں۔“

”لیکن یہ ٹکٹ مارک روزمین کا ہے۔“

”ہاں اس کے ٹکٹ پر میں سفر کر رہا ہوں۔“ ایرک نے اسے ایجنسی کا اجازت نامہ دکھایا۔

”ٹھیک ہے۔“ آفیسر نے کہا اور اسے ایرک روزمین کے نام سے اجازت نامہ بنا کر دیدیا۔ ایرک نے اسے دیکھا اور آفیسر کو واپس کیا۔

”آفیسر تم نے نام غلط کر دیا ہے اجازت نامہ مارک روزمین کے نام سے بناؤ۔“

”لیکن تم ایرک روزمین ہو۔“

”پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ایرک نے نرمی سے کہا مگر بات آفیسر کی سمجھ میں نہیں آئی وہ اسے انچارج کے پاس لے گیا۔ ایرک کو اس سے خاصی بحث کرنا پڑی تھی لیکن جب وہ چوکی سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں مارک روزمین کے نام سے اجازت نامہ موجود تھا۔ اب وہ اسپین میں تھا اور اس کچی سڑک پر چلنے لگا جس کے دونوں طرف خشک ہو جانے والی قد آدم گھاس تھی۔ کہیں کہیں مقامی لوگ اس گھاس کو کاٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ دور پہاڑ نظر آرہے تھے۔ آج رات ان پہاڑوں میں کہیں گزارنا تھی۔ یہیں کہیں اسپین کا قدیم شہر اینڈورا تھا۔ مگر وہ ان کے راستے میں نہیں آتا۔ اب انہیں مغرب کی طرف جانا تھا۔

دوپہر کے وقت ایرک پہاڑوں کے دامن میں ایک چھوٹے سے صحرا تک پہنچا۔ یہ ایک ریتیلا میدان تھا میں کہیں کہیں سرکنڈے نما گھاس کھڑی تھی۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں سرخ رنگ کی چٹانیں تھیں اور ایرک کو ایک شخص اپنی واکنگ اسٹک سے گالف کھیلتا دکھائی دیا۔ ایرک کو چلتے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے اس لیے وہ ایک چٹان کے ساتھ رک گیا۔ اس نے رک سیک اتار دیا تھا اور چٹان سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔ آدمی طویل قامت، سامنے سے گنجا اور بڑے دانتوں والا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد ایرک کو دیکھ لیا اور اس کی طرف آیا۔ ”ہائے... میں مائیکل ہوں، مائیکل فرام آئرلینڈ۔“

”مائیکل فرام آئرلینڈ تم کیا کرتے ہو؟“ ایرک نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ شخص جھوٹا محسوس ہوا تھا۔

”میں مصنف ہوں اور کہانیاں لکھتا ہوں۔“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں ایک کہانی لکھ رہا ہوں۔“ اس نے پُراسرار انداز میں کہا۔ ”اس کی کہانی۔“ اس نے چاروں طرف ہاتھ گھمایا اور خود بھی لہرا گیا تب ایرک نے محسوس کیا کہ وہ نشے میں تھا۔ اگر وہ ٹریکر تھا تو اس کا رک سیک نہایت مختصر تھا اور اس نے فل کے بجائے ہاف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ چٹان کے دوسری طرف سے دو افراد کے بولنے کی آواز آئی اور پھر لوور، ڈچ مین کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس نے ایرک کو دیکھا۔ ”ہائے۔“

”ہائے۔“ ایرک نے کہا۔

ڈچ مین نے ہاتھ ملایا اور گرم جوشی سے بولا۔ ”لوور نے بتایا ہے کہ تم بھی اس ٹریک پر ہو۔ لیکن تم تو الگ سفر کرتے رہے ہو۔“

”دو دن میں لیٹ ہوا اور آج میں جلدی نکل گیا۔“ ایرک نے جواب دیا۔ لوور اور ڈچ مین نے سوالیہ نظروں سے مائیکل کی طرف دیکھا، ایرک نے تعارف کرایا۔ ”مائیکل فرام آئرلینڈ۔“

اس تعارف پر ان دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ڈچ مین نے مائیکل سے بھی ہاتھ ملایا۔ ”میگر رونڈی فرام ہالینڈ...“ پھر اس نے ناک سکیڑ کر کچھ سونگھا اور آہستہ سے مائیکل سے کچھ کہا اور وہ اسے ذرا دور ایک دوسری چٹان کی طرف لے گیا۔ اس نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر میگر کو دی۔ اس نے بے تابی سے سلگائی اور ایک گہرا کش لیا۔ اس کے چہرے پر سرور کے تاثرات نظر آنے لگے۔ ایرک نے سوالیہ نظروں سے لوور کی طرف دیکھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔

”میری جوانا۔“

ایرک چونکا۔ ”یہ تو نشہ ہے، سرحد پر روکا نہیں؟“

”نہیں، وہاں کتے نہیں تھے اور ویسے بھی اس قسم کی چیک پوسٹوں پر سیاحوں کو تنگ نہیں کرتے ہیں۔“ لوور نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگی پھر اس نے جلدی سے کہا۔ ”یہ خالی سگریٹ ہے۔“

ایرک کے آرام کا وقت پورا ہو گیا تھا، اس نے اپنا رک سیک پشت پر لادا اور آگے چل پڑا۔ لوور، میگر کی طرف چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں مائیکل اور اس میں برسوں کی بے تکلفی آ گئی تھی، دونوں ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے اور قہقہے بلند کر رہے تھے۔ ایرک کو جاتا دیکھ کر میگر نے حیرت سے کہا۔ ”یہ اکیلے جا رہا ہے؟“

”وہ اکیلے زیادہ خوش رہتا ہے۔“ لوور نے آہستہ سے کہا۔ ”اب چلو، رات سے پہلے کوئی ٹھکانا تلاش کرنا ہوگا۔“

پہاڑوں کے درمیان ایک سڑک بل کھاتی جا رہی تھی۔ شام کے قریب جب ایرک آرام کے بعد چلنے کے لیے تیار ہوا تو وہ تینوں بھی آ گئے۔ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ جوان اور صحت مند تھے جبکہ ایرک سر جھکائے تیز مشینی قدموں سے چلتا تھا۔ وہ پہاڑوں کے سب سے اوپری حصے میں تھے اور وہاں سے مغرب کی طرف پھیلتی ڈھلان صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں کہیں آبادیاں دکھائی دے رہی تھیں اور ان کے آس پاس باغات تھے۔ یہاں زیتون کے ساتھ سنگترے کے باغات تھے۔ میگر نے ایرک سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ایک ساتھ سفر کرنا چاہیے۔“

”کیوں؟“ ایرک نے چلتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں ہمیں کسی سے رات بھر پناہ کی درخواست کرنی ہوگی۔“ لوور نے کہا۔ ”یہاں ہوٹل اور سرائے جیسی چیز مشکل سے ملے گی لیکن لوگ بہت اچھے اور مہمان نواز ہیں۔“

میگر بولا۔ ”سب کو انفرادی جگہ مشکل سے ملے گی لیکن کوئی ایک اچھا شخص مل گیا تو وہ سب کو مہمان بنا لے گا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ ایرک نے کہا۔ ”اگر کسی کے گھر میں جگہ نہیں ملی تو میں کھلے میں بھی سو سکتا ہوں، میرے پاس سلیپنگ بیگ ہے۔“

ایرک اپنی تیز رفتاری سے چلتا ہوا ان سے آگے نکل گیا۔ مائیکل نے ناپسندیدگی سے کہا۔ ”اس شخص کا انداز مشینی ہے۔“

”کسی قدر پُراسرار بھی ہے۔“ میگر بولا۔ ”میں نے اسے دیکھا ہے، یہ راستے میں کہیں کہیں رک کر راستے سے ہٹ کر چٹانوں اور درختوں میں کچھ کرتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھے دور سے آتے دیکھا تو یوں جلدی سے راستے پر آ گیا جیسے مجھ سے کچھ چھپا رہا ہو۔“

”وہ صرف تنہائی پسند ہے۔“ لوور نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”وہ بالکل بھی پُراسرار نہیں ہے۔“

”یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”کیونکہ میں عورت ہوں اور ایک عورت کسی مرد کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

ایرک اب تھکن محسوس کر رہا تھا مگر گزشتہ دو دنوں کے مقابلے میں آج وہ کہیں بہتر چلا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بدن ٹیون ہو گیا ہے اور اس کا اسٹیمنا بھی بہتر ہوتا جا رہا تھا، آرام کے وقفوں کے بعد جب وہ روانہ ہوتا تو اس کے قدم آرام سے اٹھتے تھے۔ ٹریکر ایجنسی کی خاتون منیجر نے اس علاقے کے بارے میں خبردار کیا تھا کیونکہ یہاں علیحدگی پسندوں کی تحریک جاری تھی جو اسپین سے الگ ہونا چاہتے تھے انہیں محتاط رہنے کو کہا جاتا تھا۔ شام ہو گئی تھی اور وہ ایک خوب صورت پہاڑی قصبے کے قریب تھا۔ وہ ایک گھر کے پاس سے گزر رہا تھا جہاں باغ میں اہل خانہ جمع ہو کر لکڑی کی بڑی سی میز پر کھانے پینے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ یہ یہاں کا رواج تھا۔ ان میں سے ایک آدمی کی نظر ایرک پر پڑی۔ وہ اس کے رک سیک سے بھانپ گیا تھا، اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”سینور!“

ایرک رک گیا، وہ اس کے پاس آیا۔ ”انگلش؟“

”امریکن۔“ ایرک نے جواب دیا۔

آدمی مسکرایا۔ ”میں تھوڑی سی انگریزی جانتا ہوں، تم سیاح ہو؟“

”ہاں اور رات گزارنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش میں ہوں، کیا یہاں کوئی ہوٹل یا پیئنگ گیسٹ ہاؤس ہے۔“

”نہیں۔“ آدمی نے اپنا رخسار سہلایا۔ ”یہاں کوئی کرائے پر جگہ نہیں دیتا، ہم مہمان نوازی کے قائل ہیں۔ اس گھر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے اپنے بڑے سے دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔

ایرک مسکرایا۔ ”بہت خوب صورت ہے لیکن میں اکیلا نہیں ہوں، میرے تین ساتھی اور بھی آ رہے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو ہمارے پاس بہت جگہ ہے۔ آ جاؤ... آ جاؤ۔“ وہ ایرک کو اندر لایا اور بلند آواز سے اس کا تعارف کرایا۔ وہاں درجن سے بھی زیادہ لوگ تھے۔ انہوں نے گرم جوشی سے اسے خوش آمدید کہا۔ آدمی کا نام میخائل تھا۔ وہ باسک تھے اور اسپین سے شدید نفرت کرتے تھے۔ میخائل نے اس کے لیے مقامی کشید کی ہوئی شراب نکالتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہاری جگہ کوئی اسپینی بھوک سے قریب المرگ یہاں آئے تو اسے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملے گا۔“

ایرک خاموشی سے سن رہا تھا۔ یہ سیاست تھی اور اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر ان کی آپس میں بحث چھڑ گئی اور میخائل ایرک کے لیے ترجمہ کرنے لگا۔ نوجوانوں کا خیال تھا کہ اسپینی لاتوں کے بھوت تھے۔ ان سے اسلحے کی زبان میں بات کی جائے جب ہی باسک آزاد ہو سکتے تھے۔ میخائل اور اس کے ہم عمر افراد کا خیال تھا کہ وہ مستقل دباؤ ڈال کر اور جمہوری طریقے سے اپنی تحریک کو جلد کامیابی تک پہنچا سکتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد جب باغ سے دھوپ رخصت ہو رہی تھی تو لوور، میگر اور مائیکل بھی آ گئے۔ جب میخائل نے انہیں ٹھہرنے کی پیشکش کی تو وہ خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو میخائل نے کہا۔ ”نہیں... نہیں، امریکن کا شکریہ ادا کرو، اسی نے تمہارے لیے بھی کہا تھا۔“

لوور نے معنی خیز نظروں سے مائیکل اور میگر کی طرف دیکھا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ایرک تھک گیا تھا اور جاتی دھوپ کا لطف اٹھا رہا تھا۔ سورج ڈوبتے ہی وہ اندر آ گئے کیونکہ باہر سردی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ لوگ ڈنر کر چکے تھے کیونکہ ان کا رواج تھا وہ سورج غروب ہونے سے پہلے شام کا کھانا کھا لیتے تھے۔ یہ قدیم عرب رواج تھا کہ جواب تک ان میں چلا آ رہا تھا۔ باسک اسپینی قومیت کا ایک حصہ تھے لیکن سترھویں صدی میں ان میں الگ قوم کا شعور پیدا ہوا اور اب وہ اسپین سے الگ ہو کر اپنا ملک بنانا چاہتے تھے۔ کسی زمانے میں باسک تحریک پُرتشدد تھی اور بہت خون خرابا ہوا تھا۔ مگر اب وہ پُرامن انداز میں اپنی تحریک چلا رہے تھے۔

ان کے لیے ڈنر آٹھ بجے مہیا کیا گیا تھا۔ ڈنر میں کئی اچھی ڈشز تھیں خاص طور سے چاولوں کی ڈش ایرک کو بہت اچھی لگی تھی۔ کھانے کے بعد وہ اوپر آئے۔ گھر بیچ بہت بڑا تھا۔ ایرک اور مائیکل کو ایک ساتھ کمرے ملے تھے جبکہ لوور اور میگر دوسرے کمرے میں رکے تھے۔

میگر نے یہاں بھی بہت جلد سب سے اور خاص طور سے میخائل سے دوستی کر لی تھی۔ وہ خوش باش آدمی تھا جسے خوب کھانے، بولنے اور ہنسنے کا شوق تھا۔ میخائل ان کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمرے میں آیا ہوا تھا۔ اس نے اچانک پوچھا۔ ”امریکن تم لوگوں سے الگ سفر کرتا ہے؟“

”وہ تیز چلنے کا عادی ہے۔“ لوور نے جلدی سے کہا۔ ”اس لیے عام طور سے ہم سے آگے نکل جاتا ہے۔“

”مگر ہم ایک گروپ ہیں۔“ میگر احتجاجی انداز میں بولا۔

”ہاں ایک گروپ ہونے کا مطلب ساتھ ساتھ چلنا نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی رفتار سے چلتے ہیں۔ مگر ہم رات کو ایک جگہ ہوتے ہیں اور صبح سفر کا آغاز بھی ساتھ کرتے ہیں۔ ہمارا سفر بھی ایک ہی راستے پر ہے۔“ لوور نے اس کا احتجاج مسترد کر دیا۔

میخائل خاموشی سے سن رہا تھا مگر ایسا لگا جیسے اسے لوور کی بات پسند آئی ہو۔ اس نے کہا۔ ”امریکن اچھا، مگر وہ خود میں مگن رہنے والا آدمی ہے۔ میخائل کھڑا ہو گیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے وہ کوئی قرض ادا کر رہا ہے۔ اچھا دوستو! شب بہ خیر، کل صبح ملیں گے۔“

ایرک کی آنکھ کھلی تو ابھی صبح کا آغاز تھا، ہلکی سی روشنی پھیل رہی تھی۔ باہر ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ مائیکل نیند میں تھا۔ ایرک نے لباس پہنا اور کھڑکی سے نیچے جھانکا تو اسے میخائل ایک سرخ چادر لیے خیالی بل فائٹنگ کرتا دکھائی دیا۔ اس کے انداز میں رقص کا سا ردھم تھا، پھر اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اس نے اوپر دیکھا اور جھینپ کر جلدی سے میز پوش واپس میز پر رکھ دیا۔ ایرک تیار ہو کر نیچے آیا۔ ”میں بچپن میں بل فائٹر بننا چاہتا تھا مگر...“ میخائل نے کہا۔ ”ناشتا کچھ دیر میں ملے گا اس وقت تک کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اچھا خیال ہے۔“ ایرک نے کہا اور کافی لے کر باہر آیا تو لوور باغ میں پتھر کی دیوار پر بیٹھی حسب معمول سگریٹ پی رہی تھی۔ ایرک اس کے پاس چلا آیا۔ ”تمہیں کینسر سے ڈر نہیں لگتا؟“

”پہلے لگتا تھا، اب نہیں لگتا۔“ وہ بولی۔ ”آج کے لیے کیا ارادہ ہے، تم اکیلے روانہ ہو گے؟“

”اگر میں تمہارے ساتھ ہوں گا تب بھی اکیلا ہی ہوں گا۔“

”میں یہ بات سمجھتی ہوں لیکن مائیکل اور میگر نہیں سمجھتے۔“

”میں ان کو سمجھانا ضروری بھی نہیں سمجھتا۔“ ایرک کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

”ہم ایک ٹیم ہیں۔“ لوور نے آہستہ سے کہا۔ ”آنے والے پندرہ بیس دن تک ہمیں ایک ساتھ وقت گزارنا ہے۔“

ایرک خاموش رہا۔ کچھ دیر میں میگر اور مائیکل بھی اٹھ کر آ گئے۔ اندر کچن کی گرم فضا میں میخائل کی بیوی ناشتا تیار کر رہی تھی۔ شوہر کی طرح وہ بھی سادہ اور مخلص تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ سب روانگی کے لیے تیار تھے۔ میخائل انہیں قصبے کے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ جب وہ چاروں رہ گئے تو لوور نے ایرک سے پوچھا۔

”کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے؟“

”میں تیز چلنے کا عادی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور چل پڑا۔ ذرا دیر میں وہ خاصا آگے نکل گیا تھا۔ لوور کے پیچھے میگر اور مائیکل آ رہے تھے۔ میگر، مائیکل سے کہہ رہا تھا۔

”امریکن اور انگریز آپس میں دوست ہوتے ہیں لیکن تم دونوں کی آپس میں نہیں بنتی ہے۔“

”اس کی وجہ ہے۔ اوّل تو میں انگریز نہیں آئرش ہوں۔ دوسرے وہ مجھے دھوکے باز اور جھوٹا سمجھتا ہے۔“ مائیکل نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری۔

”دھوکے باز اور جھوٹا۔“ میگر نے حیرت سے کہا۔ ”میرا خیال ہے تم دونوں کی پہلی ملاقات اس میدان میں ہوئی تھی اور وہاں تم دونوں کا صرف تعارف ہوا تھا، تب اس نے تمہیں دھوکے باز اور جھوٹا کیسے قرار دیدیا؟“

”اس نے الفاظ سے نہیں اپنے انداز سے مجھے جھوٹا اور دھوکے باز قرار دیا۔“ مائیکل غصے میں تھا۔ ”اب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے غصہ آ جاتا ہے۔“

لوور سن رہی تھی اس سے رہا نہیں گیا وہ پلٹ کر آئی اور مائیکل سے کہا۔ ”اس وقت تم جس حال میں تھے کوئی بھی تمہیں جھوٹا اور دھوکے باز ہی سمجھتا۔ منشیات استعمال کرنے والے کو آدمی اور کیا سمجھے۔“ یہ کہہ کر لوور تیز قدموں سے دوبارہ آگے بڑھ گئی۔ مائیکل غصے سے اس کے پیچھے جانے لگا تھا کہ میگر نے اس کا بازو تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں تنبیہ تھی کہ مائیکل بات بڑھانے سے گریز کرے۔

”امریکی میں خرابی نہیں ہے۔“ میگر نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہمیں نشے کی حالت میں کسی سے بات نہیں کرنی چاہیے، اس سے یقیناً کوئی اچھا تاثر سامنے نہیں آئے گا۔“

مائیکل کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اپنا بازو چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ ایرک ان لوگوں سے خاصا آگے نکل گیا تھا۔ ایک جگہ اسے چند قبریں دکھائی دیں۔ وہ راستہ چھوڑ کر ان قبروں کی طرف بڑھا۔ اس نے جیکٹ سے پلاسٹک کا لفافہ نکالا اور اس میں موجود سنہری بالوں میں سے چند نکال کر ایک قبر کے ساتھ زمین پر رکھ دیے۔ وہ خاموش کھڑا تھا کہ عقب سے آنے والی آہٹ پر چونکا۔ لوور کھڑی تھی۔ ایرک اس کے پاس سے گزر کر راستے کی طرف جانے لگا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس سے پہلے کہ لوور اس سے کچھ کہتی، اس نے کہا۔ ”تم لوگ میرے بارے میں سوچتے ہو؟“

”ہاں۔“ لوور نے اعتراف کیا۔ ”ہم سب تمہارے بارے میں سوچتے ہیں۔ میگر کا خیال ہے تم پُراسرار ہو، مائیکل تم پر غصہ ہے کہ تم اسے جھوٹا اور دھوکے باز خیال کرتے ہو اور میخائل کا کہنا تھا کہ تم پہلی بار کسی ٹریک پر نکلے ہو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ایرک نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے یہ تمام باتیں کسی حد تک درست ہیں مگر اس انداز میں نہیں جس طرح یہ لوگ سوچ رہے ہیں۔“ لوور نے کہا۔ ”تم سچ مچ مائیکل کو دھوکے باز اور جھوٹا سمجھتے ہو؟“

”ہاں، مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔“

لوور زور دے کر بولی۔ ”ہم سب ایک ساتھ ہیں، ایک ٹیم کا حصہ ہیں۔“

”میں اس ٹیم کا حصہ نہیں ہوں۔“ ایرک نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اکیلے سفر کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے لوور نے اپنی رفتار کم کر لی۔ اس دن وہ الگ الگ جگہوں پر رکتے رہے۔ البتہ شام کے وقت وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ اس بار انہیں کوئی آبادی نہیں ملی تھی اور راستے میں ہی رات ہو گئی تھی۔ ایرک نے دو چٹانوں کے درمیان جگہ منتخب کی اور پیچھے سے وہ تینوں بھی آ گئے۔ مائیکل کا خیال تھا کہ انہیں آگے سفر جاری رکھنا چاہیے، ممکن ہے کوئی آبادی مل جائے مگر میگر اور لوور اندھیرے میں سفر کے خلاف تھے اور ایرک پہلے ہی پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ خوش قسمتی سے نزدیک ہی ایک چشمہ بھی بہہ رہا تھا، اس لیے پانی کا مسئلہ نہیں تھا۔ ایرک نے اپنا رک سیک اتارا اور جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ سورج ڈوبتے ہی سردی تیزی سے بڑھی تھی اور وہ سب ٹھٹھر رہے تھے۔ آگ جلی تو اس کی حرارت سے سب کی جان میں جان آئی۔ یہاں چاروں طرف بے حساب خشک لکڑی موجود تھی۔ ایرک کے پاس کافی کا برتن تھا۔ اس نے کافی بنائی۔ کپ ایک ہی تھا مگر لوور کے پاس کاغذی مگ تھے اس لیے سب کو گرما گرم کافی مل گئی۔ ایرک کے پاس ٹن بند کھانا تھا، اس نے مچھلی اور فرائی آلوؤں کا ایک ٹن کھول لیا اور پھر اپنا سلیپنگ بیگ نکال کر اس میں لیٹ گیا۔ مائیکل کے پاس کچھ نہیں تھا اور میگر کے پاس خشک آلو کے ساتھ پنیر تھا، اس نے اسی سے ڈنر کیا۔ لوور نے ایرک کی پیشکش کے باوجود کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ لوور کے پاس ہوا سے بھرنے والا گدا تھا جس پر ہلکا سا کمبل بھی چڑھا ہوا تھا اس نے اسے کھولا اور اس میں گھس گئی۔ ”آج رات میں سردی سے بچ جاؤں گی۔“

میگر اور مائیکل کے پاس رات گزارنے کے لیے ایسی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے وہ اپنے بیگوں سے ٹیک لگائے الاؤ کے سامنے بیٹھے تھے۔ میگر نے اپنا تھیلے جیسا پیٹ تھپتھپایا۔ ”یہ اضافی بوجھ دیکھ رہے ہو نا... میں اسے خود سے اتار پھینک دینا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے میں نے وزن کم نہیں کیا تو ایک دن اچانک میرا دل رک جائے گا۔“

”مجھے کہانی کی تلاش ہے۔“ مائیکل نے کہا۔

”مجھے اپنے گھر، اپنے دفتر اور اپنی گاڑی سے نفرت ہو گئی تھی۔“ لوور کی آواز آئی۔

”میرا خیال ہے ہم جھوٹوں کو اب سو جانا چاہیے۔“ ایرک نے کہا تو مائیکل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا وہ اٹھنے جا رہا تھا کہ میگر نے اسے روکا۔

”اس نے تمہیں نہیں، سب کو کہا ہے۔“

”سب میں، میں بھی شامل ہوں۔“ مائیکل رک گیا لیکن اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

”سب میں یہ خود بھی شامل ہے۔“

مائیکل ایک جھٹکے سے واپس بیٹھ گیا تھا۔ ایرک کچھ دیر ان کی باتیں اور پھر الاؤ میں لکڑیاں چٹخنے کی آواز سنتا رہا۔ کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح سورج کی روشنی نے ان سب کو بیدار کیا۔ ایرک نے سلیپنگ بیگ سے منہ نکال کر گہری سانس لی اور اسے تعجب ہوا کہ یہ ہوا بالکل مختلف تھی۔ بالکل تازہ اور بنا کسی ملاوٹ کے تھی۔ لوور نے کافی چڑھا دی تھی۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے ایک بڑی سی ڈبل روٹی اور خالص مکھن کے ڈلے کے ساتھ آٹھ عدد ابلے انڈے نکالے۔ وہ سب خوش ہو گئے تھے لیکن میگر سب سے زیادہ خوش تھا۔ انڈے سب کو دو دو ملے تھے لیکن ڈبل روٹی وہ نصف کھا گیا تھا۔ ایرک نے سرسری سے انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے تمہارے ڈاکٹر کی پیش گوئی درست ثابت ہو گی۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“ میگر نے اعتراف کیا۔

”جب تمہارے پاس یہ سب تھا تو تم نے رات کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیوں نہیں کھایا۔'' مائیکل نے لوور سے پوچھا۔

''میں بھوک کا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔''

''تم نے یہ کب لیا؟'' ایرک نے پوچھا۔

''میں نے نہیں لیا، مجھے شیبانا نے دیا تھا۔ میخائل کا کہنا تھا کہ اس شام ہمیں کوئی آبادی نہیں ملے گی تو یہ صبح ہمارے ناشتے کے کام آئے گا۔ اس کا کہنا درست ثابت ہوا۔''

قوت بخش اور بھرپور ناشتے اور گرم کافی نے انہیں تازہ دم اور سفر کے لیے تیار کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا سامان پیک کیا اور چل پڑے تھے۔ چھوٹے آئینے میں پیچھے دیکھتی لوور نے مسکرا کر آئینہ بند کر دیا اور تیز قدموں سے چلتی ایرک کے پاس آگئی جو حسب معمول سر جھکائے تیز تیز چل رہا تھا۔ ''تم نے رات پھر مائیکل کو طیش دلا دیا۔''

''وہ طیش میں نہیں آتا صرف پوز کرتا ہے۔ اندر سے وہ بہت ٹھنڈا ہے۔''

''تم نے سب کو جھوٹا کیوں قرار دیا؟''

ایرک چلتے چلتے رک گیا اور لوور کی طرف مڑا۔ ''کیا یہ غلط ہے، ہم سب جھوٹے نہیں ہیں۔۔۔؟ ہم اس ٹریک کی جو وجہ بتاتے ہیں کیا وہ درست ہے؟۔۔۔ نہیں، ہم سب جھوٹ بولتے ہیں۔ تم بھی اور میں بھی۔''

ایرک دوبارہ چلنے لگا لیکن اس بار اس کی رفتار ذرا سست تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر جیسے خود سے کہنے لگی۔ ''پانچ سال پہلے میں ٹریک پر نہیں جاتی تھی۔ میں تو گھر سے کبھی باہر نہیں نکلتی تھی۔ مجھے گھر میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ میرا گھر بہت خوب صورت تھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں وہ سجا سنورا اور صاف نہیں تھا۔ میرے دو بچے جین اور رومین بہت شرارتی تھے۔''

لفظ تھے پر ایرک چونکا مگر اس نے کچھ کہا نہیں، وہ جانتا تھا اسے صرف سننا تھا۔ لوور کہتی رہی۔ ''میرا شوہر مارلوین مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت نے مجھے اپنا اسیر بنا رکھا تھا۔ اسکول کے دور میں، میں خواب دیکھتی تھی کہ ساری دنیا میں گھومتی پھر رہی ہوں۔ مگر مارلوین سے شادی کر کے میں سب بھول گئی۔ پھر جین اور رومین ہوئے تو مجھے بالکل کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ سب میری زندگی تھے۔ پھر ایک دن۔۔۔ نومبر کا ہی ایک سرد دن تھا۔ مجھ سے میرا سب چھن گیا۔'' لوور کی آواز نم ہونے لگی۔ ''مارلوین بچوں کے ساتھ مارکیٹ گیا اس کی کار پر ایک ٹریلر چڑھ گیا۔۔۔ کار چکنا چور ہو گئی۔۔۔ اس کے اندر جو تھا وہ بھی۔۔۔۔'' لوور کی آواز میں نمی بڑھ گئی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گئی۔ ایرک نے اپنی رفتار

تیز کر دی اور لوور نے رفتار سست کر لی وہ پیچھے رہ گئی۔

دوپہر کے وقت ایرک ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوا۔ اس کے چوک پر بڑی رونق تھی۔ ایرک کے آرام کا وقت آگیا تھا اس لیے وہ ایک میز پر ٹک گیا۔ دھوپ تیز تھی اور مسلسل چلنے سے اسے پسینا آ رہا تھا۔ ایک عمارت سے ایک شخص نکلا اور اورنج جوس کا گلاس اس کے سامنے رکھ کر مسکرایا اور واپس عمارت میں چلا گیا۔ ایرک اورنج جوس پی رہا تھا کہ وہ تینوں بھی آ پہنچے۔ میگر بہت خوش تھا کیونکہ یہاں چاروں طرف کھانے پینے کے لیے بہت کچھ نظر آ رہا تھا۔ لوور سگریٹ پی رہی تھی اور اس کے چہرے پر کچھ دیر پہلے سنائی کہانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میگر کھانے کی بات کرتا، ایرک نے کہا۔

''تم نے صبح اچھا خاصا ناشتا کر لیا ہے، اب تم شام تک گزارا کر سکتے ہو۔''

''لیکن رات پھر کسی ویرانے میں ہوئی تو؟'' میگر نے کہا اور اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک پلیٹ میں بھنی بوٹیاں اور گارلک بریڈ کے ٹکڑے لے آیا۔ مائیکل دوسری میز پر اکیلا بیٹھا ہوا اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ لوور واش روم کے لیے ایک ریستوران کے اندر چلی گئی۔ واپسی میں وہ اٹالین سویوں جیسی کوئی ڈش لے آئی۔ میگر نے ایرک کو آفر کی تھی مگر اس نے شکریے کے ساتھ منع کر دیا۔ ''میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔ شام تک گزارا ہو جائے گا۔''

مگر وہ لوور کی پیشکش مسترد نہیں کر سکا تھا کیونکہ اسے یہ ڈش اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے چکھ کر دیکھا۔ ''اچھی ہے۔'' اس نے دو چمچ لے کر ہاتھ روک لیا۔ ''بس مجھے اتنی ہی اچھی لگی ہے۔''

''یہ اب تک کی میری سب سے اچھی ڈش ہے۔'' لوور بولی۔ ایرک آج وہ پندرہ منٹ کے بجائے بیس منٹ بیٹھ گیا تھا۔ لوور نے اسے روکا۔

''مزہ آ رہا ہے کچھ دیر اور رک جاؤ۔''

''مسٹر روز مین کو جلدی ہے۔'' مائیکل نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ایرک نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ جلد قصبہ اور اس کی رونق پیچھے رہ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سبزے سے لدی پہاڑیوں کے درمیان سفر کر رہا تھا اور اس کے کانوں میں قصبے کے چوک میں کھیلتے بچوں کے قہقہے گونج رہے تھے وہ حیرت سے سوچنے لگا کہ کیا ایک انسان کسی منظر میں اتنی جان ڈال دیتا ہے اور جب انسان

ہٹ جاتا ہے تو وہی منظر بے جان لگنے لگتے ہیں۔ وہ دوسری بار رکا تو اسے اپنے عقب میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اس بار بھی وہ بیس منٹ رکا رہا اور جب وہ روانہ ہوا تو اسے فکر لاحق ہو چکی تھی کہ وہ کہیں راستہ بھٹک تو نہیں چکا ہے؟

راستے کی نشانیوں میں ایک بڑی ندی اور پھر سرخ پتھروں سے بنا ہوا پل آتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے وہ ندی تک پہنچ گیا تھا۔ آج بھی کوئی آبادی نہیں ملی تھی اس لیے رات اس نے یہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ دریا کی قربت کی وجہ سے نمی اور سردی زیادہ تھی لیکن ایک بار الاؤ جلایا تو سردی کا احساس جاتا رہا تھا۔ اس نے پنیر لگے مٹر اور جیلی کا ٹن کھولا تھا۔ آخر میں کافی پی کر وہ خود کو بہت آسودہ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے سلیپنگ بیگ میں گھس کر اپنے جوتے اتارے تو اس کے پاؤں کسی قدر سوجے ہوئے تھے۔ اس کا رک سیک اور سلیپنگ بیگ واٹر پروف تھا باقی سامان اس نے ایک جھاڑی تلے کر دیا۔ رات بارش ہوئی تھی کیونکہ وہ جاگا تو الاؤ بجھا ہوا تھا۔ ادھ جلی لکڑیوں پر نمی موجود تھی۔ انہیں دوبارہ جلانا دشوار تھا اس لیے اس نے ناشتے اور کافی کا ارادہ ترک کیا اور سامان پیک کر کے روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

سرخ پتھروں سے بنا پل جس سے اسے ندی عبور کرنا تھی کوئی ایک کلومیٹر آگے ملا۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ درست راستے پر جا رہا تھا۔ پل سے ندی کا منظر بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ ایرک نے رک سیک شانے پر ٹانگ رکھا تھا اس نے کچھ دیر کے لیے اسے پل کی دیوار پر رکھا اور جیسے ہی چھوڑا رک سیک کا توازن بگڑا اور وہ دریا میں گر گیا۔ ایرک کا ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گیا تھا۔ دراصل وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں رہ گئے اور اسی بے دھیانی میں بیگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر وہ تیزی سے نیچے کی طرف بھاگا جب کنارے پر پہنچا تو اس کا رک سیک اس کی نظروں کے سامنے پانی پر تیرتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ ایرک پھر بھاگا اور ایک جگہ جہاں دریا تنگ تھا وہ نیچے اتر آیا۔ رک سیک اسی طرف آ رہا تھا۔ ایرک نے دریا کی گہرائی کا اندازہ لگایا اور وہ جان گیا کہ تیرے بغیر رک سیک تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ جھجکا کیونکہ پانی نہایت سرد تھا۔ مگر رک سیک کے بغیر وہ اس سفر کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا تھا پھر یہ رک سیک اس کے لیے نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے جیکٹ اتار کر کنارے پر پھینکی اور پانی میں اتر گیا۔ چند لمحے کو یخ بستہ پانی نے اسے بد

کیمسٹری اور سیاستدان

ایک بیکر میں نعروں اور وعدوں کا سفوف برابر مقدار میں ڈالیں اور اچھی طرح ملا لیں۔ یعنی اتنا ملائیں کہ دو قالب یک جان ہو جائیں۔ اس کے بعد بیکر میں رشوت اور سفارش کا تیزاب ڈال دیں۔ نعروں اور وعدوں کے مرکب کو اس تیزاب میں اچھی طرح حل کر لیں۔ پھر مظلوم کے لیے پرائی آگ پر رکھ دیں۔ دس منٹ بعد سیاستدان تیار ہو جائے گا۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ اسے کسی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑائیں یا آزاد امیدوار کے طور پر الیکشن میں کھڑا کر دیں۔

****

آجکل

☆ کیا آجکل ساس اور بہو اکٹھی مل جل کر رہ سکتی ہیں؟

جی ہاں۔ بشرطیکہ، ساس بہری اور بہو گونگی ہو۔

****

بی پازیٹو

ایک لڑکے نے اپنے خون سے ایک میڈیکل کی طالبہ کو خط لکھا جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ تو لڑکے نے وہ خط دوشیزہ کو دے دیا اور کہا۔ ''جواب کا انتظار رہے گا۔''

اگلے دن جب دونوں ملے تو لڑکی نے ایک خط دیا۔

اس پر صرف اتنا تحریر تھا۔ ''آپ کے خون کا گروپ بی پازیٹو ہے۔''

****

بچت

عورت دکاندار سے۔ ''یہ ٹوٹے ہوئے انڈے کتنے روپے درجن ہیں؟''

دکاندار۔ ''پچاس روپے۔''

''اور یہ ثابت انڈے۔''

دکاندار۔ ''نوے روپے۔''

''ثابت انڈے توڑ کر ایک درجن شاپر میں ڈال دیں۔''

انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال

WWW.PAKSOCIETY.COM

حواس کر دیا تھا پھر وہ ہمت کر کے نزدیک آتے رک سیک کی طرف بڑھا اور تقریباً وسط میں جا کر اسے پکڑ لیا اب اسے کنارے تک لانا تھا، وہ ایک ہاتھ سے تیرتا رہا اور دوسرے ہاتھ سے رک سیک کو کھینچتا رہا۔ پانی کا دھارا اسے آگے دھکیل رہا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح کنارے پر پہنچ گیا۔

کتنی دیر وہ کنارے پڑا ہانپتا رہا پھر اٹھا اور رک سیک کھینچ کر اوپر لے آیا۔ پیچھے جا کر اس نے جیکٹ اٹھائی۔ پھر واپس آ کر کپڑے بدلے اور دوسری پتلون اور جرسی پہن لی مگر جوتے یہی تھے، انہیں خشک ہونے کے لیے رکھ دیا۔ واٹر پروف ہونے کے باوجود نمی کے اثرات اندر پہنچے تھے اور جو چیز گیلی تھی وہ اس نے دھوپ میں ڈال دی۔ اس نے جیکٹ پہن لی تھی مگر اس کا جسم کانپے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے لگا جیسے اسے بخار چڑھ رہا ہو۔ وہ وہیں گھاس پر لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے دور سے آواز دے رہا ہے۔ بہ مشکل اس نے آنکھیں کھولی۔ لوور اس پر جھکی ہوئی اس کے گال تھپتھپا رہی تھی۔ میگر اس کے پاس بیٹھا تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”یہ پانی میں بھیگا ہے اور اسے سردی لگ گئی ہے۔“

سورج ڈھل رہا تھا اس کا مطلب تھا وہ کئی گھنٹے تک ہوش و حواس سے بیگانہ رہا تھا۔ میگر نے نہ جانے کہاں سے برانڈی کی بوتل برآمد کی اور لوور نے کافی تیار کر کے اس میں برانڈی مکس کر کے ایرک کو چمچ سے پلائی۔ اس کا حیرت انگیز اثر ہوا، ایرک اٹھ بیٹھا تھا۔ باقی کافی اس نے خود پی تھی۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے لوور سے پوچھا۔ ”تم لوگ کب آئے؟“

”کچھ دیر پہلے ہی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم اسی قصبے میں رک گئے تھے رات وہاں جشن تھا، نئے جوڑوں کے انتخاب کا، بہت مزہ آیا۔“

مائیکل دریا کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔ وہ تینوں صبح قصبے سے روانہ ہوئے تھے اور کچھ دیر پہلے یہاں پہنچے تو ایرک کو بے ہوش پایا تھا۔ ایرک نے اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کیں جو سوکھ چکی تھیں۔ لوور نے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”آگے نہیں چلنا ہے؟“

”نہیں، ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں ہے۔ کم سے کم ایک رات آرام کرو گے تب سفر کے قابل ہو گے۔“

”تم لوگ میری وجہ سے رک رہے ہو؟“

”اگر ایسا ہے تو کیا برائی ہے آخر ہم ایک ہی ٹیم ہیں۔ کچھ دیر بعد بھی تو کہیں رکنا تھا۔“ میگر نے کہا اور برانڈی کی بوتل سے منہ لگا کر ایک لمبا گھونٹ لیا۔ لوور نے اسے ملامت سے دیکھا۔

”تم پی رہے ہو وہاں بھی تم نے بے تحاشا پی تھی، میں تو صبح تمہیں اٹھتے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔“

میگر ڈھٹائی آمیز شوخی سے ہنسا۔ ”مجھے نشہ نہیں ہوتا ہے اور ان کی شراب تو پانی کی طرح تھی۔“

”دیکھو میگر اگر تمہیں یہاں کوئی مسئلہ ہوا تو ہم کیا کریں گے۔ ہم تو تمہیں اٹھا کر بھی نہیں لے جا سکتے۔“ لوور نے فکرمندی سے کہا۔

”مت لے جانا۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”یہیں کہیں دفنا دینا... دفن ہونے کے لیے یہ اچھی جگہ ہے۔“

ایرک نے سامان رکھ دیا تھا مگر سلیپنگ بیگ باہر رکھا تھا۔ وہ سب سے زیادہ نم ہوا تھا مگر اب اس کی نمی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ سورج ڈوبنے والا تھا مائیکل اپنی نوٹ بک سے فارغ ہو کر اب میگر کے ساتھ بھری سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔ ایرک نے آہستہ سے لوور سے کہا۔ ”یہ اپنے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ اس کے ہارٹ کا مسئلہ بڑھ چکا ہے۔“

”تجربہ۔“ لوور نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

ایرک ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ”میں ہارٹ سرجن ہوں۔ گزشتہ پینتیس برس سے ہارٹ سرجری کرتا رہا ہوں یا پھر گولف کھیلتا رہا ہوں۔“

”اور ٹریکنگ؟“

ایرک نے گہری سانس لی۔ ”میں پہلی بار کسی ٹریک پر نکلا ہوں۔“

”یعنی میخائل کا اندازہ درست تھا۔“ لوور بولی پھر اس نے پوچھا۔ ”میگر کا کہنا ہے تم کبھی کبھی راستے سے ہٹ کر کسی جگہ چلے جاتے ہو وہاں کچھ کرتے ہو۔ وہ دیکھ نہیں سکا لیکن اس کا اندازہ ہے کہ تم کچھ کرتے ہو۔“

”میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔“

”کیسا فرض؟“

ایرک خاموش رہا پھر کھڑا ہو گیا۔ ”رات سے پہلے کچھ لکڑیاں جمع کر لیں ورنہ اندھیرے میں یہ کام مشکل ہو جائے گا۔“

وہ لکڑیاں چننے لگے۔ میگر اور مائیکل بھی شامل ہو گئے اور دس منٹ میں الاؤ کے لیے لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس بار ان تینوں کے پاس ڈنر کا سامان تھا۔ لوور نے اسے اپنا ٹن پیک کھولنے سے منع کر دیا۔ ”میں تمہارے لیے سویاں لائی ہوں۔“

میگر اپنے لیے مشروم کی ایک ڈش لایا تھا اور مائیکل نے اسنیک لیے تھے۔ وہ کم کھاتا تھا۔ تاریکی چھانے کے بعد انہوں نے اپنا اپنا ڈنر مکمل کیا اور کافی پینے لگے۔ اس دوران میں مائیکل دوبارہ نوٹ بک کھول کر الاؤ کی روشنی میں کچھ لکھنے لگا۔ میگر نے اس سے کہا۔ ”کیا تم اس سفر کی کہانی لکھو گے؟“

”بالکل۔“ وہ بولا۔ ”میری روزی کا ذریعہ یہی ہے، میں سفر کرتا ہوں اور پھر کہانیاں لکھتا ہوں۔“

”تم جو پیتے ہو وہ تمہیں گھر بیٹھے دنیا جہاں کی سیر کرا سکتی ہے۔“ لوور نے الاؤ کو کریدتے ہوئے کہا۔ مائیکل کا چہرہ تن گیا تھا۔

”تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

”یہی کہ اگر تم کہیں منشیات کے ساتھ پکڑے گئے تو ہم سب بلاوجہ شک کی لپیٹ میں آئیں گے۔“

”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اپنا منہ بند رکھو...“ مائیکل نے جملے کا خاتمہ ایک غیر متوقع گالی پر کیا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ لوور کا منہ کھلا رہ گیا پھر اس نے اچانک مائیکل کے گال پر تھپڑ مارا۔ وہ بے قابو ہو کر اٹھا تھا کہ ایرک درمیان میں آ گیا اور اس نے مائیکل کے منہ پر گھونسا مارا۔ وہ پلٹ کر گرا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میگر نے اسے دبوچ لیا۔ وہ چلایا۔ ”یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟“

”چھوڑ دو مجھے، میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔“ مائیکل جدوجہد کرتے ہوئے بولا۔

ایرک نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ہاں چھوڑ دو اسے... یہ کچھ زیادہ ہی بے قابو ہو رہا ہے۔“

”پلیز۔“ لوور ایرک کو پیچھے کھینچتے ہوئے بولی۔ ”تم لوگ بچے بن گئے ہو... سوری مائیکل میں بے قابو ہو گئی تھی۔“

”تم اس سے سوری کر رہی ہو۔“ ایرک برہمی سے بولا اور واپس سلیپنگ بیگ پر جا بیٹھا۔ رفتہ رفتہ مائیکل کا غصہ بھی سرد پڑ گیا اور اس نے لوور سے معذرت کر لی۔ لوور نے اسے معاف کر دیا مگر مائیکل نے ایرک سے بات نہیں کی۔ صبح جب ایرک سفر کے لیے سامان پیک کر رہا تھا تو لوور اس کے پاس چلی آئی۔

”تم جذباتی ہو گئے تھے۔“

”وہ تم پر ہاتھ اٹھانے والا تھا۔“ ایرک اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ لوور نرمی سے بولی۔ ”ہم ٹیم ہیں اور ایسی چھوٹی موٹی باتیں ہو جاتی ہیں۔“

”ٹیم... ڈیم اٹ۔“ ایرک نے رک سیک پشت پر لادا اور اسٹک چلاتے ہوئے چل پڑا تھا میگر بھی تیار تھا مگر مائیکل اپنی نوٹ بک کا پیٹ بھر رہا تھا اس کا ساتھ دینے کے لیے لوور وہیں رک گئی۔ میگر تیز تیز قدموں سے چلتا ایرک کے پاس آ گیا۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔

”تمہارا ہاتھ بہت زوردار ہے۔ مائیکل کہہ رہا تھا۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ ایرک نے بولا۔

”مجھے اُمید ہے اس واقعے کا اثر ہمارے بقیہ سفر پر نہیں ہوگا۔“

”اُمید ہے۔“ ایرک نے کہا۔ وہ خاصا آگے نکل آئے تھے۔ اس وقت وہ ایک چھوٹے سے چشمے کے پاس سے گزر رہے تھے جو آگے جا کر بڑی ندی میں گرتا ہوگا۔ اس کے ساتھ بہت خوب صورت سرخ رنگ کی جھاڑی تھی۔ اس کی شاخیں اندر سے سبز اور آخر میں سرخ ہو رہی تھیں اور گولائی لیے ہوئے یہ بڑی حسین لگ رہی تھیں۔ ایرک راستہ چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا، اس کے قریب پہنچ کر اس نے جیکٹ سے پلاسٹک کا لفافہ نکالا اور میگر کی نظروں سے بچاتے ہوئے چند سنہری بال جھاڑی پر ڈال دیے۔ پھر لفافہ واپس رکھا اور راستے پر آ کر آگے روانہ ہو گیا۔ میگر وہیں کھڑا رہا تھا۔ جب ایرک نظروں سے اوجھل ہو گیا تو جھاڑی کی طرف بڑھا اور قریب آ کر اس کا معائنہ کیا۔ اسے سنہری بال اوپر ہی نظر آ گئے تھے اس نے ایک بال اٹھا کر اس کا معائنہ کیا اور پھر اسے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

پیچھے سے لوور اور مائیکل آ رہے تھے۔ دونوں رات کا واقعہ بھول کر ہنس رہے تھے اور سگریٹ نوشی میں مگن تھے۔ البتہ لوور اپنی سگریٹ پی رہی تھی کیونکہ مائیکل کی سگریٹ یقیناً بھری ہوئی تھی۔ تب ہی وہ دن میں دو تین بار ایک ہی سگریٹ سے تین چار کش لیتا تھا اس کا مطلب تھا وہ اعتدال میں رہ کر نشہ کرتا تھا۔ لوور نے نزدیک آ کر کہا۔

”تم کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ نہیں، میں اس جھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔“ میگر نے کہا تو لوور نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”اس سفر کے دوران میں نے تمہیں کسی جھاڑی یا پودے میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔“

مائیکل ہنسا۔ ”ممکن ہے ایرک بھی اس جھاڑی کے پاس گیا ہو۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

میگر نے اسے سخت نظروں سے دیکھا اور پھر تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب وہ جس علاقے میں سفر کر رہے تھے یہ سارا اسینٹ موریسی نیشنل پارک کا حصہ تھا۔ یہاں جنگل، دریا اور پہاڑ تھے مگر آبادیاں بہت کم تھیں۔ ٹوریا کے شہر تک انہیں ایسے ہی ویرانوں میں سفر کرنا تھا اور ابھی ٹوریا کا سفر دو دن کا تھا۔ ممکن ہے راستے کی دشواری کی وجہ سے انہیں اس سے زیادہ وقت لگ جاتا۔ شام سے پہلے وہ ایک ریزرٹ پہنچے، وہاں انہوں نے کھانا پیک کرایا کیونکہ ابھی دو گھنٹے کا سفر مزید باقی تھا۔ ریزرٹ کا مالک مُصر تھا کہ رات وہاں رک جائیں مگر انہوں نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ رات پہاڑوں میں بسر ہوئی اور اس بار سردی کہیں شدید تھی۔ الاؤ جلانے کے باوجود وہ رات بھر ٹھٹھرتے رہے تھے۔ ایرک اور لوور پھر بھی اپنے بستروں میں کسی قدر آرام سے تھے لیکن مائیکل اور میگر کا حشر ہو گیا تھا۔ انہوں نے صبح سویرے اعلان کر دیا کہ اب وہ رات کسی چھت تلے ہی بسر کریں گے۔ لوور نے انہیں یاد دلایا۔ ”چھت ٹوریا پہنچ کر ہی ملے گی۔“

”تب ہم آج ہی ٹوریا پہنچیں گے۔“ میگر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

مائیکل اپنا نقشہ دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”ہم ٹوریا سے بیس میل کے فاصلے پر ہیں، پہاڑوں میں اسے دوگنا کر لو۔“

”بے شک ساٹھ میل ہو لیکن ہم آج ہی ٹوریا پہنچیں گے۔“ میگر نے کہا اور چل پڑا۔ عام طور سے وہ سب سے آخر میں روانہ ہوتا تھا لیکن اس روز وہ ان سب سے پہلے نکلا تھا۔ لوور ہنسی۔

”یہ ٹوریا پہنچ کر ہی رکے گا۔“

ایرک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اس کی حالت اتنی بری بھی نہیں ہے۔“ مائیکل نے کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر چل پڑا۔ لوور اور ایرک ایک ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ کیونکہ اب پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے ایرک ذرا آہستہ چل رہا تھا تاکہ لوور پیچھے نہ رہ جائے۔ وہ مخصوص رفتار سے نہیں چلتی تھی۔ کبھی وہ اس سے بھی تیز چلتی اور کبھی چہل قدمی کے انداز میں۔ لوور نے پوچھا۔

”میگر کو کیا ہوا؟“

”اس کا چہرہ ہلکا عنابی ہو رہا ہے اور سانس معمول سے تیز چل رہی ہے جبکہ اس نے ابھی سفر کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔“ ایرک نے وضاحت کی۔ ”اس کا دل گڑبڑ کر رہا ہے، ایسے میں زیادہ مشقت خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔“

”میرے خدا۔“ لوور پریشان ہو گئی۔ ”تب اسے روکنا ہوگا۔ وہ بہر صورت آج ٹوریا پہنچنا چاہتا ہے۔“

ایرک سر جھکائے چلتا رہا اور لوور آگے نکل گئی۔ وہ شاید میگر تک پہنچ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ ایرک درمیان میں دو جگہ رکا لیکن اسے ان تینوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ پہاڑوں میں تھے کہ شام ہو گئی۔ ایرک چلتا رہا کیونکہ وہ رات اکیلے بسر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ان تک جا پہنچا۔ وہ ایک چٹان کے چھجے تلے الاؤ جلا کر بیٹھے تھے۔ میگر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھا اور اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ایرک نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کی ہارٹ بیٹ بڑھی ہوئی تھی اور اس میں کمی بیشی ہو رہی تھی۔ اتفاق سے ایرک کے پاس کچھ دوائیں تھیں، اس نے میگر کو گولیاں دیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ”یہ کیا ہیں؟“

”ہارٹ کے لیے ہیں۔“ ایرک نے نرمی سے کہا اور ایک انرجی ڈرنک نکال کر اسے دی۔ ”یہ لے لو مگر اب الکوحل اور سگریٹ بالکل مت استعمال کرنا۔“

”ہمیشہ کے لیے؟“

”جب تک ہم ٹوریا نہیں پہنچ جاتے۔ وہاں تم لازمی ڈاکٹر کو دکھانا۔“

اس چٹان تلے انہوں نے رات سکون سے گزاری۔ ایرک نے اپنا سلیپنگ بیگ اصرار کے ساتھ میگر کو پیش کر دیا۔ وہ انکار کر رہا تھا مگر پھر اسے ماننا پڑا۔ ایرک نے رات چٹان سے ٹیک لگا کر اور بہت مشکل سے گزاری کیونکہ سردی واقعی زیادہ تھی۔ صبح میگر کی حالت اچھی تھی۔ وہ روانہ ہوئے اور دوپہر کے قریب ٹوریا پہنچ گئے۔ یہ چھوٹا شہر تھا پرانی عمارتیں مگر لوگ زندہ دل اور خوش اخلاق تھے۔ یہاں بھی حسبِ معمول کھلے چوراہوں پر کیفے بجے ہوئے تھے، وہ ایک ایسے ہی کیفے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ٹوریا نیچے تھا اس لیے موسم اتنا سرد نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اپنی جیکٹیں اتار دیں۔ ایرک نے میگر سے کہا۔ ”تمہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔“

”ارے نہیں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

ایرک نے اپنی جیکٹ ایک خالی کرسی پر رکھ دی تھی اچانک اسے حرکت کا احساس ہوا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لڑکا اس کی جیکٹ اٹھا کر بھاگ رہا تھا۔ ایرک بے اختیار اٹھا اور چلّایا۔ ”اے میری جیکٹ...“

جب تک لوگ متوجہ ہوتے لڑکا ایک گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ ایرک اس کے پیچھے دوڑا اور اس کے پیچھے تینوں دوڑے۔ ایرک باقاعدگی سے جاگنگ کرتا تھا لیکن اتنا تیز وہ کبھی نہیں دوڑا تھا۔ اس کے لیے جیکٹ اور اس میں موجود رقم، پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات اہم تھے لیکن اس کی اہم ترین چیز پلاسٹک کا لفافہ تھا جس میں سنہری بال تھے۔ یہ بال اس کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی تھے۔ لڑکا کم عمر اور پستہ قد لیکن نہایت پھرتیلا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا اور جلدی جلدی گلیاں مڑ رہا تھا۔ ایرک کے لیے اس کا تعاقب کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ پھر لوور اور مائیکل اس سے آگے نکل گئے تھے۔ میگر اس سے پیچھے تھا۔ وہ دوڑ رہا تھا اور اس کا سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر ایرک رکا اور پھر جھپٹ کر اس کے پاس آیا۔ میگر کی اکھڑتی سانسوں اور نیلے پڑتے ہونٹوں سے اسے صورتِ حال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ایرک، لوور اور مائیکل اسپتال میں آئی سی یو کے ویٹنگ روم میں تھے۔ میگر اندر تھا۔ مائیکل اور لوور بھی ناکام رہے تھے، لڑکا جیکٹ سمیت غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر آیا اور واجبی انگریزی میں ان کو مطلع کیا۔ ”مریض کی حالت اب ٹھیک ہے، تم اس سے مل سکتے ہو۔“

وہ اندر آئے تو میگر بستر پر لیٹا ہوا مسکرا رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں بچ گیا... ہارٹ اٹیک نہیں تھا۔“

”یہ کہو کہ اپنی کوشش کے باوجود بچ گئے۔“ ایرک بولا۔ ”ورنہ تم نے اپنی جان لینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔“

میگر سنجیدہ ہو گیا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو میں نے اپنا وزن کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اٹھارہ سال کی عمر سے میرا وزن اتنا ہی ہے اور آج میں چالیس کا ہونے والا ہوں۔ میں فٹ بالر بننا چاہتا تھا مگر وزن کی وجہ سے نہیں بن سکا۔ میری شادی ہوئی میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا اب بھی کرتا ہوں۔ وہ مجھے وارننگ دیتی رہی کہ میں وزن کم کر لوں مگر میں نہیں کر سکا... پھر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“ میگر خاموش ہو گیا۔

لوور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میگر کچھ دیر بعد بولا۔ ”اب میں وزن کم کیسے کر سکتا ہوں، مجھے معلوم ہے میں نہیں کر سکتا... میں دوسروں اور خود کو دھوکا دیتا ہوں۔ ایرک نے ٹھیک کہا تھا۔ میں بھی جھوٹا ہوں۔“

”لیکن تمہیں خود پر اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔“ لوور نے نرمی سے کہا۔

”میں جانتا ہوں، میں زندہ نہیں رہوں گا۔ کسی دن مجھے جان لیوا ہارٹ اٹیک ہوگا اور میں دنیا سے گزر جاؤں گا۔ اس لیے میں اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہوں۔“

ایرک ڈاکٹر سے رپورٹ لے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہارٹ اٹیک نہیں تھا۔ بس دل کو زیادہ کام کرنا پڑ رہا تھا اس لیے اس نے ہڑتال کر دی۔ میگر کے لیے کچھ دوائیں تجویز کر دی تھیں۔ ڈاکٹر نے ٹریکنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا لیکن احتیاط کے ساتھ۔ ”یہ اس کے لیے اچھا ہوگا بشرطیکہ وہ خود پر برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔ تم لوگ اسے شام تک لے جا سکتے ہو۔ وہ اب ٹھیک ہے۔“

ایرک ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایرک کی جیکٹ تھی۔ ایرک بے اختیار اس کی طرف بڑھا، آدمی بولا۔ ”سینور یہ تمہاری ہے؟“

”ہاں۔“ ایرک نے کہا۔ آدمی نے اس کی طرف بڑھائی۔ ایرک نے چیک کیا۔ تمام چیزیں موجود تھیں، پلاسٹک کا لفافہ بھی تھا۔

”سب موجود ہے، میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ میرے بیٹے کا کام ہے۔“ آدمی نے کہا اور بلند آواز سے اسپینش میں کچھ کہا۔ فوراً ہی وہ لڑکا اندر آیا جو ایرک کی جیکٹ لے کر بھاگا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر ندامت تھی۔ آدمی نے درشت لہجے میں کچھ کہا تو لڑکے نے اٹک اٹک کر کہا۔

”سینور... میں معافی چاہتا ہوں... میں نے آپ کی جیکٹ چرائی تھی۔“

آدمی نے کہا۔ ”سینور، میرا نام مونٹی مارلو ہے اور یہ میرا بیٹا کرس مارلو ہے۔ تمہیں تکلیف ہوئی ہے اور تمہاری چیز چرائی گئی ہے، تمہیں پورا اختیار ہے اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرو۔ لیکن اگر تم اسے معاف کر دو تو شاید اسے شرم آئے اور یہ پھر کبھی یہ حرکت نہ کرے۔“

ایرک نے لڑکے کی طرف دیکھا تو اسے بے اختیار اپنا بیٹا مارک یاد آیا، اس نے سر ہلایا۔ ”میں اسے معاف کرتا ہوں۔“

مونٹی کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ”سینور تم آج شام میرے گھر ڈنر پر آ سکتے ہو۔“

ایرک نے سر ہلایا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے، میرے ساتھ تین آدمی اور ہیں۔“

”وہ سب میرے مہمان ہوں گے۔“ مونٹی فراخ دلی سے بولا۔ ”تم نے میرے بیٹے کو معاف کر کے مجھ پر اور اس پر احسان کیا ہے۔“

”میں اپنے ساتھیوں سے پوچھ لیتا ہوں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ تینوں فوراً راضی ہوگئے تھے۔ میگر نے کہا۔ ”ایک ٹریکر کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ ایک رات کسی چھت تلے اور گھر کا بنا ہوا ڈنر کرے۔“

اس رات انہوں نے شاندار اسپینش ڈنر کیا تھا۔ مونٹی نے خود ڈشز بنائی تھیں۔ اس کی بیوی مرچکی تھی اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ کرس اسکول میں پڑھتا تھا مگر مونٹی کو تشویش تھی کہ اس کی صحبت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چوری جیسی علت کا شکار ہوگیا تھا۔ کیونکہ رات ہوگئی تھی اس لیے وہ وہیں رکے اور پھر اگلی صبح روانہ ہوئے تھے۔ مونٹی بہ طور سزا کرس سے ایرک کا رک سیک اٹھوا کر شہر سے باہر جانے والے راستے تک چھوڑنے آیا تھا۔ باپ کے حکم پر اس نے ایک بار پھر ایرک سے سوری کی اور سر جھکا کر چلا گیا۔ بیٹے کے جانے کے بعد مونٹی کے درشت تاثرات نرم پڑ گئے، اس نے کہا۔ ”میرے باپ کی لوگ مثال دیتے تھے، وہ کہتے کہ گورمیلو کو کہیں کلو سونا پڑا نظر آجائے تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا اور اسی گورمیلو کا پوتا چوری کررہا ہے۔“

”اسے نرمی اور پیار سے سمجھاؤ۔“ ایرک نے مشورہ دیا۔ سب نے مونٹی سے ہاتھ ملایا اور آگے چل پڑے۔ لوور ایرک کے ساتھ تھی، اس نے آہستہ سے کہا۔

”اسے کہتے ہیں ٹریکنگ کا چارم، ایسے کردار اور واقعات صرف ایک ٹریکر کو ملتے ہیں۔“

ٹوریا کے بعد اگلی منزل باسکس تھی۔ مگر انہیں یہاں رکنا نہیں تھا کیونکہ مسافت صرف دس میل تھی۔ البتہ وہ یہاں سے کھانا لے سکتے تھے کیونکہ رات انہیں پھر کسی کھلی جگہ بسر کرنی پڑتی۔ مونٹی نے ان کے لیے ایک اچھا کام اور کیا تھا، جب اسے پتا چلا کہ میگر کے پاس کوئی سلیپنگ بیگ نہیں تھا تو اس نے اپنی ایک خاص رضائی اسے دیدی۔ یہ ہلکی اور پتلی سی لیکن خاصی گرم تھی۔ اس کا کہنا تھا اس میں ایک مقامی پودے کی روئی بھری ہوئی تھی جو بہت گرم ہوتی ہے۔ اس رات وہ کھلے میں بھی سکون سے سویا تھا۔ اس سے اگلے دن وہ آن سو پہنچے تھے۔ مزید دو دن کے سفر کے بعد وہ ایک چھوٹے سے قصبے آئیواز پہنچے تو سب نے مل کر ایک دن وہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ ایک کسان نے اپنے اناج گھر کے اوپر بنی کوٹھری انہیں کرائے پر دیدی تھی۔ اس کے فرش پر سنہری گھاس بچھی تھی اور وہ رات کو مزے سے سوئے تھے۔ اگلے دن انہوں نے بہت سارے کام نمٹائے۔ ایرک کے کپڑے میلے ہورہے تھے اس نے نزدیکی ٹیوب ویل پر کپڑے دھوئے اور اپنے جوتے ایک مقامی موچی سے مرمت کرائے۔ وہ سب نہائے دھوئے تھے۔ پھر کھانے کے لیے مقامی سرائے میں چلے گئے۔ اس کا حلیہ قدیم سراؤں جیسا تھا مگر کھانا بہت اچھا تھا۔ میگر نے ایرک کے منع کرنے کے باوجود مقامی رم کی بوتل لی اور ان سے کہا۔

”مجھے اس سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اس میں شیئر کرلو۔“

اس رات انہوں نے فارم ہاؤس کے سامنے الاؤ جلا کر رم اور مرغی کے بھنے ٹکڑوں سے ڈنر کیا تھا یہ مرغی ان کے میزبان نے انہیں تحفے میں دی تھی۔ اگلے دن انہیں پامپلونا پہنچنا تھا جہاں سے ایرک پرتگال کے کونسلیٹ سے ویزا لگواتا۔ وہ شام تک پامپلونا پہنچ گئے تھے اگرچہ راستہ نہایت دشوار اور بعض مقامات پر پتھریلا تھا کیونکہ انہوں نے ہائی وے سے گریز کیا تھا۔ لوور کا اصرار تھا کہ ٹریکر کو پکے راستوں سے گریز کرنا چاہیے اور باقیوں نے اس سے اتفاق کیا۔

ایرک نے انہیں آگاہ کیا۔ ”مجھے ابھی پرتگال کا ویزا لینا ہے۔“

”ہم وہیں جارہے ہیں۔“ لوور بولی۔ ”یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔“

یہاں ایرک کو کسی قدر مشکل پیش آئی تھی کیونکہ ویزا اس کے پاسپورٹ پر لگ گیا تھا لیکن اجازت نامہ مارک کے نام سے نہیں مل رہا تھا مجبوراً اسے کونسلر سے ملنا پڑا اور تب کہیں جاکر یہ مسئلہ حل ہوا۔ میگر اور مائیکل باہر رک گئے تھے۔ لوور اس کے ساتھ آئی تھی وہ بھی حیران تھی کہ ایرک کیوں مارک روزمین کے نام سے اجازت نامہ بنوا رہا ہے۔ مگر اس نے پوچھا نہیں۔ اب ان کا رخ جنوب مغرب کی سمت تھا۔ یہ سفر آسان تھا کیونکہ اب آبادیاں زیادہ تھیں اور جا بہ جا پختہ سڑکیں تھیں۔ میگر اور مائیکل خوش تھے کیونکہ آبادی کا مطلب تھا انہیں خوراک اور شراب آسانی سے ملے گی۔ میگر دوا ضرور کھا رہا تھا مگر پرہیز بالکل نہیں کررہا تھا۔

لوور نے مسکرا کر معنی خیزی سے سرگوشی کی۔

”مائیکل اپنی نوٹ بک میں کیا لکھتا رہتا ہے؟“

”تم ایک بار اس کی نوٹ بک دیکھ لینا۔“ ایرک نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ لوور پیچھے رہ گئی۔ میگر اور مائیکل حسب معمول یک جان ہوکر چل رہے تھے۔ تین بجے وہ کچھ دیر کے لیے ایک قصبے میں رکے تھے۔ یہاں انہوں نے ہلکا پھلکا کھایا اور مائیکل واش روم کی طرف گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی لوور نے اس کے بیگ کی تلاشی لی لیکن اس کی نوٹ بک اس میں نہیں تھی۔ ایرک نے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے غور نہیں کیا وہ نوٹ بک ہمیشہ اپنی جیکٹ میں رکھتا ہے۔“

میگر غور سے سن رہا تھا، اس نے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر ہے؟“

”میں مائیکل کی نوٹ بک دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میگر مسکرایا۔ ”کیا تم اس میں کہانی دیکھنا چاہتی ہو؟“

”ہاں... ایرک کا خیال ہے وہ کہانیوں کے لیے سفر نہیں کرتا ہے۔“

”یہ درست ہے۔“ میگر نے سر ہلایا۔ ”وہ اپنی نوٹ بک میں الٹے سیدھے نمبر لکھتا ہے، اسکیچ بناتا ہے اور یہ اسکیچ اتنے خراب ہوتے ہیں کہ وہ یقیناً آرٹ کے پیپر میں فیل ہو جاتا ہوگا۔“

لوور حیران ہوئی تھی۔ ”سچ مچ... وہ نوٹ بک میں کچھ نہیں لکھتا؟“

”ہاں، وہ پوز کرتا ہے کہ کچھ لکھ رہا ہے۔“ میگر نے کہا۔ ”مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے... ہم سب کچھ نہ کچھ پوز کرتے ہیں۔“

آدھے گھنٹے کے آرام کے بعد وہ لوگ روانہ ہوئے۔ شام چھ بجے انہوں نے ایک روڈ سائڈ کیفے میں ڈنر کیا اور اس سے کچھ دور ایک کسان کے فارم ہاؤس کے احاطے میں اس سے اجازت لے کر ڈیرا جما لیا تھا۔ وہ ڈیٹوریا شہر سے آگے نکل گئے تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے الاؤ جلایا تھا۔ اب وہ چاروں تھے۔ ایرک نے مائیکل سے کہا۔ ”کیا تمہارا ایڈیٹر کہانی کا مطالبہ کررہا تھا؟“

”ہاں، میں اس کے ہاتھ نہیں آرہا تھا، اپنا موبائل بند رکھتا ہوں۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ میں فرانس میں کہیں ہوں۔ مگر اب وہ جان گیا ہے کہ میں اسپین میں ہوں۔“

”تم اس کے لیے بہت ساری کہانیاں لے جاسکو گے۔“ لوور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے تم نے اپنا نوٹ بک میں بہت کچھ محفوظ کرلیا ہوگا۔“

مائیکل نے لوور کو گھورا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ میگر نے افسوس سے کہا۔ ”تم نے برا کیا؟“

”ہم ایک ٹیم ہیں اور ایک دوسرے سے سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔“ لوور بولی۔ ”وہ اوور ری ایکٹ کررہا ہے۔“

”تم زیادتی کررہی ہو۔“ ایرک نے کہا۔ مائیکل دور فارم ہاؤس کی لکڑی کی باڑھ کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔

”اس کا پس منظر کیا ہے؟“ لوور بولی۔

میگر بتانے لگا۔ ”کچھ نہیں، گریجویشن اس نے کیمبرج سے کیا اور پھر کہانیاں لکھنے لگا۔ شادی کی، ایک بیٹی ہوئی بدقسمتی سے اسے بلڈ کینسر ہوگیا اور وہ کم عمری میں فوت ہوگئی۔ پھر مائیکل کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تب سے اکیلا ہے۔“

ایرک کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ وہ آج کل جلد تھک جاتا تھا۔ صبح وہ اٹھا تو مائیکل جاگ رہا تھا۔ لوور اور میگر سو رہے تھے۔ مائیکل الاؤ پر کیتلی رکھے کافی تیار کررہا تھا، اس نے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایرک کی طرف دیکھا۔ ''کافی پیو گے؟''
ایرک سلیپنگ بیگ سے باہر نکل آیا۔ صبح سرد مگر ہوا بہت خوشگوار تھی۔ ایسے میں گرم کافی نے جادو کا کام کیا تھا ایرک کی تھکاوٹ اور کسل مندی غائب ہو گئی۔ اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم کس رسالے کے لیے لکھتے ہو؟''
''یونیورس کے لیے۔'' مائیکل نے کہا تو ایرک چونک گیا۔ یہ رسالہ اس کی نظروں سے گزرا تھا، گولف کلب کی لائبریری میں باقاعدگی سے آتا تھا۔ اکثر ممبران اسے پڑھتے تھے۔
''یہ تو مشہور رسالہ ہے، امریکا میں بھی پسند کیا جاتا ہے۔''
''ہاں میں اسی میں لکھتا ہوں۔'' مائیکل نے بے دلی سے کہا۔
ایرک نے غور سے اسے دیکھا۔ ''شاید اب تمہیں لکھنا پسند نہیں ہے؟''
مائیکل کا چہرہ ستا گیا تھا پھر وہ بولا۔ ''ایک زمانے میں، میں سمجھتا تھا کہ لکھنا میرا عشق ہے۔ اس کی خاطر میں نے سب کو نظر انداز کیا تھا۔ میری بیٹی... میگی۔'' مائیکل نے اپنا پرس نکال کر اس کی تصویر ایرک کو دکھائی۔ میگی سرخ بالوں والی معصوم سی بچی تھی اس کی آنکھیں نیلی اور رنگت گلابی تھی۔ ''کوئی باپ اپنی اتنی پیاری بیٹی کو نظر انداز کر سکتا ہے... نہیں نا؟... لیکن میں نے کیا۔ اس وقت میں کہانیوں کے پیچھے پاگل تھا۔ میں بہت اعلیٰ مصنف تھا۔ مگر جب میگی کو بلڈ کینسر ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں بہت برا باپ ہوں۔ وہ صرف ایک سال زندہ رہی اور...'' مائیکل چپ ہو گیا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ایرک جان گیا تھا کہ اب اسے لکھنے سے کیوں نفرت ہو گئی تھی، مگر لکھنا اس کی مجبوری تھی۔ اسے اس کے سوا کچھ آتا بھی نہیں تھا۔ کافی پی کر ایرک سامان پیک کرنے لگا۔ اس دوران میں لوور اور میگر بھی اٹھ گئے تھے۔
ایرک روانہ ہوا، اسے معلوم تھا وہ اس کے پیچھے آئیں گے۔ تقریباً ایک کلومیٹر بعد اسے ریستوران مل گیا اور ایرک خوش ہو گیا کیونکہ یہ امریکن طرز کا فاسٹ فوڈ ریستوران تھا۔ کھانے کو بہت کچھ تھا سب خوش تھے البتہ لوور خاموش تھی۔ اس نے دو عدد ابلے انڈے لیے اور پھر کافی لی۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو لوور نے کہا۔ ''ہم اب ساتھ ساتھ سفر کریں گے کیونکہ اب سفر بہت کم رہ گیا ہے۔''
''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ایرک نے شانے اچکائے۔ ''بشرطیکہ تم لوگ میرا ساتھ دو۔''
''معاف کرنا ایسا لگتا ہے جیسے تم ٹریک پر نہیں ہو، فریضہ انجام دے رہے ہو۔'' لوور نے کہا۔ ''تم نے بہت کم مناظر غور سے دیکھے ہیں۔''
''تم غلط کہہ رہی ہو، میں سب کچھ دیکھتا ہوں۔'' ایرک نے کہا اور اپنا رک سیک اٹھا کر باہر چلا گیا۔ میگر نے لوور سے کہا۔
''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے کیونکہ یہ راستے کے آس پاس کوئی منظر مس نہیں کرتا اور اکثر راستے سے اتر کر اس طرف چلا جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے تو جاتا ہے۔''
''لیکن وہ کیوں جاتا ہے؟''
لوور کے اس سوال پر میگر نے اپنے پرس میں رکھا سنہری بال نکال کر انہیں دکھایا۔ ''یہ رکھنے جاتا ہے... اس نے ندی کے پار آنے والے چشمے کی سرخ جھاڑی پر یہ بال ڈالے تھے، میرا اندازہ ہے وہ ہر جگہ یہی بال رکھتا ہے۔''
''لیکن کیوں..... اور یہ کس کا بال ہے؟''
''ان سوالوں کے جواب صرف ایک شخص دے سکتا ہے۔'' میگر نے بال واپس پرس میں رکھ لیا۔ وہ تینوں باہر آئے تو ایرک بہت دور جا چکا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔ ان میں ایرک جو سفر کے دوران اکثر ان سے الگ ہوتا تھا۔ اب وہ بھی ان سے جڑ گیا تھا۔ مائیکل نے کہا۔ ''جانتے ہو جب انسان کسی سے جڑنے لگتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''
''یہی کہ جدائی کا وقت آ گیا ہے۔'' لوور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''درست۔'' میگر یوں ہنسا جیسے یہ سب مذاق ہو۔ شاید اپنی زندگی کی طرح وہ ہر چیز کو ہلکے پھلکے انداز میں لینے کا عادی ہو گیا تھا۔ ''کیونکہ ہم ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں اس لیے الگ ہونے کا وقت آ گیا ہے۔''
''کیا انسان کسی کے اتنا پاس آ سکتا ہے کہ تمام فاصلے مٹ جائیں؟'' لوور نے پوچھا۔
مائیکل نے شانے اچکائے۔ ''شاید... کم سے کم وہ ایسا محسوس کر سکتا ہے۔''
''اور جب انسان ایسا محسوس کرتا ہے وہیں سے جدائی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔'' میگر نے کہا۔ ''ہم سب جڑ گئے ہیں لیکن کیا امریکی ہم سب سے الگ نہیں ہے؟''
''وہ الگ نہیں ہے صرف ایسا لگتا ہے۔'' لوور نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

یقین سے کہا۔

"ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" میگر نے اعتراض کیا۔

"ہاں، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" مائیکل نے لوور کی طرف دیکھا۔ "تم بھی نہیں جانتیں۔"

"ہم اس کے بارے میں کچھ جان لیں تو بھی اس کا کیا فائدہ؟ کیونکہ اس کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ ہاں، کچھ خاص ہے جس کا تعلق ہم سے ہے۔ وہ ہم نہیں جان سکتے ہیں۔"

"امریکی بہت گہرا ہے۔" مائیکل نے کہا۔ وہ چلتے ہوئے حسبِ عادت راہ میں آنے والے کنکروں کو ٹھوکر سے ہٹا رہا تھا۔ وہ اپنی رفتار سے چل رہے تھے اس لیے ایرک خاصا آگے نکل گیا تھا اور تقریباً ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میگر نے کہا۔

"مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ اس نے عمر کے اس حصے میں خود پر بہت بوجھ ڈال دیا ہے۔"

"سوال یہ نہیں ہے کہ اس نے خود پر بوجھ ڈال دیا ہے، سوال یہ ہے کہ اس نے کیوں ڈالا ہے؟"

اس شام وہ برگوس میں رکے تھے، یہ راہ میں آنے والا اسپین کا آخری بڑا شہر تھا۔ انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلی صبح وہ روانہ ہوئے تو سب سنجیدہ اور خاموش تھے۔ حتیٰ کہ بولنے والا مائیکل بھی چپ تھا۔ اس روز وہ ایک چھوٹے سے قصبے تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے مگر رات گزارنے کے لیے جگہ نہیں ملی تھی اس لیے وہ کھلے میں سوئے۔ دوسرا دن بھی ایسا ہی گزرا تھا۔ وہ ویلا ڈولیڈ نامی شہر کے باہر سے گزرتے ہوئے پرتگال کی سرحد کے پاس ہوتے جا رہے تھے۔ ایرک بہت کم بولتا تھا، وہ سفر کے دوران سر جھکائے چلتا رہتا اور جب وہ رکتے تو وہ جلدی سے کھانا کھا کر اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس جاتا تھا اس کی آنکھوں کے گرد حلقے آ گئے تھے۔ وہ صبح سب سے آخر میں اٹھتا اور دیر سے روانہ ہوتا لیکن عام طور سے ان سے آگے نکل جاتا تھا۔ البتہ اس کا معمول کے راستوں سے ہٹ کر مختلف جگہوں پر جانے اور وہاں بال ڈالنے کا عمل برقرار رہا تھا۔

اگلے دن انہوں نے سرحد عبور کی اور پرتگال میں قدم رکھا۔ یہ براگینسا کا پہاڑی علاقہ تھا مگر سڑکیں بنی ہوئی تھیں اس لیے راستے دشوار نہیں تھے۔ وہ بحر اوقیانوس کے پاس آ گئے تھے اور ہوا میں سمندری نمی محسوس کی جا سکتی تھی۔ سرحد پر کوئی چوکی نہیں تھی بس ایک نشان تھا جو بتاتا تھا کہ یہاں سے پرتگال کی حد شروع ہو گئی ہے۔ ان کے سفر کا یہ آخری مرحلہ تھا اور اس کے بعد انہیں جدا ہو جانا تھا۔ اگلی صبح لوور، ایرک کے ساتھ تھی، اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ سست قدموں سے چل رہا تھا۔ دوپہر کے قریب وہ ایک چھوٹی سی خوش رنگ پہاڑی کے پاس سے گزرے جس کے سب سے اوپر والے حصے میں ایک پیالہ نما چٹان تھی۔ ایرک وہاں رک گیا۔ لوور نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"میں اوپر جاؤں گا۔"

پہاڑی کوئی دو سو فٹ اونچی تھی اور اوپر جانے کا راستہ واضح نہیں تھا۔ لوور نے تشویش سے کہا۔ "بہت مشکل ہے۔"

ایرک جواب دینے کے بجائے رک سیک اتارنے لگا۔ اس نے چھڑی بھی وہیں چھوڑ دی تھی اور پہاڑی کی طرف بڑھا۔ ڈھلان شروع سے مشکل تھی۔ لوور دیکھ رہی تھی کہ اسے اوپر جانے میں بہت مشکل پیش آ رہی ہے پھر ایک جگہ سے اس کا ہاتھ پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا۔ لوور بے اختیار بھاگی۔ ایرک دس بارہ گز نیچے آیا۔ وہ چت لیٹا ہوا تھا اور اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ لوور نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں... ہاں میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے کھڑا نہیں ہوا گیا۔ لوور اسے سہارا دے کر ایک پتھر تک لائی اور وہ اس سے ٹک کر ہانپنے لگا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ جوس پی کر اس کی حالت کسی قدر سنبھلی تو وہ دوبارہ اوپر جانے کے لیے تیار ہو گیا، اس بار لوور نے سختی سے روک دیا۔

"نہیں، اس بار تم گرے تو بچو گے نہیں۔"

ایرک نے پیالے نما چٹان کی طرف دیکھا۔ "لیکن مجھے وہاں جانا ہے۔"

"میں چلی جاتی ہوں۔" لوور بولی۔ "مجھے بتاؤ کیا کرنا ہے۔"

ایرک کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے جیکٹ سے پلاسٹک کا لفافہ نکالا، اس میں اب بہت کم بال رہ گئے تھے۔ "میں ان میں سے چند بال اس پیالہ نما چٹان پر ڈالنا چاہتا ہوں۔"

لوور نے اس سے لفافہ لیا اور اوپر کی طرف بڑھی۔ یہ کام اس کے لیے بھی مشکل تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس پیالے تک جا پہنچی۔ اس نے چند بال وہاں ڈالے اور پھر آس پاس دیکھا تو خود کو ایرک کا شکر گزار محسوس کیا کیونکہ وہاں سے جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ صرف یہیں سے دکھائی

دے سکتا تھا۔ اس نے چند تصاویر لیں اور نیچے اتر آئی۔ ایرک کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی، اس نے لفافہ واپس جیکٹ میں رکھا اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ لوور نے اس سے کچھ پوچھا نہیں اور اس نے بتایا بھی نہیں۔ اس رات وہ ایک جنگل میں رکے۔ درختوں کے درمیان الاؤ جلا کر انہوں نے ایک دوسرے کو بتایا کہ وہ ٹریک کے خاتمے پر کیا کریں گے؟

"میں واپسی کے لیے ٹرین پکڑوں گی۔" لوور نے کہا۔ "سارے راستے سوتی جاؤں گی۔"

"میں شاید کسی کشتی پر بیٹھ جاؤں جو ساحل پر چلتی ہیں اور اسی طرح واپس آئرلینڈ پہنچ جاؤں گا۔" مائیکل نے اپنا ارادہ بتایا۔

"میں بائی ائر واپس جاؤں گا۔" میگر بولا۔ "اب میں مزید چلنا نہیں چاہتا۔"

"میں واپس اٹلانٹا سٹی جاؤں گا اور وہاں ہفتے میں چھ دن کام کروں گا اور اتوار والے دن گولف کھیلوں گا۔"

"تم پھر ٹریک پر نہیں جاؤ گے؟" میگر نے پوچھا۔

"نہیں، یہ میرا پہلا اور آخری ٹریک ہے۔ بلکہ یہ میرا نہیں ہے۔"

لوور اس کے قریب سرک آئی۔ "پھر کس کا ہے؟"

"میرے بیٹے مارک روز مین کا۔" ایرک نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

"مارک کہاں ہے؟"

"وہ... واپس جا چکا ہے، اٹلانٹا میں... میرا انتظار کر رہا ہے۔" ایرک کہنے لگا۔ "وہ نیورو سرجن تھا لیکن دل سے سوچتا تھا۔ جیسے میں دل کا سرجن ہوں لیکن دماغ سے سوچتا ہوں۔ یہ بات مارک کہتا تھا۔ سال میں دو مرتبہ وہ ایک مہینے کی چھٹی کرتا اور اپنا سرجری کا ایپرن اتار کر ٹریکر سوٹ پہن لیتا اور رک سیک لے کر کسی انجانی سرزمین کی طرف روانہ ہو جاتا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ پہلی بار وہ اس وقت گیا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بھی محبت کرتا تھا تب ہی نیویارک میں اپنی اچھی جاب چھوڑ کر میرے پاس اٹلانٹا آ گیا لیکن وہ میرے منع کرنے کے باوجود سال میں دو بار جاتا تھا۔ میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ اسے ویرانوں میں مارے مارے پھر کر کیا ملتا ہے۔ وہ اپنے فارغ وقت کو دوستوں کے ساتھ کھیل کر اور ہنس بول کر کیوں نہیں گزارتا۔ پھر وہ اس ٹریک کے لیے فرانس آیا۔ میں اتوار والے دن اپنے دوستوں کے ساتھ گولف کھیل رہا تھا جب مجھے فرانس سے کال آئی۔ مارک حادثاتی موت کا شکار ہو گیا تھا اور اس کی لاش میری منتظر تھی کہ میں اسے واپس لے جاؤں اور دفناؤں۔ میں یہاں آیا، میں نے اسے دیکھا اور پھر مجھے پتا چلا وہ جس ٹریک کے لیے آیا تھا اس پر نہیں جا سکا تھا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ اس کی آخری رسومات سے زیادہ اہم اس کے ادھورے ٹریک کی تکمیل تھی۔ وہ میرا وارث تھا اور میں اس کا وارث ہوں اس لیے اس کے ادھورے کاموں کی تکمیل میری ذمے داری ہے۔ میں نے اس کی لاش کو اٹلانٹا کے لیے روانہ کیا اور خود یہاں آ گیا۔ یہ بال..." اس نے جیکٹ سے لفافہ نکال کر اس میں بچے ہوئے چند بال دکھائے۔ "یہ مارک کے ہیں... یہ اس کا ٹریک ہے۔ اس لیے میں اس کے وجود کا ایک حصہ ساتھ لے آیا۔ یہ ہر جگہ میرے ساتھ رہا... میں اسے ہر جگہ چھوڑتا رہا... وہ اس ٹریک پر بٹ گیا... جسمانی طور پر موجود رہا... میں اسے آخر تک لے جاؤں گا۔ وہ میرا بیٹا ہے... کیا ہوا جو موت نے اسے اس کا ٹریک مکمل کرنے نہیں دیا، میں نے اسے مکمل کیا... میں اس کا باپ ہوں... یہ میرا فرض بنتا ہے۔" بولتے ہوئے ایرک کی آواز تھرتھرانے لگی تھی۔

وہ سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ ایرک بھی کھل گیا تھا۔ سفر شاید ایسی چیز ہے جو انسان کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اگلے دن ایرک کی رفتار کہیں زیادہ سست ہو گئی تھی۔ اس لیے اب وہ اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ اس رفتار سے وہ دیر سے اپنی منزل تک پہنچتے۔ بالآخر دوسرے دن دوپہر میں وہ ساحل پر واقع قصبے تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں سمندر چٹانوں کے ڈھیر پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایرک ممکن حد تک آگے گیا جہاں لہریں بپھر کر اوپر تک آ رہی تھیں اور اس نے پلاسٹک کے لفافے کے سارے بال پانی میں ڈال دیے۔ چشم زدن میں لہریں انہیں نگل گئیں۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کے یا مارک کے ٹریک کا اختتام ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا فرض نبھا دیا تھا لیکن ایک فریضہ ابھی باقی تھا۔ اسے مارک کو ایک اور ٹریک پر روانہ کرنا تھا اور اب اسے بھی اس کے پیچھے جانا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی روانگی کب ہو گی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ان تینوں کی طرف بڑھ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انسان دشمن

ملک صفدر حیات

مشرق ہو یا مغرب... جرائم کی دنیا میں تباہی یکساں ہوتی ہے۔ انسانیت کے دشمن رسوائیوں کے گڑھے میں یوں ہی گرتے اور گراتے آئے ہیں۔ انداز اور حالات مختلف مگر نتائج ایک... برائی کے خلاف اور اچھائی کی حمایت کرنے والا جانے کیوں خسارے میں رہتا ہے اور یہاں تو کوئی زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا... رشتوں کو کھو دینے کی اذیت کیا ہوتی ہے... تپتی دھوپ میں بے سائبان ہو جانے کا احساس کیسے روح گھائل کرتا ہے... یہ بات ایک انسان دشمن کبھی نہیں سمجھ سکتا اور یہی نکتہ سمجھانے کے لیے ملک صفدر حیات جیسے لوگوں کو ہر دور میں حرکت میں آنا پڑتا ہے ورنہ... مجرموں کی کھیپ تیزرفتاری سے بڑھ جاتی ہے۔ گویا جرائم کی شرح میں اضافہ۔

بے سبب گلے پڑنے والی ایک نیکی کا

دلخراش ماجرا

رانی کے اغوا کی رپورٹ درج کروانے نصف درجن سے زیادہ لوگ تھانے پہنچے تھے۔ ان دنوں میں سعید آباد کے تھانے میں تعینات تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ مین روڈ سے لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ آمدورفت کے لیے تانگے اور بیل گاڑیاں استعمال ہوتی تھیں جو ایک نہر کے کنارے بنی سڑک پر رواں دواں رہتی تھیں۔ میں نے فوراً ان لوگوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ جون کی آخری تاریخیں اپنے جوبن کی حدت سے علاقے کے ماحول اور فضا کو دہکا رہی تھیں۔ بعض اوقات تو حبس اس قدر بڑھ جاتا کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔ بہرحال، ہر موسم کی ایک اپنی ادا ہوتی ہے اور اس ادا کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

ابتدائی گفتگو میں، میں نے فوراً اندازہ قائم کر لیا کہ میرے پاس آنے والے افراد میں صرف دو بندے کام کے ہیں۔ میں نے انہیں کمرے میں رکھ کر باقی سب کو باہر بھیج دیا۔ میں نے جنہیں اپنے پاس روکا ان میں ایک تو رانی کا باپ شوکت علی تھا اور دوسرا سعید آباد ہی کا ایک رہائشی اللہ بخش تھا۔

میں نے شوکت علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ، تمہاری بیٹی رانی کو کب اور کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟“

”ابھی...... کوئی دو گھنٹے پہلے جناب۔“ وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔ ”ادھر گاؤں ہی سے......!“

”کیا تم سعید آباد ہی کے رہنے والے ہو؟“

”ہم لوگ پرانا سعید آباد میں رہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ اصل سعید آباد گاؤں مین روڈ سے کوئی پانچ میل کی دوری پر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، سڑک سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اور سعید آباد وجود میں آ گیا تو اس کا نام ”نیا سعید آباد“ رکھ دیا گیا، جبکہ پہلے والا سعید آباد ”پرانا سعید آباد“ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ میرا تھانا نیا سعید آباد میں تھا جبکہ رانی کا اغوا پرانا سعید آباد سے ہوا تھا۔

”اغوا کنندہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اس کا نام گلاب خان ہے۔“ اللہ بخش نے جواب دیا۔ ”گلاب خان ایک جرائم پیشہ شخص ہے جناب......“

مجھے اس علاقے میں تھانے داری کرتے ہوئے کافی

WWW.PAKSOCIETY.COM

عرصہ ہو گیا تھا مگر میں نے کبھی گلاب خان غنڈے کا نام نہیں سنا تھا لہٰذا اللہ بخش سے سوال کیا۔

''کیا یہ گلاب خان پرانا سعید آباد ہی کا باشندہ ہے؟''

''نہیں جناب......!''

''پھر......!'' میں نے اللہ بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

''علاقے کے بارے میں حتمی طور پر میں کچھ نہیں بتا سکتا جناب۔'' اللہ بخش نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''سنا ہے، کسی دور دراز گاؤں سے اس کا تعلق ہے لیکن وہ ہمارے علاقے میں سے اکثر گزرتا رہتا ہے۔''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''گلاب خان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی نہیں جناب۔'' وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو آج تک اسے دیکھا ہی نہیں...... اس کا مجھ سے کوئی بیر کیسے ہو سکتا ہے۔''

''جب گلاب خان کا تم سے کوئی بیر نہیں تو پھر اس نے تمہاری بیٹی کو کس خوشی میں اغوا کر لیا ہے؟'' میں نے شوکت علی کو تیز نظر سے گھورا۔

''بیر اور دشمنی کے بارے میں، میں بتاتا ہوں جی۔'' اللہ بخش نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یاد ہو گا، چند روز پہلے دو لڑکیاں آپ کے پاس آئی تھیں۔ وہ آپ کو چند مشکوک افراد کے بارے میں بتانا چاہتی تھیں جنہوں نے کھیتوں کے اندر کچھ چھپایا تھا......؟''

مجھے فوراً یاد آ گیا۔ چند روز پہلے میں نے اپنے جوانوں کے ساتھ نہر کے پل پر ناکا لگایا ہوا تھا۔ مجھے خبر ملی تھی کہ کچھ جرائم پیشہ افراد اس راستے سے غیر قانونی مال اِدھر سے اُدھر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نہر کا مذکورہ پل پرانا سعید آباد سے بہت نزدیک تھا۔ ناکے کے دوران ہی دو لڑکیاں میرے پاس آئی تھیں اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کھیتوں کے اندر چند مشکوک افراد نے کچھ چھپایا ہے۔ میں فوراً ان لڑکیوں کے ساتھ مذکورہ مقام تک پہنچا تھا لیکن جب مجھے وقوعہ پر کچھ بھی نظر نہیں آیا تو میں نے الٹا انہی کو ڈانٹ دیا تھا۔

''ہاں، ہاں...... مجھے یاد ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اللہ بخش کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اس واقعے کا رانی کے اغوا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''تعلق یہ ہے تھانے دار صاحب!'' اللہ بخش ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ان دو لڑکیوں میں ایک میری بیٹی شبنم اور دوسری رانی تھی...... شوکت علی کی وہ بیٹی جسے اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا کہ گلاب خان نامی اس غنڈے کا رانی سے کیا تعلق؟''

''اصل تعلق کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ......'' اللہ بخش نے بتانا شروع کیا۔ ''رانی اور میری بیٹی شبنم بڑی گہری سہیلیاں ہیں۔ یہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ ہی نظر آتی ہیں۔ اس روز جب انہوں نے تین افراد کو کھیتوں میں کچھ چھپاتے دیکھا تب بھی یہ دونوں ایک ساتھ ہی تھیں، رانی نے تو گھر جا کر کچھ نہیں بتایا لیکن شبنم نے مجھے ساری کہانی سنا دی تھی۔ جب میں نے شبنم کی بات سنی تو مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ لوگ گلاب خان کے گروپ سے تو تعلق نہیں رکھتے......''

''کمال ہے......!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ بخش! مجھ سے زیادہ تو تم گلاب خان اور اس کے بندوں کے بارے میں جانتے ہو بلکہ...... میں تو سمجھو، جیسے کچھ جانتا ہی نہیں...... یہ بڑی عجیب سی بات نہیں ہے؟''

''مجھے بھی بس اتفاق ہی سے یہ معلومات حاصل ہوئی تھیں۔'' وہ بے خوفی سے بولا۔ ''میں بعد میں آپ کو اس کی تفصیل بتا دوں گا۔ فی الحال، رانی کو بازیاب کرنے کا مسئلہ درپیش ہے اس لیے آپ میری بات توجہ سے سن لیں۔''

''توجہ ہی سے سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم بولتے جاؤ۔''

''آج جب رانی کو اغوا کیا گیا تو شبنم بھی اس کے ساتھ تھی۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''وہ دونوں نہر کے کنارے والے نیم پختہ راستے پر چل رہی تھیں کہ گلاب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، وہ لوگ اپنے کسی مشن پر نکلے ہوئے تھے اور انہیں راستے میں یہ لڑکیاں مل گئیں۔ انہوں نے انہیں اٹھا کر گھوڑوں پر لادنے کی کوشش کی۔ شبنم جان بچا کر بھاگ نکلی اور رانی کو وہ اٹھا کر لے گئے۔ میرا خیال ہے، گلاب خان کو شک ہو گیا تھا کہ انہی لڑکیوں نے تھانے دار کو ان کی ''سرگرمی'' کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے تو یہ ایک انتقامی کارروائی لگتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہاری بیٹی شبنم......'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رانی کے اغوا کی چشم دید گواہ ہے؟''

''جی یہی حقیقت ہے......'' اللہ بخش نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اللہ بخش! تمہارا تفصیلی انٹرویو تو میں بعد میں کروں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہلی فرصت میں تمہاری بیٹی شبنم سے ملنا ہو گا تاکہ رانی کی بازیابی کے لیے کوئی جامع لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔''

''شبنم اس وقت گھر میں ہے جناب......!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم سب پرانا سعید آباد جا رہے ہیں۔''

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

پرانا سعید آباد جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، نیا سعید آباد کے شمال میں لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے کانسٹیبل رفیق کو اپنے ساتھ لیا اور اللہ بخش و شوکت علی کی معیت میں، ایک تانگے پر سوار ہو کر پرانا سعید آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم اصل سعید آباد یعنی پرانا سعید آباد نامی گاؤں کے اندر تھے۔

اللہ بخش کی راہنمائی میں ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سے گلاب خان نامی غنڈے نے رانی کو اغوا کیا تھا۔ شبنم نے گھر جا کر اللہ بخش کو رانی کے اغوا کی کہانی من و عن سنا دی تھی۔

وہ جگہ کھیتوں کے کنارے ایک مقام تھا۔ یہ دراصل ایک کچی پگڈنڈی تھی جو کھیتوں کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نہر کے اس پل کی طرف جاتی تھی جہاں چند روز پہلے میں نے ناکا لگایا تھا۔ اللہ بخش نے گلاب خان نامی غنڈے کے بارے میں جتنے وثوق سے بات کی تھی اس نے میرے ذہن میں ایک سنسنی سی جگا دی تھی۔ یہ شخص اگر گلاب خان کے بارے میں جانتا تھا تو پھر میرے لیے بہت کام کا ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اللہ بخش کو ذہن میں رکھتے ہوئے جائے وقوعہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

کچی زمین پر مختلف انسانوں کے قدموں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ چند جانوروں کے پاؤں بھی بڑے واضح بنے ہوئے تھے جن میں گھوڑوں کے سموں کو الگ شناخت کیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام تر نشانات آپس میں اس طرح گڈمڈ تھے کہ ان سے کوئی مدد لینا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے گھوم پھر کر اس کچی پگڈنڈی کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا لیکن بادی النظر میں کھرے کھوج کا کوئی امکان دکھائی نہ دیا۔ پولیس کو وہاں مصروف کار دیکھ کر چند دیہاتی جمع ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے بھی پوچھ گچھ کی مگر کوئی کام کی بات سامنے نہ آ سکی جس کی مدد سے میں رانی تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔

میں نے نصف گھنٹے کے اندر موقع کی کارروائی کو نمٹایا اور اللہ بخش کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ مغوی رانی کا باپ شوکت علی بھی وہیں چلا آیا تھا۔ موسم کی شدت کے پیش نظر اللہ بخش نے ہمارے لیے لسی پانی کا بندوبست کیا۔ میں نے کہا۔

''اللہ بخش! میں پہلی فرصت میں تمہاری بیٹی شبنم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ لسی وغیرہ پئیں۔ میں شبنم کو بلا کر لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

ہم اس وقت اللہ بخش کے گھر کے وسیع و عریض صحن میں، ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں دو چارپائیاں پہلے سے بچھی ہوئی تھیں۔ میرے لیے اللہ بخش نے ایک کرسی ڈال دی تھی۔ شوکت علی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس گھر میں اللہ بخش اور اس کی بیٹی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ برسوں پہلے شبنم کی ماں زینت کا انتقال ہو گیا تھا۔

گاؤں دیہات کے گھروں میں عموماً کشادگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اللہ بخش کا گھر کچھ زیادہ ہی کشادہ نظر آتا تھا۔ صحن میں انواع و اقسام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ مال مویشی بھی بندھے ہوئے تھے۔ شوکت علی نے مجھے بتایا کہ اللہ بخش پہلے شہر میں رہتا تھا۔ کافی عرصہ پہلے گاؤں میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اللہ بخش اپنی بیٹی کے ہمراہ ہماری طرف بڑھتا نظر آیا تو میں نے شوکت علی سے کہا۔

''میں شبنم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں......!''

وہ فوراً سے پیشتر میری بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، تھانے دار صاحب! میں اپنے گھر چلتا ہوں۔ آپ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میری طرف آ جائیے گا۔''

''تمہارا گھر کس طرف ہے شوکت علی؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی گلی میں ہے جی۔'' شوکت علی کے بجائے اللہ بخش نے جواب دیا۔ پھر شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھو نا...... تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں ذرا سائرہ کو جا کر تسلی دوں۔'' شوکت علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''رانی کی وجہ سے اس کا برا حال ہو رہا ہے......''

WWW.PAKSOCIETY.COM

سائرہ، رانی کی ماں کا نام تھا۔ شبنم کی طرح رانی بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ میں نے شوکت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''شوکت علی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا اور...... ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا تمہاری طرف ہی آرہا ہوں۔''

وہ مجھے سلام کر کے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔

شبنم اور اللہ بخش میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔

میں نے پہلی نظر ہی میں شبنم کو پہچان لیا۔ چند روز پہلے وہ اپنی سہیلی مغوی رانی کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ شبنم متناسب القد، دبلی پتلی اور خوب صورت لڑکی تھی۔ عمر لگ بھگ بائیس سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں شے اس کی موٹی موٹی آنکھیں تھیں، وہ اپنی سہیلی کے اغوا پر خاصی افسردہ اور چپ چپ سی نظر آتی تھی۔

''بیٹی!'' میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے نہایت ہی نرمی سے کہا۔ ''اگر تم مجھ سے تعاون پر آمادہ ہوجاؤ تو میں جلد از جلد تمہاری سہیلی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوسکتا ہوں۔''

''میں...... تعاون......؟'' اس نے اپنی موٹی آنکھوں میں الجھن بھر کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں، مجھے تمہارا تعاون چاہیے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''رانی کو تمہارے سامنے اغوا کیا گیا ہے...... تم ہی مجھے بتا سکتی ہو، وہ کون لوگ تھے اور رانی کو کس طرف لے گئے ہیں......؟''

''وہ کل تین افراد تھے...... گھوڑوں پر سوار......'' وہ سہمی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جنہیں چند روز پہلے ہم نے کھیتوں میں کچھ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا اور...... آپ کو بتانے تا کے پر گئی تھیں......''

''ان کی کون سی باتوں سے تمہیں اندازہ ہوا کہ یہ وہی لوگ تھے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''چند روز پہلے جب میں اور رانی آپ کے پاس ان کی شکایت لے کر پہنچی تھیں تو ہم نے بہت دور سے انہیں بڑے پُراسرار انداز میں، کھیتوں کے اندر کچھ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے ہمیں واضح طور دکھائی نہیں دیے تھے۔ آج جب ہم دونوں سہیلیاں کھیتوں کے ساتھ ساتھ کچی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے گاؤں کی طرف آرہی تھیں تو تین گھڑسوار ہمارے نزدیک آکر رکے۔ ان میں سے ایک ان کا لیڈر نظر آتا تھا۔ ان کی باہمی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ وہی لوگ تھے......''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے ایسی کون سی باتیں کی تھیں......؟''

وہ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔ ''ہم پر نظر پڑتے ہی ان کے سردار نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا...... یہ تو وہی لڑکیاں ہیں جنہوں نے تھانے دار سے ہماری شکایت لگائی تھی......''

''پھر کیا حکم ہے دادا......؟'' اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے بڑے لوفرانہ انداز میں پوچھا۔

دوسرا بولا۔ ''گلاب خان...... ہم تو تیرے اشارے کے منتظر ہیں...... اتنی خوب صورت کبوتریوں کو چھوڑنا کفرانِ نعمت ہے......''

''ٹھیک کہتے ہو......!'' گلاب خان نامی اس غنڈے نے حریصانہ نظر سے ہماری طرف دیکھا اور تحکمانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اٹھا لو ان دونوں کو...... ڈیرے پر جا کر ان کا معائنہ کریں گے......''

ان غنڈوں کے خبیثانہ عزائم کا اندازہ ہوتے ہی ہم نے دوڑ لگا دی۔ رانی کی بدقسمتی کہ وہ ایک ناہموار جگہ پر پاؤں پڑنے سے منہ کے بل گر پڑی۔ بھاگنے کے دوران میں ہمارے درمیان کافی فاصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ میں آگے اور رانی پیچھے تھی۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر میں رکی تھی۔ میں نے دیکھا، گلاب خان نامی غنڈے کے دونوں ساتھی رانی کو ڈنڈا ڈولی کر کے گھوڑے کے قریب لے گئے تھے۔ پہلے میرے ذہن میں آئی کہ مجھے آگے بڑھ کر رانی کو غنڈوں سے بچانا چاہیے پھر خیال آیا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ مجھے فوراً گاؤں والوں کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے...... میں نے اندھا دھند گھر کی سمت دوڑ لگا دی......''

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی، ایک طویل سانس لی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''میں نے گھر پہنچ کر ابا کو رانی کے اغوا کے بارے میں بتا دیا۔ ابا نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور گلاب خان کے ذکر پر یہ گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا......''

میں نے شبنم کے قریب ہی بیٹھے ہوئے اللہ بخش کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ اللہ بخش کے ہونٹوں پر مجھے بڑی پُراسرار مسکراہٹ نظر آئی۔ اس مسکراہٹ میں گمبھیرتا بھی شامل تھی۔ میں اللہ بخش کو اسٹینڈ بائی رکھ کر دوبارہ شبنم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''پھر...... پھر کیا ہوا......؟'' میں نے شبنم سے پوچھا۔

''پھر...... میں اور ابا سیدھے رانی کے گھر پہنچے۔'' وہ بتانے لگی۔ ''رانی کی اماں اور ابا کو اس واقعے کے بارے میں بتایا پھر...... میں واپس گھر آگئی اور ابا باقی لوگوں کے ساتھ آپ کے پاس تھانے چلا گیا تھا۔''

''تم نے اپنی سہیلی رانی کے گھر رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' میں نے تیز نظر سے شبنم کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''رانی کی ماں کو تسلی دلاسے کی ضرورت تھی اور اس موقع پر تم سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوسکتی تھیں......؟''

''میں فوراً واپس نہیں آئی تھی!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کافی دیر تک رانی کے گھر میں موجود رہی تھی۔ اس کے بعد ہی اپنے گھر آئی تھی ویسے بھی......'' اس نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

''ویسے بھی رانی کا گھر مجھ سے دور تھوڑی ہے۔ وہ بھی اسی گلی میں رہتی ہے...... میرا مطلب ہے، رہتی تھی۔ جب جی چاہے گا، میں دوبارہ وہاں چلی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''مجھے ان تین افراد کے حلیوں کے بارے میں وضاحت سے بتاؤ جنہوں نے رانی کو اغوا کیا ہے......؟''

''یہی سوال ابا نے بھی کیا تھا......!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''ایک بار مجھے بھی بتا دو......''

اگلے دو منٹ میں شبنم نے گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کے قد کاٹھ اور حلیوں کے بارے میں مجھے تفصیلاً بتا دیا۔ میں نے یہ صورتی معلومات اپنے دماغ کے ایک خاص خانے میں محفوظ کرلیں اور شبنم سے استفسار کیا۔

''جائے وقوعہ سے گھر کی طرف آتے ہوئے تم نے کس کس کو رانی کے اغوا کے بارے میں بتایا تھا؟''

''راستے میں مجھے صرف ایک آدمی ہی ملا تھا...... علی مراد!'' میرے سوال کے جواب میں شبنم نے بتایا۔ ''بس، میں نے علی مراد ہی سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔''

''تم نے جائے وقوعہ سے فوراً گھر کی سمت دوڑ لگا دی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں یہ تو پتا نہیں ہوگا کہ وہ غنڈے رانی کو کس طرف لے گئے تھے......؟''

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ مطلب یہ کہ اسے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا اور اس کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ بخش! میں اب شوکت علی کے گھر جاؤں گا۔ تم علی مراد کو ڈھونڈ کر میرے پاس لے آؤ۔ میں اس بندے سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں......''

''ٹھیک ہے جی، چلیں۔'' اللہ بخش نے کہا۔

ہم اللہ بخش کے گھر سے نکل کر شوکت علی کے گھر کی جانب بڑھ گئے۔

اب تک کی ملاقات میں، میں نے جو محسوس کیا تھا اس کے مطابق، اللہ بخش بہت ہی گہرا آدمی نظر آیا تھا۔ میں فرصت میں اس کا تسلی سے انٹرویو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ خصوصاً گلاب خان کے حوالے سے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوگا۔

میں شوکت علی کے گھر میں لگ بھگ دو گھنٹے تک موجود رہا اور گھما پھرا کر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا مگر ایسا کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا جسے تھام کر میں رانی تک رسائی حاصل کرسکتا۔ بہ ظاہر یہی نظر آتا تھا کہ گلاب خان اور اس کے ساتھی انتقاماً رانی کو اٹھا کر کہیں لے گئے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ شبنم کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان لوگوں کی باقاعدہ ان لڑکیوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ رانی ان کی وقتی خفگی کا نشانہ بن گئی تھی۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں گلاب خان اینڈ کمپنی کا تعاقب کرنے کے بجائے گاؤں ہی میں بیٹھا لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا پھر رہا تھا۔ آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں کیونکہ آپ نہیں جانتے، رانی کے اغوا کو جب تک کتنا وقت گزر چکا تھا۔

جی ہاں...... جب مجھے رانی کے اغوا کی اطلاع دی گئی اس وقت اس واقعے کو لگ بھگ ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ یہ میں کم از کم وقت بتا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے، اس سے زیادہ وقت ہی گزرا ہوگا۔ ان حالات میں اندھا دھند کسی سمت دوڑ لگا دینا عقل مندی نہیں تھی۔ گلاب خان اور اس کے ساتھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس دوران میں رانی کو جائے وقوعہ سے کافی دور پہنچا چکے ہوں گے لہٰذا مناسب سمت کا تعین کیے بنا منہ اٹھا کر کہیں بھی نکل کھڑے ہونا وقت برباد کرنے کے مترادف تھا اور میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا جبھی رانی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی سرے کی تلاش میں تھا۔ اس سلسلے میں علی مراد نے بڑی حد تک میری مدد کی۔

علی مراد وہ بندہ تھا جو شبنم کو جائے وقوعہ سے گھر کی جانب جاتے ہوئے راستے میں ملا تھا اور شبنم نے اسے رانی کے اغوا کے بارے میں بتایا تھا۔ میری ہدایت پر اللہ بخش، علی مراد کو پکڑ کر شوکت علی کے گھر لے آیا تھا۔

علی مراد کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ واجبی سی صحت کا مالک ایک عام سا آدمی تھا۔ رسمی سوالات کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''علی مراد! کیا تم نے ان گھڑسواروں کو جاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

''جی ہاں......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب شبنم نے مجھے بتایا کہ رانی کو چند غنڈوں نے اغوا کرلیا ہے تو اس نے ایک جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ جب میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے اڑتی ہوئی دھول کے اندر دوڑتے ہوئے گھوڑے نظر آئے تھے......''

''تم نے اغوا کنندگان کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''جناب، یہ ممکن نہیں تھا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''وہ لوگ اتنی دور نکل گئے تھے کہ میں طوفان کی رفتار سے بھاگ کر بھی انہیں پکڑ نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے...... ان کے پیچھے جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا......''

''وہ رانی کو اٹھا کر کس طرف گئے تھے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''پلیا سے ادھر...... مغرب کی جانب......!'' علی مراد نے بتایا۔

''پلیا سے مغرب کی جانب...... کا مطلب تھا نہر سے قائمہ زاویہ پر۔ مذکورہ نہر شمالاً جنوباً بہتی تھی اور علی مراد اسی پلیا کا ذکر کر رہا تھا جہاں چند روز پہلے میں نے ناکا لگایا تھا۔ پلیا سے مغربی جانب سرسبز و شاداب کھیتوں کا ایک طویل و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ انہی کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ رانی کو اغوا کرنے والے گھڑسواروں نے فرار کے لیے وہی راستہ اختیار کیا تھا۔

میری معلومات کے مطابق اس راستے پر کوئی آٹھ، نو یا دس میل آگے چاند نگر نامی ایک گاؤں پڑتا تھا۔ اگر اغوا کنندگان شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خط مستقیم پر گھوڑے دوڑاتے رہتے تو سیدھے چاند نگر پہنچ جاتے۔ گو عارضی طور پر ہی سہی، اغوا کنندگان کی سمت کا تعین ہو گیا تھا۔ علی مراد کے پاس میرے لیے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دو چار سوالات کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔

پھر میں نے شوکت علی کو اس کی بیٹی کی سلامتی اور بہ حفاظت واپسی کا یقین دلایا اور اللہ بخش کو اپنے ساتھ لے کر رانی کے گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر آکر میں نے اللہ بخش سے کہا۔

''تم ابھی میرے ساتھ تھانے چلو گے......؟''

''تھانے!'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''کیوں جی......؟''

''تم سے مجھے بہت ضروری کام ہے اللہ بخش!''

''مم مگر......؟'' اس کے استفسار میں گھبراہٹ بھی شامل ہوگئی۔

''ڈرو نہیں اللہ بخش!'' میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میں تمہیں کسی جرم کے سلسلے میں تھانے نہیں لے جا رہا بلکہ مجھے تم سے نہایت ہی ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا، تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''میں ذرا شبنم کو بتا آؤں جی......!''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو بہت ضروری ہے۔''

اس نے ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں، اللہ بخش، کانسٹیبل رفیق تانگے پر سوار ہو کر تھانے کی طرف جا رہے تھے۔ میں اللہ بخش کے ساتھ تانگے کی عقبی نشست پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ کانسٹیبل رفیق اور کوچوان اللہ رکھا اگلی نشست پر موجود تھے۔ اس دوران میں، میں اللہ بخش سے بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔

''اللہ بخش! تمہاری عمر کیا ہوگی؟'' میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''جناب انچاس واں سال چل رہا ہے۔'' وہ بڑے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''اگلے سال پچاس دیا میں چلا جاؤں گا۔''

''ماشاء اللہ......!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اللہ جھوٹ نہ بلوائے...... تم چالیس سے زیادہ کے نہیں

لگتے ہو۔ تمہاری صحت بڑی عمدہ اور شاندار ہے۔''

وہ خوشی سے پھول گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اللہ بخش! تمہیں گھڑسواری تو آتی ہوگی؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''بڑی چنگی طراں......!''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''آپ نے گھڑسواری کے بارے میں کیوں پوچھا۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''اس لیے کہ...... اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب......!''

''میں نے رانی کی تلاش کے سلسلے میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تلاش چونکہ گھوڑوں پر سفر کرتے ہوئے جاری رکھی جائے گی اس لیے تمہارا گھڑسوار ہونا ضروری ہے۔''

''اوہ......!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''تم کس سوچ میں پڑ گئے؟'' میں نے اللہ بخش کو بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی سوچ نہیں جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بس، یہ سن کر بڑا عجیب سا لگا تھا کہ میں کسی مشن میں پولیس کی مدد کروں گا......''

''میں نے مذاق نہیں کیا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں رانی کی تلاش کے دوران میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لیکن پہلے تم اس راز سے پردہ اٹھاؤ گے کہ گلاب خان نامی اس غنڈے کو تم کیسے جانتے ہو......؟''

اس کے ساتھ ہی میں نے کن انکھیوں سے اگلی نشست پر موجود کانسٹیبل رفیق اور کوچوان اللہ رکھا کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کو میں نے ایک دوسرے سے باتوں میں مگن پایا۔ میں اللہ بخش کے ساتھ اطمینان سے بات کرسکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شروع ہو جاؤ......'' وہ شروع ہوگیا۔

اللہ بخش نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا، میں اس کا خلاصہ اس کی زبانی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ بھی اللہ بخش کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔

''میں، اللہ بخش نوجوانی کے زمانے میں سعید آباد کو خیرباد کہہ کر شہر چلا گیا تھا۔ اس نقل مکانی کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ میں شہر میں سیٹ ہو کر شہری زندگی کا حصہ بن جانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کڑی محنت کرنا پڑی۔ میں نے بعض اوقات دن میں بیس بیس گھنٹے بھی کام کیا۔ مختلف ملازمتیں بدلنے کے بعد میں نے اپنا کام شروع کر دیا پھر تو سمجھو...... چل سو چل۔ اللہ تعالیٰ نے میرے کام میں برکت ڈالی اور میں ایک چھوٹا بزنس مین بن گیا۔ میں نے جوتوں کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا تھا۔

میرا بزنس دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ جب انسان کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو تو سب سے پہلے وہ اپنے لیے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور شریف النفس مرد اپنا ساتھی بیوی کی شکل میں تلاش کرتے ہیں۔

میں نے بھی شادی کر لی۔ میری بیوی زینت بہت ہی سگھڑ اور فرماں بردار عورت تھی۔ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتی تھی۔ شادی کے لگ بھگ دو سال بعد میری بیٹی شبنم پیدا ہوئی گویا...... ہماری زندگی مکمل ہوگئی۔

شبنم پانچ سال کی تھی کہ ہماری زندگی میں ایک انقلاب نے دستک دی۔ ٹریفک کے ایک حادثے میں شبنم کی ماں زینت کا انتقال ہوگیا۔ یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ میں رفیق زندگی سے محروم ہوگیا تھا اور شبنم کائنات کی سب سے شفیق اور مہربان ہستی ماں کو کھو بیٹھی تھی۔ ہم دونوں باپ بیٹی نے اپنی اپنی سطح پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تھک ہار کر میں مشورے کے لیے اپنے ایک دوست کے پاس گیا۔

''امیر علی! میں نے واپس گاؤں جانے کا فیصلہ کرلیا ہے......!'' میں نے اپنے دوست سے کہا۔

''پھر......؟'' امیر علی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''تم میرے ایسے دوست ہو کہ جس سے میں ہر بات بلاجھجک کرلیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے مشورہ دو...... ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے......؟''

''جو شخص کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہو اسے مشورہ نہیں دیا جاتا۔'' امیر علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بس، اتنا کہوں گا کہ تمہارا کاروبار شہر میں سیٹ ہے تو تمہیں ادھر ہی رہنا چاہیے۔ گاؤں جا کر کیا کرو گے......؟''

''یار...... بات دراصل یہ ہے کہ زینت کی جدائی کے بعد میں خود کو اندر سے بڑا خالی محسوس کرنے لگا ہوں۔'' میں جذباتی ہوگیا۔ ''میرے اندر سے مسلسل ایک آواز ابھر رہی ہے کہ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے مجھے اپنے ماضی کی جانب سفر کرنا چاہیے۔ اسی لیے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اسی لیے میں نے باقی کی زندگی گاؤں جا کر گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے شہر میں رہتے ہوئے اتنا کما لیا ہے کہ اپنے آبائی گاؤں میں اچھی خاصی زمین خرید کر بڑی مطمئن زندگی شروع کرسکتا ہوں پھر...... دو افراد کا آخر خرچہ ہی کتنا ہوتا ہے......"

امیر علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بتاؤ...... میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں......؟"

"یہ کی ہے نا تم نے کام کی بات۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ......" میں نے بتانا شروع کیا۔ "تم میرا چلتا ہوا بزنس خرید لو تاکہ مجھے جانے میں آسانی ہو۔ میں دوسروں کی نسبت کم پیسوں میں اپنا سارا کاروبار تمہارے حوالے کردوں گا...... یہ بات میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سودے میں تمہیں گھاٹا نہیں ہوگا۔"

امیر علی بھی ایک کاروباری شخص تھا۔ اس کا گارمنٹس کا بزنس تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر تم نے شہر چھوڑ کر گاؤں جانے کا اٹل فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں اور...... یہ تم نے دوسروں سے کم پیسے لینے کی کیا بات کی ہے۔ تمہارے بزنس کی جو بھی مارکیٹ ویلیو ہوگی، میں تمہیں وہی دوں گا......" وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"گھر کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"ظاہر ہے...... وہ بھی بیچنا ہے......"

"ٹھیک ہے، تم اپنا کاروبار اور گھر میرے ہاتھ فروخت کردو۔" امیر علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہم کل ہی تمہارے مکان اور کارخانے کی مارکیٹ ویلیو معلوم کرلیتے ہیں......"

اس طرح میں برسوں پہلے شبنم کو لے کر شہر سے گاؤں آگیا تھا۔ میں نے یہاں آکر ایک مناسب سا گھر اور کچھ زمین خرید لی اور راضی خوشی زندگی بسر کرنے لگا...... اب میں آپ کو گلاب خان وغیرہ کے بارے میں بتاتا ہوں......"

چند لمحات کا توقف کرکے اس نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے گاؤں میں مستقل رہائش تو اختیار کرلی تھی لیکن کبھی کبھار شہر کا چکر بھی لگ جاتا ہے۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ میں امیر علی سے ملنے شہر گیا ہوا تھا۔ وہاں کے ایک اخبار میں، میں نے گلاب خان نامی ایک غنڈے کے بارے میں پڑھا۔ ان دنوں گلاب خان خبروں میں تھا۔ آئے روز اخبارات میں اس کی تصویریں بھی چھپ تھیں۔ گلاب خان اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ میں تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ گلاب خان ایک بین الا اسمگلر کے لیے کام کرتا ہے۔ گلاب خان کا حلیہ اور میرے ذہن میں نقش ہوکر رہ گئی تھی۔ ایک ماہ پہلے میں گلاب خان کو اپنے گاؤں کے قریب سے گزرتے چونک اٹھا۔"

اتنا بتا کر اللہ بخش خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا......؟"

"چند روز پہلے جب شبنم نے مجھے آکر بتایا کہ نے اور رانی نے چند مشکوک افراد کو کھیتوں میں کچھ چھ دیکھا ہے اور وہ اس واقعے کی شکایت لے کر آپ کے بھی گئی تھیں تو میں نے شبنم سے ان جرائم پیشہ افراد حلیوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جو حلیے بیان ان میں ایک ہوبہو گلاب خان تھا۔ میں ایک ماہ پہلے گلاب خان کو اپنے علاقے میں دیکھ چکا تھا لہٰذا میرا دھیان فوراً کی طرف چلا گیا اور آج...... آج وہی گلاب خان رانی کو کرلے گیا ہے...... یہ ہے کل کہانی جناب!"

"ہوں......!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "اس کا مطلب ہے، مجھے جن جرائم پیشہ افراد کی تلاش ہے، گلاب خان اور اس کے ساتھی بھی ہوسکتے ہیں۔ تم کیا رہے ہو کہ...... گلاب خان اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے......؟"

"جی تھانے دار صاحب!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ پچھلے ایک ماہ کے اندر اس علاقے میں تین چار مرتبہ دیکھا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کہیں آس پاس ہی اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ اگر آپ سرگرمی سے اسے تلاش کریں تو رانی کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔"

"میں تو اسے ایسی سرگرمی سے تلاش کروں گا کہ تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کا ٹھکانا جہاں کہیں بھی ہے، وہ مجھ سے بچ کر نہیں جائے گا۔"

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں بیان کیا ہے کہ چند روز پہلے میں نے سعید آباد والی نہر کے پل پر ناکا لگایا تھا۔ مجھے اوپر سے ہدایات موصول ہوئی تھیں کہ میرے علاقے کے راستے غیر قانونی اسلحے کی نقل و حمل ہونے والی ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں ناکا لگایا تھا لیکن کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اب اللہ بخش نے جو تفصیل بیان کی تھی اس کی روشنی میں بہت ساری باتیں واضح ہوگئی تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس امر کی تصدیق شبنم اور رانی کی رپورٹ میں بھی ہوئی تھی۔ ناکے والے دن انہوں نے تین افراد کو کھیتوں کے اندر کچھ چھپاتے ہوئے دیکھا تھا بعد میں اللہ بخش کی تصدیق سے پتا چلا کہ ان کا لیڈر گلاب خان تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس روز گلاب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سعید آباد کے راستے کچھ غیر قانونی نوعیت کی سرگرمی کرنا چاہتا تھا اور نہر کے پل پر لگے ناکے نے اسے محتاط کر دیا تھا، لہٰذا اس نے ''مال'' کھیتوں میں چھپا دیا اور جب تک میں شبنم اور رانی کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچتا، وہ اپنے جرائم کے ثبوت کو نکال لے گیا اس کی دیدہ دلیری اس بات سے ظاہر ہوتی تھی آج بھی وہ ادھر سے گزرا تھا اور رانی کو اٹھا لے گیا تھا۔ گویا، اس نے سعید آباد کو اپنی گزرگاہ بنا لیا تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں گلاب خان تک پہنچنا تھا۔

✤✤✤

جون کا مہینا اپنے جوبن پر تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا اور اسی آسمان کے نیچے میں، اللہ بخش گھوڑوں پر سوار ہو کر سعید آباد کی مغربی سمت میں محوِ سفر تھے۔ علی مراد نامی شخص کی زبانی پتا چلا تھا کہ گلاب خان اور اس کے ساتھی غنڈے رانی کو اٹھا کر اسی سمت میں گئے تھے۔

میں اللہ بخش کو پہلے اپنے ساتھ تھانے لے آیا تھا اور ضروری تیاری کے بعد ہی ہم رانی کی تلاش میں روانہ ہوئے تھے۔ اللہ بخش چاق و چوبند اور بیدار مغز شخص تھا اسی لیے میں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پرانا سعید آباد والے نہر کے پل سے مغرب کی جانب آٹھ نو میل کے فاصلے پر چاند نگر نامی ایک گاؤں واقع تھا۔ اگر ہم ناک کی سیدھ میں سفر کرتے رہتے تو کھیتوں کے بیچ بنا یہ کچا راستہ ہمیں چاند نگر تک لے جاتا۔ دورانِ سفر میں ہم آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھ لیا۔

''اللہ بخش! اگر گلاب خان اچانک تمہارے سامنے آجائے تو کیا تم اسے پہچان لو گے......؟''

''تھانے دار صاحب! یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''میں یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا۔''

''قانون پوری طرح تمہارے ساتھ ہے اللہ بخش!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میں گلاب خان کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میں تمہیں سرکار کی طرف سے انعام وغیرہ بھی دلواؤں گا......''

''ملک صاحب! میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔'' وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''میں انعام وغیرہ لے کر کیا کروں گا اور میں کسی انعام کے لالچ میں آپ کے ساتھ ہوں بھی نہیں...... میری خواہش ہے کہ شوکت علی کی بیٹی رانی جلد از جلد مل جائے۔''

''یہ میری بھی خواہش ہے اللہ بخش!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اسی لیے تو میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر اس قیامت خیز گرمی میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوں......''

''جناب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' اللہ بخش نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''کون سی بات اللہ بخش؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہم لوگ رانی کی تلاش میں نکلے ہیں اور آپ رانی کو چھوڑ کر زیادہ ذکر گلاب خان کا کر رہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں...... خاص وجہ ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا میں وہ وجہ جان سکتا ہوں؟''

''ہاں...... ضرور!'' میں نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔ آیندہ پانچ منٹ میں، میں نے اللہ بخش کو اپنے اس مشن کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا جس کی وجہ سے میں نے پچھلے دنوں نہر کے پل پر ناکا لگایا تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور آخر میں کہا۔

''میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو جس جرائم پیشہ شخص کی تلاش ہے وہ گلاب خان کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم موضع چاند نگر پہنچ گئے۔ میں نے چاند نگر کے سب سے بااثر شخص چودھری منصور چاند کی حویلی کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

چودھری منصور چاند ساٹھ کے پیٹے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم چلچلاتی دھوپ میں سفر طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ ٹھنڈی ٹھار لسی سے ہماری آؤ بھگت کی گئی پھر چودھری منصور نے ہماری آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ میں نے غیر قانونی سامان کی نقل و حمل کا ذکر گول کرتے ہوئے اپنی گفتگو رانی کے اغوا تک محدود رکھی۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے میری بات سنی پھر اپنے دو خاص بندوں، اقبال اور نصیر کو بلایا اور رانی والے معاملے کے سلسلے میں ان سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ان بندوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

چودھری منصور چاند نے کہا۔ ''یہ اقبال اور نصیر کسی عقاب سے بھی زیادہ تیز نگاہ رکھتے ہیں۔ چاند نگر میں ہونے والی ہر کارروائی کی انہیں بہ خوبی خبر ہوتی ہے...... اگر کسی لڑکی کو اغوا کر کے اس طرف لایا گیا ہوتا تو اس کی اطلاع انہیں ضرور ہوتی۔''

''اور چاند نگر سے باہر کے بارے میں ان کی معلومات کیا کہتی ہیں؟'' میں نے باری باری اقبال اور نصیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چودھری سے سوال کیا۔

''خبر تو یہ ہر طرف کی رکھتے ہیں ملک صاحب۔'' چودھری نے فخریہ لہجے میں جواب دیا پھر سوالیہ نظر سے اپنے بندوں کو تکنے لگا۔

اقبال نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تک تو ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے جناب۔ اب رات ہونے والی ہے۔ آپ ہمیں ایک دن کی مہلت دے دیں۔ کل تک ہم آپ کو ساری رپورٹ پیش کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں کل شام تک کا وقت دیتا ہوں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں جو بھی تحقیق کرو، اس کی رپورٹ تھانے آ کر مجھے دینا ہوگی۔''

''بالکل دیں گے جی...... آپ بے فکر ہو جائیں۔'' اقبال نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے اضافہ کیا۔ ''لڑکی کے اغوا کے علاوہ بھی ایک معاملے کے سلسلے میں مجھے معلومات چاہئیں۔ ذرا اس کا بھی خیال رکھنا ہے۔''

''کون سا معاملہ جی؟'' نصیر نے چونک کر پوچھا۔

چودھری بولا۔ ''ملک صاحب! کیا کوئی اور بھی مسئلہ ہے......؟''

''جی چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ چند جرائم پیشہ لوگ اس راستے سے غیر قانونی سامان لے کر سعید آباد کے راستے آگے کہیں پہنچاتے ہیں۔ ان کے سرغنہ کا نام گلاب خان ہے۔''

''کس قسم کا غیر قانونی سامان؟'' چودھری کے استفسار میں تشویش تھی۔

''اسلحہ اور منشیات وغیرہ......!'' میں نے بتایا۔

''اوہ......!'' چودھری گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے، ہمارے گاؤں کے آس پاس سے تو اس قسم کا کوئی غیر قانونی کام نہیں ہو رہا جی۔ اس بات کی تو میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں۔''

اقبال اور نصیر بھی یک زبان ہو کر بولے۔ ''نہیں جناب...... ایسا کوئی کام ہمارے روٹ پر نہیں ہو رہا۔ ویسے ہم اس بارے میں معلومات اکٹھی کر کے آپ تک پہنچائیں گے......''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والی نظر سے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ''اور اس معاملے کو نہایت ہی خفیہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے......''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں تھانے دار صاحب!'' اقبال نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ہم ہاتھ پاؤں بچا کر یہ کام کریں گے۔''

چودھری گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! چاند نگر سے آگے دس میل کے فاصلے پر جمال پور واقع ہے اور سعید آباد سے آگے چھ میل کے فاصلے پر نور محل نامی گاؤں ہے۔ اگر آپ کی بات کو میں درست مان لوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گلاب خان کا گروہ جمال پور سے نور محل کی طرف سفر کرتا ہے اور راستے میں ہمارا گاؤں چاند نگر اور سعید آباد آتے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''نہیں چودھری صاحب...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''جلد از جلد اس معاملے کی حقیقت کھل کر سامنے آنا چاہیے۔ کمال ہے......!'' وہ عجیب سے انداز میں متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہاں اتنا کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ خبر ہی نہیں......!''

ہم مزید تھوڑی دیر تک چودھری منصور چاند کے پاس بیٹھے پھر واپسی کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

جب ہم سعید آباد سے چاند نگر کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ہم نے کسی آستانے کا بورڈ لگا دیکھا تھا۔ اس بورڈ پر لکھا تھا۔ ''آستانہ جھنڈے شاہ'' اس کے نیچے تیر کا نشان دے کر دو میل لکھا ہوا تھا۔ تیر کا نشان اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

رستے سے جنوب کی جانب اشارہ کرتا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہاں سے دو میل جنوب میں ”جھنڈے شاہ“ کا آستانہ واقع تھا ایک لکیر نما راستہ بھی آستانے کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔

اس بورڈ کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ یہاں سے سعید آباد پانچ میل اور چاند نگر چار، ساڑھے چار میل پر تھا۔ یہ جگہ ان دونوں گاؤں کے تقریباً درمیان میں واقع تھی۔ میں نے راستے کے کنارے نصب بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں، ادھر سے گزر رہے ہیں تو ذرا اس آستانے کو بھی چیک کر لیں...... تمہارا کیا خیال ہے؟“

”اچھا خیال ہے جی......!“ اللہ بخش آستانے والے پتلے سے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو پھر چلیں......؟“ میں نے پوچھا۔

”جی...... چلیں......!“ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

ہم دونوں نے اپنے گھوڑے پتلے سے، تاریک راستے پر ڈال دیے۔ پھر کچھ ہی دیر کے بعد ہم آستانے پر پہنچ گئے۔

درحقیقت وہ کوئی آستانہ نہیں بلکہ پیر جھنڈے شاہ کا مزار تھا۔ چاردیواری کے اندر آستانے یا مزار کی دیکھ بھال کرنے والے مجاور کا کمرا بنا ہوا تھا۔ مجاور کا نام سکندر معلوم ہوا۔ سکندر ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا اور صحن میں ایک چارپائی پر لے جا کر بٹھایا۔

ہمارے آنے سے پہلے وہ کھانا وغیرہ پکانے میں مصروف تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چولہے پر ہانڈی نما کوئی برتن چڑھا ہوا تھا۔ چولہے میں آگ نیم روشن تھی اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

میں چونکہ وردی میں ملبوس تھا لہٰذا مجھے دیکھ کر وہ خاصا الرٹ ہو گیا تھا۔ میں نے مجاور سکندر سے سوال کیا۔

”تمہارے علاوہ یہاں اور کون رہتا ہے......؟“

”کوئی نہیں جی...... بس، میں ہی رہتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آج دن میں کتنے عقیدت مند جھنڈے شاہ کے مزار پر حاضری دے چکے ہیں؟“ میں نے مجاور سکندر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

”دو عورتیں اور...... ایک مرد آیا تھا۔“

”کس وقت؟“

”دوپہر سے پہلے جی......!“

”ان کی عمریں کیا تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مرد تو جی بالکل بڈھا بابا تھا......“ مجاور سکندر نے بتایا۔ ”اور دونوں عورتیں بھی اچھی خاصی عمر کی تھیں۔ وہ بوڑھی تو نہیں تھیں البتہ انہیں ادھیڑ عمر کہہ سکتے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے، ان میں کوئی بھی جوان نہیں تھی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اٹھارہ، بیس یا بائیس سال کی لڑکی......؟“

”نہیں جناب، بالکل نہیں!“ اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ”آخر بات کیا ہے تھانے دار صاحب......؟“

”بات بڑی خطرناک ہے سکندر بادشاہ!“ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج صبح پرانا سعید آباد سے ایک لڑکی کو تین غنڈوں نے اغوا کر لیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے، وہ جھنڈے شاہ کے آستانے کی طرف آئے تھے اسی لیے میں لڑکی کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آ نکلا ہوں......“

میں نے آخری جملوں میں تھوڑی دروغ گوئی سے کام لیا تھا تاکہ مجاور کا ردِعمل سامنے آ سکے۔ وہ جلدی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب...... آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ اگر اس نوجوان لڑکی کو آستانے پر لایا جاتا تو مجھ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔“

”چلو...... آستانے پر نہیں لایا ہوگا۔“ میں نے بات کو تھوڑا موڑ دیا۔ ”باہر باہر سے گزر گئے ہوں گے......؟“

”اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں جناب......“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”یہ تو بتا سکتے ہو، پچھلے آٹھ دس دن میں تم نے تین اجنبی افراد کو گھوڑوں پر اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”جو شکل و صورت سے بدمعاش اور غنڈے نظر آتے ہوں؟“

”نہیں جی...... کوئی اجنبی نظر نہیں آیا مجھے......!“ اس نے جواب دیا۔

”یہ راستہ آگے کس طرف جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ سیدھا مین روڈ کی طرف جاتا ہے جناب......!“ مجاور سکندر نے بتایا۔ ”یہاں سے وہ سڑک زیادہ سے زیادہ تین میل دور ہوگی۔“

میں نے سوال کیا۔ ”اگر یہاں سے مین روڈ کی طرف جائیں تو راستے میں کیا کیا آئے گا؟“

”کچھ بھی نہیں......“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور

بتایا۔ ”صرف کھیت ہی کھیت نظر آئیں گے آپ کو......“

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک گھما پھرا کر مجاور سکندر سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر آخر میں کہا۔

”سکندر بادشاہ! کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ پولیس جھنڈے شاہ کے مزار پر پوچھ گچھ کے لیے آئی تھی۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں جناب! میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“

”سمجھ دار تو تم شکل ہی سے لگتے ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ذرا اپنے دھیان کو بھی بیدار رکھنا۔ اگر تمہیں اس آستانے پر یا اس کے آس پاس کوئی اجنبی اور مشکوک شخص نظر آئے تو اس پر گہری نگاہ رکھنا اور فوراً مجھے اس کی اطلاع دینا۔“

”ٹھیک ہے جناب...... آپ جیسا کہہ رہے ہیں، میں ویسا ہی کروں گا۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے اسے چند ضروری ہدایات دیں اور اللہ بخش کے ساتھ آستانے سے نکل آیا۔ اس وقت تک تاریکی نے ماحول کو پوری طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ جب ہم پرانا سعید آباد پہنچے تو عشا کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اللہ بخش نے مجھ سے پوچھا۔

”ملک صاحب! آپ مجھے اپنے ساتھ تھانے لے کر جائیں گے یا میں......؟“

”تمہیں تھانے جانے کی ضرورت نہیں ہے اللہ بخش!“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”تم یہاں سے سیدھے اپنے گھر جاؤ اور میں جاتا ہوں تھانے کی طرف۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں شبنم کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا۔ وہ اتنی دیر تک کبھی گھر میں اکیلی نہیں رہی......“

”مجھے بھی اس بات کا احساس ہے اللہ بخش!“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ دوبارہ جب بھی مجھے تمہاری ضرورت پیش آئے گی، میں تمہیں بلا لوں گا۔“

”میں ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں جناب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آپ کو جب بھی میری ضرورت پڑے، میں سارے کام چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

میں نے اللہ بخش کو پرانا سعید آباد والی نہر کی پلیا پر چھوڑا اور اپنے گھوڑے کو نیا سعید آباد والے راستے پر ڈال دیا۔ نیا سعید آباد...... جہاں میرا تھانا تھا......

آیندہ روز دوپہر تک رانی کی گمشدگی یا گلاب خان کے حوالے سے مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں مسلسل اس حوالے سے سوچ بچار میں مصروف تھا کہ گلاب خان رانی کو اغوا کر کے کہاں لے گیا ہوگا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ مجھے سادہ لباس پولیس اہلکاروں کی دو تین ٹیمیں ترتیب دے کر گرد و نواح کے علاقوں میں پھیلا دینا چاہیے تاکہ گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کے سلسلے میں کوئی سراغ لگایا جا سکے۔

میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ سہ پہر کے وقت مجاور سکندر مجھ سے ملنے تھانے پہنچ گیا۔ گزشتہ رات جھنڈے شاہ کے آستانے پر میں سکندر کو مختلف نوعیت کی ہدایات دے آیا تھا۔ اس وقت اس کی آمد خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے فوراً سے پیشتر اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

مجاور سکندر کی عمر چالیس اور پینتالیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وضع قطع اور حلیے سے وہ ویسا ہی دکھائی دیتا تھا جیسا کسی مزار کے مجاور کو نظر آنا چاہیے تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ چکا تو میں نے سوال کیا۔

”سکندر بادشاہ! سب خیریت تو ہے نا...... تمہارے چہرے پر مجھے خاصی سنسنی نظر آ رہی ہے؟“

”خیریت نہیں ہے تھانے دار جی......!“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ادھر کھیتوں میں ایک جوان لڑکی کی لاش ملی ہے......“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”کدھر...... کن کھیتوں میں؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”تم کس جوان لڑکی کی بات کر رہے ہو......؟“

وہ میرے پے در پے سوالات سے گھبرا گیا۔ ”لڑکی کون ہے، یہ تو میں نہیں جانتا جناب......“ اس نے بتایا۔ ”ہو سکتا ہے، یہ وہی لڑکی ہو جس کی تلاش میں کل رات آپ آستانے پر آئے تھے...... آستانے سے کوئی آدھا میل دور، کھیتوں کے اندر اس کی لاش پڑی ملی ہے۔“

”کیا لاش تم نے دریافت کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”لاش کے بارے میں مجھے رفاقت اور رشیدہ نے بتایا تھا۔“

”یہ رفاقت اور رشیدہ کون ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”میاں بیوی ہیں جناب۔“ مجاور سکندر نے جواب

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیا۔ ”یہ لوگ آستانے سے اوپر کی طرف ایک چھوٹے سے گاؤں نذیر کوٹ میں رہتے ہیں جی۔ ان کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں لیکن بے چاروں کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں۔ وہ جھنڈے شاہ کے مزار پر دعا وغیرہ کے لیے آتے رہتے ہیں......“

سکندر نے موضع نذیر کوٹ کی لوکیشن بتاتے وقت ”اوپر کی طرف“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ جب میں نے اس کی وضاحت مانگی تو اس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق، نذیر کوٹ، جھنڈے شاہ کے مزار سے شمال مشرق میں کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ کھیتوں کے اندر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

”کیا تم نے رفاقت اور رشیدہ کی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا یا جا کر لڑکی کی لاش کو دیکھا بھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے ان کے ساتھ جا کر خود اپنی آنکھوں سے لڑکی کی لاش کو دیکھا ہے سرکار۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”اس بدنصیب کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نظر نہیں آتی اسی لیے تو مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جس کے اغوا کے بارے میں رات آپ نے مجھے بتایا تھا......“ وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کی طرف آنے سے پہلے میں نے ایک کام اور بھی کیا ہے!“

”کیسا کام سکندر بادشاہ؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے رفاقت اور رشیدہ کو واپس نہیں جانے دیا۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”وہ ادھر آستانے پر ہی بیٹھے ہیں جب تک میں نہیں جاؤں گا، وہ آستانے سے ہلیں گے بھی نہیں۔“

”یہ واقعی تم نے بڑا لاجواب کام کیا ہے سکندر بادشاہ!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم یہاں تک کیسے آئے ہو؟“

”گھوڑے پر جی۔“ اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم دس منٹ رکو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں......“

آئندہ دس منٹ میں، میں نے مبینہ جائے وقوعہ تک رسائی کے لیے ضروری بندوبست کیا پھر مجاور سکندر کی راہنمائی میں روانہ ہو گیا۔ میں نے سردست رانی کے گھر والوں کو اس نئی اطلاع کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا البتہ اللہ بخش کو میں اپنے ساتھ لے جانا نہیں بھولا تھا۔ وہ کام کا آدمی تھا اور رانی کی شناخت کے سلسلے میں بھی اس سے مدد لی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کانسٹیبل صفدر کو بھی میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ہمارے پاس ایک تانگا اور دو گھوڑے تھے۔ مجاور سکندر کا گھوڑا اس کے علاوہ تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ تانگے کو کوچوان سمیت اس کچی راہ گزر پر چھوڑ دیا گیا تھا جہاں پیر جھنڈے شاہ کے آستانے سے متعلق بورڈ نصب تھا۔ اس سڑک سے آستانے تک کا راستہ اتنا تنگ تھا کہ اس پر تانگا نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

میں اللہ بخش، صفدر، سکندر اور رفاقت و رشیدہ کے ہمراہ اس جگہ پر پہنچا جہاں کسی نوجوان لڑکی کی لاش دیکھی گئی تھی۔ یہ مقام کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی کے کنارے واقع تھا۔ آستانے سے اس مقام کا فاصلہ بہ مشکل آدھا میل رہا ہوگا۔

مذکورہ لڑکی کی لاش پر نگاہ پڑتے ہی اللہ بخش چلّا اٹھا۔ ”یہ...... یہ تو رانی ہے...... شوکت علی کی بیٹی رانی......!“

میں لاش کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ رانی اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی اور مجھے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہ لگی کہ اسے موت کی آغوش میں پناہ حاصل کیے کافی وقت گزر گیا تھا...... کم از کم پندرہ بیس گھنٹے!

میں نے الٹ پلٹ کر رانی کی لاش کا تفصیلی معائنہ کیا تو پتا چلا کہ اس کی موت سر میں لگنے والی خطرناک چوٹ کے سبب واقع ہوئی ہوگی۔ سر کے عقبی حصے میں اس کی کھوپڑی ایک مقام سے پچک گئی تھی۔ یا تو سر کے اس حصے پر کسی وزنی شے سے وار کیا گیا تھا یا پھر اس کا سر بڑے طوفانی انداز میں کسی ٹھوس شے کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ قصہ مختصر، رانی کا شمار اب زندہ افراد میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے نگاہ گھما کر چاروں جانب دیکھا۔ ہر طرف سرسبز لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ رانی کو اغوا کرنے والوں نے رات کے کسی حصے میں اسے یہاں پھینکا تھا۔ وہ خود کہاں تھے، اس بارے میں فی الحال اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ گلاب خان کے خیال کو پس پشت ڈال کر میں رانی کی لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تھانے دار صاحب!“ رفاقت نے ملتجی لہجے میں مجھے پکارا۔ ”اگر آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں تو

آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندھیرا ہونے لگے گا۔ ہمیں ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے گھر بھی پہنچنا ہے......“

رفاقت کی مجبوری میں مجھے کوئی بہانہ نظر نہ آیا۔ میں نے اس سے اور اس کی بیوی سے رسمی پوچھ گچھ کی اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ وہ رانی کی موت کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان کی باتوں اور انداز سے بہ خوبی اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے تھے لہٰذا انہیں خواہ مخواہ جائے وقوعہ پر روکے رکھنا زیادتی والی بات ہوتی۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد میں نے سکندر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”سکندر بابا! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو...... رانی کی لاش کو کس نے یہاں پھینکا ہوگا؟“

”جناب...... میں کیا بتاؤں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں جی......!“

”جائے وقوعہ کے نزدیک ترین کوئی جگہ، پیر جھنڈے شاہ کا آستانہ ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اس آستانے کے تم مجاور ہو۔ تمہارے سوا اس آستانے پر کوئی اور بندہ بشر نہیں رہتا لہٰذا سب سے پہلے تو میں تمہی سے پوچھ گچھ کروں گا نا......؟“

”جناب...... کیا آپ...... مجھ پر لڑکی کے قتل کا شک کر رہے ہیں......!“ وہ خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھ سے، بڑی سے بڑی قسم لے لیں...... مجھے اس معاملے کی کچھ خبر نہیں ہے......“

”میں نے نہ تو تم پر رانی کے قتل کا الزام عائد کیا ہے اور نہ ہی کسی طرح کی قسم اٹھانے کی بات کی ہے......!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک قتل ہوا ہے...... مقتول کی لاش تمہارے آستانے سے آدھے میل کے فاصلے پر پائی گئی ہے۔ آستانہ، جائے وقوعہ سے قریب ترین جگہ ہے لہٰذا تم سے پوچھ گچھ اور کڑی تفتیش کا تو حق بنتا ہے سکندر بادشاہ......؟“

”جی...... جی......!“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ ضرور تفتیش کریں...... مجھ سے جو بھی پوچھنا چاہیں، وہ پوچھیں...... میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں جناب۔“

میں نے مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر مجاور سکندر سے کوئی درجن بھر سوال کیے لیکن اس کے جوابات میں مجھے کام کی ایک بات بھی نہ مل سکی۔ بالآخر ہم لوگوں نے جلدی جلدی جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی کو نمٹایا اور رانی کی لاش کو ایک گھوڑے کی پشت پر لاد کر ہم آستانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب ہم آستانے پر پہنچے تو شام کا سماں تھا۔ دھوپ رخصت ہو رہی تھی لیکن ابھی تک فضا حدت سے دہکی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ہوا نام کو نہیں تھی۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دم گھٹ کی سی کیفیت طاری تھی۔

آستانے کے دروازہ نما گیٹ پر پہنچے تو میں نے مجاور سکندر سے کہا۔ ”میرا یہ آدمی......“ میں نے کانسٹیبل صفدر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”کچھ عرصے کے لیے اس آستانے پر قیام کرے گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

جائے وقوعہ سے آستانے کی طرف آتے ہوئے میں نے صفدر سے تفصیلی بات کر لی تھی اور اسے سمجھا دیا تھا کہ وہاں رک کر اسے کن چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ وہ میرے مقصد کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

”نہیں جناب...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ مجاور سکندر نے باری باری مجھے اور کانسٹیبل صفدر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے سپاہی جی جب تک چاہیں، آستانے پر رہ سکتے ہیں۔“

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ”صفدر! میں لاش کو لے کر جا رہا ہوں۔ تم ادھر ہی رکو گے......“

”ٹھیک ہے ملک صاحب!“ وہ بڑی سعادت مندی سے بولا۔ ”جو آپ کا حکم......!“

میں کانسٹیبل صفدر کو پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر چھوڑ کر اللہ بخش کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ ہم نے رانی کی لاش کو تانگے میں ڈالا اور تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

کانسٹیبل صفدر کو میں نے ایک خاص مقصد کے لیے آستانے پر چھوڑا تھا۔ میں اپنے ایک شک کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس کی، تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ اگرچہ میں نے مجاور سکندر کو اچھی طرح ٹٹول کر اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ وہ رانی کے قتل میں کسی بھی طور ملوث نہیں تھا لیکن وہی شک والی بات کہ...... ہو سکتا ہے، گلاب خان نے پچھلی رات اسی آستانے پر گزاری ہو اور ڈرا دھمکا کر سکندر کو زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا ہو۔ بہرحال، حقیقت جو بھی تھی وہ زیادہ عرصے تک مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

ہم پرانا سعید آباد پہنچے تو اللہ بخش نے مجھ سے کہا۔ ”ملک صاحب! اگر کوئی حرج نہ ہو تو شوکت علی کو اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتہا ہناک واقعے کے بارے میں بتادیں؟''

''حرج تو کوئی نہیں ہے اللہ بخش!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن رانی کی لاش فی الحال اس کے ورثا کے حوالے نہیں کی جاسکتی۔ پہلے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوانا ہوگا......!''

''ٹھیک ہے جناب! آپ قانونی تقاضے ضرور پورے کریں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں، شوکت کو پتا چل جائے کہ اس کی بیٹی کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے۔''

''چلیں...... اتنا تو کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے کہا پھر کوچوان کو ہدایت کی۔

''شوکت علی کے گھر کی طرف چلو بھئی......!''

جوان اولاد کی موت کا غم کتنا ظالم اور رلا دینے والا ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے کسی اسپیشل قسم کی عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس دکھ اور اذیت کو بہ خوبی سمجھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے...... شوکت علی کا گھر دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ بن گیا تھا۔

میں نے پچھلی رات ہی رانی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا۔ ایک بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ مقتول رانی کے ساتھ کسی قسم کا غیر اخلاقی سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ اگر وہ ایسے کسی ناخوشگوار تجربے سے گزری ہوتی تو میری عقابی نگاہ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رانی کی لاش کا بہ غور معائنہ کرتے وقت اس نکتے کو ذہن میں رکھا تھا۔ عموماً دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جب کسی لڑکی یا عورت کو اس طرح اغوا کیا جاتا ہے تو اس کے پیچھے اغوا کنندگان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مغوی کی عزت کا جنازہ نکالا جائے لیکن رانی کے ساتھ ایسا کچھ بھی پیش نہیں آیا تھا۔ اس بات نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا۔

ابھی تک جو معلومات مجھے حاصل تھیں ان کی روشنی میں رانی اور گلاب خان اینڈ کمپنی میں کسی دشمنی کا سراغ نہیں ملتا تھا لہٰذا بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ وہ لوگ محض اپنی عیاشی کے خیال سے رانی کو اٹھا لے گئے تھے لیکن اس نوعیت کی کسی بے ہودگی کے آثار بھی نہیں ملے تھے اور رانی کی جان بھی چلی گئی تھی۔ یہاں سوال یہ اٹھتا تھا کہ رانی کی موت کا سبب یا اس کے قتل کا مقصد کیا تھا......؟

اگر میں اس ایک سوال کا جواب تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو باقی کے تمام مسائل خود بہ خود حل ہو جاتے۔

دوپہر سے پہلے میں نے حسب پروگرام، دو دو اہلکاروں پر مشتمل تین ٹیمیں تشکیل دیں اور انہیں خصوصی ہدایت کے ساتھ اردگرد کے علاقوں میں پھیلا دیا۔ مجھے قوی اُمید تھی کہ بہت جلد ان لوگوں کی جانب سے کوئی سودمند خبر سننے کو ملے گی۔

وہ ایک اداس اور تڑپا دینے والا دن تھا۔ گزشتہ رات پرانا سعید آباد میں یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ رانی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ رانی کے باپ شوکت علی نے اپنی مردہ بیٹی کی جھلک پچھلی رات ہی دیکھ لی تھی اور آج صبح ہی صبح وہ تھانے پہنچ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر متعدد سوالات تھے۔ گزشتہ رات کی طرح اس وقت بھی میں نے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

''شوکت علی! میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں تمہاری بیٹی کو تو واپس نہیں لاسکتا۔ البتہ یہ تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں رانی کی موت کے ذمے داروں کو بہت جلد گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔''

''جناب......!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''میری تو ایک ہی ایک بیٹی تھی۔ جب رانی نہیں رہی تو ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب اس کے قاتلوں کو سزا ملے یا جزا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''بہت فرق پڑتا ہے شوکت علی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ایک سنگین اور سفاک حقیقت ہے کہ رانی کو زندگی کی طرف واپس نہیں لایا جاسکتا لیکن اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوا کر بہت سی، رانی جیسی معصوم لڑکیوں کی زندگیوں اور عزتوں کی حفاظت تو کی جاسکتی ہے۔ گلاب خان جیسے جرائم پیشہ لوگ معاشرے کے لیے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ناسوروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''شاید نہیں، میں یقیناً ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''ایک بات تو بتائیں تھانے دار صاحب......؟'' وہ زخمی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ہاں پوچھو...... کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''میری رانی نے کسی گلاب خان کا کیا بگاڑا تھا جو اس کی زندگی چھین لی گئی؟'' اس کے سوال میں بڑا درد تھا۔ ''ہم نے تو کبھی اس منحوس کا نام تک نہیں سنا تھا۔''

''شوکت علی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے کہا۔ ''جب انسان کا نصیب ساتھ نہ دے رہا ہوتا تو ہر سیدھا قدم الٹا ہو جاتا ہے۔ جو کچھ بھی پیش آیا، اس میں نہ تو رانی کا کوئی قصور تھا اور نہ ہی اسے کسی دشمنی کا شاخسانہ کہا جاسکتا ہے...... بس، یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔''

وہ گلوگیر آواز میں پوچھ بیٹھا۔ ''رانی کی لاش اسپتال سے کب تک آجائے گی۔ ہمیں اس کے کفن دفن کا بھی بندوبست کرنا ہے۔''

شوکت علی کے سوال کے جواب میں، میں نے بتایا۔ ''مجھے اُمید ہے، رانی کی لاش کل صبح اسپتال سے آجائے گی یا زیادہ سے زیادہ شام تک......''

وہ مزید تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا پھر مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

دوپہر کے بعد میں تھانے ہی میں بیٹھا ہوا تھا کہ کانسٹیبل صفدر آ گیا۔ صفدر کو گزشتہ رات میں پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر چھوڑ آیا تھا۔ اس کا چہرہ خاصا تمتمایا ہوا لگ رہا تھا۔ میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے صفدر...... لگتا ہے، تم نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہے؟''

''پتا نہیں جناب...... یہ کارنامہ ہے یا کچھ اور......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لیکن آج صبح میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ ضرور آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔''

''تم نے آج صبح ایسا کیا دیکھ لیا ہے صفدر!'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''مجھے بھی تو پتا چلے آخر......؟''

''جناب! آپ رات کو مجھے پیر جھنڈے شاہ کے مزار پر چھوڑ آئے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''رات گئے تک میں مجاور سکندر سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے گھما پھرا کر ہر زاویے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے مطلب کی کوئی بات سامنے نہ آسکی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ تو مجاور رانی کے اغوا یا اس کی موت سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ ہی اسے گلاب خان اینڈ کمپنی کی کوئی خبر ہے، ہم مجاور سکندر کو مشکوک افراد کی فہرست میں شامل نہیں کر سکتے......''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' وہ سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے سوال کیا ''تم نے آج صبح کیا دیکھا ہے، مجھے اس کے بارے میں بتاؤ؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آج صبح میں رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گیا تو میرا جی چاہا کہ تھوڑی سیر کرلوں، تو جناب...... میں ٹہلتا ہوا اس طرف جا نکلا جہاں رانی کی لاش پڑی ملی تھی۔ میں چند لمحات تک وہاں رکا پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر......!''

''آگے کس طرف؟'' میں نے چونک کر قطع کلامی کی۔ ''کیا تم نے نذیر کوٹ کی جانب رخ کیا تھا؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نذیر کوٹ تو وہاں سے شمال مشرق کی طرف پڑتا ہے۔ میں سیدھا مشرق کی سمت بڑھتا چلا گیا تھا۔ کوئی آدھا میل آگے جانے کے بعد میں ٹھٹک کر رک گیا اور میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے فی الفور آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''بجھارتیں نہیں ڈالو صفدر علی!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''فوراً مجھے اس منظر کی تفصیل سے آگاہ کرو جس نے تمہیں بے چین کر کے میرے پاس پہنچا دیا ہے......؟''

''ملک صاحب! میں نے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک ڈیرا دیکھا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اس ڈیرے نے مجھے چونکا دیا اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں ڈیرے تک جا پہنچا لیکن اس کے اندر داخل ہونے کا مجھے موقع نہ مل سکا کیونکہ ڈیرے کے گیٹ پر ایک تالا جھول رہا تھا۔ میں نے ڈیرے کے چاروں طرف کا ایک چکر لگایا اور سن گن لینے کی کوشش کی لیکن ڈیرے کے اندر مجھے زندگی کے آثار محسوس نہیں ہوئے......''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''میں سیدھا جھنڈے شاہ کے آستانے پر پہنچا۔ وہاں ناشتا کیا اور پھر آپ کی طرف آ گیا ہوں۔'' صفدر نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے مجاور سکندر سے اس ڈیرے کا تذکرہ کیا ہے؟''

''نہیں جناب! میں نے اس سلسلے میں سکندر سے کوئی بات نہیں کی۔''

''یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ اس ڈیرے کا معائنہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔'' صفدر نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ تو بہت ضروری ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا ''ہم ابھی اس طرف روانہ ہو رہے ہیں۔''

کانسٹیبل صفدر اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوپہر کو ڈھلے کافی دیر ہوگئی تھی تاہم دھوپ کی تمازت اور فضا کی حدت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اساڑھ (ہاڑ) کا مہینا ایسا ہی ظالم اور سفاک ہوتا ہے۔ یہ اپنی شدت سے ایک طرف کھڑی فصل کو پکاتا ہے تو دوسری جانب مخلوق خدا کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دیتا ہے۔ بہرحال، تمام موسم اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور اللہ کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی حکمت چھپی ہوتی ہے۔

میں صفدر کی راہنمائی میں مذکورہ ڈیرے پر پہنچ گیا۔ آستانے سے ہم نے مجاور سکندر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ صفدر کا کہنا بالکل درست تھا کہ ڈیرے پر تالا لگا ہوا تھا اور اندر کسی ذی روح کے آثار محسوس نہیں ہوتے تھے۔ میں نے اس ڈیرے کے گردونواح کا بہ غور جائزہ لیا۔

نزدیک یا دور مجھے کوئی گاؤں دیہات نظر نہیں آیا۔ کھیتوں کے بیچ بنے اس ڈیرے کو دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ جس مقام سے کل مجھے رانی کی لاش ملی تھی وہاں سے ایک کچا راستہ موضع نذیر کوٹ کی طرف جاتا تھا۔ یہ کچا راستہ درحقیقت نذیر کوٹ کو پیر جھنڈے شاہ کے آستانے سے ملاتا تھا جو بعدازاں پکی سڑک سے جاملتا تھا۔ یہ وہی پکی سڑک تھی جو سعید آباد اور چاند نگر کے درمیان آمدورفت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

جب میں صفدر کی معیت میں اس خاموش ڈیرے کی طرف آیا تو ہمیں نذیر کوٹ کی جانب جانے والے راستے کو چھوڑنا پڑا تھا۔ یہ ڈیرا جائے وقوعہ سے عین مشرق میں ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ڈیرے پر کھڑے کھڑے میری نگاہ نے دو اور راستے بھی دریافت کر لیے۔ ایک راستہ ڈیرے سے شمال میں، کھیتوں کے بیچوں بیچ چلا گیا تھا۔ دوسرا راستہ ڈیرے سے جنوبی سمت میں چلا گیا تھا۔ ڈیرے سے نکلنے والے اور ڈیرے تک پہنچانے والے راستوں کو میں نے ذہن میں محفوظ کرلیا اور مجاور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سکندر بادشاہ! تمہارے خیال میں یہ ڈیرا کس کی ملکیت ہے؟“

”جناب! میری معلومات کے مطابق یہ ڈیرا نذیر کوٹ کے چودھری حکمت یار کا ہے۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”لیکن پچھلے کافی عرصے سے تو یہ یونہی غیرآباد پڑا ہے۔ میں نے یہاں کسی کو رہتے نہیں دیکھا۔“

”نظر تو اب بھی یہاں کوئی نہیں آرہا......“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میری چھٹی حس بار بار مجھے اطلاع دے رہی ہے کہ یہ ڈیرا غیرآباد نہیں......“

”غیرآباد نہیں......!“ سکندر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے جی؟“

”اس کا مطلب ابھی کھل کر سامنے آجائے گا۔“ میں نے جواب تو مجاور سکندر کو دیا تھا لیکن میری توجہ کا مرکز کانسٹیبل صفدر علی تھا۔

”ملک صاحب!“ صفدر نے فوراً میرا ذہن پڑھ لیا۔ ”ہمیں اس ڈیرے کا اندر سے جائزہ لینا چاہیے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

صفدر بولا۔ ”ملک صاحب! میرا خیال ہے، ہمیں دیوار پھلانگ کر ڈیرے کے اندر داخل ہوجانا چاہیے۔“

”سکندر بادشاہ! تم بھی ہمارے ساتھ ڈیرے کے اندر جاؤ گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اس امر کے گواہ رہو گے کہ میں محض خانہ تلاشی کے لیے ڈیرے میں داخل ہوا تھا اور یہ تلاشی میں نے تمہاری آنکھوں کے سامنے لی ہے......تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی......!“ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ”بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں تھانے دار صاحب!“

”ہوں!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کانسٹیبل صفدر علی کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تو پھر......بسم اللہ کریں!“

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم ڈیرے کے اندر تھے۔

وہ عام ڈیروں ہی جیسا ایک ڈیرا تھا۔ وسیع وعریض صحن اور عقبی حصے میں دو تین کمرے بنے ہوئے لیکن وہاں کوئی بندہ بشر نظر آتا تھا اور نہ ہی مال مویشی۔ صحن میں مختلف اقسام کے چار پانچ درخت بھی ایستادہ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اندر پہنچتے ہی ایک دیوار کے ساتھ بنی کھرلیوں (کنڈیوں) کا رخ کیا۔ یہ میرا ایک غیرارادی عمل تھا۔ میرے اندر سے ایک آواز اٹھی تھی کہ مجھے اس طرف جانا چاہیے اور یہ آواز بے سبب نہیں تھی۔

ایک دو کھرلیوں میں تازہ چارا دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ جب ڈیرے پر کوئی مال مویشی یا جانور نظر نہیں آرہا تھا تو پھر کھرلیوں میں تازہ چارے کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔ کھرلیوں سے پلٹ کر میں کچے صحن کی زمین کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

جلد ہی میں نے تین چار گھوڑوں کے پاؤں کے نشانات کو ڈھونڈ نکالا، گویا وہاں تین، چار گھوڑے ادھر ادھر

چلتے پھرتے رہے تھے اور کھرلیوں میں موجود چارا ابھی انہی گھوڑوں سے تعلق رکھتا تھا۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر پکارنے لگی کہ گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے اس ڈیرے پر قیام کیا تھا اور......وہ لوگ رانی کو اغوا کر کے بھی اسی ڈیرے پر لائے تھے۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں ڈیرے کے عقبی حصے میں بنے کمروں کی جانب بڑھ گیا۔ مذکورہ کمروں کے دروازے بند تھے اور ان کمروں میں داخل ہونے سے پہلے ہی مجھے وہاں کسی کے قیام کے مزید آثار بھی مل گئے۔

کمروں سے متصل دیوار کے ساتھ دو تین چولہے بنے ہوئے تھے۔ چولہوں کی کیفیت اور وہاں پڑے چند برتنوں کی حالت سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ چولہے کچھ دیر پہلے زیر استعمال رہے تھے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہاں کچھ لوگ ٹھہرے تھے۔

ہم نے تھوڑی سی کوشش کر کے بند کمروں کو کھول لیا۔ ایک کمرے میں ٹوٹا پھوٹا مختلف نوعیت کا سامان بھرا ہوا تھا۔ باقی دونوں کمروں کی حالت سے لگتا تھا، وہ ڈیرا غیرآباد نہیں تھا۔ کمروں کے اندر چارپائیاں اور بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ کھونٹیوں پر تین چار جوڑے مردانہ بھی ٹنگے نظر آرہے تھے۔ ان کپڑوں کی موجودگی نے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی کہ وہ ڈیرا کسی بھی قیمت پر غیرآباد نہیں تھا۔

میں فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور گردن جھکا کر چارپائیوں کے نیچے نگاہ دوڑائی۔ ایک چارپائی کے نیچے بڑا سا چوبی صندوق رکھا نظر آیا۔ میں نے وہ صندوق کھینچ کر باہر نکال لیا۔

صندوق کو تالا بند نہیں کیا گیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کے اندر کوئی اہم یا قیمتی چیز نہیں ہوگی۔ میں نے اس بات کی تصدیق کے لیے صندوق کھول لیا اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مذکورہ صندوق کے اندر صرف دو چیزیں رکھی دکھائی دیں۔ ایک انگوری رنگ کا دوپٹا اور دوسری زنانہ سلیپر......!

میرے تخیل نے پرواز کی اور جائے وقوعہ پر پہنچ گیا جب میں نے پہلی مرتبہ رانی کی لاش کو دیکھا تھا۔ اس کے بدن پر پھول دار قمیص اور پلین شلوار تھی۔ اس لباس میں ہلکا سبز رنگ غالب نظر آتا تھا اور مردہ رانی پاؤں سے ننگی تھی۔ انگوری دوپٹے اور زنانہ سلیپر نے رانی کو پیش آنے والی صورت حالات کی وضاحت کردی تھی۔ اب اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ رانی کو اغوا کر کے اسی ڈیرے پر لایا گیا تھا اور اس کی موت بھی ادھر ہی واقع ہوئی تھی۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ گلاب خان اینڈ کمپنی نے اس ڈیرے کو اپنا اڈا بنا رکھا تھا، میرے رگ وپے میں ایک سنسنی خیز لہر سی دوڑ گئی۔ اللہ بخش کے مطابق گلاب خان کسی بڑے جرائم پیشہ شخص کا آلۂ کار تھا۔ تاہم اس ڈیرے کی حالت، رانی کی موت، رانی کے اغوا اور اللہ بخش کی بیان کردہ کہانی اسی جانب واضح اشارے کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اس تمام ترکھٹ راگ میں میرے لیے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ گلاب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ وہاں آئے گا کیونکہ ان کے کپڑے لتے اور دوسرا سامان ابھی تک وہیں رکھا ہوا تھا۔

جب صورت حالات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی تو مجاور سکندر نے کہا ”تھانے دار صاحب! یہ دوپٹا اور جوتی تو اسی بدنصیب لڑکی کی لگتی ہے، کل آپ جس کی لاش یہاں سے اٹھا کر لے گئے تھے......“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے سکندر بادشاہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رانی کو اغوا کرنے والوں نے اس ڈیرے کو اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے، یہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں جبکہ......یہاں سے تمہارا آستانہ زیادہ سے زیادہ آدھے میل کی دوری پر ہے۔“

”آپ میری بات کا یقین کریں سرکار!“ وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ”میں رانی کے اغوا، اس کی موت یا اسے اغوا کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ ڈیرا تو کافی عرصے سے غیرآباد پڑا ہوا ہے اور میرا اس طرف آنا جانا کبھی نہیں ہوتا۔“

”تم نے کیا بتایا تھا، یہ ڈیرا کس کی ملکیت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

سکندر نے جواب دیا۔ ”چودھری حکمت یار کی جناب۔“

”حکمت یار موضع نذیر کوٹ کا چودھری ہے نا......؟“

”جی ہاں......!“

”کیا کل سے اب تک نذیر کوٹ سے کسی نے آکر پوچھا ہے کہ یہاں کس لڑکی کی لاش ملی ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”نہیں جناب......!“

”حالانکہ ایسا ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”رانی کی لاش کو رفاقت اور اس کی بیوی رشیدہ نے دریافت کیا تھا۔ یہ جوڑا موضع نذیر کوٹ کا رہنے والا ہے۔ انہوں نے گاؤں جا کر اس اندوہناک واقعے کا ذکر تو کیا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد وہاں سے کوئی ادھر کا رخ نہ کرے؟“

”مجھے خود بھی اس بات پر حیرت ہے......!“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”اب یہی ہوسکتا ہے کہ رفاقت اور رشیدہ نے گاؤں واپس جا کر اپنی زبان بند رکھی ہو......!“

”ایسا ممکن تو نظر نہیں آتا اور یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے......!“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”بہرحال، دیکھتے ہیں، آگے کیا ہوتا ہے۔“

کانسٹیبل صفدر نے مجھ سے پوچھا۔ ”ملک صاحب! اب کیا کرنا ہے؟“

”کیا کرنا ہے......!“ میں نے زیرلب دہرایا پھر سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سکندر بادشاہ! آپ تو جاؤ واپس آستانے پر۔“

”اگر میری ضرورت ہو تو میں رک جاتا ہوں......“ سکندر نے کہا۔

”نہیں......!“ میں نے قطعیت سے کہا۔

”ٹھیک ہے جی...... جو آپ کا حکم!“

وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ”سکندر بادشاہ! اس حوالے سے اپنی زبان بند رکھنا کہ پولیس نے یہ ڈیرا دریافت کیا ہے......!“

”میں سمجھ گیا جناب!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بے فکر ہوجائیں...... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

سکندر مجاور کے جانے کے بعد، میں نے کانسٹیبل صفدر سے کہا۔ ”صفدر! میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اگر اس ڈیرے کو گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے تو وہ دوبارہ ادھر ضرور آئیں گے اور وہ رات ہی میں ادھر کا رخ کریں گے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تک ہم تھانے کا ایک چکر لگا لیتے ہیں۔ وہاں کی خیر خبر رکھنا بھی ضروری ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب!“ وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر چلیں......“

”ہاں، چلیں......!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ہم اپنے گھوڑوں کی جانب بڑھ گئے۔

ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میں نے اپنے گھوڑے کا رخ جنوبی سمت میں موڑا۔ صفدر نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

”ملک صاحب! یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟“

”ظاہر ہے......!“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ہم تھانے جا رہے ہیں۔“

”لیکن......!“ وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ”ہم آئے تو ادھر سے تھے۔“ اس نے پیر جھنڈے شاہ کے آستانے کی سمت اشارہ کیا۔ ”اور اب آپ کسی دوسری طرف چل پڑے ہیں......!“

”یہ ضروری تو نہیں کہ ہم جس راستے سے آئے ہیں اسی سے واپس بھی جائیں۔“ میں نے گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو نئی نئی راہیں دریافت کرتے رہنا چاہیے......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے، یہ راستہ مین روڈ کی طرف نکلے گا...... ادھر سے چلتے ہیں۔ مین روڈ سے سیدھے تھانے کی طرف نکل جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے جناب...... جیسا آپ کہیں۔“ صفدر نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

ہم گھوڑوں کو مناسب رفتار سے دوڑاتے ہوئے اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔ میرا اندازہ صد فیصد درست نکلا۔ ڈیرے سے نکلنے والا وہ کچا راستہ مین روڈ سے آملا اور ایک محتاط حساب کے مطابق، یہ فاصلہ دو میل کے لگ بھگ رہا ہوگا۔

مین روڈ پر آ کر ہم نے گھوڑوں کو مشرق کی سمت ڈال دیا۔ یہ روڈ ہمیں نیا سعید آباد تک پہنچانے کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

جب میں تھانے پہنچا تو ایک ٹیم میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، میں نے دو، دو افراد پر مشتمل تین ٹیمیں تشکیل دے کر اِدھر اُدھر کے علاقے میں پھیلا دی تھیں تا کہ وہ رانی اور گلاب خان کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں۔ انہی میں سے ایک ٹیم میرا انتظار کر رہی تھی۔ مذکورہ ٹیم کانسٹیبل ارشاد اور اسلم پر مشتمل تھی۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

”ہاں بھئی......“ وہ دونوں میرے سامنے آ کر بیٹھے تو میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے، کوئی سنسنی خیز رپورٹ لے کر آئے ہو؟“

”جی ملک صاحب!“ ارشاد نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”بڑی خاص رپورٹ ہے۔ ہم نے گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کا سراغ لگا لیا ہے۔“

”تفصیل کیا ہے؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اسلم نے بتایا۔ ”جناب! مین روڈ پر کوئی دو، سوا دو میل مغرب کی طرف جائیں تو وہاں سڑک کے کنارے ایک چھپر ہوٹل ہے، اس ہوٹل کے مالک رب نواز نے بتایا ہے کہ وہاں سے تین گھڑسوار اکثر گزرتے ہیں...... یہ سلسلہ پچھلے ایک، دو ماہ سے جاری ہے......“

”تین گھڑسوار؟“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا ہوٹل والے رب نواز نے گلاب خان کا نام لے کر تمہیں یہ اطلاع دی ہے؟“

”نہیں جناب!“ ارشاد نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”رب نواز ان تین میں سے کسی شخص کے نام سے واقف نہیں۔ موجودہ حالات کی روشنی میں یہ تو ہمارا اندازہ ہے کہ وہ گلاب خان اور اس کے دو ساتھی ہوسکتے ہیں۔“

”یہ تین گھڑسوار کس طرف سے آتے ہیں اور رب نواز کے ہوٹل کے قریب سے گزر کر کدھر کو جاتے ہیں۔“ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ”رب نواز نے اس بارے میں کچھ بتایا ہے......؟“

”ہم نے بہت محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے رب نواز کو کریدا ہے۔“ اسلم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”اس کے مطابق وہ لوگ مین روڈ پر مغرب کی طرف سے آتے ہیں اور اس کے ہوٹل سے بائیں جانب ایک کچے راستے پر مڑ جاتے ہیں۔ یہ راستہ مین روڈ سے شمال میں کسی طرف جاتا ہے۔“

میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا۔ متروکہ ڈیرے سے واپسی کے سفر میں جب ہم مین روڈ پر پہنچے تھے تو میں نے وہاں سڑک کے کنارے ایک چھپر ہوٹل دیکھا تھا۔ کانسٹیبل اسلم یقیناً اسی ہوٹل کا ذکر کر رہا تھا۔ ہم لوگ ڈیرے سے جنوب میں آئے تھے اور وہ گھڑسوار مین روڈ سے شمال کی جانب جاتے تھے یعنی ایک ہی بات تھی۔

”کیا تم لوگوں کی پوچھ گچھ سے ہوٹل کے مالک رب نواز کو کسی قسم کا شک تو نہیں ہوا؟“ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں جناب، بالکل نہیں......“ ارشاد بڑے اعتماد سے بولا۔ ”ہم نے بڑی ہوشیاری سے کام دکھایا ہے۔“

”اب تم دونوں یہاں سے سیدھے رب نواز کے ہوٹل کی طرف جاؤ گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”اور نہایت ہی چابک دستی سے رب نواز کے ہوٹل پر نظر رکھو گے پھر...... جیسے ہی تمہیں وہ گھڑسوار نظر آئیں، فوراً سے پیشتر تھانے آ کر مجھے اطلاع دو گے...... تم میں سے ایک ادھر ہی ٹھہرے گا، دوسرا میرے پاس آئے گا۔ ٹھیک ہے......؟“

”جی ملک صاحب!“ وہ بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ”بالکل ٹھیک ہے......!“

اسلم اور ارشاد کو رخصت کرنے کے بعد میں صفدر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ”صفدر! تم کانسٹیبل فرید کو اپنے ساتھ لے کر پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر چلے جاؤ۔ تم دونوں وہیں ڈیرا جما کر بیٹھو گے اور اردگرد کے ماحول پر گہری نظر رکھو گے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی سمجھ گیا ملک صاحب!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا......“

”شاباش!“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں تم سے کسی ایسے ہی جواب کی توقع کر رہا تھا۔“

”ایک بات پوچھوں ملک صاحب؟“ صفدر نے کہا۔

”ہاں...... ضرور پوچھو۔“

”آپ کا اپنا کیا پروگرام ہے......؟“

”صفدر!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر گلاب خان یا اس کے ساتھیوں ہی نے رانی کو موت سے ہمکنار کیا ہے تو پھر وہ ایک آدھ دن کے لیے ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اس دوران میں، میں تھانے میں رہ کر چند ضروری کام نمٹا لوں گا۔“

کانسٹیبل صفدر نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

میں رات تک تھانے میں بیٹھا اسی کیس کا تانا بانا سلجھانے کی کوشش کرتا رہا پھر اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف آگیا۔

رات کو میں سونے کے لیے لیٹا تو بھی گلاب خان والا معاملہ میرے دماغ سے چپکا ہوا تھا۔ اب تک اس سلسلے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں گلاب خان پر ہاتھ ڈالنے کے لیے متروکہ ڈیرے کی کڑی نگرانی بہت ضروری تھی لیکن اس سے پہلے مجھے ایک اور اہم کام بھی کرنا تھا۔

میں ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد سو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اگلی صبح میں نے اے ایس آئی جمشید خان کو خصوصی ہدایات دیں اور خود ہیڈ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ میں نے علاقہ ایس پی سے ملاقات کی اور انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایس پی صاحب نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر انہوں نے کہا۔

''صفدر حیات...... یہ بندہ اللہ بخش کون ہے؟''

''جناب! وہ پرانا سعید آباد میں رہتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کسی زمانے میں اللہ بخش شہر میں رہا کرتا تھا۔ اب طویل عرصے سے ادھر گاؤں میں ہے اور کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اس کی ایک جوان بیٹی ہے...... شبنم جو متوفی رانی کی بڑی گہری دوست ہے۔''

میں نے رپورٹ پیش کرتے وقت ایس پی صاحب کو اللہ بخش اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا تھا۔

''اللہ بخش پر خصوصی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''گلاب خان اور اس کے سرغنہ کے بارے میں اس کی معلومات بڑی حیرت انگیز ہیں...... ہوسکتا ہے، اللہ بخش کا کنکشن انہی لوگوں سے ہو۔''

''سر! مجھے تو ایسا محسوس نہیں ہوتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کا حکم ہے تو میں اسے نظر میں رکھوں گا۔''

''صفدر حیات!'' وہ گمبھیر انداز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''میں نے پہلے تمہیں نہیں بتایا تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم جس اسمگلر گروہ کی تاک میں ہیں اور جن کے بارے میں تمہیں بتایا گیا تھا ان لوگوں کا تعلق اسی سرغنہ بدنام زمانہ شخص ہی سے ہے اور اللہ بخش کے انکشاف کے بعد وہ گلاب خان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ تمہیں بہت زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔''

''آپ مجھ پر بھروسا رکھیں سر!'' میں نے بڑے عزم سے کہا۔ ''میں بہت جلد آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔''

''ویری گڈ!'' انہوں نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا۔ ''تم جو بھی لائحہ عمل ترتیب دو...... میرا مشورہ ہے کہ اللہ بخش کو نظر انداز نہیں کرنا۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں سر۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اس مشن میں اللہ بخش کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کروں گا۔''

''شاباش!'' وہ گردن کی اثباتی جنبش کے ساتھ بولے۔ ''اگر اس کام کے لیے تمہارے تھانے کی نفری کم پڑ رہی ہو تو میں کوئی اور بندوبست کرتا ہوں......''

''نہیں سر...... میں کام چلا لوں گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ ''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آ... کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' ای... صاحب نے کہا۔

میں ان سے رخصت لے کر ہیڈ کوارٹر سے نکل... ضلعی اسپتال بھی تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔ میں ایک... کے زیر اثر سرکاری اسپتال پہنچ گیا۔

میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے ملاقات کی اور اسے... آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ مذکورہ ڈاکٹر نے مجھے... کہ متوفی رانی کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے اور ابتدائی رپو... بھی تیار ہے۔ آج دوپہر کے بعد لاش کو اسپتال سے ر... کرنے کا ارادہ تھا۔

''میں اتفاق سے ادھر آ ہی گیا ہوں تو لاش کو بھی ا... ساتھ لے جاتا ہوں۔'' میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے کہا۔ ''... اس میں آپ کی طرف سے کوئی انتظامی رکاوٹ ہو تو......؟''

''کوئی رکاوٹ نہیں ہے!'' ڈیوٹی ڈاکٹر نے جوا... دیا۔ ''بس، آپ کو لگ بھگ آدھا گھنٹا انتظار کرنا ہوگا۔ کچھ ضروری بندوبست کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں آدھے گھنٹے کے بعد آ... ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک ادھر شہر میں ایک دو ک... ہیں، انہیں نمٹا لیتا ہوں۔''

واضح رہے کہ اس روز میرے اور ایس پی صاحب... کے درمیان گلاب خان اور اس کے سرغنہ کے حوالے سے خاصی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔ لہٰذا بنا کسی ٹھوس ثبوت کے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں نے ایس پی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ میں انہیں گلاب خان کی گرفتاری کی شکل میں ایک ٹھوس ثبوت فراہم کروں گا۔

میں آدھے پونے گھنٹے تک شہر میں اِدھر اُدھر گھومتا ر... پھر رانی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کے ساتھ سعید آباد آ گیا۔ میں نے تھانے جانے کے بجائے سیدھا رانی کے گھر وا... پرانا سعید آباد کا رخ کیا تاکہ رانی کی لاش کو اس کے ور... کے حوالے کرسکوں۔ اس طرح وہ تھانے آنے اور لاش لے... جانے کی زحمت سے محفوظ رہتے۔

میں نے مختلف کاغذات پر شوکت علی کے دستخط لے کر... قانونی تقاضے پورے کیے اور واپس تھانے آ گیا۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ میں نے واپسی کے سفر کے دوران ہی پڑھ لی تھی۔ جس کے مطابق رانی کی موت اس کے اغوا کے بعد آنے والی رات کو واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا وقت نصف شب کے آس پاس بتایا گیا تھا اور سبب کے ذیل میں درج تھا کہ متوفی کا سر بڑے طوفانی انداز میں کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا تھا جس کے نتیجے میں وہ زندگی ہار بیٹھی تھی۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے اے ایس آئی جمشید خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ آ کر میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔

''جمشید خان! کام کیسا چل رہا ہے؟''

''ایک دم فرسٹ کلاس ملک صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں تمہارا کام بڑھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گھبرا تو نہیں جاؤ گے؟''

''بالکل نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے تھانے میں تو ویسے بھی کام بہت کم ہوتا ہے...... مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ مجھے کوئی مشن سونپ دیں گے۔''

''بس...... تو سمجھ لو، آج سے...... بلکہ ابھی سے آٹھ دس دن کے لیے تم ایک خصوصی مشن پر ہو۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ مشن ان ڈور ہوگا۔ اس تھانے کی چار دیواری کے اندر......!''

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!''

''میں آنے والے چند روز بہت مصروف رہوں گا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اکثر مجھے تھانے سے باہر کارروائی کے لیے جانا پڑے گا اور میرے غیاب میں تم یہاں کے تھانا انچارج ہو گے۔''

''اوہ......!'' اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔''

''اب اس اعزاز کی حفاظت کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ تمہاری نیٹ پریکٹس ہے...... آخر، آگے چل کر ایک دن تمہیں تھانے دار بھی تو بننا ہے۔''

''ملک صاحب! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' اس کی باچھیں کھل گئیں۔

''آمین!'' میں نے تہ دل سے کہا۔

مایوس لاعلاج اور خوف زدہ حضرات کیلئے عظیم سرمایہ طاقت
نسخہ سپر پاور ہیرے والا
جسمانی اعصابی اور خاص کمزوری شوگر، بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان مریض زندگی میں ایک بار اسے ضرور استعمال کریں اور تمام عمر فٹ رہیں
ایسی خواتین کیلئے بھی مفید ہے جو شوگر کی وجہ سے دماغی جسمانی اور اعصابی کمزوری محسوس کرتی ہیں۔
نوٹ نسخہ سپر پاور ہیرے والا سونے، چاندی یاقوت، زمرد، عقیق مرجان اور ہیرے جواہرات کا مرکب ہے جو کہ بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتا ہے لہٰذا یہ بازار سے نہیں ملتا صرف ہمارے ہاں ہی دستیاب ہے۔ آپ خود ملیں یا گھر بیٹھے فون کر کے وی پی پارسل منگوالیں
No Side Effect
پنڈلیوں، جوڑوں اور پٹھوں کے درد سے مکمل نجات دلاتا ہے
کورس 15 دن صرف 2500 روپے
پتھری گردہ مثانہ یا پتہ میں ہو انشاء اللہ ریت بن کر نکل جائے گی۔ کورس 20 دن صرف 1500 روپے
موٹاپا بڑھا ہوا پیٹ ڈھلکا ہوا پیٹ قد سے زائد وزن جسم کی فالتو چربی پسینہ بن کر خارج ہو جائے گی کورس ایک ماہ صرف 2000 روپے
گیس ٹربل سینے کی جلن تیزابیت، دائمی قبض، پیٹ سخت ہونا معدے کے زخم اور انتڑیوں کے زخم کا کامیاب علاج کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے
طب یونانی کے مایہ ناز حکیم عالم شیر کھرل
بلھے شاہ روڈ نزد اڈا اللیانی قصور شہر
0345-6397367, 0300-4280816

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ رانی کی تدفین کے تین روز بعد کا واقعہ ہے۔ میں تھانے میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ کانسٹیبل اسلم مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اسلم کے اکیلے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم خبر لایا ہوگا اور وہ خبر یقیناً گلاب خان سے متعلق ہوگی۔

میں نے اسلم کو اپنے پاس بلا کر استفسار کیا تو اس نے بتایا۔ ”ملک صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ تین گھڑسوار رب نواز کے ہوٹل کے پاس سے گزر کر کھیتوں والے راستے کی طرف گئے ہیں۔“

میں اس سنسنی خیز اطلاع کے بعد ریڈ الرٹ ہوگیا اور کانسٹیبل اسلم سے پوچھا۔ ”ان لوگوں کو آپ دونوں کی نگرانی کے حوالے سے کوئی شک تو نہیں ہوا؟“

”بالکل نہیں ملک صاحب!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”کیا ان لوگوں نے گھوڑوں پر کوئی سامان وغیرہ بھی لاد رکھا تھا؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

اسلم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جی ملک صاحب! دو گھوڑوں پر دو بڑے بیگ بھی موجود تھے......“

”ٹھیک ہے، تم واپس ارشاد کے پاس جاؤ۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”آج کی رات تم دونوں کو جاگ کر ڈیوٹی دینا ہے...... اگر وہ گھڑسوار افراتفری میں واپس آتے دکھائی دیں تو انہیں قابو کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ وہ بچ کر نہیں جانا چاہئیں۔ ان پر گرفت حاصل کرنے کے لیے گولی شولی بھی چلانا پڑے تو ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرنا...... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا......؟“

”جی ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان کو قابو کرنے کے سلسلے میں آپ کا حکم تو اچھی طرح سمجھ میں آ رہا ہے مگر وہ افراتفری میں واپس کیوں آئیں گے......؟“

”اس سلسلے میں تمہیں اپنے دماغ کو تھکانے کی ضرورت نہیں اسلم!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تھکے ہوئے دماغ کے ساتھ تم چوکس رہ کر ڈیوٹی نہیں دے سکو گے۔ بس، اتنا سمجھ لو کہ......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں آج کی رات ہانکا کرنے جا رہا ہوں......!“

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور مجھے سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے اے ایس آئی جمشید خان کو اپنے پاس بلا کر چند ہنگامی ہدایات دیں پھر ضروری تیاری کے بعد سعید آباد کی جانب روانہ ہوگیا۔

جب میں نے اللہ بخش کو بتایا کہ آج کی رات مشن گلاب خان میں میرے ساتھ ہوگا تو وہ خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ ہم نے شبنم کو شوکت علی کے گھر پر چھوڑا اور جھنڈے شاہ کے مزار کی جانب روانہ ہوئے۔

میں نے متروکہ ڈیرے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا تھا جو پرانا سعید آباد سے موضع نگر کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے ہم پہلے پیر جھنڈے شاہ کے آستانے پر جا چکے تھے۔ وہاں پر میں نے پہلے ہی کانسٹیبل صفدر اور فرید کو تعینات کر رکھا تھا۔ اس روٹ کو اختیار کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گلاب خان کمپنی پر ادھر سے دھاوا بولنا زیادہ سودمند ثابت ہوتا۔ دوسری جانب یعنی رب نواز کے ہوٹل کی طرف میں کانسٹیبل اسلم اور ارشاد کو چوکنا کر دیا تھا لہٰذا گلاب خان اس کے ساتھیوں کے ادھر سے فرار ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔

راستے بھر میرے اور اللہ بخش کے درمیان گلاب خان کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی تھی۔ میں اس سے پہلے اس ڈیرے کا جو سروے کر کے گیا تھا اس کے بارے میں اللہ بخش کو تفصیلاً بتا چکا تھا لہٰذا وہ کچھ زیادہ ہی جوشیلا ہو رہا تھا۔

ہم نے پیر جھنڈے شاہ کے مزار سے صفدر اور فرید کو اپنے ساتھ لیا اور لگ بھگ دس بجے رات اس ڈیرے کے قریب پہنچ گئے جسے پچھلے کچھ عرصے سے گلاب خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنا اڈا بنا رکھا تھا۔ راستے میں، میں نے صفدر اور فرید کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

ڈیرے کے اندر اور باہر سناٹے کا راج تھا۔ باہر سناٹے کا سبب تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اندر کی خاموشی مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ صفدر نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔

”ملک صاحب! ہو سکتا ہے، وہ لوگ ادھر آئے ہی نہ ہوں......!“

”یہ نہیں ہو سکتا......!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اللہ بخش نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ تینوں کے بدن پر پولیس کی وردیاں ہیں جبکہ میں عام دیہاتی لباس میں ہوں۔“

”پھر......؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اللہ بخش کی طرف دیکھا۔

”میں گلاب خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کے بل سے نکالنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”لگتا ہے، تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے......؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”جی ہاں......!“ اس نے بڑے اعتماد سے اثبات میں گردن ہلائی پھر بولا۔ ”آپ لوگ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جائیں اور بالکل چوکنا رہیں۔ میں ڈیرے کا گیٹ کھلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے......“ میں نے اللہ بخش کو تجربے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ”تم کوشش کر کے دیکھ لو......“

اللہ بخش ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر، ڈیرے کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہم تینوں ایسے زاویے پر کھڑے تھے جہاں سے ڈیرے کا گیٹ صاف نظر آ رہا تھا لیکن گیٹ میں کھڑے ہو کر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اللہ بخش نے گیٹ پر پہنچ کر خاصی زوردار دستک دی۔ میرے ذہن میں ایک خدشے نے سر اٹھایا۔ ایس پی صاحب کے الفاظ میری سماعت میں گونجنے لگے۔

”اللہ بخش پر خصوصی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ گلاب خان اور اس کے سرغنہ کے بارے میں اس کی معلومات بڑی حیرت انگیز ہیں...... ہو سکتا ہے، اللہ بخش کا کنکشن انہی لوگوں سے ہو۔“

”اوّل تو ایسا ہے نہیں کیونکہ میری نظر بندے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی۔“ میں نے اپنی سوچ میں خود سے کہا۔ ”اور اگر ایسا ہے تو پھر میں...... میں اللہ بخش کا حشر گلاب خان سے بھی زیادہ عبرت ناک کروں گا......“

میرے ذہن میں ایک منفی سوچ ابھری۔ ”اگر اللہ بخش نے گلاب خان کو خفیہ اشارہ دے کر کوئی گڑبڑ کر دی تو......؟“

میں نے فوراً سے پیشتر سر جھٹک دیا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوگا......!“

اللہ بخش کی زوردار دستک پر جب اندر سے کوئی ردِعمل نہیں آیا تو اس نے دوسری دستک کے ساتھ بہ آواز بلند پکارا۔

”بھائی...... اندر کوئی ہے...... میں راستہ بھٹکا ہوا مسافر ہوں...... کوئی میری مدد کرے......!“

اللہ بخش کی اس کوشش پر اندر سے جو جواب آیا، اس نے مجھ سمیت صفدر اور فرید کو بری طرح چونکا دیا۔ وہ ایک آواز تھی...... جانی پہچانی آواز...... گھوڑوں کے ہنہنانے کی مخصوص آواز یعنی...... ہنہناہٹ......!

اس ہنہناہٹ نے ثابت کر دیا کہ اندر چند گھوڑے موجود ہیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ گھڑسوار بھی اندر موجود ہیں جن کی تلاش میں پچھلے چند روز سے میں سرگرداں تھا۔

میں نے صفدر اور فرید کو اشارہ کیا کہ وہ ڈیرے کے عقبی حصے کی جانب چلے جائیں۔ میں سامنے سے دھاوا بولتا ہوں۔ اگر ان لوگوں نے پچھلے حصے سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ انہیں سنبھال لیں گے۔ وہ میرا اشارہ سمجھ کر مذکورہ سمت بڑھ گئے۔ میں اللہ بخش کے پیچھے تھوڑا فاصلہ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ گیٹ پر نمودار ہونے والا شخص فوری طور پر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اللہ بخش نے ایک مرتبہ پھر زوردار دستک دی اور فریادی لہجے میں پکارا۔

”بھائی گیٹ کھولو...... اور میری مدد کرو...... میں ایک بھولا بھٹکا پردیسی ہوں۔ مجھے راستہ سمجھا دو......“

تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ میں نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے بہ آہستگی گیٹ کھلا اور کسی نے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے مجھے بس اتنی ہی مہلت درکار تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص اللہ بخش سے کسی نوعیت کی گفت و شنید کا آغاز کرتا، میں نے ایک زوردار دھکا دے کر گیٹ کا پٹ اس کے منہ پر کھول دیا۔ وہ بلبلاہٹ کی آواز خارج کرتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ میں بھرا مار کر ڈیرے کے اندر داخل ہوگیا۔

اسی لمحے کمروں کی جانب سے آواز ابھری۔

”مراد...... کون ہے باہر؟“

گیٹ کا ”تھپڑ“ کھا کر گرنے والا مراد بڑا ہی نامراد ثابت ہوا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی اس نے میری وردی کو ٹھیک طرح سے دیکھ لیا تھا۔ اپنے ساتھی کے سوال کے جواب میں وہ چلّایا۔

”گلاب خان...... پولیس آئی ہے......!“

”پولیس......؟“ گلاب خان بس اتنا ہی کہہ سکا۔

گلاب خان کی حیرت اور بے یقینی میں ڈوبی ہوئی آواز نے مجھے بتا دیا کہ وہ ڈیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک ہوائی فائر کیا پھر گرج کر کہا۔

”کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ اس ڈیرے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

پولیس کے جوانوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ جو بھی مہم جوئی کرے گا، حرام موت مرے گا......"

پھر میں نے مراد کی کمر پر ٹھڈا رسید کرتے ہوئے کہا۔ "اٹھ...... کھڑا ہو جا۔"

اسی لمحے کچھ ایسی آوازیں ابھریں جیسے گلاب خان اور اس کا دوسرا ساتھی میری دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈیرے کے عقبی حصے سے فرار کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں نے ایک فوری فیصلے کے تحت مراد نامی غنڈے کی ٹانگ پر فائر کیا اور اللہ بخش سے کہا۔

"تم اس کا خیال رکھو...... میں دوسروں کی خیریت پوچھ کر آتا ہوں۔"

پھر میں کمروں کی جانب لپک گیا۔ میں نے انہیں دھمکی تو دی تھی کہ جو بھی بھاگنے کی کوشش کرے گا، بے موت مرے گا لیکن میں اس لمحے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایسی کوئی کوشش کریں اور صفدر و فرید کو کارروائی ڈالنا پڑے۔

جب میں ڈیرے کے عقبی حصے میں بنے کمروں تک پہنچا تو میں نے دیکھا، دو افراد دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ وہ دونوں دردناک آوازیں خارج کرتے ہوئے دھڑام سے ڈیرے کے اندرونی حصے میں گرے۔ میں نے فائر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کے جسم کا زیریں حصہ ہی متاثر ہو۔

میں بھاگ کر ان کے سر پر پہنچ گیا اور ٹارچ جلا کر ان کا معائنہ کرنے لگا۔ اتنی دیر میں صفدر اور فرید بھی ڈیرے کے اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے فوری کارروائی کے طور پر مراد کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ اللہ بخش میری جانب لپکا اور زمین پر پڑے دو افراد میں سے ایک مچھل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

"ملک صاحب...... یہی ہے گلاب خان......!"

آیندہ پانچ منٹ کے اندر اندر ان تینوں غنڈوں کو الٹی ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں پھر میں نے کمروں کی تلاشی لی اور وہ دو بڑے بیگ دریافت کر لیے جن کے بارے میں کانسٹیبل اسلم نے مجھے بتایا تھا۔

میں نے بیگ کھول کر دیکھے تو دنگ رہ گیا۔ ایک بیگ کے اندر خطرناک اسلحہ بھرا ہوا تھا جبکہ دوسرا بیگ منشیات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تینوں مجرم اپنے خطرناک جرم کے ثبوتوں کے ساتھ میری گرفت میں آ چکے تھے لہٰذا مجھے اپنا کام کرنے کے لیے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ گلاب خان کے دوسرے ساتھی کا نام ایوب تھا۔

ان تینوں زخمی غنڈوں اور ان کے جرائم کے ثبوت کو لے کر میں رات کے آخری پہر اپنے تھانے پہنچ گیا۔ واپسی کے لیے ہم نے وہ راستہ اختیار کیا تھا جدھر اسلم اور ارشاد تعینات تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جب گلاب خان اور ایوب دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو ان کے پاس ہتھیار بھی موجود تھے لیکن میں نے انہیں گولی چلانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ میرے ریوالور سے نکلنے والی گولیوں نے گلاب خان کی تشریف اور ایوب کے ٹخنے کو لہولہان کر دیا تھا جبکہ مراد کی ران مسلسل خون اگل رہی تھی۔

مجھے گلاب خان اور اس کے ساتھی غنڈوں پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ وہ بری طرح زخمی تھے اور میں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ جب تک وہ اقبالی بیان نہیں دیں گے، میں ان کی مرہم پٹی کا بندوبست نہیں کروں گا۔ ان کے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب میں نے گلاب خان مچھل سے رانی کی موت کے حوالے سے سوال کیا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اسے میں نے نہیں مارا۔ وہ اپنی موت خود مری ہے......"

"کیسے......" میں نے پوچھا۔ "وہ اپنی موت خود کیسے مر گئی......؟"

"میں اس کی عزت خراب کرنا چاہتا تھا اور وہ خود کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش میں تھی۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ "اسی چھینا جھپٹی میں اسے ایک زوردار دھکا لگا اور اس کا سر ایک دیوار سے جا ٹکرایا...... بس، وہ ادھر ہی گر گئی اور مر گئی......!"

"رانی تو مر گئی، بچو گے تم بھی نہیں......" میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ "تم جس کے خاص آدمی ہو ہم جانتے ہیں۔ میں نے تمہیں تمہارے جرائم کے ثبوت کے ساتھ گرفتار کیا ہے۔ تمہاری باقی کی زندگی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے گی۔ میں اتنا سخت چالان بناؤں گا کہ تمہارا سرغنہ تو کیا، اس کا باپ بھی تمہیں نہیں چھڑا سکے گا......"

وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

پاس ورڈ

بابر نعیم

کبھی کبھی دل میں خواہش زور پکڑتی ہے کہ کاش ہم فلاں زمانے میں پیدا ہوتے تو ایسا ہوتا مگر آرزو کا پورا نہ ہونا ہی تو انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے اور کسی کی کیا مجال کہ وقت کا توازن اپنے ہاتھ میں لے سکے... ایسے میں کاش کا لفظ ادھوری خواہشوں کی مکمل کہانی کچھ اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ ہر موڑ پر تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر جانے کیسے نظر دھوکا کھاتی ہے اور وہ سب دکھائی دینے لگتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے۔ اس کے سامنے بھی اچانک وہ منظر آگیا جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

وقت کی بساط پر نبرد آزما حال اور ماضی کی دلچسپ معرکہ آرائی

وہ جولائی کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ رچرڈ فوریسٹر نے اپنی کار گرین ٹاؤن کے مشہور آئس کریم پارلر کے سامنے روکی۔ تپتی سڑک سے گزر کر وہ پارلر میں داخل ہوا اور کسی غیر معمولی آئس کریم کی فرمائش کی۔ ویٹر نے متعدد نام لیے لیکن وہ انکار کرتا رہا۔ مگر جب پرانے زمانے کی لائم ونیلا آئس کریم کا نام آیا تو اس نے کہا۔ "ہاں...... یہ مناسب رہے گی۔"

آئس کریم کے انتظار میں اس نے گھومنے والے اسٹول

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو اپنے پیروں پر زور ڈال کر گردش دی۔ اندر کے ماحول میں خوش گوار خنکی تھی۔ چمکتے ہوئے آئینوں، چھت پر گردش کرتے پنکھوں اور چھوٹی کھڑکیوں پر لہراتے سرسراتے سبز پردوں پر سے پھسلتی ہوئی اس کی نظر ایک چہرے پر رک گئی۔ اس نے پیروں پر دباؤ ڈال کر اسٹول کو روک دیا۔ وہ چہرہ مس سائمن کا تھا۔ ان کی عمر 95 سال تھی۔ آئس کریم ان کے منہ میں تھی اور آئس کریم کا چمچہ ہاتھ میں۔

''نوجوان۔'' مس سائمن نے کہا۔ ''تم حوصلہ مند بھی ہو اور خوش ذوق بھی۔ کوئی جذباتی طور پر نڈر جنٹلمین ہی لائم ونیلا آئس کریم کا آرڈر دے سکتا ہے...... بغیر کسی جھجک کے۔''

رچرڈ نے احتراماً سر کو ہلکا سا خم کیا۔

''آؤ...... میرے پاس بیٹھو۔'' مس سائمن نے کہا۔ ''ہم آئس کریم اور ایسی ہی چیزوں کے متعلق بات کریں گے۔ ڈرو نہیں۔ بل میں ادا کروں گی۔''

اتنی دیر میں رچرڈ کی آئس کریم آچکی تھی۔ اس نے اپنی آئس کریم اٹھائی اور مسکراتا ہوا ان کی میز کی طرف چلا گیا۔

''تم...... تم رچرڈ فوریسٹر ہی ہو نا؟''

''جی ہاں مادام۔''

''تمہارے متعلق میں نے بہت کچھ سنا ہے۔'' مس سائمن نے کہا اور بڑی نزاکت سے آئس کریم کا چمچہ منہ میں رکھ لیا۔ ایک لمحے وہ آئس کریم سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ آئس کریم ان کی زبان پر گھل گئی تو انہوں نے کہا۔ ''اچھے آدمی ہو۔''

''میں آپ کو جانتا ہوں۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''آپ مس لنیلا سائمن ہیں۔''

''ریکارڈ کے مطابق معمر ترین کنواری خاتون۔'' انہوں نے اضافہ کیا۔

''میں ایک زمانے میں آپ کی محبت میں گرفتار رہا ہوں۔'' رچرڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''واہ...... یہ ایک نئی گفتگو شروع کرنے کا بہت اچھا طریقہ ہے۔ مجھے پسند آیا۔'' مس سائمن نے اپنی آئس کریم پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں آئندہ بھی ملنا چاہیے۔ نہیں......'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر رچرڈ کو کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''مجھے یہ نہ بتاؤ کہ تم کب اور کہاں میری محبت میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ باتیں آئندہ پر رکھ چھوڑو۔ ابھی مجھے گھر جانا ہے۔ تم روزنامہ سن کے لیے کام کرتے ہو نا؟ ایسا کرو، کل سہ پہر میرے گھر آجاؤ...... چائے پر۔ باتیں بھی ہو جائیں گی۔ مسٹر فوریسٹر، تم مجھے اس شخص کی یاد دلاتے ہو، جس کے ساتھ میں تقریباً ایک صدی سے پہلے گھومتی پھرتی رہی ہوں...... لنچ، ڈنر کرتی رہی ہوں۔''

وہ اس کے مقابل بیٹھی تھیں۔ ان سے بات کرنا ایسا لگ رہا تھا جیسے راستہ بھولے کسی پروانے سے بات کی جا رہی ہو۔ آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''تو کل تم آرہے ہو نا؟''

''میں ضرور آؤں گا...... یقینی طور پر۔''

وہ چلی گئیں...... اور جب تک نظر آتی رہیں، رچرڈ فوریسٹر انہیں دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اگلی صبح رچرڈ فوریسٹر نے اپنے اخبار کے لیے کچھ اسپورٹس آئٹم چیک کرنے میں گزاری۔ پھر اس نے لنچ کیا۔ اس کے بعد کچھ دیر قصبے کے باہر دریا کے کنارے مچھلیوں کا شکار کھیلا۔ اس نے تین چار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑیں۔ مگر فوراً ہی انہیں پانی میں اچھال دیا۔ یہ اس کا اظہارِ مسرت تھا۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس کی نظریں دور...... بہت دور کسی غیر مرئی نکتے پر جمی ہوئی تھیں۔

جیسے ہی تین بجے، وہ خود کار انداز میں اپنی کار میں جا بیٹھا۔ اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جم گئے اور وہ غیر معمولی انداز میں مس سائمن کے گھر کی طرف کار دوڑانے لگا۔ اس نے عشق پیچاں کی بیل سے ڈھکے ایک پورچ میں گاڑی روکی۔ وہ کار سے اترا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی کار اس کے پائپ کی طرح پرانی اور کھٹارا ہے اور اسے اپنی کار اس تین منزلہ وکٹورین طرز کے مکان کے سامنے کھڑی بہت بے ڈھنگی اور بے جوڑ لگ رہی تھی۔

باغ کے اس سرے کی جانب سے اسے ایسی آواز سنائی دی، جیسے کوئی پروانہ شمع کی طرف لپک رہا ہو۔ پھر اس نے سرگوشی جیسی ایک چیخ سنی اور دیکھا کہ اس طرف مس سائمن اس کی منتظر ہیں۔ وہ وقت اور فاصلوں کی تمام حدود سے بے نیاز، چاندی کی پیالیاں سجائے، میز پر ٹی پاٹ رکھے تنہا بیٹھی تھیں۔

''یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی خاتون ہر طرح سے تیار میری منتظر بیٹھی ہے۔'' رچرڈ نے وہاں پہنچ کر کہا۔ ''اور یہ پہلا موقع ہے کہ میں بالکل ٹھیک وقت پر کہیں پہنچا ہوں۔''

''ایسا کیوں؟'' مس سائمن نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' رچرڈ نے اعتراف کیا۔

''خیر...... تو بات شروع کرتے ہیں۔'' مس سائمن بولیں۔ ''یہ بتاؤ، دنیا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''

''یہ تو آغازِ دانش کی علامت ہے۔ سترہ سال کی عمر میں آدمی سب کچھ جانتا ہے۔ اور جب کوئی ستائیس سال کی عمر میں بھی یہی کہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں تو سمجھ لو کہ اس کی ذہنی عمر اب بھی سترہ سال ہے۔''

''آپ کو گزرے ہوئے برسوں نے بہت کچھ سکھایا ہے۔''

''بوڑھے لوگ بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ انہیں کوئی چیلنج نہیں کرتا لیکن یہ سب کچھ جاننا محض ایک ڈھونگ، ایک نقاب ہے۔ ہم بوڑھے لوگ ایک دوسرے کو آنکھ مارتے اور مسکراتے ہیں...... زبانِ خاموشی سے ایک دوسرے سے کہتے ہیں...... ''کہو، میرا نقاب، میری اداکاری، میرا مصنوعی یقین اور اعتماد کیسا رہا؟'' زندگی ایک ڈراما ہے نا؟ میں نے اپنا کردار کیسا ادا کیا...... خوش اسلوبی سے؟''

وہ دونوں ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے۔ گزشتہ کئی ماہ میں وہ پہلا موقع تھا کہ رچرڈ سچ مچ اندر سے ہنسا تھا۔

پھر مس سائمن نے اپنی چائے کی پیالی دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس میں جھانکا۔ ''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اتنی دیر سے ملے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ہرگز پسند نہ کرتی کہ میں تم سے اکیس سال کی عمر میں ملتی، جو بے وقوفی کی عمر ہوتی ہے۔''

''اکیس سال کی خوبصورت لڑکیوں کے لیے تو یہ لمحے خاص ہی ہوتے ہیں۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ میں خوبصورت تھی؟''

رچرڈ نے خوش دلی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' مس سائمن نے کہا۔ ''تم جب پہنچے تو عمر کا اژدہا خوبصورتی سے راج ہنس کو نگل چکا تھا۔ اژدھے کے منہ پر لگے چند پروں کو دیکھ کر تم راج ہنس کے بارے میں کیا فیصلہ کر سکتے ہو؟ میں تو خود راج ہنس کو بھول چکی ہوں کہ وہ کیسا لگتا تھا۔ ہاں...... میں اسے محسوس اب بھی کر سکتی ہوں۔ وہ میرے اندر محفوظ ہے...... اب بھی زندہ ہے اور اس میں ایک پر برابر بھی فرق نہیں پڑا ہے۔'' وہ چند لمحے خاموش رہیں پھر بولیں۔ ''جانتے ہو، بہار یا خزاں کی کچھ صبحیں ایسی ہوتی ہیں، جب میں سو کر اٹھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ...... آج میں کھیتوں سے گزر کر جنگل میں جاؤں گی اور ڈھیر ساری اسٹرابری توڑوں گی یا...... میں جھیل میں پیراکی کروں گی...... یا میں آج رات بھر رقص کروں گی...... صبح تک۔ لیکن جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میں وہ راج ہنس ہوں، جو اژدھے کی قید میں ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میں وہ شہزادی ہوں، جو گرتے ہوئے مینار میں قید ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ نہیں۔ سو وہ پرنس چارمنگ کے انتظار میں ہے۔''

''آپ کو تو کتابیں لکھنا چاہیے تھیں۔''

''پیارے لڑکے، میں افسانے لکھتی رہی ہوں۔ ایک بوڑھی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ تیس سال کی عمر تک میں ایسی دیوانی لڑکی تھی جس کا سر ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر دنیا

نفس

☆ جو شخص اپنے نفس پر حکومت کرتا ہے جذبات، خواہشات اور خطرات کو دباتا ہے۔ وہ شخص بادشاہ سے بڑھ کر ہے۔ ضبطِ نفس کے بغیر آپ کو کامیابی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ جو انسان اپنے نفس پر فتح پاتا ہے وہی بہادر کہلانے کا مستحق ہے۔

☆ مانا کہ آپ بہت ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صحت مند ہیں لیکن اگر آپ کو اپنے آپ پر بھروسا اور نفس پر قابو نہیں تو کامیابی کی توقع محض خود فریبی اور خوش فہمی ہے۔

☆ ہوشیار درحقیقت وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس پر قابو پایا اور موت کے بعد آنے والی زندگی سنوارنے میں لگ گیا اور بے وقوف وہ ہے جس نے اپنے آپ کو نفس کی ناجائز خواہشوں کے پیچھے لگایا اور اللہ سے غلط توقع باندھی۔

☆ خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے والا دنیا اور آخرت دونوں میں گرفتارِ عذاب رہتا ہے۔ دنیا میں انہیں تلاش کرنے کی وجہ سے اور آخرت میں حساب کی بنا پر۔

(حضرت یحییٰ بن معاذؒ)

☆ نفس کی ایک خواہش پوری کرنے سے اللہ کے راستے پر چلنے میں سینکڑوں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(حضرت ابو محسن خرقانیؒ)

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، بہاول پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے اس واحد شخص نے، جس کی مجھے پروا تھی، میرے انتظار سے اکتا کر کسی اور سے شادی کرلی۔ مجھے بہت غصہ آیا...... خود پر بھی آیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس سزا کی مستحق ہوں کہ بہترین موقع ملنے کے باوجود بھی شادی نہ کروں۔

"پھر مجھے سیاحت کا خبط ہوگیا۔ میں پیرس میں بھی تنہا تھی، ویانا میں بھی تنہا تھی اور لندن میں بھی۔ اور اب یہاں بھی میں اکیلی ہی ہوں۔ اے لڑکے...... سوچنے کے لیے تمہارے پاس وقت بہت ہے۔ ذرا تمیزداری کا مظاہرہ کرو۔ گفتگو میں حصہ لو۔"

وہ دونوں چائے پیتے رہے۔

"اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔" مس سائمن نے کہا۔ "میں خوامخواہ خودترسی میں مبتلا ہورہی تھی۔ تو تمہاری عمر اکتیس سال ہے اور تم ابھی تک غیر شادی شدہ ہو؟"

"اجازت ہو تو میں اس بات کو اس انداز میں کہوں کہ ایسی عورتیں شاذونادر ہی ملتی ہیں، جو آپ کی طرح سوچتی، عمل کرتی اور باتیں کرتی ہوں۔"

"میرے خدا۔" مس سائمن نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں جوان عورتوں سے یہ توقع کرنی بھی نہیں چاہیے۔ دیکھو نا، پہلی بات تو یہ کہ وہ کم عمر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ عام آدمی کو جیسے ہی کسی لڑکی میں ذہانت نظر آتی ہے، وہ فوری طور پر راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ تم بھی کئی ایسی لڑکیوں سے ملے ہوگے، جنہوں نے بڑی ذہانت اور کامیابی سے اپنی ذہانت کو تم سے چھپایا ہوگا۔ ذہانت تو تمہیں کرید کرید کر تلاش کرنا ہوگی۔"

دونوں پھر ہنسنے لگے۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں ایک جزئیات ہیں، کنوارا بڈھا مروں گا۔" رچرڈ نے کہا۔

"نہ نہ...... ایسا نہ کرنا۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہوگی۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تمہیں آج یہاں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"تو مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟"

"کہیں سوئمنگ کرتے، اسٹرابری توڑتے۔ اگر یہ سب کچھ اپنی خاطر نہیں کرسکتے تو میری خاطر کرو۔ یہ بتاؤ، تم کہاں کی سیاحت پسند کرو گے؟ اور تم زندگی میں کیا کچھ کرنا پسند کرو گے؟" مس سائمن نے بہ غور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں استنبول، پورٹ سعید، نیروبی، بوڈاپسٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔ اور میں ایک اونچے چٹانی چھجے سے نیچے کھائی میں گرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بھی چاہتا ہوں درمیان میں کسی درخت سے اٹک جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ مراکش کی تاریک گلیوں میں آدھی رات کو مجھ پر گولی چلائی جائیں اور میں کسی خوبصورت عورت سے محبت چاہتا ہوں۔"

"میں تمہیں یہ سب کچھ تو نہیں دے سکتی۔" مس سائمن نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں بہت سے مقامات کی سیر کراسکتی ہوں اور اگر تم آج رات گیارہ بجے میرے گھر کے سامنے والے لان پر دوڑ لگانے کی زحمت کرو تو میں تم پر فائر بھی کردوں گی بشرطیکہ اس وقت تک سو نہ گئی۔ میرا خیال ہے، اس سے تمہاری مردانگی اور خواہش مہم جوئی، دونوں کی تسلی ہوجائے گی۔"

"جی ہاں۔ کام چل جائے گا میرا۔" رچرڈ نے خوش دلی سے کہا۔

"اب یہ بتاؤ کہ پہلے تم کہاں کی سیر پسند کرو گے، میں تمہیں لے چلوں گی۔ تم صرف جگہ کا نام بتادو۔ لندن، قاہرہ؟ ہاں...... قاہرہ کا نام سن کر تمہارا چہرہ روشن ہوگیا ہے۔ تو چلو...... قاہرہ چلتے ہیں۔ اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو، اپنا پائپ سلگاؤ اور کرسی سے ٹیک لگالو۔"

رچرڈ نے اپنا پائپ سلگایا، کرسی سے ٹیک لگائی اور مسکراتے ہوئے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"یہ قاہرہ ہے......" مس سائمن نے کہا اور بولتی چلی گئیں۔

ایک گھنٹا گزر گیا...... جواہرات میں، شہر کی گلیوں میں، مصر کے صحراؤں کی طرف سے چلنے والی ہواؤں میں۔ دھوپ سنہری تھی اور نیل جہاں ڈیلٹا کی طرف بہتا تھا، وہاں اس کا پانی گدلا تھا۔ کوئی جوان اور پھرتیلا وجود ہرم کے بلند پر چڑھا، ہنستے ہوئے اسے پکار رہا تھا...... رچرڈ...... رچرڈ! ارے، یہ تو مس سائمن ہیں۔ وہ اسے سائے کی طرف بلا رہی تھیں۔ وہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ آخری مرحلے میں مس سائمن نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے سہارا دیا تھا۔ اوپر چڑھنے میں اس کی مدد کی تھی۔ پھر وہ دونوں اونٹ کی سواری کررہے اور ہنس رہے تھے۔ اور اب رات ہوگئی تھی۔ چاندی اور کانسی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دور کہیں...... بہت دور سے کسی مشرقی دھن کی گونج سنائی دے رہی تھی......

رچرڈ فوریسٹر نے آنکھیں کھول دیں۔ مس سائمن نے اپنا ایڈونچر ختم کیا...... وہ دونوں گھر واپس آگئے تھے۔ اس باغ میں بیٹھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے...... بے حد جانے پہچانے تھے۔ چاندی کے پاٹ میں رکھی چائے ٹھنڈی ہوچکی تھی اور اترتی دھوپ میں بسکٹ سخت اور خشک ہوگئے تھے۔

رچرڈ نے گہری سانس کے ساتھ ایک انگڑائی لی اور آہ بھر کے کہا۔ "مجھے اتنا سکون کبھی نہیں ملا۔"

"مجھے بھی۔" مس سائمن بولیں۔

"میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ مجھے اب سے ایک گھنٹا پہلے چلے جانا چاہیے تھا۔"

"تمہیں بتاؤں...... میرے لیے اس گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک پل محبت بھرا اور یادگار تھا۔ لیکن تم بتاؤ۔ تمہیں ایک بے وقوف بوڑھی عورت میں ایسا کیا نظر آیا......"

رچرڈ نے کرسی سے ٹیک لگائی اور نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کی چمک اتر آئی تھی۔ اس نے پہلے سر داہنی جانب اور پھر بائیں جانب جھکایا۔

"یہ تم کیا کررہے ہو؟" مس سائمن نے پوچھا۔ وہ اس نظر کے سامنے بے آرامی محسوس کررہی تھیں۔

وہ بہ دستور انہیں دیکھتا رہا۔

"ٹھیک طرح سے دیکھا جائے تو سب کچھ نظر آتا ہے...... ویسا، جیسا نظر آنا چاہیے۔"

اور وہ خود سوچ رہا تھا، اس طرح جھریاں مٹ جاتی ہیں۔ گزرے ہوئے برس لوٹ آتے ہیں۔

پھر وہ بری طرح چونکا......

"کیا ہوا؟" مس سائمن نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

لیکن وہ چیز فوراً ہی غائب ہوگئی تھی۔ رچرڈ نے آنکھیں کھول دیں کہ شاید وہ کھلی آنکھوں سے نظر آجائے۔ اسے احساس ہوا کہ اس سے غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ اسے آنکھیں نہیں کھولنا چاہیے تھیں۔ نیم وا آنکھوں ہی سے دیکھتے رہنا چاہیے تھا۔ فاصلے مٹتے ہی رہتے...... وقت کے فاصلے!

"میں نے اسے دیکھا تھا۔" رچرڈ نے بتایا۔ "صرف ایک لمحے کے لیے وہ مجھے نظر آیا تھا۔"

"کون نظر آیا تھا؟"

"راج ہنس۔" اس نے سوچا۔ اس کے ہونٹوں نے خاموشی سے اس لفظ کی شکل بنادی۔

اگلے ہی لمحے مس سائمن اپنی کرسی پر تنی بیٹھی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ ان کی گود میں رکھے تھے۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور رچرڈ بے بسی اور شرمندگی سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں بھر آئی تھیں...... چھلک رہی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے کہا۔ "میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔"

"نہیں۔ شرمندہ نہ ہو۔ افسوس نہ کرو۔" مس سائمن نے کہا۔ وہ تنی بیٹھی رہیں۔ انہوں نے اپنے چہرے، اپنی آنکھوں کو نہیں چھوا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہیں۔ "اب تم چلے جاؤ۔ جی چاہے تو کل آجانا۔ لیکن اس وقت چلے جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

وہ اپنی کار کی طرف چل دیا۔ باغ سے گزرتے ہوئے اسے پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

☆☆☆

جولائی کے دن جل بجھے۔ یہاں تک کہ اگست آگیا۔ وہ چائے پر، لنچ پر، ڈنر پر مدعو کیا جاتا رہا۔ لمبی ہری بھری سہ پہروں میں وہ بیٹھ کر باتیں کرتے۔ آرٹ کی، ادب کی، سیاست کی، زندگی کی باتیں۔ وہ آئس کریم کھاتے اور خوش ذائقہ وائن پیتے۔

"مجھے کوئی پروا نہیں کہ کوئی کیا کہتا ہے۔" ایک دن مس سائمن نے کہا۔ "لوگ تو باتیں بناتے ہی رہتے ہیں۔"

رچرڈ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں جانتی ہوں۔ عورت بے چاری کبھی افواہوں سے محفوظ نہیں رہتی۔ خواہ اس کی عمر 95 سال ہو۔" وہ بولیں۔

"آپ کہیں تو میں آپ سے ملنا چھوڑ دوں۔"

"نہیں...... نہیں۔" وہ چلائیں۔ پھر انہوں نے خود کو سنبھالا اور ہموار لہجے میں بولیں۔ "تم بھی جانتے ہو کہ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تم جانتے ہو کہ تمہیں بھی کسی کے کچھ کہنے کی پروا نہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ ہم تو جانتے ہیں نا کہ ہمارا تعلق پاک وصاف ہے۔ اس میں کوئی آلائش نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

"اب......" وہ ٹھیک طرح سے جم کر بیٹھ گئیں۔ "آج ہم کہاں چلیں گے؟ پیرس؟ ہاں...... میرا خیال ہے، پیرس ہی مناسب رہے گا۔"

"جی ٹھیک ہے۔ پیرس مناسب رہے گا۔"

"چلو پھر۔" مس سائمن کا لہجہ خواب ناک ہوگیا۔ "یہ 1885ء ہے۔ ہم سمندر کے سینے پر سفر کررہے ہیں۔ ہم مارسیلز پہنچنے والے ہیں......"

وہ ایک پل پر کھڑی، نیچے دریائے سین کے شفاف پانی کو دیکھ رہی تھیں اور پھر اچانک وہ آگیا۔ وہ ان کے برابر آن کھڑا ہوا۔ وہ موسم گرما کو لہر در لہر بہتے دیکھتے رہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھر وہ اپنی انگلیوں میں نزاکت سے ایک جام تھامے کھڑی تھیں۔ رچرڈ نے جھکتے ہوئے ان کے جام سے اپنا جام ٹکرایا۔ رچرڈ کا چہرہ ورسیلز کے آئینوں سے جڑے ہال میں نظر آرہا تھا پھر وہ اسٹاک ہام میں تھے۔ وہ وینس کی نہروں میں بجروں کی گنتی کررہے تھے......

وہ سب کچھ، جو مس سائمن نے اکیلے کیا تھا، اب وہ دونوں مل کر کررہے تھے۔

☆☆☆

اواخر اگست کی ایک ڈھلتی سہ پہر، وہ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ”آپ کو احساس ہے کہ میں تقریباً ہر روز آپ کے پاس آتا رہا ہوں؟“ رچرڈ نے پوچھا۔

”یہ...... یہ تو ناممکن ہے۔“

”اور یہ بھی سن لیں کہ میں نے آپ کی قربت کے ایک ایک لمحے کو انجوائے کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس عرصے میں تم نہ جانے کتنی لڑکیوں سے مل سکتے تھے۔“

”آپ میں ہر وہ خوبی ہے، جس سے لڑکیاں محروم ہوتی ہیں۔ نرمی، مہربانی، ذہانت، حوصلہ اور دانش......“

”بے وقوف۔ یہ سب چیزیں تو عمر کے ساتھ ساتھ آتی ہیں۔ یہ نرمی، مہربانی، ذہانت۔ اور بیس سال کی عمر میں تو بے رحمی اور بے پروائی بھی اچھی لگتی ہے۔“ مس سائمن نے توقف کیا اور ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ”اب میں تمہیں شرمندہ کرنے والی ہوں۔ تمہیں وہ پہلی سہ پہر یاد ہے، جب ہم آئس کریم پارلر میں ملے تھے۔ تم نے کہا تھا...... میں بھی آپ کی محبت میں گرفتار رہا ہوں۔ اس کے بعد تم نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میرے لیے وہ ایک خلش ہے۔ اب مجھے مجبوراً تم سے تفصیل پوچھنا پڑ رہی ہے۔“

”لیکن یہ میرے لیے شرمندگی کی بات ہے۔“ رچرڈ نے احتجاج کیا۔

”بہرحال...... اپنا سینہ ہلکا کردو۔“

”میں نے برسوں پہلے آپ کی ایک تصویر دیکھی تھی۔“

”لیکن میں نے ہمیشہ تصویر کھنچوانے سے انکار کیا ہے۔“

”وہ ایک پرانی تصویر تھی۔ اس وقت کی، جب آپ 19 سال کی تھیں۔“

”اوہ وہ...... وہ تو اچھا خاصا مذاق ہے۔ جب بھی میں کسی فلاحی ادارے کو چندہ دیتی ہوں یا کہیں افتتاح کے لیے بلائی جاتی ہوں تو وہ اس تصویر کو جھاڑ پھونک کر شائع کردیتے ہیں۔ اس پر قصبے میں سب لوگ ہنستے ہیں۔ حد ہے کہ میں بھی ہنستی ہوں۔“

”یہ تو اخبار والوں کی بے رحمی ہے۔“

”نہیں۔ وہ میری ہدایت کے تحت ایسا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا تھا...... اگر تمہیں میری تصویر چھاپنی ہو تو 1878ء والی تصویر چھاپ دیا کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے اسی تصویر کے حوالے سے یاد رکھیں۔ اور میں نے ہدایت کی ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے نام پر، میرا تابوت بند ہی رکھنا۔ ڈھکنا کھول کر چہرہ نہ دکھانا۔“

”اب میں آپ کو اس کے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا۔“ اس نے یہ کہہ کر توقف کیا۔ وہ اس تصویر کو یاد کررہا تھا۔ وہ اس کے ذہن کے پردے پر بے حد واضح تھی۔ اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً...... یہاں، گارڈن میں بھی اس تصویر کو ہر ہر زاویے سے دیکھتا اور سراہتا رہا تھا۔ اکیلی اور خوبصورت مس سائمن، 19 سال کی عمر میں پہلی بار تصویر کھنچواتے ہوئے۔ اس کے متبسم چہرے پر بڑا سکون اور شرمیلا پن تھا۔

وہ موسم بہار کا چہرہ تھا۔ اس میں گھاس کی سانسوں کی حدت تھی۔ اس میں مکئی کی بالی کی نرمی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر انار کی چمک تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھری دوپہر کا آسمان تھا۔ وہ زبان پر پہلی اسٹرابری کا ذائقہ تھی۔ اس کے چہرے کو چھونا ایسا تھا، جیسے آپ دسمبر کی صبح سویرے کھڑکی کھول کر ہاتھ باہر نکالیں تو پہلی کنواری برف کا پاؤڈر بغیر کسی اعلان کے خاموشی سے آپ کے ہاتھ پر گرے اور یہ تجربہ ہر بار نیا لگے۔

اور یہ سب کچھ، سانسوں کی خوش گوار حدت اور آلوچوں کی نرمی اور مٹھاس کسی معجزے کے تحت ہمیشہ کے لیے اس تصویر میں محفوظ ہوگئی تھی۔ وقت کی ہوا کا کوئی جھونکا اس میں ایک گھنٹے کی، ایک منٹ کی، ایک سیکنڈ کی تبدیلی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ کنواری ٹھنڈی برف کبھی نہیں پگھل سکتی۔ یہ ہزاروں موسم گرما اسی طرح رہے گی۔

تو ایسی تھی وہ تصویر۔ اور رچرڈ نے اسے اسی طرح محسوس کیا تھا۔

”میں نے پہلی بار وہ تصویر دیکھی تو مجھے وہ سادہ اور زندہ لگی۔ بالوں کا اسٹائل سادہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی پرانی تصویر ہے۔“ رچرڈ کہہ رہا تھا۔ ”اخبار میں تفصیل دی گئی تھی کہ مس لنیلا سائمن آج رات ٹاؤن ہال کا افتتاح کررہی ہیں۔ میں نے وہ تصویر بڑی نفاست سے اخبار سے تراش لی۔ پورا دن میں اسے لیے پھرتا رہا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس تقریب رقص میں جاؤں گا۔

”پھر شام کے وقت کسی نے مجھے اس تصویر کو دیکھتے دیکھ لیا۔ تب مجھے تفصیل بتائی گئی کہ یہ اس لڑکی کی 1878ء کی تصویر ہے اور اخبار میں ہر سال چھپتی ہے۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ میں اس تقریب میں نہ جاؤں...... اس تصویر کے ساتھ...... اور آپ کو نہ دیکھوں۔“

دونوں دیر تک یونہی بیٹھے رہے۔ رچرڈ نے مس سائمن کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں۔

وہ کچھ دیر اپنی کرسی کو جھلاتی رہیں۔ پھر انہوں نے بہت نرم اور شیریں لہجے میں پوچھا۔ ”اور چائے پیو گے؟ یہ لو۔“

دونوں بیٹھے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ پھر مس سائمن نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اس کے بازو کو چھوا۔ ”شکریہ!“ انہوں نے کہا۔

”کس بات کا؟“

”اس تقریب رقص میں آنے اور مجھے ڈھونڈنے کی خواہش کرنے کا۔ اخبار میں سے میری تصویر تراشنے کا۔ بہت بہت شکریہ رچرڈ۔“

وہ اٹھ کر گارڈن میں ٹہلنے لگے۔

”اور اب۔“ مس سائمن بولیں۔ ”اب میری باری ہے۔ تمہیں یاد ہے، میں نے ایک شخص کا تذکرہ کیا تھا، جو کبھی مجھ پر توجہ نچھاور کرتا رہا تھا۔ 70 سال پہلے کی بات ہے یہ۔ اب اسے وفات پائے کم از کم تیس سال ہوچکے ہیں۔ لیکن جب وہ جوان تھا...... اور بہت خوبرو تھا تو وہ کئی کئی دن اور موسم گرما میں راتوں کو بھی ایک تیز رفتار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے مرغزاروں میں، قصبے کے گرد دوڑاتا تھا۔ وہ صحت مند آدمی تھا۔ اس کا چہرہ زندگی کی روشنی سے دمکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ہمیشہ خراشیں ہوتی تھیں، وہ ہر وقت چمنی کی طرح دھواں چھوڑتا تھا۔ چلتا یوں تھا، جیسے اڑنے کے لیے پر تول رہا ہو۔ وہ کوئی ملازمت زیادہ عرصے تک نہیں کرسکتا تھا۔ دل بھر جاتا تو چھوڑ دیتا اور ایک بار وہ مجھ سے منہ موڑ کر چل دیا۔ صرف اس لیے کہ میں اس سے زیادہ متلون مزاج تھی اور ٹک کر کہیں بیٹھتی نہیں تھی۔ بس پھر کھیل ختم ہوگیا۔

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آئندہ کبھی اسے جیتا جاگتا دیکھ سکوں گی۔ لیکن تم جیتے جاگتے انسان ہو۔ تم بھی اس کی طرح راکھ کریدتے پھرتے ہو۔ تم میں بھی کاہلی، پھوہڑپن اور وقار جیسے تضادات یکجا ہوگئے ہیں۔ تم جو کچھ کرنے والے ہوتے ہو، مجھے پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب تم وہی کچھ کرچکتے ہو تو مجھے ہر بار حیرانی ہوتی ہے۔ میں آواگون کو خرافات سمجھتی ہوں لیکن گزشتہ روز میرا جی چاہا...... اور میں نے سوچا کہ اگر میں تمہیں سڑک پر جاتے دیکھوں اور پکاروں...... رابرٹ، رابرٹ۔ تو کیا تم پلٹ کر دیکھو گے؟ کیا رچرڈ فوریسٹر، رابرٹ کے نام کی پکار سن کر پلٹ کر دیکھے گا؟“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ رچرڈ نے کہا۔

”میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ یہی تو زندگی کی خوبصورتی اور دلچسپی ہے۔“

☆☆☆

موسم گرما تقریباً گزر چکا تھا۔ خزاں کا پہلا سرد لمس قصبے کو چھو رہا تھا۔ ہر درخت کو جیسے بخار چڑھ رہا تھا۔ ہر درخت کا رنگ جھلس رہا تھا۔ پہاڑیاں چمکنے لگی تھیں اور گنے کے کھیتوں نے جنگل کے شیروں کی رنگت اپنالی تھی۔

اوائل ستمبر کی سہ پہر رچرڈ فوریسٹر مس سائمن سے ملنے پہنچا تو وہ چائے کی میز سجائے بیٹھی بڑی احتیاط سے کچھ لکھ رہی تھیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بولیں۔ ”میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔“

”تو لیجیے، میں خود آگیا۔ میں نے آپ کو اس زحمت سے بچالیا۔“ رچرڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں...... یہ تو بہت خاص خط ہے۔ ضرور لکھا جائے گا۔ ذرا دیکھو تو۔“ انہوں نے اسے خوبصورت نیلے رنگ کا لفافہ دکھایا۔ ”اس لفافے کو خوب پہچان لو۔ جب یہ تم تک پہنچے گا تو میں مرچکی ہوں گی۔“

”یہ کیسی باتیں کررہی ہیں آپ؟“

”بیٹھ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔“

وہ بیٹھ گیا۔

”مائی ڈیئر رچرڈ۔“ مس سائمن نے کہا۔ ”چند روز میں، میں مرجاؤں گی۔ نہیں......“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”تم کچھ بھی نہ کہو۔ میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ آدمی جب طویل زندگی گزارتا ہے تو اسے موت کا خوف نہیں رہتا۔ مجھے جھینگے کبھی پسند نہیں رہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے کبھی جھینگا کھایا ہی نہیں تھا۔ اپنی 80 ویں سالگرہ پر میں نے جھینگا کھایا۔ جھینگا مجھے اب بھی زیادہ پسند نہیں۔ لیکن اب میں اس کے ذائقے سے تو نا آشنا نہیں۔ لہٰذا مجھے اس کا خوف بھی نہیں۔ تو میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے موت بھی اسی طرح ہے۔ مجھے اس کا ڈر نہیں۔ میں اس سے نمٹ سکتی ہوں۔ خیر...... اسے چھوڑو۔ اہم بات یہ ہے کہ موت کے بعد میں تم سے نہیں مل سکوں گی۔ میں نے ہدایت کردی ہے۔ میری موت کے بعد رسومات نہیں ہوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایک مرنے والی عورت کو اتنی پرائیویسی تو ملنی چاہیے، جتنی رات سونے کے لیے لیٹنے والی ایک عورت کو ملتی ہے۔"

رچرڈ گنگ سا بیٹھا تھا۔ بالآخر اس کے لب ہلے۔ "موت کے متعلق تو کوئی بھی پیش گوئی نہیں کرسکتا۔"

"میں پچاس سال سے اپنے گھر کے ہال میں لگے بڑے دیواری کلاک کو دیکھتی رہی ہوں۔ جب میں اس میں چابی بھرتی ہوں تو یہ بھی بتاسکتی ہوں کہ یہ کس وقت بند ہوجائے گا۔ میں بھی اس کلاک کی طرح ہوں۔ میں اپنی مشینری کو سست پڑتا محسوس کررہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اب مشینری رکنے والی ہے۔ اوہ رچرڈ...... پلیز، یوں اداس نہ ہو۔ خدا کے لیے، تم اداس ہو کے مجھے بھی اداس کردوگے۔"

"میں کیا کروں۔ اس اداسی پر میرا اختیار نہیں۔" رچرڈ نے جواب دیا۔

"دیکھو...... ہم نے بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ ہے نا؟ ہم نے ہر روز باتیں کی ہیں۔ ہمارا ہر دن خاص دن تھا۔" مس سائمن نے کہا اور اپنے ہاتھ میں موجود نیلے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "میں ہمیشہ سے جانتی ہوں کہ محبت کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے۔ اگرچہ جسم کبھی کبھی یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ جسم تو اپنے لیے زندہ رہتا ہے۔ اسے نیند اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم شبینہ ہوتا ہے۔ لیکن ذہن تو دن کی پیداوار ہے۔ سورج سے روشنی لیتا ہے۔ وہ تو زندگی کے ہزاروں گھنٹے جاگ کر گزارتا ہے۔

"تو کیا تم اس فانی، گھلنے والے قابلِ رحم جسم کو جو رات ہے، عمر بھر کے بیدار اور روشن ذہن کے مقابلے میں رکھ سکتے ہو۔ اب میں کیا کہوں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ تمہارا ذہن...... میرے ذہن سے مل گیا تھا۔ تو ہم نے ایک ساتھ جو سہ پہریں گزاریں، ان جیسا خوبصورت وقت مجھے یاد ہی نہیں۔ اور ابھی تو بہت سی باتیں ہیں جو کرنا تھیں مگر ہم انہیں آنے والے وقت کے لیے بچا کر رکھیں گے۔"

"مگر ایسا لگتا ہے کہ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔" رچرڈ نے آزردگی سے کہا۔

"نہیں۔ لیکن شاید ہم پھر ملیں...... کسی اور وقت، کسی اور زمانے میں۔ وقت بہت عجیب چیز ہے اور زندگی وقت سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ پہیے گھومتے رہتے ہیں۔ کبھی دندانے مس کرجاتے ہیں۔ نتیجتاً زندگی سے زندگی کبھی قبل از وقت ملتی ہے اور کبھی بعد از وقت۔ یہ طے ہے کہ میں نے بہت طویل زندگی گزاری ہے۔ اور تم یا تو بہت جلدی پیدا ہوئے...... یا بہت دیر میں۔ وقت کے توازن میں بہت زیادہ گڑبڑ تھی، اہم گڑبڑ اور شاید مجھے بے وقوف لڑکی ہونے کی سزا ملی ہے اور شاید اگلے عہد میں بھی یہی مسئلہ ہوگا۔ مگر اس دوران، اس عہد سے پہلے تم کسی پیاری سی لڑکی سے شادی کرلینا اور خوش رہنا۔ لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو......"

"آپ کہہ کر تو دیکھیں۔"

"وعدہ کرو کہ تم بہت زیادہ نہیں جیو گے۔ اگر موزوں سمجھو تو پچاس سال کی عمر سے پہلے ہی مرجانا۔ میں یہ مشورہ اس لیے دے رہی ہوں کہ مجھے نہیں معلوم، للیا سائمن کب پیدا ہوگی۔ اور اگر تم نوے سال تک جیے اور کسی دن کسی اسٹریٹ پر ٹہلتے ہوئے میں تمہیں کھڑی نظر آئی...... اکیس سالہ، تو یہ بہت خوف ناک بات ہوگی۔ توازنِ وقت پھر بگڑ جائے گا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ اب ہمیں پچھلی، گزری ہوئی سہ پہروں جیسی اور سہ پہریں مل سکیں گی۔ خواہ وہ کتنی ہی خوش گوار رہی ہوں۔ ہزاروں گیلن چائے اور لاکھوں بسکٹ بھی ایک دوستی کے لیے ناکافی ہوتے ہیں۔ تو تم پر اگلے بیس برس کے اندر اندر نمونیے کا اٹیک ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں نہیں جانتی کہ وقت کے اس طرف انسان کو کتنا عرصہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا پتا، وہ تمہیں فوراً ہی بھیج دیں۔ لیکن رچرڈ میں اپنے طور پر پوری پوری کوشش کروں گی اور اگر ہم توازن قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو جانتے ہو، کیا ہوگا؟"

"آپ بتائیے۔"

"1989ء یا 1990ء کی ایک سہ پہر ایک نوجوان ٹہلتا ہوا ایک آئس کریم پارلر میں آئے گا اور لائم ونیلا آئس کریم کا آرڈر دے گا۔ تقریباً اس کی ہم عمر ایک لڑکی وہاں بیٹھی ہوگی۔ اس آئس کریم کا نام سن کر اسے کچھ ہونے لگے گا۔ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا، میں نہیں جانتی۔ اس لڑکی کو بھی نہیں معلوم ہوگا کہ اسے کیا ہورہا ہے۔ نوجوان کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ بس اس آئس کریم کا نام ان دونوں کے لیے اچھا ثابت ہوگا۔ وہ مل بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔ بعد میں...... ایک دوسرے کے نام سے واقف ہونے کے بعد وہ آئس کریم پارلر سے اکٹھا نکلیں گے۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ "یہ سب کچھ تمہیں احمقانہ لگے گا۔ ایک بوڑھی عورت کو طویل وقت کے پھیلے ہوئے بے کار سامان کے پیکٹ بنانے پر معاف کردینا۔ تمہیں اس طرح چھوڑ کر جانا میری زیادتی ہے۔ لیکن اس پر میرا کچھ اختیار نہیں۔ چلو...... اب کوئی اور بات کرو۔ دنیا میں کوئی ایسی جگہ بچی ہے، جہاں ہم نہ گھومے ہوں؟ اسٹاک ہام گئے ہیں ہم؟"

"جی ہاں۔ اسٹاک ہام اچھا شہر ہے۔"

"گلاسگو؟ اچھا ہاں...... ہم جاچکے ہیں۔ تو پھر آج کہاں چلیں؟"

"کیوں نہ گرین ٹاؤن، الی نوائس چلیں۔" رچرڈ نے کہا۔ "یہاں...... ہم اپنے شہر میں ایک ساتھ نہیں گھومے ہیں۔"

مس سائمن سنبھل کے بیٹھ گئیں۔ "میں تمہیں بتاتی ہوں کہ بہت پہلے...... جب میں انیس سال کی تھی تو یہ شہر کیسا تھا......"

وہ موسم سرما کی رات تھی۔ وہ ایک منجمد تالاب پر اسکیٹنگ کررہی تھی۔ اس کے قدموں تلے اس کا عکس پھسل رہا تھا، اس سے سرگوشیاں کررہا تھا۔ پھر وہ موسم گرما کی رات تھی۔ ہوا میں اس کے رخساروں کی، اس کے دل کی تمازت تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ہر طرف جگنو اڑتے پھر رہے تھے۔

اور وہ اکتوبر کی پتوں سے سرسراتی رات تھی۔ وہ کچن میں کھڑی ہنس رہی تھی اور اب وہ دریا کے کنارے دلدلی علاقے میں دوڑ رہی تھی۔ اب وہ موسم بہار کی ایک رات میں تالاب میں پیراکی کررہی تھی اور یہ چار جولائی تھی۔ امریکا کا یوم آزادی، پٹاخے چھوڑے جارہے تھے۔ ہوائیاں آسمان کو چھو کر آرہی تھیں۔ ہر پورچ رشتے داروں سے بھرا تھا۔ پارک میں بینڈ بج رہا تھا اور وہ تھرک رہی تھی...... گارہی تھی۔

"کیا تم یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہو؟" مس سائمن نے پوچھا۔ "تم مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھ سکتے ہو؟"

"جی ہاں" رچرڈ نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ "ہاں...... میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں۔"

"اور پھر...... مس سائمن بولیں۔ "اور پھر......"

ان کی آواز بہتی رہی...... بہاتی رہی۔ سہ پہر کے رنگ پھیکے پڑگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جھٹ پٹا اتر آیا۔ لیکن وہ آواز بہتی رہی۔ باغ کے اس طرف سڑک سے گزرنے والوں کو وہ بہت دور سے کسی پروانے کے پروں کی دھیمی دھیمی آواز لگی ہوگی...... بہت دھیمی......

☆☆☆

دو دن بعد سات ستمبر کو رچرڈ فوریسٹر اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اسے وہ خط موصول ہوا۔ اس نے نیلے لفافے کو پہچان لیا لیکن کھولا نہیں۔ وہ بس اٹھا۔ اس نے خط کو اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور دفتر سے نکل آیا۔

"کیا بات ہے، آج جلدی لنچ کررہے ہو؟" کسی نے پوچھا۔

اس نے وہ آواز سنی تک نہیں۔ باہر نکل کر وہ آدھے گھنٹے تک بے مقصد ادھر ادھر پھرتا رہا۔ خط اس کی جیب میں تھا۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ ستمبر کی اس سہ پہر موسم گرما نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔ اچانک رچرڈ فوریسٹر کے قدم آئس کریم پارلر کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ پارلر میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے خط اپنے سامنے رکھ لیا۔

اس نے چھتوں پر اور فٹ پاتھ پر مچلتی دھوپ کو دیکھا۔ اس نے دیواری کیلنڈر کو دیکھا...... سات ستمبر 1954ء۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور اپنے دل کی دھڑکنیں سنیں جو مدھم ہوگئی تھیں۔ گھڑی کی سوئیاں بھی سست رفتاری سے حرکت کررہی تھیں۔ کیلنڈر میں بھی جیسے وہ تاریخ ہمیشہ کے لیے جم کر رہ گئی تھی۔ سورج غروب ہوئے بغیر چھپ گیا تھا۔

پنکھے سے نکلنے والی ہوا اس کے بالوں کو چھو رہی تھی۔ کھلے دروازے کے پاس سے کچھ عورتیں ہنستے ہوئے گزریں اور اس کی نظروں سے دور نکل گئیں۔ لیکن اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں کہیں دور جمی ہوئی تھیں۔

اس نے لفافہ کھول کر خط نکالا اور پڑھنے لگا۔

اس نے گھومنے والے اسٹول کو پیروں کے دباؤ سے گھمایا اور ایک میز پر اس کی نظر جم گئی۔ اس نے پیروں کے دباؤ سے اسٹول کو روک دیا۔ اس میز پر کوئی بیٹھا نہیں تھا۔ وہ جگہ خالی تھی۔ وہ خاموشی سے وہ الفاظ دہراتا رہا، ان لفظوں کو اپنی نوک زبان پر، اپنے ہونٹوں پر محسوس کرتا رہا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اب وہ بلند آواز سے دہرا رہا ہے...... "ایک ڈش لائم ونیلا آئس کریم...... ایک ڈش لائم ونیلا آئس کریم......" وہ تو بس ان لفظوں کو ہمیشہ کے لیے یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

ویٹر نے سمجھا کہ اس نے آرڈر دیا ہے لیکن جب وہ لائم ونیلا آئس کریم کی ڈش لے کر آیا تو رچرڈ فوریسٹر کے دل کی دھڑکنیں تھم چکی تھیں!

WWW.PAKSOCIETY.COM

محفلِ شعر و سخن

* احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف

جس کو بھی دیکھا پیار میں روتے ہوئے دیکھا
یہ محبت تو مجھے کسی فقیر کی بددعا لگتی ہے

* مہرین ناز......حیدرآباد

اسے کہنا کہ لوٹ آئے سلگتی شام سے پہلے
کسی کی خشک آنکھوں میں صدائیں رقص کرتی ہیں
خدا جانے کیسی کشش ہے اس کی یادوں میں
میں اس کا ذکر چھیڑوں تو ہوائیں رقص کرتی ہیں

* مدحت......کراچی

سر پہ سورج کی سواری مجھے منظور نہیں
اپنا قد دھوپ میں چھوٹا نظر آتا ہے مجھے

* ناصر علی صدیقی......رحیم یار خان

یہ پھول یہ کلیاں یہ صبا یہ تارے
سب نظر آتے ہیں خدوخال تمہارے

* محمد بشارت......کنگر دودرہ

ہائے یہ بیگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

* گل ناز رئیس......گلستان جوہر، کراچی

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحب سرور نہیں

* محمد زریان سلطان......اردو بازار، کراچی

کہا ہر راستہ بخشا ہے ناہموار کیوں مجھ کو
جواب آیا تجھے ہر راستہ ہموار کرنا ہے
کہا کیا تیغ اٹھائی ہے غنیموں نے غنیموں پر
جواب آیا کہ یاروں نے بھی چھپ کر وار کرنا ہے

* رزاق شاہد کوہلہ......ڈیرہ اسمٰعیل خان

دیکھو سورج ڈھلنے لگا ہے
سایا قد سے نکلنے لگا ہے
میں بھی پیار سے آ گیا عاجز
وہ بھی آنکھ بدلنے لگا ہے

* بخت علی خٹک......خالق آباد

پھیلے گی تیرے ہاتھ کی خوشبو بھی اس کے ساتھ
پاگل ہوا کے دوش پر لکھا نہ کر مجھے

* اظہر حسین پچار......ہزاری جتوئی

پُر کیف مناظر تو بہت سے ہیں جہان میں
لیکن تیرے دیدار کا منظر نہیں ملتا

* توصیف احمد......پٹھان کالونی

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

* سلطان احمد قائم خانی......ٹنڈو جان محمد

سب جو ڈھونڈو گے تو عمر بیت جائے گی
کہا تا یاد آتے ہو تو بس آتے ہو

* محمد عقیل چٹھہ......حافظ آباد

مخلص ہوں میں دشمن پر بھی کرتا ہوں بھروسا
تا عمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

* داؤد اشفاق......اوکاڑہ

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مانند
بچھڑ کے اس نے طبیعت اداس کر دی ہے

* اشفاق شاہین......اوکاڑہ

زہر بیچنے والے آ بسے ہیں شہروں میں
سانپ کی طرح اب تو دوستی بھی ڈستی ہے

* انیلا رشید سیال......خیر پور، میرس

کیوں اتنی تصدیق کرتے ہو
ہر حوالے سے ہم تمہارے ہیں

* محمد اشفاق سیال......شہداد کوٹ سٹی

زندگی ایک امانت ہے مگر کچھ لوگ
یہ بوجھ بھی تھک ہار کے رکھ دیتے ہیں

* حافظ شاہد عمران جدھڑ......سینٹرل جیل گوجرانوالہ

اک درد مسلسل مجھے سونے نہیں دیتا
دل صبر کا عادی ہے مجھے رونے نہیں دیتا
وہ یہ راز تو جان گیا کہ میں اس کا ہوں
وہ کس کا ہے یہ احساس مجھے ہونے نہیں دیتا

* سید محی الدین اشفاق......لیہ

تمام عمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ ایک شب جو تیری یاد میں گزاری ہے
مجھے یہ ناز کہ حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ فخر کہ تصویر تو ہماری ہے

* سلیم شہزاد رائے......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی
کچھ لوگ شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

* عنصر محمود کرڑ......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

دل کو تیری آہٹ کی آس رہتی ہے
نگاہوں کو تیری صورت کی پیاس رہتی ہے
تیرے بغیر کسی چیز کی کمی تو نہیں لیکن
تیرے بغیر طبیعت بڑی اداس رہتی ہے

* ثمینہ حبیب......کوئٹہ

نظر رکھ اس کی رحمت پر نہ گھبرا ڈوبنے والے
اسی دریا میں طوفاں ہے اسی میں اس کی رحمت ہے

* ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی

ٹوٹے ہوئے پتوں کو حقارت سے نہ دیکھو
ایک روز خلاؤں میں بکھر جاؤ گے تم بھی

* ریاض بٹ......حسن ابدال

اب وہی لوگ ہیں شامل میرے نقادوں میں
جو میرے فن کی بہت داد دیا کرتے تھے

* ایچ اے لطیف، توقیر محمود......فیصل آباد

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

* حسیب احمد چنائے......الگڑی کرک

زندگی اتنی مختصر کیوں ہے
مختصر ہے تو دربدر کیوں ہے
جو رکھتا تھا پل پل کی خبر ہماری
آج ہم سے اتنا بے خبر کیوں ہے

* حسنین عباس، کمیل عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں

یہ سرد سرد ہوائیں یہ بادلوں کے ہجوم
تصورات کی لہروں پہ بہہ رہا ہوں میں
تمہارے سر کی قسم شاعری نہیں کرتا
مجھے کچھ اپنے سے کہنا ہے کہہ رہا ہوں میں

* رضوان تنولی......اورنگی ٹاؤن، کراچی

جدائی تیری کتنی عجیب تھی وصی
نہ سفر کے رہے نہ ہم سفر کے رہے
ٹکڑے ہوئے جسم کے اتنے کہ
نہ کفن کے رہے نہ دفن کے رہے

* وحید عباسی......بہاولپور

اک عمر سے ہم اس کی تمنا میں ہیں بے خواب
وہ چاند جو آنگن میں اترتا بھی نہیں ہے

* مسز بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں

وہ گھاٹیوں سے اٹھے پربتوں کے دل کے بخار
یہ بادلوں نے مسرت کے اشک برسائے
ہر اک نظارے پر طاری ہے خود فراموشی
خدا کرے کہ میرے دل کو بھی قرار آئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

❊ منیر احمد......ڈنگہ شہر
درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

❊ ساجدہ راجا......سرگودھا
عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

❊ بابر عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

❊ ملک افضال نادر......جنڈالوالہ کھاریاں
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

❊ سلیم کامریڈ......کھاٹاں
چھری کی دھار سے کٹتی نہیں چراغ کی لو
بدن کی موت سے کردار مر نہیں سکتا

❊ احمد حیات، نوید حسین ساگر......ساہیوال
تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستورِ الفت ہے کرے کوئی بھرے کوئی

❊ عائشہ احمد چنائے......الگڑی کرک
گزرے کل سا لگتا ہے جب آنے والا کل
ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل

❊ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

❊ سید توقیر حسین بخاری ایڈووکیٹ......ملتان
حاصل کُن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

❊ قیصر اقبال کچھ......ضلع بھکر
سر کو اٹھا کر آزادی سے جینے والوں میں
کیا میرے اجداد نہیں تھے آزادی سے پہلے

❊ حسنین ہاشمی......سینٹرل جیل گوجرانوالہ
معلوم ہوتا ہے بھول گئے ہو شاید
یا پھر کمال کا صبر رکھتے ہو

❊ عاصم حفیظ لوہانچ......لیہ
اب خواب میں بھی بس وہی چہرہ دکھائی دے
اس کا خیال ذہن کو بینائی دے گیا

❊ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
یہ میرے شہر پہ آسیب کیسا چھایا ہے
مکان شہر کے لگتے ہیں مقبروں کی طرح

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
میں مانتا ہوں ہے عقل سب سے بڑی حقیقت
خرد سے آگے ہمیشہ پھر بھی جنوں ہے کیسے

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
گل نہ تھے جس میں وہ گلشن بھی تھا جنگل کی طرح
گھر وہ قبرستان تھا جس میں کوئی بچہ نہ تھا

❊ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
روش روش یہ خزاں کے نقیب ہیں یارو
چمن بچاؤ غمِ آشیاں کا وقت نہیں

❊ منشی عاشق حسین......پنجاب یونیورسٹی، لاہور
غوغائے رقیباں میں اصغر یہ کارگزاری ہے اپنی
جب سنگ زنی تھم جاتی ہے ہم بیٹھ کے پتھر گنتے ہیں

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
محبت سے زیر کر مجھے میرے ہمدم
انا کی جنگ میں تو میں ہی فاتح ٹھہروں گا

❊ جبران احمد......گلشن اقبال، کراچی
میرا ہو کے بھی تو پاس نہیں میرے
مجبور ہوگیا ہوں تجھے "حسرت" کہنے پر

❊ فرحان شیخ......پاک کالونی، کراچی
پہلے ہم اچھے تھے اب کیسے برے ہوگئے
بیان تو مت بدلو، اپنے بدل جانے پر

کوپن برائے شمارہ جولائی 2013

مُحفلِ شِعروسُخن

نام: --

پتا: --

جیت کی ہار

مریم کے خان

دولت کا حصول مقصدِ حیات بنالینا... یا تو بے ضمیر لوگوں کا شوق ہوتا ہے یا پھر انتہائی مجبور و بے کس انسانوں کا روگ... اس کا شمار بھی دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا تھا... اس کی زندگی کے تقاضے کچھ اور تھے۔ مگر یہ روگ اسے ایک ایسے گرداب میں پھنسا گیا جہاں ہر جانب ایک خونیں کھیل جاری تھا۔ کسی کے مزاج کی تسکین اور کسی کی جان کی بازی... عجب تماشا تھا لیکن جب وہ اس جنگ کے بعد فتح کے نشے میں چور پلٹی تو تمام رستوں کو ویران پایا... پھر تنہائیوں نے کچھ اس طرح جشن منایا کہ ہر آنکھ اشکبار ہوگئی۔

رشتوں کی ڈور میں بندھے ایک لرزہ

خیز واقعے کی منظرکشی

ایلس اسمتھ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی۔ مُتا ہوا چہرہ، آنکھوں کے گرد کسی قدر حلقے تھے۔ وہ تقریباً بتیس برس کی چھریرے جسم کی عورت تھی۔ سر کے بال بھی روکھے ہو رہے تھے۔ آج شام اسے کہیں جانا تھا۔ وہ اپنا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے کون سا لباس پہننا ہوگا؟ اور کیسا میک اپ مناسب ہوگا۔ وہ میک اپ کم کرتی تھی۔ کیونکہ وہ جہاں ملازمت کرتی تھی وہاں لباس اور حلیے سے زیادہ کام دیکھا جاتا تھا۔ وہ کھلونے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بنانے والی ایک فیکٹری کے پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھی۔ تنخواہ بس اتنی تھی کہ اس کا اور اس کے بھائی کوون اسمتھ کا گزارا ہو جاتا تھا۔ کوون اس سے پورے پندرہ سال چھوٹا تھا۔ دو مہینے قبل اس کی سترھویں سالگرہ تھی۔ اس سالگرہ پر ایلس نے اسے ایک اپر گفٹ کیا تھا۔ یہ اپر کوون کو اتنا پسند آیا تھا کہ وہ ہمہ وقت اسے پہن کر گھومتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس لیے وہ اپنی پسندیدہ چیزیں زیادہ سے زیادہ استعمال کر لینا چاہتا تھا۔

ایک سال پہلے اسے جگر کا کینسر تشخیص ہوا تھا اور اس کا واحد علاج جگر کی تبدیلی تھی مگر اس کا علاج اتنا مہنگا تھا کہ ایلس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ایلس کا ایک ہی بھائی تھا اور وہ اسے مرتا نہیں دیکھ سکتی تھی مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ علاج کے لیے سات لاکھ پاؤنڈز کی ضرورت تھی اور وہ کسی صورت اتنی بڑی رقم جمع نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ لوگوں سے اپیل کرے مگر کوون نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ وہ...... خوددار تھا۔ ایلس رو دی تھی۔ ”میں تمہیں اپنے سامنے مرتے نہیں دیکھ سکتی۔“

”اگر میری موت آ گئی ہو گی تو تم اسے نہیں روک سکو گی۔“ کوون نے کہا۔ ”اگر میں کینسر سے نہیں مروں گا تو کسی حادثے میں مر سکتا ہوں۔ کوئی مجھے قتل کر سکتا ہے۔“

ایلس اس سے متفق نہیں تھی، وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اسے کہیں سے ڈھیروں دولت مل جائے اور وہ کوون کا علاج کرا سکے مگر وہ جانتی تھی ایسا ممکن نہیں ہے۔ اسے کہیں سے بہت ساری دولت ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ خیال دو دن پہلے تک برقرار رہا تھا۔ ملازمت پر جاتے ہوئے اس نے ٹیوب ٹرین میں ایک استعمال شدہ اخبار اٹھا لیا۔ وہ اخبار نہیں پڑھتی تھی مگر اس وقت ایسے ہی دیکھنے لگی اور پھر اس کی نظر ایک اشتہار پر گئی۔ ”کیا آپ ایک گیم میں حصہ لے کر اتنی دولت کمانا چاہتے ہیں جتنی کہ آپ سوچتے ہیں۔“

اشتہار پر صرف ایک پتا دیا ہوا تھا۔ پکاڈلی کے قریب کی جگہ تھی اور یہ جگہ ایلس کی فیکٹری سے خاصے فاصلے پر تھی اس لیے ایلس نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ایسے اشتہار آئے دن اخبارات اور انٹرنیٹ پر آتے رہتے تھے اور اکثر فراڈ ہوتے تھے۔ لوگوں سے رقم بٹور کر ان کو کوئی ایسا پزل یا گیم تھما دیا جاتا جسے حل کرنا یا درست طریقے سے کھیلنا ممکن ہی نہیں ہوتا تھا۔ شام کو وہ تھکی ہاری گھر جا رہی تھی۔ ایلس کا یہ چھوٹا سا آبائی گھر لندن سے جنوبی نواحی علاقے میں تھا۔ وہ گھر پہنچی تو کوون اپنے آئی فون پر کسی سے چیٹ میں مصروف تھا۔ ایلس نے اس سے دوا اور کھانے کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے دوا لے لی تھی مگر مجھے بھوک نہیں ہے۔“

کوون بہ ظاہر صحت مند تھا صرف اس کے عنابی ہونٹ اور آنکھوں کا پیلا ہوتا رنگ بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ فٹ بال کھیلتا تھا لیکن کینسر کے انکشاف کے بعد اس نے فٹ بال کھیلنا چھوڑ دی تھی۔ وہ گھر سے بھی کم باہر جاتا تھا۔ ایلس نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”کھانا ضروری ہے ورنہ دوا اثر نہیں کرے گی۔“

”ایلس ...... تم بیکار کوشش کر رہی ہو۔“ عقب سے کوون نے کہا۔ ”میں بچ نہیں سکوں گا اپنی رقم مجھ پر ضائع مت کرو۔“

ایلس نے جواب نہیں دیا لیکن اس کا دل رونے لگا تھا۔ بچپن سے اس نے اور کوون نے گھر میں سکون اور اچھے حالات نہیں دیکھے تھے اور اس کی ذمے داری ایلس اور کوون کی ماں جینی پر آتی تھی۔ ایلس نے ہوش سنبھالا تو شاید ہی کوئی لمحہ ایسا تھا جب اس نے ماں کو نشے میں دھت نہ دیکھا ہو۔ چھوٹی سی عمر سے وہ شرابی ماں کے ہاتھوں بے دردی سے پٹنے لگی تھی۔ جب اسے کسی بات پر غصہ آتا تو وہ اسے ایلس پر نکالتی تھی۔ اس کا شوہر شیر اسمتھ معمولی سی ملازمت کرتا تھا اور وہ جو کماتا اس کا بڑا حصہ جینی شراب میں اڑا دیتی تھی۔ اگر شیر اسے رقم دینے سے انکار کرتا تو وہ ایلس کو مارتی تھی اور اسے بچانے کے لیے شیر جینی کا مطالبہ پورا کر دیتا تھا۔ ایلس پندرہ سال کی تھی جب کوون پیدا ہوا۔ جینی نے اس سے چھٹکارے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کوون پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بچپن سے ایلس دیکھتی آئی تھی۔ کوون پانچ برس کا ہوا تو جینی اور شیر ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جینی کا جگر جواب دے گیا تھا اور شیر کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ تب سے ایلس کوون کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

اسے خیال آیا کہ وہ کوون کو ایسے ہی مر جانے دے گی، کیا وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی؟ باتھ لیتے ہوئے وہ اسی موضوع پر سوچ رہی تھی کہ اچانک اسے اس اشتہار کا خیال آیا۔ دوسرے اشتہاروں سے ذرا الگ لگا تھا۔ اس میں ڈھیر سارے فون نمبر اور ای میل نہیں تھے۔ نہ آن لائن رابطے کا تھا۔ صرف ایک پتا تھا اور وہ ایلس کے ذہن میں تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کوشش تو کرے ممکن ہے کوئی امکان ہو کہ وہ اتنی رقم حاصل کر لے کہ کوون کا علاج کرا سکے۔ اگلے دن تک وہ ارادہ بدلتی رہی۔ کبھی وہاں جانے کا سوچتی اور کبھی

ملتوی کر دیتی۔ مگر شام کو جب فیکٹری سے نکلی تو بے اختیار پکاڈلی جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اشتہار والا دفتر ایک چھوٹی سی دکان کے اوپری حصے میں تھا۔ وہ گلاس ڈور کھول کر اندر آئی تو سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ اس کا چہرہ آنکھ سے نیچے ذرا رخسار کے اوپری حصے تک جلا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ایلس نے دیکھا وہاں وہیل چیئر پر ایک بوڑھی اور موٹی عورت بھی موجود تھی۔ ایلس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”ایلس اسمتھ۔“

”جونی کاریل۔“ ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

”میں اشتہار کے جواب میں آئی ہوں۔“

”مس اسمتھ آپ بیٹھیں، میں ذرا مسز رائن سے بات کر لوں۔“ جونی نے بوڑھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ایلس ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جونی مسز رائن سے آہستہ لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بھی اسی طرح جواب دے رہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ بعد جونی نے اسے وہیل چیئر سمیت دروازے تک چھوڑا اور پھر ایلس کے پاس آیا۔ ”مس اسمتھ میرے ساتھ آئیے۔“

وہ اسے سیڑھیوں سے اوپر لے گیا۔ یہ چھوٹا سا دفتر تھا۔ اس نے ایلس کو میز کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود عقب میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیچھے کھڑکی سے ڈوبتے سورج کی روشنی اس طرح آ رہی تھی کہ کمرا سنہری دھوپ سے جگمگا رہا تھا۔ ایلس کو دیکھنے میں ذرا دشواری پیش آ رہی تھی۔ جونی نے اس سے پہلا سوال کیا۔ ”مس اسمتھ کیا آپ اس گیم میں دلچسپی محسوس کرتی ہیں؟“

”ہاں ...... لیکن میں معلوم کرنا چاہتی ہوں اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کے لیے کوئی فیس ادا کرنی پڑے گی؟“

”کوئی فیس نہیں ہے۔“ جونی نے کہا۔ ”گیم ایک رات کا ہے اور صرف چند گھنٹوں میں ختم ہو جائے گا۔ آپ کی شرکت کی صورت میں آپ کو گھر سے پک اینڈ ڈراپ بھی دیا جائے گا۔ بعد میں بھی آپ سے فیس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔“

ایلس کو حیرت ہوئی کہ یہ کس قسم کا گیم تھا جس میں کوئی فیس نہیں تھی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ لوگ کوئی چکر چلا رہے تھے۔ جونی بہ غور اسے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”مس اسمتھ آپ بے فکر رہیں۔ گیم فیئر ہو گا اور اس میں کوئی دھاندلی نہیں ہو گی۔ ایک شخص فاتح ہو گا اور وہی ایک ملین پاؤنڈز کا حق دار ہو گا۔“

”ایک ملین پاؤنڈز۔“ ایلس کے منہ سے نکلا۔ ”سچ سچ ایک ملین پاؤنڈز؟“

”بالکل سچ سچ ایک ملین پاؤنڈز۔“ جونی لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

ایلس ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ”کیا مجھے کچھ سوالات کرنے کی اجازت ہے؟“

”بالکل ہے۔“ جواب ایلس کے عقب سے آیا تو وہ اچھل پڑی، اسے اندازہ نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی اور شخص بھی ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو لیدر صوفے کے آخری حصے میں ایک خوش پوش اور صورت سے اوپری طبقے کا نظر آنے والا شخص براجمان تھا۔ اس نے نفیس لینن کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی کلائی میں ہیروں سے مزین گھڑی تھی۔ نفاست سے تراشی مونچھیں اور سلیقے سے بنے ہوئے بال تھے۔ تاثرات سے وہ نرم خو لیکن مضبوط شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔ ایلس کو متوجہ پا کر وہ مسکرایا۔ ”سوری میں نے تمہیں ڈرا دیا۔“

”مسٹر ہارٹ۔“ جونی نے تعارف کرایا لیکن اس نے پورا نام نہیں لیا تھا۔ ”گیم کے مالک یہی ہیں۔“

ہارٹ نے سر ہلایا۔ ”مس اسمتھ تم کوئی بھی سوال کر سکتی ہو۔“

”گیم کی نوعیت کیا ہے؟“

”یہ مقابلے کا کھیل ہے۔“ ہارٹ نے شانے اچکائے۔ ”کوئی اصول نہیں ہے، ہاں جو میں کہوں وہ مقابلے میں حصہ لینے والوں کو کرنا ہو گا دوسری صورت میں وہ مقابلے سے باہر ہو جائیں گے۔“

”مسٹر ہارٹ اگر آپ ایسا کوئی کام کہہ دیں جو کرنا ممکن ہی نہ ہو؟“

”میں ایسا کوئی کام نہیں کہوں گا جو ایک انسان کے لیے جسمانی طور پر ناممکن ہو۔“ ہارٹ نے پختہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس معاملے میں بے فکر رہو۔“

”انعامی رقم صرف ایک امیدوار کو ملے گی؟“

”بالکل...... جو آخری مقابلہ جیتے گا اسے ہی ایک ملین پاؤنڈز کی رقم ملے گی۔“

ایلس آخری سوال کرتے ہوئے ہچکچائی۔ ”کیا کوئی اور شخص یہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟“

”تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔“ ہارٹ نے جونی کی طرف اشارہ کیا، ایلس نے پلٹ کر دیکھا تو سورج کی تیز روشنی میں اس کی پیشانی اور رخسار کا جلا ہوا حصہ نمایاں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایلس نے بالوں کو شیمپو کیا اور انہیں خشک کیا تو وہ کسی قدر بہتر صورت میں آگئے تھے۔ اس نے ایک فراک نما لباس منتخب کیا۔ اس میں بھاگ دوڑ یا جسمانی کام کرنے میں آسانی رہتی۔ پیروں میں اس نے سادہ پمپی شوز لیے تھے جن کی صرف ایک انچ کی ایڑی تھی۔ یہ بھی آسان جوتے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کھیل کس قسم کا ہوگا اور اسے کن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اس نے ہلکی سی لپ اسٹک لگائی اور مرجھائے رخساروں پر ہلکا سا غازہ لیپ کیا۔ تیار ہو کر اس نے آئینے میں دیکھا تو خلاف توقع وہ خود کو اچھی لگی تھی۔ کوون نے کمرے میں جھانکا۔ ”تم جا رہی ہو؟“

”ہاں۔“ ایلس نے بالوں میں آخری برش کیا۔

”یہ کون سا بوائے فرینڈ ہے جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم؟“

ایلس نے اس سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہے۔ ”حال ہی میں ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ اچھا آدمی ہے۔“

کوون اس کے لیے فکر مند تھا۔ ”تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟“

وہ مسکرائی۔ ”میں کوئی ٹین ایج لڑکی نہیں ہوں۔ تم فکر مت کرو میں اپنی دیکھ بھال کرنا جانتی ہوں۔“

ایلس کو بتایا گیا تھا کہ ٹھیک چھ بجے گاڑی اس کے گھر پر ہوگی۔ کوون حسب معمول اپر میں تھا اور اس کا رنگ معمول سے زیادہ زرد دکھائی دے رہا تھا۔ ایلس نے اسے پیار کیا اور سرگوشی میں بولی۔ ”فکر مت کرو تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے پھر کوئی فکر نہیں ہوگی۔“

کوون کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک کہہ رہی ہو جلد کوئی فکر نہیں رہے گی۔“

ایلس مکان سے باہر آئی۔ سامنے چھوٹا سا باغ تھا۔ وہ اپنے باپ کی شکر گزار تھی جو ان کے لیے یہ مکان چھوڑ گیا تھا، ورنہ اس کے اور کوون کے لیے زندگی اور دشوار ہو جاتی۔ صرف کوون کی وجہ سے اس نے شادی نہیں کی تھی۔ زندگی کا سنہری دور اسی میں نکل گیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہو گئی۔ ٹھیک چھ بجے ایک شاہانہ رولز رائز اس کے سامنے رکی اور ایک بوڑھے اور تربیت یافتہ ڈرائیور نے اتر کر اس کے لیے عقبی دروازہ کھولا، اس نے ایلس سے کچھ پوچھا نہیں تھا اور اسے بٹھا کر وہ روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ شمال کی طرف سے تھا اور وہ لندن سے باہر جا رہے تھے کیونکہ ڈرائیور نے موٹر وے کا رخ کیا تھا۔ ایلس کا دل چاہا کہ وہ پوچھے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس سارے چکر میں اسے بہت کچھ عجیب اور مشکوک لگ رہا تھا، اس کے دل میں کئی طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ اسے خوف بھی تھا۔ مگر وہ کوون اور ایک ملین پاؤنڈز کی خاطر ہر چیز کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ سفر تقریباً دو گھنٹے جاری رہا اور پھر وہ سمندر پر بنا ایک چھوٹا سا پل عبور کر کے اس جزیرے میں داخل ہوئے جس پر صرف ایک ہی عمارت کھڑی تھی۔ کار اس کے سامنے رکی اور ڈرائیور نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔

اس کئی منزلہ پیلس نما عمارت کی پہلی منزل بھی زمین سے کوئی دس فٹ اونچی تھی۔ یہ بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ فرنچ ونڈوز سے کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی، باقی عمارت جیسے تاریکی میں تھی۔ البتہ پورچ اور باغ میں روشنیاں تھیں۔ ڈرائیور کے اشارے پر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی جہاں ایک چھوٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا شخص کھڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی فولادی مجسمے کو سوٹ پہنا دیا گیا ہو۔ وہ بہت احترام کے ساتھ اس کی رہنمائی کرتا ہوا اسے اندر لایا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے بالآخر وہ سرکنے والے لکڑی اور شیشوں کے دروازوں کے پیچھے ایک چھوٹے سے ہال میں داخل ہوئے جس کے وسط میں ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل لگی تھی۔ ایلس نے دیکھا وہاں مسٹر رائن اور ہارٹ سمیت چھ افراد اور میز پر موجود تھے۔ یہ دس افراد والی ڈائننگ ٹیبل تھی اور سامنے والی کرسی کے علاوہ صرف دائیں طرف کی دوسری کرسی خالی تھی۔ سرکنے والے دروازوں کے پاس دو ملازم نما شخص موجود تھے اور تیسرا گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔ ہارٹ نے سر کے اشارے سے ایلس کو خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ایلس کے بیٹھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”لیڈیز اینڈ جنٹل مین، آج کے گیم کے تمام شرکا آ چکے ہیں۔ پہلے ڈنر ہوگا اور پھر ہم گیم کا آغاز کریں گے لیکن پہلے تعارف کرا دیا جائے۔ مجھے سب جانتے ہیں، ہارٹ انگر مین اور یہ میرا بٹلر روز ہے۔“ اس نے گٹھے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ”روز گیم میں مددگار ہوگا۔“

ایلس چونک گئی تھی۔ اسے یاد آیا اس نے ہارٹ انگر مین کا نام سنا تھا اس کی شمالی انگلینڈ میں جاگیر تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ پراسرار سا آدمی ہے اور لوگوں سے کم ملتا ہے، زیادہ تر اپنے پیلس میں رہتا ہے جو کسی جزیرے پر بنا ہوا ہے یہ یقیناً وہی پیلس تھا۔ گٹھے ہوئے شخص کے بارے میں اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، وہ بٹلر تھا مگر اسے روز کہنا کسی گینڈے کو ہرن کہنے کے مترادف تھا۔ انگر مین واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ”سب اپنا تعارف کرائیں۔“

انگر مین کے دائیں طرف بیٹھے معمر شخص نے کہا۔ ”جم اسٹون...... سابق برٹش آرمی آفیسر۔“

اس کے سامنے بیٹھے خوش پوش جوان آدمی نے تعارف کرایا۔ ”گریگ مارش...... میں بینکر ہوں۔“

باقی چار افراد میں خوبرو سائمن نورڈ بزنس مین تھا۔ جولیانا جیسن میڈیکل کی طالبہ تھی۔ وہ خوب صورت اور مغرور نظر آنے والی لڑکی تھی۔ اس نے بہت نمایاں کرنے والا لباس پہنا ہوا تھا اور وہ ایلس کے بالکل سامنے تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے آتے ہی ایلس کو بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھا تھا۔ جولیانا کے ساتھ سیاہ فام روبیک ولیم تھا۔ اس کے بال جھاڑی کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ رنبیر شرما انڈین نژاد تھا مگر وہ انگلینڈ میں پیدا ہوا تھا، وہ اب تک اپنے باپ کی گروسری کی دکان پر کام کرتا تھا۔ تعارف کے بعد انگر مین کے اشارے پر ڈنر لایا گیا۔ سب کے لیے ایک سا ڈنر تھا۔ گوشت کا تلا ہوا بڑا سا پارچہ، اس کے ساتھ سلاد اور کچھ آلو کے قتلے تھے جن کو ہلکا سا تلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سرخ شراب کا جام تھا۔ سب نے ڈنر شروع کیا لیکن ایلس ہچکچا رہی تھی۔ ہارٹ نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر لی۔

”کوئی مسئلہ ہے مس اسمتھ، تم نے ڈنر شروع نہیں کیا؟“

”وہ...... میں گوشت نہیں کھاتی ہوں۔“ اس نے یوں شرمندگی سے کہا جیسے گوشت نہ کھانا کوئی بری بات ہو۔

”اوہ ویجی ٹیرین۔“ انگر مین نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”کیا شروع سے ہو؟“

”نہیں بس چند سال پہلے۔“

”یعنی تم گوشت کھا چکی ہو...... تو آج کھانے میں کیا حرج ہے؟“

”میں نہیں کھا سکتی، لیکن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”نہیں مسئلہ تو ہے۔ یہاں سب گیم میں شامل ہیں۔ تمہیں بھی گوشت کھانا چاہیے۔“

”نہیں......“

”روز......“ انگر مین نے کہا تو بٹلر آگے آیا اور اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو سب چونک گئے مگر اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ اس نے وہ گڈی انگر مین کے سامنے رکھ دی۔ انگر مین نے گڈی ذرا سی ایلس کی طرف سرکائی۔ ”مس اسمتھ یہ پانچ ہزار پاؤنڈز ہیں اگر تم نے گوشت کھایا تو یہ تمہارے ہوں گے۔“

یک لخت ایلس کا ارادہ کمزور پڑ گیا۔ اس کے لیے پانچ ہزار پاؤنڈز چھوٹی رقم نہیں تھی۔ وہ رقم کے لیے تو یہاں آئی تھی۔ انگر مین متوقع انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سب بھی ہاتھ روک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایلس نے چھری سے گوشت کا ٹکڑا کاٹا اور پھر اسے منہ میں رکھ لیا۔ انگر مین تالیاں بجانے لگا۔ ”زبردست...... زبردست...... تم لوگوں نے دیکھا، دولت کس طرح آدمی کی عادت کو بدل دیتی ہے۔ آج رات تم لوگ انسانی فطرت کے دولت سے متعلق اور پہلو بھی دیکھو گے۔“

اس لمحے ایلس کو احساس ہوا کہ وہ کسی خطرناک چکر میں پھنس چکی ہے اور اس سے گلو خلاصی آسان نہیں ہوگی۔ اس کے کھاتے ہی ماحول معمول پر آگیا۔ سوائے ایلس کے سب ہی ایزی ہو گئے تھے۔ اس کی تشویش بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس پانچ ہزار پاؤنڈز کی اچھی رقم آ چکی تھی مگر اسے لگ رہا تھا یہاں سے رقم لے کر جانا آسان نہیں ہوگا۔ جم اسٹون گوشت رغبت سے کھا رہا تھا مگر اس نے ابھی تک سرخ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ انگر مین نے اچانک پوچھا۔

”مسٹر اسٹون تم شراب نہیں لے رہے؟“

”میں نے شراب چھوڑ دی ہے، جگر کا مسئلہ ہو گیا تھا۔“

”کب سے نہیں پی؟“

”چار برس ہو گئے ہیں۔“

”آج پی کر دیکھو۔“

”میں چھوڑ چکا ہوں۔“

”روز......“ انگر مین نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، میں کہہ چکا ہوں کہ میں شراب چھوڑ چکا ہوں۔“ جم اسٹون نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

”روز......“ انگر مین نے پھر کہا تو روز نے ایک طرف رکھی ٹرے اٹھائی جو کپڑے سے ڈھکی تھی اور اسے انگر مین کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کپڑا ہٹایا تو سب چونک گئے ٹرے میں سلیقے سے تہ در تہ سو پاؤنڈز کے نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ انگر مین نے ایک گڈی اٹھا کر جم کے سامنے رکھی۔ مگر اس کے تاثرات میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ انگر مین نے دوسری، پھر تیسری گڈی اس کے سامنے رکھی آخر میں دو گڈیاں ایک ساتھ رکھیں۔

”پچاس ہزار پاؤنڈز، یہ آخری حد ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس بار جم کے تاثرات بدلے تھے اور اس نے سر ہلا کر سامنے رکھا سرخ شراب کا جام اٹھانا چاہا لیکن انگرمین نے اسے روک دیا۔ ”نہیں مسٹر اسٹون...... تم نے اپنی پسند کی رقم لی، اب میری پسند کی شراب پیو گے۔“

روز اسپینی شراب کی بوتل لایا جو نہایت تیز اور تلخ شراب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے پورا جام بھر کر جم اسٹون کے سامنے رکھ دیا۔ انگرمین نے انگلیوں سے اشارہ کیا۔ جم اسٹون اقرار کر چکا تھا اس لیے مجبوراً اس نے جام اٹھا لیا۔ چند گھونٹ لیتے ہی اس کا سر گھومنے لگا تھا، یہ شراب اس کی برداشت سے کہیں زیادہ تھی مگر پچاس ہزار پاؤنڈز بھی اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ تھے۔ انگرمین اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ ایلس سختی سے نیپکن تھامے جم اسٹون کو دیکھ رہی تھی۔ اس بار باقی سب بھی سنجیدہ تھے۔ مسز رائن نے کہا۔ ”یہ مر جائے گا۔“

انگرمین مسکرایا۔ ”انتخاب مسٹر اسٹون کا ہے۔“

بالآخر جم نے جام خالی کر دیا۔ مگر اتنی سی دیر میں اس کا چہرہ عنابی ہو گیا تھا اور اس کا سر میز سے جا لگا۔ انگرمین کھڑا ہو گیا۔ ”لیڈیز اینڈ جنٹل مین! ڈنر ختم ہوا اور کچھ دیر میں گیم کا آغاز ہوگا۔ آپ لوگوں کو کچھ دیر کے لیے اکیلے چھوڑا جاتا ہے۔“

انگرمین اپنے آدمیوں سمیت رخصت ہو گیا لیکن دروازے پر موجود دو افراد اب بھی باہر تھے، ان کے سائے شیشوں سے نظر آ رہے تھے۔ ایلس نے اٹھ کر جم اسٹون کو دیکھا۔ وہ نیم بے ہوش ہو رہا تھا۔ ”یہ پاگل پن ہے۔“

”تم اس پاگل پن میں اپنی مرضی سے شریک ہونے آئی ہو۔“ جولیانا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کس قسم کے حالات سے واسطہ پڑے گا۔ ابھی گیم شروع نہیں ہوا ہے اور ہم اس کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں دولت کی مدد سے وہ ہمیں اپنی مرضی سے استعمال کر رہا ہے۔“

ایلس کی اس بات نے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا مگر ایک ملین پاؤنڈز کی کشش ایسی تھی کہ ان میں سے کوئی اسے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کے لیے وہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔ جم اسٹون اور مسز رائن اپنا بڑھاپا سکون اور آزادی سے گزارنا چاہتے تھے دوسری صورت میں انہیں سرکاری اولڈ ہاؤس میں رہنا پڑتا۔ گریگ مارش ایک بینک لون کے معاملے میں مشکل میں پڑ گیا تھا اور اسے اس چکر سے نکلنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ سائمن نورڈ تباہی کے دہانے پر کھڑے اپنے بزنس کو پھر سے اٹھانا چاہتا تھا۔ جولیانا جیسر غیر سرکاری اسپتال میں مریضوں کی خدمت کے لیے نیورو سرجن بننا چاہتی تھی اور اس کے لیے بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ روبیک ولیم عام سا سیاہ فام نوجوان تھا وہ اچھی زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا کیونکہ اس کے پاس نہ تو تعلیم تھی اور نہ کوئی ہنر تھا۔ شرما چالیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے باپ کا محتاج تھا وہ اس محتاجی سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ جب کہ ایلس اپنے بھائی کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک ملین پاؤنڈز حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا لیکن وہ پھر بھی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے سرکے اور انگرمین اندر آیا اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔

”یہ میرا بیٹا اور وارث مارٹی ہے۔“

مارٹی باپ کے برعکس لمبا تڑنگا اور شکل سے اجڈ نظر آنے والا نوجوان تھا مگر سوٹ اس نے بھی قیمتی پہن رکھا تھا۔ ایلس کے برابر میں بیٹھے سائمن نے کہا۔ ”کیا یہ بھی کھیل میں شامل ہوگا؟“

”بہ طور کھلاڑی نہیں۔“ انگرمین نے کہا۔ ”لیکن کھیل کا کچھ حصہ مارٹی کی مرضی سے ہوگا۔“

”اگر ہم میں سے کوئی کھیل میں شامل ہونے سے انکار کرنا چاہے؟“ ایلس نے پوچھا۔

انگرمین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے، یہاں آنے کے بعد ہر فرد کھیل میں حصہ لینے کا پابند ہو گیا ہے۔“

مارٹی مخالف سمت سرے والی کرسی پر براجمان تھا اس نے ایلس کو گھورا اور باچھیں پھیلا کر کہا۔ ”کھیل ضرور ہوگا۔“

”لیڈیز اینڈ جنٹل مین۔“ انگرمین نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ”کھیل کا پہلا حصہ شروع ہونے والا ہے۔“

روز دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے انگرمین کے اشارے پر بلند آواز سے کہا۔ ”لے آؤ۔“

دونوں ملازم ایک ٹرالی دھکیلتے ہوئے لائے جس پر رکھی چیز سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان کے سامنے لا کر روز نے اس سے چادر کھینچی اس کے نیچے ایک بڑی مشین تھی اسے دیکھتے ہی ان کے چہرے سفید پڑ گئے تھے ان میں سے بیشتر پہچان گئے تھے۔ یہ کرنٹ والی مشین تھی۔ سر پر فکس کرنے والی چمڑے کی پٹی تھی جس پر لوہے کی ڈسک لگی تھیں۔ جم اسٹون جو کسی قدر ہوش میں آ گیا تھا، اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم پاگل ہو اس کرنٹ مارنے والے آلے کا کھیل سے کیا تعلق ہے۔“

”تعلق ہے مسٹر اسٹون اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔“

مگر جم اسٹون نے اپنے پچاس ہزار پاؤنڈز اپنے کوٹ میں رکھے اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ”جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا کھیل اب میں اس میں مزید حصہ نہیں لے سکتا۔“

روز نے سامنے آ کر راستہ روک لیا۔ ”واپس جاؤ مسٹر اسٹون یہاں سے کوئی کھیل ادھورا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“

”میں جاؤں گا۔“ جم غرایا۔ جواب میں روز نے جو کیا وہ جم کے ساتھ ان سب کے لیے بھی انتہائی غیر متوقع تھا۔ ایلس کا خیال تھا کہ روز اس بوڑھے کو زبردستی واپس کرسی پر دھکیل دے گا یا اس سے پچاس ہزار ڈالرز چھین لے گا مگر روز نے اچانک ہی کوٹ سے پستول نکالا اور جم کو شوٹ کر دیا۔ گولی اس کے دل میں لگی اور وہ بغیر آواز نکالے آنکھوں میں حیرت لیے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی موت فوری واقع ہوئی تھی۔ وہ سب بوکھلا کر اٹھے، ایلس اور مسز رائن کی چیخ نکل گئی تھی۔ صورت حال اچانک ہی خوفناک اور لرزہ خیز ہو گئی تھی۔ باقی دو ملازمین نے بھی پستول نکال لیے تھے۔ انگرمین نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ سب جان گئے ہیں کہ کھیل میں شرکت سے انکار کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ سب بیٹھ جائیں۔“

تین پستولوں کے سامنے وہ سب بے بس تھے۔ انہیں کرسیوں پر بیٹھنا پڑا۔ جب وہ سب بیٹھ گئے تو روز نے جھک کر جم اسٹون کی جیب سے رقم نکال کر واپس ٹرے میں رکھی اور اس کے اشارے پر ایک شخص جم کی لاش کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔ ایلس منہ ہاتھوں میں دبائے سسکیاں لے رہی تھی۔ انگرمین یوں مطمئن تھا جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔ اس نے کہا۔ ”اب ہم کھیل کا آغاز کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مسٹر ولیم۔“

روبیک اچھل پڑا۔ ”کیا مطلب؟“

جب روز نے اسے کرسی پر دبا کر دونوں ہاتھوں سے جکڑا اور دوسرے ملازم نے اسے سر پر چمڑے کی پٹی پہنا کر اسے پیچھے سے بند کیا تو مطلب واضح ہو گیا۔ ”تم مجھے کرنٹ لگاؤ گے؟“

”نہیں مسٹر ولیم۔“ انگرمین نے کہا۔ اس دوران میں دوسری چرمی پٹی مسز رائن کے سر پر پہنچائی جا رہی تھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن روز نے آسانی سے اسے جکڑ دیا۔ دونوں پٹیوں سے تاریں نکل کر مشین تک جا رہی تھیں۔ روز نے بٹن دبا کر مشین آن کی تو ان دونوں کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ آخر میں روز نے مسز رائن کے سامنے ایک بکس رکھا جس پر دو بٹن تھے۔ انگرمین نے کہا۔ ”اس میں نیلا بٹن دبانے پر تمہیں خود کرنٹ لگے گا اور سرخ بٹن دبانے پر مسٹر ولیم کو۔ اب تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف بیس سیکنڈ ہیں جیسے ہی یہ وقت پورا ہو تمہیں خود کرنٹ لگے گا۔“ انگرمین نے کہتے ہوئے ایک گھڑی سامنے رکھ دی۔ جس میں صرف سیکنڈ کی سوئی تھی جو تیزی سے چل رہی تھی۔ مسز رائن نے کانپتے ہاتھوں سے بکس اٹھایا۔

”نہیں۔“ روبیک کراہا مگر مسز رائن نے سرخ بٹن دبا دیا تھا۔ روبیک کو اتنا شدید جھٹکا لگا کہ اس کا جسم اکڑ گیا۔ کرنٹ زیادہ نہیں تھا مگر جب پانچ سیکنڈ بعد مشین نے خود بہ خود کرنٹ ختم کیا تو روبیک کے چہرے سے پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ باقی سب دہشت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ روز نے اس کے سر سے پٹی اتار دی، البتہ مسز رائن کے سر سے پٹی لگی رہی۔ مشین کھسکا کر جولیانا کے سر سے لگا دی۔ اب مسز رائن اسے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اس کے سامنے بکس رکھا گیا تھا اور انگرمین رول بتا رہا تھا کہ اس نے اٹھا کر سرخ بٹن دبا دیا۔ مسز رائن لرزنے لگی تھی۔ گریگ مارش نے آہستہ سے کہا۔

”یہ بے رحمی ہے وہ بوڑھی عورت ہے۔“

”تو تم اس کی جگہ لے لینا اب دوبارہ ایسا موقع آئے۔“ جولیانا سرد لہجے میں بولی۔ اس دوران میں مسز رائن کرنٹ کھا کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ روز اس کا چہرہ تھپک رہا تھا بالآخر وہ ہوش میں آ گئی تھی مگر اس شاک نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”مجھے جانے دو، میں گیم میں حصہ نہیں لینا چاہتی۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ انگرمین نے حتمی لہجے میں کہا۔ مسز رائن ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایلس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اب اس کی باری آنے والی تھی کیونکہ جولیانا نے مسز رائن پر رحم نہیں کیا تھا اس لیے اس کی باری آئی تو گریگ نے بلا تکلف بٹن دبا دیا مگر جب بٹن ایلس کے ہاتھ میں آیا تو کوشش کے باوجود اس سے سرخ بٹن نہیں دب سکا اور اس نے نیلا بٹن دبا دیا۔ کرنٹ کے جھٹکوں نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے یہ پانچ سیکنڈ پانچ گھنٹے بن کر گزرے تھے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو گریگ نے کہا۔

”تمہیں سرخ بٹن دبانا چاہیے تھا۔“

”بالکل، مسٹر مارش کو ویسے ہی ہمدردی کا بہت شوق

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔" جولیانا نے طنز کیا۔

"پلیز چپ رہو۔" سائمن نے گھبرا کر کہا کیونکہ اب اس کی باری تھی۔ بکس اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے مقررہ وقت تک کوئی بٹن نہیں دبایا تو روز نے مشین کا ایک بٹن دبایا تو خود سائمن کو جھٹکے لگنے لگے۔ ایلس نے منہ ہاتھوں سے دبا لیا۔ جھٹکوں کا دورانیہ دس سیکنڈ تھا اور ان کی شدت بھی زیادہ تھی۔ آخری جھٹکے کے ساتھ سائمن جھول گیا۔ مگر روز نے بے دردی سے تھپڑ مارے تو اسے ہوش آ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر شرما کی حالت خراب ہو گئی اور اس نے بکس ہاتھ میں آتے ہی سرخ بٹن دبا دیا تھا مگر خلاف توقع خود اسے جھٹکے لگنے لگے تھے۔ کرنٹ ختم ہونے کے بعد انگرمین نے سرد لہجے میں کہا۔

"گیم ماسٹر میں ہوں میں اس میں کوئی بھی تبدیلی کر سکتا ہوں اس لیے مجھ سے ہدایت لیے یا رول سے بغیر کسی حرکت کا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

شرما نے پٹی اتار پھینکی اور چلا کر بولا۔ "یہ کس قسم کا کھیل ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی آدمی تکلیف برداشت کر رہا ہے۔"

"یہ زیادہ مشکل کھیل نہیں ہے۔ تم سب ایک ملین پاؤنڈز کے لیے یہاں آئے ہو اس کے لیے تمہیں کچھ مشکل مراحل سے تو گزرنا پڑے گا۔ یہ مرحلہ بہ ظاہر بے مقصد تھا لیکن اس میں ایلس نے نیلا بٹن دبا کر برتری حاصل کر لی ہے۔ اس کے سوا کسی نے نیلا بٹن نہیں دبایا مسٹر سائمن نے کوئی بٹن نہیں دبایا اور وہ دوسرے نمبر پر ہے لیکن اسے نہ کھیلنے کی پاداش میں دوگنے وقت تک کرنٹ برداشت کرنا پڑا۔ امید ہے اب تم لوگ کھیل کی نیچر سمجھ گئے ہو گے۔"

ملازموں نے مشین کو بند کیا اور اسے کپڑے سے ڈھک کر واپس لے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرالی لے کر آئے جس پر کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے دل لرزنے لگے تھے۔ ایلس نے انگرمین کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ "اگلا راؤنڈ شروع ہونے والا ہے۔"

"یہ بکواس ہے۔" گریگ مارش کھڑا ہو گیا۔ روز نے پستول نکالا تو وہ فوراً واپس بیٹھ گیا۔

انگرمین نے نرمی سے کہا۔ "میں نے کہا تا ایک ملین پاؤنڈز کا حصول آسان نہیں ہو گا لیکن تم میں سے کوئی ایک شخص یقینی طور پر اس رقم کا مالک بنے گا۔"

"تم نفسیاتی مریض ہو جو اپنی دولت کے بل پر دوسروں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہو۔" گریگ بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ اہم بات یہ ہے کہ تم لوگ ایک مقصد کے تحت یہاں جمع ہوئے ہو اور یقیناً ہر قسم کے حالات کے لیے تیار ہو کر آئے ہو۔ تم مجھے الزام نہیں دے سکتے کیونکہ میں فاتح کو ایک ملین پاؤنڈز دینے کے وعدے پر قائم ہوں اس لیے مہربانی کر کے کھیل پر توجہ دو۔"

"میں اب اس کھیل میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" گریگ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

انگرمین کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایلس کی طرف دیکھا۔ "مس اسمتھ، کھیل کا آغاز تم سے کرتے ہیں۔ تمہارے سامنے دو آپشن ہیں۔ ایک تم چاقو مسٹر نوڈز کی ران میں اتار دو۔" انگرمین کے کہنے کے دوران روز نے ٹرالی سے ایک چھ انچ لمبا تیز دھار چاقو اٹھا کر ایلس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ انگرمین نے بات جاری رکھی۔ "یا تم افریقی بید کی اس چھڑی سے مسٹر مارش کی پشت پر تین ضربیں لگاؤ گی؟"

روز نے تین فٹ لمبی سیاہ چھڑی بھی میز پر رکھ دی۔ ایلس کانپنے لگی تھی۔ "میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کم آن ایلس۔" اس بار انگرمین نے بے تکلفی سے کہا۔ "تم کر سکتی ہو۔ جب تم دفتر آئی تھیں تب ہی میں نے جان لیا تھا تم اس گیم میں حصہ لینے کی اہل ہو۔ تمہارے پاس عمل کے لیے پچاس سیکنڈ ہیں اس کے بعد روز تمہاری پشت پر تین بار بید مارے گا۔"

ایلس رونے لگی تھی، انگرمین نے گھڑی چلا دی تھی۔ اچانک گریگ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ایلس سے کہا۔ "تم مجھے چھڑی مارو۔"

ایلس نے سر ہلایا اور چھڑی اٹھا لی۔ گریگ نے کوٹ اتار دیا تھا، اس نے کرسی پلٹ کر رکھی اور اس سے سینہ لگا کر بیٹھ گیا۔ ایلس اس کے پیچھے آئی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہی ہو۔ اس نے ہمت کر کے پہلی ضرب لگائی مگر یہ زوردار نہیں تھی۔ انگرمین نے اسے روک دیا۔ "ضرب قوت سے لگانی ہے ورنہ دوبارہ لگانی پڑے گی تم سمجھ رہی ہو تم جتنی کم قوت سے لگاؤ گی اسے اتنی ہی زیادہ ضربیں برداشت کرنا پڑیں گی اس لیے بہتر ہے پوری قوت سے صرف تین ضربیں لگاؤ۔"

روز نے چھڑی لے کر مظاہرہ کر کے دکھایا کہ ایلس کو کس طرح ضرب لگانی ہے۔ اس بار ایلس نے قوت سے ضرب لگائی تھی۔ شدت کرب سے گریگ کا جسم بل کھا گیا تھا

مگر اس نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ ایلس نے دو ضربیں اور لگائیں اور پھر روتی ہوئی واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اور دوسرے سمجھ گئے تھے کہ یہ جنونی ان سے اپنی بات منوا کر رہے گا۔ انکار کی صورت میں ان کی مشکلات میں ہی اضافہ ہو گا جیسا کہ جم اسٹون کے ساتھ ہوا تھا اور جیسا گریگ کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کی پشت پر تین سرخ لکیریں ابھر آئی تھیں، شرٹ پھٹ گئی تھی اور اندر اس کی جلد بھی پھٹ گئی تھی۔ انگرمین نے روبیک کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مسٹر ولیم تم چاقو مسز رائن کی ران میں گھونپنا پسند کرو گے یا مسٹر مارش کی پشت پر تین بار چھڑی مارنا پسند کرو گے؟"

روبیک کے چہرے پر پسینا آ گیا تھا۔ اس کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ مسز رائن دہشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پچاس سیکنڈ پورے ہونے سے پہلے اس نے چھڑی اٹھا لی اور گریگ کی طرف بڑھا۔ اس نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔ "مجھے معاف کر دینا دوست، مجھے اس لعنتی ایک ملین پاؤنڈز کا خیال تک نہیں ہے مگر میں مجبور ہوں۔"

گریگ نے سر ہلایا اور دانت بھینچ لیے تھے۔ روبیک نے تین بار چھڑی سے اسے مارا اور اس بار اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ آخری ضرب کے بعد وہ نڈھال سا ہو کر آگے جھک گیا تھا۔ اگلی باری شرما کی تھی۔ انگرمین نے اس کے سامنے مسز رائن کی ران میں چاقو گھونپنے یا گریگ کو چھڑی مارنے کی تجویز رکھی تھی۔ شرما گریگ کی حالت دیکھ رہا تھا اور اس نے خلاف توقع چاقو اٹھا لیا۔ مسز رائن بلبلانے لگی تھی۔ شرما اس کے پاس آیا اس نے جھک کر مسز رائن سے کہا۔ "گرینی میری بات سنو...... میری بات سنو...... تمہاری ٹانگ پہلے ہی سن ہے تمہیں تکلیف نہیں ہو گی صرف زخم لگے گا وہ بعد میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں پلیز، میں مر جاؤں گی۔" مسز رائن رونے لگی۔ "میرے خدا میں کیوں اس جگہ آئی؟"

شرما نے اچانک ہی چاقو مسز رائن کی دائیں ران میں گھونپ دیا۔ اس نے رونا ترک کر دیا اور چلا کر بولی۔ "تم نے مجھے چاقو مارا ہے۔"

"سوری گرینی ...... آئی ایم سوری۔" شرما نے گھبرا کر جلدی سے چاقو نکال لیا اور اپنے رومال سے دبا کر خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خون رک نہیں رہا تھا۔ پھر شرما نے اپنی بیلٹ نکالی۔ روبیک اس کی مدد کو آ گیا اور انہوں نے مل کر مسز رائن کے زخم پر بیلٹ کس کر باندھی تاکہ خون رک جائے۔ اتنی دیر میں وہ جھول گئی تھی۔ وہ اس کے لیے

کل اور آج

☆ کل لوگ نمک اور دال سے روٹی کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے لیکن آج بریانی اور مٹن کھا کر کہتے ہیں مزہ نہیں آیا۔

☆ کل پردہ عورت کی زینت تھا اور آج کھڑکیاں اور دروازوں کی زینت ہے۔

☆ کل کھڑے ہو کر کھانا بدتمیزی تھا آج فیشن ہے۔

☆ کل لوگوں میں پیار تھا لیکن آج ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔

☆ کل لوگ سنتِ رسول ﷺ کو فروغ دیتے تھے مگر آج فیشن کو فروغ دیتے ہیں۔

مرسلہ: طارق کلیر اینڈ کرم علی چوہان، تحصیل نور پور تھل گاؤں جاڑا

☆☆☆

طوفانی بارش میں ایک شخص پیزا ہٹ پہ پیزا لینے آیا۔ منیجر نے پوچھا۔ "سر کیا آپ غیر شادی شدہ ہیں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "اللہ کے بندے خود سوچو ایسے طوفان میں کون سی ماں اپنے بیٹے کو پیزا لینے بھیجتی؟"

☆☆☆

بیوی۔ "میرا جینا حرام ہو گیا ہے میں یہ گھر چھوڑ کے جا رہی ہوں۔"

شوہر ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "جان چھوڑو خدا کے واسطے۔"

بیوی واپس آتے ہوئے۔ "ایک تو آپ کی یہ عادت بہت بری ہے، ہمیشہ جان کہہ کر، خدا کا واسطہ دے کر اور ہاتھ جوڑ کے روک لیتے ہو۔"

☆☆☆

لڑکا دوست سے۔ "یار وہ لڑکی مجھے مسکرا کے دیکھتی ہے۔"

دوست۔ "بھائی! پہلے کنفرم کر لے مسکرا کے دیکھتی ہے یا دیکھ کے مسکراتی ہے۔"

☆☆☆

خاموشی ایک نعمت ہے بالخصوص اس مقام پر جہاں اختلاف زیادہ، آوازیں بلند، علم کی شدید کمی اور دلائل کی کوئی وقعت نہ ہو، میرا مطلب ہے کہ "زوجہ محترمہ کے سامنے"

☆☆☆

سردار نے بیوی کو فون کیا کہ "میں گھر نہیں آ سکتا کار کا اسٹیئرنگ چوری ہو گیا ہے۔" کچھ دیر بعد پھر فون کیا۔ "آ رہا ہوں پہلے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔"

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انگر مین اور مارٹی دلچسپی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ انگر مین نے سائمن سے کہا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔ تم چاقو شرما کی ران میں اتارو گے یا گریگ کو تین چھریاں مارو گے؟''

شرما نے رحم طلب نظروں سے سائمن کی طرف دیکھا۔ دوسری طرف گریگ بے ہوش سا ہو رہا تھا۔ سائمن نے سرد آہ بھر کر چھری اٹھالی۔ مزید تین ضربیں کھا کر گریگ کے رہے سہے ہوش بھی جواب دے گئے تھے اور آخری ضرب کے ساتھ وہ کرسی سے لڑھک کر نیچے گر گیا۔ سائمن واپس اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ مسز رائن کا سر جھکا ہوا تھا۔ انگر مین نے اسے مخاطب کیا اور جب کوئی ردعمل نہیں ہوا تو اس نے روز کو اسے ہوش میں لانے کا حکم دیا۔ روز نے مسز رائن کو تھپڑ مارے اور پھر اس کی گردن پر نبض چیک کی۔ چند لمحے تک چیک کرنے کے بعد اس نے انگر مین سے کہا۔ ''یہ مر چکی ہے۔''

ایلس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ جولیانا نے بھی دہشت زدہ ہو کر مسز رائن کو دیکھا۔ شرما کا برا حال ہو گیا، وہ ہکلا ہکلا کر کہہ رہا تھا۔ ''میں ...... نے صرف ...... چاقو مارا تھا...... خون بھی رک گیا تھا۔''

انگر مین کے اشارے پر ایک ملازم مسز رائن کو وہیل چیئر سمیت وہاں سے لے گیا۔ وہ سب یوں پرسکون تھے جیسے ایک انسان نہ مرا ہو کوئی کیڑا مر گیا ہو جس کی باقیات کہیں پھینکنی تھیں۔ انگر مین نے جولیانا کی طرف دیکھا۔ ''مس جولیا اب تمہاری باری ہے۔''

''مجھے صرف یہ اختیار دو کہ میں جسے چاہے چاقو ماروں؟'' اس نے مطالبہ کیا تو انگر مین مسکرانے لگا۔

''خوب ...... یعنی تمہارے ذہن میں اس گیم کا کوئی نیا پہلو ہے۔ ٹھیک ہے تمہیں اختیار ہے کہ ان میں سے کسی کو چاقو مار دو یا گریگ کو تین چھریاں مارو۔''

''یہ مر چکا ہے؟'' جولیانا نے فرش پر پڑے گریگ کی طرف دیکھا۔

''نہیں، بے ہوش ہے۔'' روز نے چیک کر کے بتایا۔

''تم کسی کو جان لیوا زخم نہیں لگاؤ گی۔'' انگر مین نے جولیانا کو خبردار کیا۔ جولیانا چاقو اٹھاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''فکر مت کرو میں میڈیکل کی طالبہ ہوں مجھے معلوم ہے کہاں زخم کتنی گہرائی میں جان لیوا ہوتا ہے۔''

وہ گھوم کر میز کے دوسری طرف آئی تو سائمن، شرما اور ایلس کی حالت خراب ہو گئی۔ ظاہر ہے اس کا نشانہ ان میں سے کوئی تھا۔ جولیانا بہ ظاہر سائمن کی طرف جھکی تھی لیکن اس نے اچانک ایلس کے دائیں پہلو میں پسلیوں سے ذرا نیچے چاقو مارا۔ ایلس کے منہ سے چیخ نکلی، اس نے پہلو پر ہاتھ رکھا جو خون سے بھر گیا تھا۔ جولیانا واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گئی اور سائمن ایلس کا زخم دیکھ رہا تھا۔ چاقو کی نوک مشکل سے ایک انچ اندر گئی تھی اور زخم خطرناک نہیں تھا مگر ایلس کو تکلیف ہو رہی تھی اور یہی شاید جولیانا چاہتی تھی۔ دوسرے ران کے مقابلے میں پہلو کا زخم انسان کو زیادہ کمزور کرتا ہے جولیانا اسے مقابلے سے خارج کرنا چاہتی تھی۔ سائمن نے میز پوش کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور اسے پٹی کے طور پر ایلس کے زخم پر باندھ دیا۔ انگر مین خوش تھا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ پٹی باندھ کر سائمن نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ لعنتی گیم کب ختم ہوگا؟''

''کسی ایک شخص کے فاتح ہونے پر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تم دیکھ رہے ہو کھلاڑی تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ اب صرف پانچ رہ گئے ہیں۔''

''مگر گریگ ......'' سائمن نے کہنا چاہا۔

''وہ خود دست بردار ہو گیا تھا اور دوسرے وہ اس قابل نہیں ہے کہ مزید مقابلے میں حصہ لے سکے۔'' انگر مین کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''دوسرا مرحلہ ختم ہوتا ہے۔''

''اس کا فاتح کون ہے؟'' جولیانا نے پوچھا۔

''کوئی نہیں اب مقابلہ ناک آؤٹ پر چلا گیا ہے۔ تم لوگوں کو دس منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔''

انگر مین باہر چلا گیا۔ روز اور مارٹی بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔ جب کہ دونوں ملازم بے ہوش گریگ کو کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا روبیک نے جھک کر تیز سرگوشی میں کہا۔ ''ہمیں کچھ کرنا ہوگا ورنہ ہم سب ایک ایک کر کے اسی طرح اس جنونی کا شکار ہوتے رہیں گے۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' سائمن نے کہا۔ وہ سادہ سا بزنس مین تھا اسے بلکہ شرما کو بھی لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایلس اور جولیانا عورتیں تھیں ان سے ویسے ہی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ روبیک نے سرگوشی کی۔

''اگر ہم کسی طرح ان پر قابو پا کر پستول حاصل کر لیں تو یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''یہ بہت خطرناک ہوگا۔'' جولیانا نے مخالفت کی۔

''ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔'' ایلس نے حمایت کی۔ شرما اور سائمن خوف زدہ تھے۔ اسی اثنا میں دونوں ملازم اندر آئے۔ ان میں سے ایک صفائی کا سامان لایا تھا۔ وہ فرش صاف کرنے لگا جب کہ دوسرا اضافی کرسیاں ہٹا رہا تھا۔ اچانک روبیک اچھلا اور اس نے کرسیاں ہٹانے والے کو زمین پر گرا دیا۔ وہ اس پر گھونسے برسا رہا تھا۔ صفائی کرنے والا چونکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا سائمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ شرما، ایلس اور جولیانا ساکت بیٹھے تھے۔ روبیک کا شکار گھونسے کھا کر بیدم ہو گیا تھا۔ روبیک نے اس کی تلاشی لی مگر اس کا پستول نہ جانے کہاں تھا۔ روبیک دروازے کی طرف لپکا۔ باہر وہ ٹرالی موجود تھی جس پر چاقو اور چھری رکھی تھی۔ روبیک نے چھری اٹھالی۔ اسی لمحے راہداری کے سرے پر انگر مین نمودار ہوا، اسے دیکھتے ہی روبیک کا دماغ گھوم گیا اور وہ چھری اوپر کر کے اس کی طرف لپکا تھا۔

ایلس، سائمن اور دوسرے آدمی کی کشمکش دیکھ رہی تھی۔ پھر دوسرے آدمی نے سائمن کو اچھال دیا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا یہ دیکھتے ہی ایلس حرکت میں آئی اور اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کرسی ملازم پر دے ماری۔ اس کی حرکت نے سائمن کی جان بچالی ورنہ ملازم اسے گولی مارنے والا تھا۔ فائر کہیں اور گیا اور پستول ملازم کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سائمن نے پستول اٹھانے کی کوشش کی لیکن ملازم نے اسے ٹکر مار کر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر ایلس تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی ایک فائر کی آواز آئی اس نے چونک کر دیکھا، راہداری کے سرے پر روبیک فرش پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ انگر مین کے ہاتھ میں موجود چھوٹے سے پستول سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ ایلس نے ٹرالی سے چاقو اٹھایا اور مخالف سمت میں دوڑی۔

پہلے اور دوسرے فائر کی آواز نے روز اور مارٹی کو بھی چونکا دیا تھا۔ وہ دوڑے آئے۔ مارٹی نے باپ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''پتا نہیں، یہ کیسے باہر آ گئے؟'' انگر مین نے تشویش سے کہا۔ ''ایلس اس طرف بھاگی ہے۔''

''میں اسے دیکھتا ہوں۔'' مارٹی نے جوش سے کہا اور برآمدہ چلا گیا۔ روز نے پستول نکال لیا تھا وہ ہال میں آیا۔ اسے دیکھتے ہی سائمن نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ملازم نے لپک کر اپنا پستول اٹھایا اور سائمن کو زبردستی کرسی پر بیٹھنے پر مجبور کیا۔ ذرا سی دیر میں ہال کا حشر ہو گیا تھا۔ کرسیاں الٹ گئی تھیں۔ جو کرسی ایلس نے پھینک کر ماری تھی وہ ٹوٹ گئی تھی۔ صفائی کے لیے لایا جانے والا ڈول الٹ گیا تھا اور اس کا پانی فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ انگر مین اندر آیا۔ اس نے ملازموں کو گھورا لیکن کچھ کہا نہیں اس نے روز کو حکم دیا۔

''تم جا کر مارٹی کی مدد کرو۔''

روز وہاں سے چلا گیا۔ انگر مین کا چہرہ سخت ہو رہا تھا۔ شاید پہلی بار اس کا گیم اس طرح سے خراب ہوا تھا مگر اس نے سائمن، شرما اور جولیانا کو کچھ نہیں کہا۔ جولیانا نے کہا۔ ''میں اور یہ شامل نہیں تھے۔''

''ہم اپنی کرسیوں سے ہلے بھی نہیں۔'' شرما نے صفائی پیش کی۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' سائمن نے اپنی سوج جانے والی بھوں دباتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی اس جگہ سے زندہ نہیں جا سکتا۔''

ملازم اب سامان سمیٹ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہاں سب پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ باہر ہونے والے فائر اور روبیک کے نہ آنے سے واضح تھا کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ ان کے چہرے ستے گئے تھے۔

اقوال زریں

- زبان درست ہو جائے تو دل بھی درست ہو جاتا ہے۔
- اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنا حماقت کی پہلی سیڑھی ہے۔
- اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں میں خوشیاں بانٹو۔
- گری ہوئی دیوار دوبارہ تعمیر کی جا سکتی ہے لیکن گرا ہوا پہاڑ دوبارہ کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔
- آگ جلانا جانتی ہے بجھانا نہیں۔
- جس دن تمہارا وفادار دوست تمہیں چھوڑ کر چلا جائے تو سمجھ لو کہ وہ دن تمہارے لیے آدھی قیامت کے برابر ہے۔

مرسلہ: ایم زاکم علی خان ...... گور چانی، داجل، ضلع راجن پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

ایلس اس سے مخالف سمت میں بھاگی تھی جہاں سے وہ روز کے ساتھ پیلس کے اندر آئی تھی اور اب اسے باہر نکلنے کے راستے کی تلاش تھی۔ وہ آنے والی کئی راہداریوں میں مڑی مگر اسے راستہ نہیں ملا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انگرمین کے آدمی اس کے پیچھے آئیں گے اور وہ اسی طرح راہداری میں بھاگتی رہی تو جلد پکڑی جائے گی۔ اس لیے وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ یہ بڑا ہال نما کمرا تھا اور اس میں ایک طرف سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں اور دوسری طرف وہ نیچے جارہی تھیں مگر ایلس نے سیڑھیوں کے بجائے دائیں طرف کھلنے والے ایک دروازے کا انتخاب کیا۔ اسے عقب سے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی قریب آگیا تھا۔ یہ چھوٹا سا اسٹور روم ثابت ہوا۔ دروازے کا اوپری حصہ اندھے شیشے کا بنا ہوا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ دبک گئی۔ چند لمحے بعد روز کا ہیولا شیشے کے سامنے سے گزرا۔ ایلس نے سانس روک لی۔ روز ہال میں موجود دروازے کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔ ایلس کا دم خشک ہونے لگا وہ یہاں پھنس گئی تھی اور زیادہ دیر نہیں لگتی وہ پکڑی جاتی۔ گینڈے کی طرح مضبوط اور مسلح روز کے خلاف چاقو بیکار تھا۔ وہ اس دروازے کی طرف آرہا تھا اور پھر اس نے ہینڈل پکڑا تھا کہ اسے سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ سنائی دی اور وہ واپس پلٹ گیا۔ ایلس نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ وہ پکڑے جانے سے بال بال بچ گئی تھی۔ روز اب اوپر جارہا تھا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیوں سے اوپر گیا۔ ایلس خاموشی سے باہر آئی اور دبے قدموں سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

یہ تہ خانہ تھا اور اتنا ہی بڑا تھا جتنی بڑی اوپر کی عمارت تھی۔ وہ راہداری سے گزر کر اس کے آخری حصے تک پہنچی یہاں اوپر چھت کے ساتھ شیشے کے روشن دان تھے۔ یہ کھل سکتے تھے لیکن ان تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ ایلس نے آس پاس دیکھا اسے کچھ دور ایک اسٹول نظر آیا وہ اسے اٹھا کر ایک روشن دان تک لائی۔ اس پر چڑھ کر وہ شیشہ کھولنے کی کوشش کررہی تھی مگر کب سے بند ہونے کی وجہ سے شیشہ جام ہورہا تھا اور کوشش کے باوجود نہیں کھل رہا تھا۔ اچانک کسی نے اسٹول پر لات ماری۔ وہ گرا اور ساتھ ہی ایلس بھی نیچے گرگئی۔ زخم والے پہلو میں گرنے سے تکلیف کہیں زیادہ ہوئی تھی۔ وہ کراہی اور اس نے اٹھنا چاہا تو مارٹی نے اس بار اس کے سینے پر ٹھوکر ماری وہ الٹ کر گری۔ البتہ اس نے چاقو نہیں چھوڑا تھا۔ مارٹی یوں خوش تھا جیسے اسے پسند کا کھیل کو مل گیا ہے۔ ایلس کو اس کی آنکھوں میں ایک جنونی چمک دکھائی دی جیسے وہ نفسیاتی مریض ہو۔ ویسے یہ باپ بیٹے درحقیقت نفسیاتی مریض ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ انگرمین دیکھنے میں نہیں لگتا تھا لیکن مارٹی صورت ہی لگ رہا تھا۔ ایلس اس سے بچنے کے لیے پیچھے سرکی مارٹی نے پھرتی سے فاصلہ کم کیا اور اسے لات مارنے کی کوشش کی۔ ایلس نے بے ساختہ ہاتھ آگے کیا تو مارٹی کی ٹانگ اس کے ہاتھ میں آگئی اور وہ لڑکھڑا کر اسی پر گر گیا۔ دبا تو ایلس پھر چیخ اٹھی۔ اس نے مارٹی کو چاقو مارنے کی کوشش کی لیکن اس نے آسانی سے چاقو چھین کر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ اس پر پوری طرح حاوی آگیا تھا۔ اب وہ اسے ... کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ایلس نے محسوس کیا کہ وہ کسی چکر میں ہے۔ وہ اس کا لباس اتارنے کی کوشش کررہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ بہک رہے تھے۔ قریب سے ایلس کو اس کی آنکھوں میں جنون کے ساتھ ہوس کی چمک دکھائی دی تھی۔ ایلس مزاحمت کررہی تھی اچانک اس نے گھٹنا اس کی ناف تلے مارا۔ وہ کچھ بے پروا ہو گیا تھا اور اسی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ کراہ کر ڈھیلا ہوا تو ایلس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور پھر جھپٹ کر چاقو اٹھاتے ہوئے اس کی ٹانگ پر مارا۔ چاقو اس کی پنڈلی کے آر پار ہو گیا۔ وہ اٹھتے ہوئے چیخ کر گر پڑا۔

''کتیا......'' اس نے چلا کر کہا۔ اسی لمحے روز نمودار ہوا۔ ایلس جو دوبارہ بھاگنے کے لیے پر تول رہی تھی اسے دیکھتے ہی ساکت ہوگئی کیونکہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ایلس دیکھ چکی تھی اس نے جم کو کتنی آسانی سے شوٹ کر دیا تھا۔ مارٹی نے روز کو دیکھا تو بولا۔ ''شوٹ کردو اسے ابھی میرے سامنے ماردو۔''

ایلس کا سانس رک گیا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے روز کی طرف دیکھا۔ مارٹی اس کے آقا کا ولی عہد تھا اس کا حکم بھی اس کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ مگر خلاف توقع روز نے پستول واپس کوٹ میں رکھ لیا اور مارٹی سے کہا۔ ''ماسٹر، کسی کو قتل کرنے کا حکم صرف باس دے سکتا ہے۔'' ''ایلس اب کوئی حرکت کیے بغیر میرے ساتھ چلو۔''

مارٹی چلایا۔ ''تم دیکھ رہے ہو اس نے میرے ... میں چاقو مار دیا ہے۔''

روز نے اسے تسلی دی۔ ''میں اسے گیم روم میں چھوڑ کر ابھی واپس آتا ہوں۔''

روز ایلس کو بازو سے پکڑ کر واپس ہال میں لے آیا۔ اسے دیکھ کر سائمن اور شرما کا چہرہ ست گیا تھا، شاید وہ توقع کر رہے تھے کہ اگر ایلس یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو ان کی گلو خلاصی بھی ہوسکتی ہے مگر وہ پکڑی گئی تھی۔ جولیانا اسے دیکھ کر بہت طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''واپسی مبارک ہو مس احمق۔''

ایلس لرزتے قدموں کے ساتھ اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اب وہ شرما کے ساتھ تھی اور سائمن کو دوسری طرف جولیانا کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ روز نے آگے جا کر انگرمین کے کان میں کچھ کہا تو اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر فوری طور پر اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ البتہ دونوں مسلح ملازم وہیں موجود رہے اور پہلے سے زیادہ چوکنا تھے۔ ان کی طرف سے ذرا سی غلط حرکت پر وہ اپنے ہتھیار استعمال کرنے کو بالکل تیار تھے۔ ایلس نے شرمندگی سے کہا۔ ''سوری، میں نہیں نکل سکی۔'' پھر اسے روبیک کا خیال آیا۔ ''اس نے روبیک کو مار دیا۔''

''ہمیں معلوم ہے۔'' جولیانا اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''اسے ہیرو بننے کا شوق تھا۔ اس نے تمہیں موقع دیا اپنی جان پر کھیل کر۔''

''انگرمین نے اسے شوٹ کر دیا۔'' سائمن دکھی ہو رہا تھا۔ ''یہ شاید ہمارے پاس زندہ رہنے کا آخری موقع تھا۔''

''شاید نہیں یقیناً۔'' شرما نے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

''مجھے یقین ہے جو گیم جیت جائے گا وہ بچ جائے گا۔'' جولیانا بولی۔

''شاید اسی امید پر تم اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔'' سائمن نے طنز کیا۔ ''مگر میرا خیال ہے جلد تمہیں اپنی اس بے عملی پر پچھتانا ہوگا۔''

''میں کبھی نہیں پچھتاتی۔'' جولیانا نے کھسیائے بغیر کہا۔

''پلیز یہ آپس میں جھگڑنے کا وقت نہیں ہے۔'' ایلس نے کہا۔ ''کچھ سوچو اس سے پہلے کہ ہم بھی نہ رہیں۔''

''ہم صرف سوچ سکتے ہیں کچھ کر نہیں سکتے۔'' شرما نے سر دو بھر کر کہا۔ ''دیکھتے ہیں اب کیا آفت سامنے آتی ہے۔''

ایلس ان سب سے زیادہ پریشان تھی کیونکہ اس نے مارٹی کو زخمی کیا تھا، نہ جانے جواب میں انگرمین کا کیا ردعمل ہو۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور انگرمین اندر آیا۔ ایلس ڈر کر خود میں سمٹ گئی۔ انگرمین اس کے پاس آیا اور جھک کر اس کے کان کے بالکل پاس آ کر کہا۔ ''احمق تم نے مارٹی کو چاقو مارا؟''

سب نے چونک کر ایلس کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں نیچی کیے کیے سر ہلایا۔ انگرمین نے اگلا سوال کیا۔ ''کیوں؟''

ایلس نے رک رک کر اسے بتایا کہ مارٹی نے اس کے ساتھ کیا، کیا تھا اور اس نے بے اختیار اسے چاقو مار دیا۔ ''مسٹر انگرمین میرا مقصد اسے نقصان......''

''بس کافی ہے۔'' انگرمین نے کہا تو ایلس چپ ہو گئی۔ اچانک انگرمین نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں اپنے بیٹے کے اس طرز عمل پر معافی چاہتا ہوں۔''

ایلس نے چونک کر اسے دیکھا۔ انگرمین نے سر ہلایا۔ ''تم نے اسے مناسب سزا دیدی ہے ورنہ میں خود اسے سزا دیتا۔ بہرحال میں ایک بار پھر تم سے معذرت چاہتا ہوں کہ تمہیں کھیل سے ہٹ کر ایک تکلیف سے گزرنا پڑا۔''

وہ سب حیران ہوئے تھے انگرمین کی اس بات پر کہاں تو وہ اب تک ان کے تین ساتھیوں کو اپنے کھیل کی بھینٹ چڑھا چکا تھا اور کہاں وہ ایلس سے ایک معمولی سی تکلیف پر معافی مانگ رہا تھا اور اپنے بیٹے کو سزا دینے کی بات کر رہا تھا۔ ایلس اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

تلوار

✂ تلوار تو پٹ پڑی نیچہ کام (کاٹ) کر گیا
(جو کام بڑے سے نہ ہوا وہ چھوٹے نے کر دیا)
✂ تلوار گری...... پرجا پھری
(بزدل حاکم سے رعایا باغی ہوجاتی ہے)
✂ تلوار یا وہی بھلا جو آن میں ہاتھ دکھائے، بیری کے ٹکڑے کرے اور آپ ترت بچ جائے۔
(شمشیر زن وہ ہے جو لڑائی میں دشمن کو قتل کرے اور خود بچ جائے)
✂ تلوار مارے ایک بار...... احسان مارے بار بار
(احسان کی مار تلوار سے بڑھ کر ہوتی ہے)

قلمی تعاون: محمد زریان، سلطان اردو بازار، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

انگرمین اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹل مین، گیم ایک تعطل کے بعد دوبارہ شروع ہوتا ہے۔''

دروازے سرکے اور روز ایک بڑا ڈرم دھکیلتا ہوا لایا۔ اس کے نیچے پہیے لگے تھے۔ ڈرم پر ڈھکن رکھا تھا اور روز جس طرح اسے دھکیل رہا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ ڈرم بھرا ہوا اور وزنی تھا۔ اسے دیکھ کر ان کے دل دھڑک اٹھے تھے کہ اب انہیں کس مرحلے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انگرمین نے کہا۔ ''یہ ڈرم اوپر تک پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اب ہم اگلے مرحلے کا آغاز کرتے ہیں۔''

روز نے پہلے ڈرم سے ڈھکن اٹھا کر اس میں بھرا پانی دکھایا۔ پھر ایک چھوٹی پلیٹ نما طشتری جو رومال سے ڈھکی تھی لا کر میز کے وسط میں رکھ دی۔ انگرمین نے کہا۔ ''اس مرحلے میں بھی ہر کھلاڑی کو دو مواقع دیے جائیں گے۔ پہلا موقع پانی میں سر رکھنے کا، اتنے وقت کے لیے جو میں منتخب کروں۔ دوسرا تمہارے سامنے طشتری پر چار کارڈ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک کارڈ چن لو اور اس پر جو لکھا ہو وہ کرنا ہوگا۔''

''اگر کارڈ پر لکھا ہو کہ خودکشی کرلو۔'' شرما نے پوچھا۔

''یہ کھیل ہے اور کھیل میں ہمیشہ چانس ہوتا ہے۔'' انگرمین نے برا نہیں مانا۔ ''اب تک تم لوگ جتنے مراحل سے گزرے ہو کیا اس میں کوئی کام ایسا تھا جو تمہارے لیے ناممکن ہو۔ ممکن ہے آج سے پہلے تم نے یہ کام نہ کیے ہوں لیکن اب تم یہ تمام کام کرسکتے ہو۔''

ایلس نے سوچا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ وہ کبھی کسی شخص کو چھڑی سے مار کر اس کی پشت ادھیڑ دے گی یا ازخود کرنٹ کھائے گی یا کوئی اسے چاقو مار کر زخمی کر دے گا۔ مگر آگے کیا تھا وہ اس سے بے خبر تھی۔ انگرمین نے کھیل کا آغاز کیا۔ ''مسٹر شرما، تم پانی کے ڈرم کا انتخاب کرو گے۔'' اس نے طشتری سے رومال ہٹایا۔ ''یا اس طشتری میں رکھے کارڈ کا۔''

شرما نے سوچا اور ہچکچاتے ہوئے کارڈ اٹھا لیا۔ یہ کارڈ نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا لفافہ تھا۔ کارڈ اس کے اندر تھا۔ انگرمین نے اشارے سے کہا کہ وہ کارڈ نکالے۔ اس نے کارڈ نکالا۔ اس پر کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے کارڈ انگرمین کی طرف کیا۔ ''اس کا مطلب؟''

''اوہ۔'' انگرمین نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے موت۔''

''کیا مطلب؟'' شرما بوکھلا گیا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ اس میں چانس ہوگا۔''

''چانس تو ہے۔'' انگرمین نے اسے تسلی دی ... کی طرف دیکھا تو اس نے ایک ڈبا لا کر میز پر رکھا ... سے ایک چاندی جیسا چمکتا ہوا ریوالور نکالا۔ اس کا ... اور پھر جیب سے تین بلٹ نکال کر ریوالور میں ایک ... کر ایک خانے میں بلٹ ڈالے۔ پھر اس نے چیمبر ... ریوالور انگرمین کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد اس ... پستول لیا اور شرما کے پاس مستعد کھڑا ہو گیا۔ انگرمین ... ریوالور شرما کی طرف سرکایا۔ وہ سفید پڑ گیا تھا۔

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔''

''مسٹر شرما تم نے کارڈ چنا اور اس میں تمہارے ... جو نکلا وہ تمہارا مقدر ہے۔ اب تم ریوالور اپنے منہ میں ... ایک بار ٹریگر دباؤ گے۔''

''نہیں......''

''اس کام کے لیے تمہارے پاس صرف تیس ... ہیں اور اس دوران میں اگر تم نے ٹریگر نہیں دبایا تو روز ... طور پر ٹریگر دبائے گا۔'' انگرمین نے گھڑی کا بٹن ... ہوئے کہا۔ ''تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب مسٹر شرما۔''

گھڑی کی سوئی تیزی سے تیس کی طرف بڑھ ... تھی۔ شرما نے کانپتے ہاتھوں سے ریوالور اٹھایا تو روز ... مستعد ہو گیا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ ... ریوالور ہاتھ میں آنے کے بعد شرما کہیں انگرمین یا اس ... فائر کردے۔ روز کے پستول کی نال اس کے سر سے ... ایک انچ کے فاصلے پر تھی اور اس کی انگلی لبلبی پر بالکل ... تھی۔ مگر خوف سے ادھ موئے ہو جانے والے شرما کے ... میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں ... ریوالور کی نال منہ میں رکھی۔ گھڑی کی سوئی پچیس پر ... تھی اور آخری پانچ سیکنڈ باقی تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی ... تھیں جیسے ہی سوئی تیس پر پہنچی اس نے لبلبی دبا دی۔ ... دھماکا ہوا اور شرما کرسی سمیت پیچھے جا گرا۔ عقبی دیوار پر ... بکھر گیا تھا۔ اس بار ایلس کے ساتھ جولیانا بھی رو ... تھی۔ مگر انگرمین اور روز پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ روز ... اور اپنے ہاتھ پر آنے والے خون کے چھینٹے رومال ... صاف کر رہا تھا۔ اس نے پھرتی سے مردہ شرما کے ... ریوالور اٹھایا۔ وہ سائمن کے پاس گرا تھا لیکن ... تھا اسے پستول اٹھانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ملازم ... آئے اور شرما کی لاش کھینچ کر باہر لے گئے۔ سائمن ... انگرمین کی طرف دیکھا۔

''تم ایک ایک کر کے ہم سب کو اسی طرح مار دو ...''

''نہیں یہ کھیل ہے۔'' انگرمین نے بے پروائی سے کہا۔ ''بالکل فیئر کھیل۔''

''جو تمہاری مرضی سے کھیلا جا رہا ہے۔''

''ہاں، کیونکہ میں اس کے لیے ایک ملین پاؤنڈز کی رقم ادا کرنے والا ہوں۔''

''مجھے امید نہیں ہے۔'' سائمن نے کہا۔

''یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' ایلس نے مداخلت کی۔ ''مسٹر انگرمین کو ہم جو چاہیں سمجھیں مگر یہ ایک جنٹل مین ہیں۔ مسٹر کارل ان کے گیم کے ایک فاتح ہیں۔''

''تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' جولیانا نے طنز کیا۔

''میں نے سچائی بیان کی ہے اور میں جانتی ہوں مجھے اس کا فائدہ نہیں ہوگا۔'' ایلس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

انگرمین نے ایلس کی طرف دیکھا۔ ''اب تمہاری باری ہے مس اسمتھ، تمہارے سامنے دو چوائس ہیں ایک پانی کا ڈرم اور دوسرا طشتری میں رکھا ہوا کارڈ۔''

ایلس گہری سانسیں لے رہی تھی۔ بالآخر وہ کھڑی ہو گئی۔ انگرمین نے تالی بجائی۔ ''ویل، مس اسمتھ نے پانی کے ڈرم کا انتخاب کیا ہے۔''

ایلس گہری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ ڈرم کے پاس آئی تو انگرمین نے گھڑی گھما کر رکھی اور بولا۔ ''مس اسمتھ تم دو منٹ کے لیے پانی میں رہو گی۔''

روز نے ایلس کا سر پیچھے سے پکڑ کر اس کا منہ پانی میں کر دیا اور اسی لمحے انگرمین نے گھڑی کا بٹن دبا دیا۔ ایلس نے دونوں ہاتھ ڈرم کے کنارے پر جما دیے تھے جیسے خود کو مزید پانی میں جانے سے روک رہی ہو حالانکہ روز نے صرف اس کا چہرہ پانی میں کیا تھا اور پھر اس کا ہاتھ پتھر کی طرح جم گیا تھا۔ ایک منٹ بعد ہی ایلس کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ اس کا آکسیجن کے لیے مچلتا ذہن اسے ماضی میں لے گیا جب اس کی شرابی ماں اسے مارنے کے لیے تلاش کرتی تھی اور جب وہ چھپ جاتی تو وہ اسے خوفناک آواز میں دھمکیاں دیتی تھی۔ ایلس کو ماں کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ اسے پکار رہی تھی دھمکیاں دے رہی تھی۔ اس کے پھیپھڑے سانس کے لیے مچل رہے تھے اور وہ پوری قوت سے سانس روکے ہوئے تھی اسے معلوم تھا اس نے ایک بار سانس لے لیا تو اس کا کھیل یہیں ختم ہو جائے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ کب دو منٹ پورے ہوئے، اسے لگا جیسے وہ نہ جانے کب سے اسی طرح پانی میں رہی تھی۔ جب روز نے اس کا منہ اوپر کیا تو وہ ماہی بے آب کی طرح منہ کھول کر سانس لے رہی تھی۔ انگرمین

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی کامیابی پر تالیاں بجا رہا تھا مگر اسے کچھ نہیں سنائی دے رہا تھا۔ پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کرسی تک آئی اور اس پر ڈھیر ہو گئی۔

"ویل ڈن مس اسمتھ۔" انگرمین خوشدلی سے بولا۔ "تمہارے بارے میں میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا ہے۔"

روز نے ایک چھوٹا سا تولیا لا کر ایلس کو دیا جس سے اس نے اپنا منہ اور سر صاف کیا۔ اب اس کی حالت بہتر تھی۔ جولیانا نے اپنے لبوں پر زبان پھیری۔ "اب کس کی باری ہے مسٹر انگرمین؟"

"تمہاری مس جولیانا۔" انگرمین نے انگشت شہادت اس کی طرف دراز کی۔ "تمہارے سامنے دو انتخاب ہیں۔ ایک پانی کا ڈرم اور دوسرا طشتری میں رکھا ہوا کارڈ۔"

جولیانا نے خوفزدہ نظروں سے طشتری کی طرف دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ یعنی اس نے ڈرم کا انتخاب کر لیا تھا۔ وہ ڈرم کے پاس آئی اور روز نے اس کا سر عقب سے تھام لیا۔ انگرمین نے کہا۔ "مس جولیانا تمہیں تین منٹ تک پانی میں رہنا ہوگا۔"

"ایک منٹ۔" وہ چلائی۔ "اسے تو دو منٹ رہنا پڑا تھا۔"

"اس نے پہلے ڈرم منتخب کیا تھا۔ جو پہلے کرتا، اسے دو منٹ پانی میں رہنا پڑتا اور اس کے بعد انتخاب کرنے والے کو ایک منٹ اضافی رہنا ہوگا اسی طرح تیسری بار انتخاب کرنے والے کو چار منٹ پانی میں رہنا ہوگا۔"

"تم نے پہلے نہیں......" جولیانا نے کہنا چاہا مگر اس دوران میں انگرمین گھڑی رکھ کر اس کا بٹن دبا چکا تھا اور روز نے بزور جولیانا کا سر پانی میں کر دیا۔ اسے سانس بھرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی، وہ سر اوپر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر روز کی بے پناہ قوت کے سامنے اس کی مزاحمت بیکار تھی۔ ایلس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وہ اور سائمن جولیانا کے پھڑ پھڑاتے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے یہ پھڑ پھڑاہٹ موت کی اینٹھن میں بدل گئی تھی۔ اب اس کا جسم ہوا کے لیے بل کھا رہا تھا۔ دوسرے منٹ سے پہلے اس نے مزاحمت ترک کر دی مگر روز نے اس کا سر پورے تین منٹ تک پانی میں رکھا اور پھر سر اوپر کیا تو وہ جھول گئی۔ روز نے چھوڑا تو وہ فرش پر گر پڑی۔ روز نے جھک کر اس کی نبض چیک کی اور انگرمین کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ ایلس رونے لگی تھی۔ حالانکہ جولیانا شروع سے اس سے بلاوجہ الجھ رہی تھی۔ اس نے اسے جان بوجھ کر تکلیف پہنچانے اور مقابلے سے باہر کرنے کے لیے پہلو میں چاقو مارا تھا مگر پھر بھی اس کے مرنے سے اد
ہو رہی تھی۔

روز نے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور وہ جولیانا کھینچ کر لے گیا۔ دوسرے نے میز کے ساتھ لگی ہٹا دی۔ اب اس پر صرف دو کھلاڑی آمنے تھے۔ انگرمین نے سائمن کی طرف دیکھا اور بولا۔ نورڈ اب تمہاری باری ہے۔ تمہارے سامنے دو ہیں۔ ایک پانی کا ڈرم اور دوسرا طشتری میں رکھا کار

سائمن خوفزدہ تھا۔ جولیانا کی موت نے اسے تھا۔ اس نے بلا تکلف طشتری سے ایک کارڈ اٹھا لیا لفافے سے نکالا تو اس پر ایک آنکھ بنی ہوئی تھی۔ ا انگرمین کی طرف دیکھا۔ "اس کا مطلب کیا ہے؟"

انگرمین نے کارڈ دیکھا اور افسوس سے ہلایا۔ "مسٹر نورڈ تمہیں اپنی ایک آنکھ کی قربانی اپ سے دینا ہوگی۔"

"کیا مطلب؟"

روز نے ایک چھوٹا سا بلیڈ لا کر سائمن کے سامنے پر رکھ دیا۔ سائمن نے خوف زدہ نظروں سے بلیڈ کی طرف دیکھا۔ انگرمین نے اشارہ کیا کہ وہ بلیڈ اٹھا لے مگر سا نے حرکت نہیں کی۔ وہ بولا۔ "میں یہ کام نہیں کر سکتا ہوں۔"

انگرمین نے گھڑی میں وقت سیٹ کیا اور اس کا سائمن کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ "مسٹر نورڈ تمہارے پاس فیصلے کے لیے صرف تیس سیکنڈ ہیں۔ تم اپنے ہاتھ اپنی آنکھ ضائع کر دو یا پھر روز تمہیں شوٹ کر دے گا۔"

روز نے پستول سائمن کے سر سے لگا دیا اور انگرمین نے گھڑی کا بٹن دبا دیا۔ سوئی تیزی سے تیس کی طرف بڑھنے لگی۔ کم سے کم سائمن کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس رفتار میں تیزی آ گئی ہو۔ اس کا سانس بھی تیز ہو رہا تھا۔ جیسے ہی سوئی تیس کے پاس آئی۔ اس نے بلیڈ اٹھا لیا اور آنکھ طرف لایا۔ اس کے حلق سے ایک طویل چیخ نکلی تھی۔ ایلس نے منہ پھیر لیا۔ انگرمین کے تالی بجاتے پر ایلس نے سامنے دیکھا۔ سائمن اپنی آنکھ ہتھیلی سے دبائے ہوئے تھا۔ بلیڈ دھار پر ہلکا سا مواد لگا تھا۔ ایلس کو لگا اس کا دم الٹ کر میں آ جائے گا۔ اس نے بے اختیار رخ پھیرتے ہوئے کر دی۔ اس طرف سارا فرش گندا ہو گیا تھا مگر انگرمین یا نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ انگرمین کھڑا ہو گیا۔

"فائنل راؤنڈ سے پہلے دس منٹ کا وقفہ کیا جاتا ہے۔"

انگرمین اور روز وہاں سے چلے گئے جب کہ ا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملازم ان کے سر پر رہا تھا دوسرا سامان لا کر فرش صاف کرنے لگا۔ خون اور الٹی صاف کر کے انہوں نے ہال میں ائرفریشنر اسپرے کیا اور پھر اپنی جگہ مستعدی سے کھڑے ہو گئے۔ سائمن نے آنکھ سے ہاتھ ہٹایا تو اس کی دب جانے والی آنکھ دیکھ کر ایلس کو پھر کچھ ہونے لگا تھا اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔ سائمن نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے نہیں لگ رہا کہ ہم میں سے کوئی یہاں سے زندہ جاسکے گا۔“

”ہاں کوئی ایک۔“ ایلس نے اس کی تائید کی۔

”تمہارا مطلب ہے یہ صرف فاتح کو جانے دے گا؟“

ایلس نے سر ہلایا۔ ”مجھے لگ رہا ہے ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔“

ایلس کو کہتے ہوئے خیال آیا کہ اس سے پہلے بھی یہاں یہ کھیل کھیلا جاتا رہا ہے۔ مسٹر کاریل ایک کھیل کا فاتح تھا۔ سوال یہ تھا کہ یہاں سے جانے والے انگرمین کا راز کیوں فاش نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کا ساتھ دیتے تھے۔ کم سے کم کاریل تو ایسا ہی کر رہا تھا۔ دس منٹ پورے ہوتے ہی انگرمین لوٹ آیا تھا۔ وہ بہت پرجوش لگ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”اب آخری مرحلہ آگیا ہے۔ اس بار تم دونوں کو اپنی ذہانت استعمال کرنی پڑے گی۔ میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔“

روز نے ایلس اور سائمن کے سامنے لمبی سی پٹی رکھی جس کے وسط میں بیل لگی تھی اور دونوں سروں پر دو بٹن تھے۔ ہر بٹن کے سامنے ایک چھوٹا سا ایل ای ڈی بلب لگا تھا۔ روز پیچھے ہٹا تو انگرمین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”سوال سننے کے بعد تم دونوں کو غور کرنا ہوگا۔ جس کے ذہن میں درست جواب آئے تو وہ بٹن دبائے گا۔ بٹن دباتے ہی اس کے سامنے موجود ایل ای ڈی سرخ ہو جائے گا اور بیل بجے گی۔ کامیاب ہونے والے کو جواب کا موقع دیا جائے گا، لیکن اگر اس نے غلط جواب دیا تو وہ ہار جائے گا اور دوسرا مقابلہ جیت جائے گا۔ اس لیے بٹن دبانے سے پہلے یقین کر لینا کہ ذہن میں آنے والا جواب درست ہے۔ تم دونوں میری بات سمجھ گئے ہو؟“

انہوں نے سر ہلایا۔ ایلس نے کہا۔ ”کیا سوال موجودہ سچویشن کے بارے میں ہے؟“

”بالکل، یہ کوئی کوئز شو نہیں ہے کہ تم سے جنرل نالج کا سوال پوچھا جائے۔“ انگرمین نے سر ہلایا۔ ”اب غور سے سنو، سوال یہ ہے کہ میں ایک ملین پاؤنڈز کے فاتح کو یہاں سے زندہ جانے کی اجازت کیوں دوں گا جب کہ وہ یہاں ہونے والے واقعات کا عینی گواہ ہوگا؟“

ایلس اور سائمن کے ہاتھ پہلے سے بٹن پر تھے۔ انگرمین کے سوال نے انہیں کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ اس کا اظہار ان کے تاثرات سے ہو رہا تھا۔ ایلس تیزی سے سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے بٹن دبا دیا۔ بیل بجی اور اس کے سامنے کا ایل ای ڈی روشن ہو گیا۔ سائمن کے چہرے پر مایوسی آگئی تھی۔ انگرمین نے ایلس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ویل مس اسمتھ تم نے یقیناً سوچ سمجھ کر بٹن دبایا ہوگا۔“

ایلس نے سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”تم فاتح کو کسی ایسے جرم میں ملوث کر دیتے ہو جس کے بعد باہر جا کر اس کے لیے زبان کھولنا ممکن نہیں رہتا ہے۔“

انگرمین نے بے ساختہ تالی بجائی۔ ”لاجواب مس اسمتھ...... تم نے بالکل درست جواب دیا ہے۔“

”یعنی میں اس مقابلے کی فاتح ہوں۔“ ایلس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر انگرمین کو نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر اس کا سکون غارت ہوگیا۔

”نہیں مس اسمتھ ابھی ایک آخری مرحلہ باقی ہے۔“ وہ بولا۔ روز آگے آیا اور اس نے اپنے کوٹ سے ایک لمبی نال والا قدیم زمانے کا پستول نکالا۔ اس کا دستہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور نال کسی چھوٹی رائفل کی طرح لمبی تھی۔ اس میں صرف ایک بلٹ آتا تھا۔ اس نے پہلے اپنا پستول نکالا اور پھر پرانا پستول ایلس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کانپنے لگی تھی۔ انگرمین نے اس کی طرف دیکھا۔ ”مس اسمتھ ایک راستہ یہ ہے کہ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ زندہ سلامت، مگر ایک بھی پاؤنڈ کے بغیر اور دوسرا راستہ ہے۔“ انگرمین ڈرامائی انداز میں رکا۔ ”تم مسٹر نورڈ کو شوٹ کر دو اور ایک ملین پاؤنڈز لے کر چلی جاؤ۔“

ایلس تو کانپ ہی رہی تھی سائمن بھی لرز اٹھا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ ناانصافی ہے، تم جان بوجھ کر مجھے مروانا چاہتے ہو۔“

”میں نے کہا ہے نا کہ مس اسمتھ اگر ایک ملین پاؤنڈز سے دست بردار ہو جائے تو تم دونوں یہاں سے زندہ جاسکتے ہو۔“

”ایلس پلیز...... یہ پاگل پن ہے تم مجھے قتل نہیں کر سکتیں...... دیکھو ہمارے پاس زندہ رہنے کا موقع ہے۔ پلیز...... پلیز۔“

سائمن کی آواز فائر کے دھماکے میں ڈوب گئی تھی۔ ایلس کی آنکھیں بند تھیں اور اب اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اسے معلوم نہیں ہوا کہ کب روز نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا۔ پھر تالیوں کی آواز سے وہ چونکی۔ انگرمین، روز اور دونوں ملازم تالیاں بجا رہے تھے، اسے مبارک دے رہے تھے کہ اس نے مقابلہ اور ایک ملین پاؤنڈز جیت لیے تھے۔ خاص طور سے انگرمین بہت خوش تھا۔ اس نے آگے آ کر ایلس کا شانہ تھپکا۔ ”مس اسمتھ تم نے کمال کر دیا۔“

تب ایلس نے دیکھا سائمن اپنی نشست پر ساکت پڑا تھا اور اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ کے اردگرد سرخ دھبا تھا جو لحہ بہ لحہ پھیل رہا تھا۔ انگرمین نے ایلس کو بازو سے تھام کر اٹھایا اور ایک نشست گاہ میں لے آیا۔ صوفے پر بٹھا کر اس نے اسے ایک گلاس میں برانڈی پیش کی جو ایلس نے ایک ہی سانس میں پی لی۔ اسے اس کی ضرورت بھی تھی۔ اسی دوران میں روز ایک بیگ لے آیا۔ اس قیمتی چرمی بیگ میں سلیقے سے پچاس پاؤنڈز والی دو سو گڈیاں رکھی تھیں۔ یہ ایک ملین پاؤنڈز کی رقم تھی جس کی خاطر ایلس بھیانک مرحلوں سے گزری تھی اور بالآخر اس نے ایک آدمی کی جان لے لی تھی۔ جب سائمن اس سے زندگی کی التجا کر رہا تھا تو اس کے ذہن میں کوون کا خیال تھا اگر وہ ایک ملین پاؤنڈز لیے بغیر چلی جاتی تو کوون زندہ نہ رہتا۔ اس خیال نے اسے مجبور کر دیا تھا اور اس نے گولی چلا دی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کیسے گولی ٹھیک سائمن کے دل میں اتر گئی۔ شاید اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”مس اسمتھ تم چیک کر لو یہ پوری ایک ملین پاؤنڈز کی رقم ہے۔“ انگرمین نے کہا۔ ”اس کے ساتھ تمہارے پانچ ہزار پاؤنڈز اور جم کے پچاس ہزار پاؤنڈز بھی اب تمہارے ہیں۔ تم انہیں بونس سمجھ لو۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو ایلس شاید ایک ہزار پاؤنڈز پا کر بھی خوشی سے پاگل ہو جاتی لیکن اس وقت ایک ملین اور پچپن ہزار پاؤنڈز کی خطیر رقم وصول کر کے بھی اس کے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کسی دوا کے اثر سے اس کا ذہن اور جسم سن ہو گیا تھا۔ اس نے رقم والا بیگ شانے پر تھاما اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ انگرمین اسے چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ ڈرائیور پورچ میں کار کے پاس کھڑا تھا۔ جانے سے پہلے ایلس نے انگرمین کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟“

”ضرور؟“

”تم یہ سب کس لیے کرتے ہو مسٹر انگرمین؟“

انگرمین نے اس کی طرف دیکھا اور تعجب سے بولا۔ ”کیا تم سمجھیں نہیں، میرے پاس دولت ہے اور میں یہ سب افورڈ کر سکتا ہوں۔ یہ میری تسکین ہے اور میرا شوق ہے۔“

ایلس نے سر ہلایا اور کار کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائیور نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ ڈھائی گھنٹے بعد وہ گھر کے سامنے اتری تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ سست قدموں سے اندر آئی۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے کوون کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بستر پر کھڑکی کی طرف رخ کیے سو رہا تھا۔ ایلس دبے قدموں اپنے کمرے میں آئی۔ پہلے اس نے اپنا خون آلود اور خراب ہو جانے والا لباس اتارا۔ زخم کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس نے شاور لے کر پہلے زخم کی ڈریسنگ کی۔ دردکش دوا لے کر وہ لیٹی تو اسے خبر بھی نہیں ہوئی وہ کب سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو ڈھلتے سورج کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ اس کے پہلو کی تکلیف کم تھی۔ اسے کوون کا خیال آیا وہ اٹھ کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ بہ دستور پہلے والے انداز میں سو رہا تھا۔ ایلس کا دل دھڑک اٹھا اور وہ تیزی سے کوون کے پاس آئی۔

”کوون۔“ اس نے اسے ہلایا تو وہ بے جان انداز میں سیدھا ہو گیا۔ ایلس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بے تابی سے کوون کی نبض چیک کی۔ نبض ساکت تھی اور جسم سرد تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ تب ایلس کی نظر اس کے بستر پر پڑی خواب آور دوا کی خالی شیشی پر گئی۔ کوون کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرچہ دبا ہوا تھا۔ ایلس نے دھندلاتی نظروں سے پرچہ نکال کر دیکھا، اس پر لکھا تھا۔

”میری پیاری بہن، اب میں تمہیں اور پریشان نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دینا۔“

ایلس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے لگا وہ جیتی نہیں بلکہ ہار گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے آنسو صاف کیے، دیوار پر لگے فون تک آئی اور پولیس کا نمبر ملانے لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر : 16

گل و گلزار سے راہِ پر خار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبری رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا۔ ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہر کارہ وہ ڈاکٹر شاہ جی

بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا ور یام خان چونکہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنا دیا۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیر علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ غلط فہمی میں اس نے مجھے مارنا چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب و لہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزماتے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اس دوران اس کے اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ہبلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیانا ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائیداد کی خاطر، بخت جان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا وہ میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے واپسی پر اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موبی کا دوست زور آور تھا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائیداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکریہ ادا کر کے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ میں نے ضد کر کے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس کے بعد ہمارا ٹکراؤ پولیس سے ہو گیا۔ اس سے گلوخلاصی کے بعد کچھ فرصت کے لمحات میسر آئے تھے کہ پیرو ماچھی کا غنڈا امداد بخش میڈم پر ایک ڈنڈے سے وار کر گیا۔ اس پر بہ مشکل قابو پا کر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا وہاں ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پا کر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرا انور بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی پناہ کی درخواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو اپنے بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرا رہے تھے کہ پیرو ماچھی نے ہمیں للکارا جو دریا پار سے واپس آ چکا تھا اور [illegible]

گہری نیند میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک بچہ اللہ دتا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نور پور جا کر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نور پور پہنچا۔ کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک بل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہو گیا وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کر کے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز خانزادی کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے تہ خانے کا دہانہ تلاش کیا۔ تہ خانے میں برکت مسیح سے مڈبھیڑ ہوئی اسے سخت تنگ و دو کے بعد یرغمال بنا کر ماں جی اور سیمو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نورن کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آ گیا۔ خانزادی کو میں نے کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیمو کی تلاش میں نورن آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کر کے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے ماں باپ کے قاتل رنگو قسائی کو اس نے اٹھوا لیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ کر کے اس ہوٹل میں ملاقات طے کر لی حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھوا لینا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا طے کیا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں میڈم بڑی منتظر تھی۔ پھر سنگین و رنگین لمحات کے دوران میڈم شکیلہ نے اپنے ماضی کے اوراق سے پردہ اٹھایا کہ وہ ایک امیر زادی کی ناجائز اولاد تھی اور ایک چوکی پر دریا میں بہتی ہوئی مچھیرے گامن کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا۔ امیر زادی کو بھی اس کا علم ہو گیا اور اس نے اس کی تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ گامن نے اسے اسکول میں داخل کرایا اور اس کو چندو ماہی کے نام سے پکارنے لگا۔ جوان ہونے پر میر ظفر حیات کے بیٹے عمر حیات نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش کی جس کی شکایت اس کے باپ سے کی گئی صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا عمر حیات اس کا قصوروار گامن اور چندو کو ٹھہراتا تھا اور انتقام پر بضد تھا اسی کوشش میں اس نے گامن کو فائر کر کے زخمی کر دیا۔ مجبوراً چندو اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی جہاں اس نے اسے مارا پیٹا پھر شرمندہ ہوا اور اسے واپس چھوڑ گیا لیکن گامن اور اس کا گھرانا سخت ناراض تھا۔ عمر حیات نے اسے اپنانے کا عہد کیا اور اسے کورٹ میرج کے لیے ساتھ لے گیا اور دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے تھے کہ اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی انہوں نے دروازے پر دیکھا تو بھونچکا رہ گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ چہرہ خوفناک تھا، نہ بدصورت مگر اس کی دہشت سے چندو ماہی کا جسم لرزنے لگا تھا۔ عمر حیات کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا تھا۔ ہکلا کر بولا۔ ”بب...... بی بی اماں آپ؟“

اس کی قریبی بائیں ماں کولھوں پہ ہاتھ رکھے، غیظ و غضب سے سرخ چہرہ لیے خشمگیں نظروں سے چندو ماہی کو گھور رہی تھی۔ اس کے عقب میں عمر حیات کی دو بڑی بہنیں جھانک رہی تھیں۔ ان کا انداز بھی خاصا جارحانہ تھا۔ ماں کے لب کشا ہونے تو اس کے اندر کا دکھ، افسوس اور غصہ چھلک گیا، بولی۔ ”عمر حیات! میں نے کہا تھا ناں کہ میں تمہارے بابا کے بعد کوئی دکھ دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم بددعا نہ دینے کا وعدہ لے کر خاندان کا منہ کالا کرنے نکل کھڑے ہوئے۔“

ماں نے کمرے کے اندر قدم رکھا۔ عمر حیات چارپائیوں کے بیچ سے گزر کر تیزی سے ماں اور چندو کے بیچ حائل ہو گیا، بولا۔ ”اماں! آپ گھر چلیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“

ماں کے عقب سے بڑی بہن طنز سے بھرپور لہجے میں بولی۔ ”ہاں بی بی اماں! لاڈلے کی بات مان لیں۔ بے چارہ کتنی محنت سے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں باجی! میں چکر نہیں دے رہا۔ تم اماں کو لے کر گھر جاؤ۔ میں شام کو حویلی آؤں گا۔“

ماں نے اُسے دھکا دے کر ایک جانب ہٹایا اور چندو تک پہنچ گئی۔ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ کر دبی آواز میں چیخی۔ ”کم ذات! اس وقت تو تُو کہہ رہی تھی کہ بی بی سائیں! اپنے بیٹے کو سمجھائیں، وہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کر لے۔ پھر اَب کیا لینے کے لیے یہاں آئی ہے؟“

چندو نے ہونٹ بھینچ کر درد برداشت کیا اور مدد طلب نظروں سے عمر حیات کو دیکھا۔ وہ جلدی سے قریب آ گیا۔ ماں کا ہاتھ تھام کر ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ”بی بی اماں! اس بے چاری کو چھوڑ دیجیے۔ اس کا کوئی قصور نہیں، میں اِسے یہاں لایا ہوں۔“

بیٹے نے پہلی مرتبہ احتجاجاً ماں کا ہاتھ تھاما تھا۔ گرفت سخت تھی۔ اجنبی سی لگی۔ حیرت بھری برہمی سے دیکھنے لگی، بولی۔ ”میرا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ تم پر اُٹھ جائے گا۔“

وہ ماں کی نافرمانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی پناہ گزین کا استحصال بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تبھی آنکھوں میں التجا بھر کر ماں کو ایک ٹک دیکھنے لگا۔ آنکھوں سے سمجھانے لگا کہ وہ مصیبت میں ہے۔ بیٹے کی مصیبت کو ماں کے علاوہ کون سمجھ سکتا تھا۔ سمجھ گئی۔ آہستہ آہستہ مٹھی کھولنے لگی۔ بیٹے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو شکست خوردہ انداز میں دیکھنے لگی، بولی۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

بڑی بہن نے فرش پر تھوکا۔ ''ایک گندی لڑکی کی خاطر تم نے اپنی ماں کا ہاتھ تھاما۔ تف ہے تم پر!''

دوسری نے ہونٹ نفرت سے سکیڑے۔ ''اگر آج بابا زندہ ہوتے تو تمہیں زندہ نہ چھوڑتے۔''

وہ آنکھیں جھپکے بغیر بولا۔ ''بی بی! میں نے واقعی اچھا نہیں کیا۔ مگر آپ نے بھی اچھا نہیں کیا جو یہاں تک چلی آئیں۔ بیٹے کے جرم کو دیکھے بغیر پردہ ڈال دیتیں تو آپ کا ہاتھ تھامنے کی گستاخی سے بچ جاتا۔''

ماں بیٹے کو جنتی ہے۔ پہلی نظر دیکھتی ہے تو پھر جیتنا بھول جاتی ہے، ہارنا سیکھ جاتی ہے۔ وہ بھی ہار گئی۔ بے جان انداز میں ہاتھ چھڑا کر ہانپتی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سر جھک گیا۔ عمر حیات کی دونوں بہنیں کولھوں پر ہاتھ رکھے نفرت سے عمر اور چندو کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ دونوں مجرم تھے۔ تبھی سر جھکائے کھڑے تھے۔ بی بی اماں بولی۔ ''میر زادے! آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ سلطنت ہاتھ سے نکل جاتی ہے جب سائیں رخصت ہو جاتا ہے۔ بیٹا بہت کچھ ہوتا ہے پر ماں کا مان نہیں ہوتا۔ تم بھی نہیں ہو۔ اب مجھے وہ پٹی پڑھاؤ جو اس حرام کی چھوکری کی خاطر پڑھانا چاہتے ہو تاکہ میں بے وقوف بن کر یہاں سے چلی جاؤں۔ خالی جھولی لیے۔''

چندو زمین میں گڑ گئی۔ عمر حیات کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''اس سے بہتر تھا کہ آپ نے بی بی سائیں کا ہاتھ نہ تھاما ہوتا۔''

اُس نے ترحم طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔ کن انکھیوں سے چندو کو دیکھا پھر ماں کے قدموں میں جھک گیا۔ دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ''بی بی اماں! آپ اِسے دوبارہ یہ طعنہ نہیں دیں گی ورنہ میں آپ کی زندگی سے بہت دور چلا جاؤں گا۔''

ماں کو اچنبھا نہیں ہوا۔ تو خیز عشق یہی دھمکی دے سکتا تھا۔ آزردگی سے مسکرائی، بولی۔ ''ہاں بیٹا! ایک یہی دکھ باقی ہے جو تم نے آج نہیں دیا۔ کل دے دو گے۔ ٹھیک ہے۔ یہ بھی جھیل لوں گی۔''

اس نے ماں کے طعنے کو نظر انداز کیا، بولا۔ ''بی بی اماں! اگر آپ شام تک کا انتظار نہیں کر سکتیں تو ان دونوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیں۔ میں ابھی ساری بات بتا دیتا ہوں۔''

بی بی نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ وہ نفرت بھری نگاہ چندو پر ڈال کر صحن میں چلی گئیں۔ عمر حیات نے اپنا سر ماں کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور ٹیپ پلیئر کی طرح بولنے لگا۔ پہلی نظر سے آخری واردات تک اُس نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ خاموش ہونے سے پہلے بولا۔ ''بی بی! بابا کہتے تھے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ کے اوپر ہوتا ہے۔ ظرف والا کبھی کم ظرفوں کی قطار میں نہیں کھڑا ہوتا۔ میں اُسی بابا کا خون ہوں۔ میں نے نادانی میں ایک جرم کیا جس کی پاداش میں گامن کا گھر تباہ ہو گیا۔ میرا بابا روٹھ گیا۔ میں مجرم ہوں۔ مجرم کو اپنی سزا خود ہی تجویز کر لینی چاہیے اور قبول بھی۔ یہی بابا نے سمجھایا تھا مجھے...... میں چندو ماہی کا مجرم ہوں۔ یہ بولتی نہیں ہے۔ میں سچ کہنے سے ڈرتا نہیں ہوں۔ سچ کہتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کے لیے عمر قید کی سزا تجویز کر لی ہے۔ میں نے چندو ماہی کو اپنی دلہن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں گی، دعاؤں کا ساتھ دے دیں گی تو میں زندہ رہوں گا۔ اگر ہاتھ کھینچ لیں گی تو نہ صرف زندگی بلکہ میری سزا کا دورانیہ بھی کم ہو جائے گا اور میں وقت سے پہلے مر جاؤں گا۔''

ماں تڑپ کر رہ گئی۔ چندو کو بہ نظر غور دیکھنے لگی۔ بیٹے کے بال مٹھی میں بھر کر جھٹکے دینے لگی، بولی۔ ''فیصلہ کرتے ہوئے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ تم کتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ اس چھوہر (لڑکی) کا آگا پیچھا خالی ہے۔ بیاہ کر حویلی میں جائے گی تو ہر کوئی ہم پر تھو تھو کرے گا۔ رشتہ دار حویلی میں قدم نہیں رکھیں گے۔ کیا زمانے سے کٹ کر زندگی گزاری جاسکتی ہے؟''

وہ عزم سے بولا۔ ''اگر میں اس لیے بڑا گنا جاتا ہوں کہ میرا باپ بڑا تھا تو کیا چندو میرے نام سے بڑی نہیں ہو جائے گی؟''

''نہیں بیٹا! نام و نسب اور شادی میں بڑا فرق ہے۔''

بیٹا اَڑ گیا۔ ''نسب تو نسبت کا عنوان ہے۔ جب چندو میری نسبت سے دیکھی جائے گی تو حویلی کی سائیں قرار پائے گی۔ تب کون انگلی اُٹھائے گا؟''

''پورا وسیب جانتا ہے کہ چندو بن باپ کی چھوہر ہے۔ اس بات کو چھپایا نہیں جاسکتا۔''

''بی بی اماں! انصاف کرو۔ کیا چندو کو اس جرم کی سزا دی جاسکتی ہے جو اس نے کیا ہی نہیں؟''

''انصاف خدا کرتا ہے۔ کیا گونگا یا بہرا پیدا ہونے والا بچہ از خود ادھورا ہوتا ہے؟... تمام عمر معذوری کی سزا تو اُسے

جھیلنا ہی پڑتی ہے۔ اِس کو بھی ساری عمر یہ طعنہ جھیلنا ہے۔''

''اگر یہ حویلی میں نہیں جاسکتی تو میں اِسے کہیں اور لے جاتا ہوں جہاں اس کے ماضی پر لاعلمی کا پردہ پڑ جائے گا۔ جہاں اِسے رہنے کی اجازت مل جائے گی، میں وہیں حویلی بنا لوں گا۔ تب تو آپ کو گلہ نہیں ہوگا ناں؟''

''کیا ماں اور چار بہنوں کو چھوڑ دو گے؟'' ماں کی آنکھیں استعجاب آمیز دکھ سے پھیل گئیں۔

''نہیں...... میں سب کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''ایک لڑکی کے لیے وسیب چھوڑ دو گے؟''

''وسیب تو کیا...... اماں! میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ کو میری بات کی سمجھ کیوں نہیں آ رہی۔'' اس کے لہجے میں عجیب عزم آمیز بے بسی رچ گئی۔ ماں کو اُمید بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ مجھے گھر سے نکال دیں، ماریں، پیٹیں، جو چاہیں، میرے ساتھ کریں، آپ کو حق ہے...... مگر خدا کے لیے! مجھ پر دعا کا دروازہ بند نہ کریں۔''

ماں کا دل پسیج گیا۔ اُسے کھینچ کر چھاتی میں چھپاتے ہوئے بولی۔ ''میرا دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ میر صاحب زندہ ہوتے تو مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ اب پتا گرے تو دل خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اگر تم نے چندو کو ہی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں اس فیصلے کو قبول کرنے کا اعلان کرتی ہوں مگر تم دونوں کو میری ایک بات ماننا ہو گی۔ بولو...... منظور ہے؟''

دونوں نے یکبارگی اثبات میں سر ہلایا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں...... ایسے نہیں۔ منہ سے اقرار کرو۔''

دونوں نے بہ یک وقت کہا۔ ''منظور ہے۔''

ماں نے تین مرتبہ اقرار لیا۔ پھر کہا۔ ''میرا حکم یہ ہے کہ تمہاری شادی تین چار سال بعد ہوگی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری بہو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ میچور ہو۔''

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا، عمر بولا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں وہی کہہ رہی ہوں جو اس موقع پر موزوں ترین ہے۔ دیکھو بیٹا! سیانے کہتے ہیں کہ پھل موسم کا اور شادی جوانی کی اچھی لگتی ہے۔ تم دونوں کم عمر ہو۔ شادی کے قابل نہیں ہو۔ چندو ماہی گریجویشن کر لے، تب میں اپنے ہاتھوں بڑی دھوم دھام سے تمہاری شادی کروں گی۔''

عمر نے سوچا۔ چندو کے گریجویشن کرنے میں پانچ سال کا عرصہ حائل تھا۔ عشق کی سولی پر چڑھ کر اتنا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کن انکھیوں سے چندو کو دیکھا۔ اُس نے آنکھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ بی بی کا کہنا مان لو۔ وہ بولا۔ ''آپ شاید بھول گئی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ چندو ماہی کو واپس نہیں بھیجا جاسکتا۔ گامن نے اِس پر اپنا دروازہ بند کر دیا ہے۔''

بی بی اماں بولی۔ ''تو کیا ہوا؟ یہ واپس نہیں جائے گی۔ میں اسے اپنی حویلی میں لے جاؤں گی۔ میٹرک کے بعد کالج میں داخل کراؤں گی۔ اس کی خواہش ہوئی تو ملتان میں بھی رہ سکتی ہے۔ پڑھنے کے بعد پھر حویلی کی رانی بنا کر لے آؤں گی۔ تب تک لوگوں کی حیرانی بھی کمزور ہو چکی ہو گی۔''

عمر نے انکار کیا۔ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''نہیں بی بی! آپ مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ وقت لے رہی ہیں تاکہ میرے سر سے چندو کے عشق کا بھوت اُتار سکیں۔ یہاں آپ غلطی پر ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ایسا ہی سہی۔ محبت وقت کی محتاج نہیں ہوتی۔ تم مجھ پر اپنی محبت کی سچائی ثابت کرو۔ انتظار کی طاقت سے میرے دھوکے کا توڑ کرو۔''

''نہیں بی بی! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔''

''تم نے میری بات منظور کرنے کا تین مرتبہ اقرار کیا ہے۔ پاؤں پر مکر گئے ہو۔ الٹا مجھے دھوکے باز کہہ رہے ہو۔'' ماں کے لہجے میں گہری کاٹ چھپی تھی۔

''دل کو آپ پر یقین نہیں آ رہا۔''

''نہ کرو۔ اپنی محبت پر یقین کر کے چندو کو حویلی میں لے چلو۔ اگر تم چار پانچ سال بعد بھی چندو سے محبت کا دعویٰ کرو گے تو تمہیں کوئی روک نہیں پائے گا۔ ہم بالکل ایسے ہی لاچار ہوں گے، جیسے آج ہم سب تمہارے فیصلے کے سامنے بے بس ہیں۔'' بی بی اماں نے اُس کی محبت کو للکارا اور کہا۔ ''دیکھو بیٹے! کیا تم نہیں چاہو گے کہ تمہاری بیوی پڑھی لکھی ہو۔ کچے سونے کے بجائے کندن ہو۔ یقیناً اپنی محبت کو ہر مرد خوبصورت اور معتبر دیکھنا چاہتا ہے۔ میرا بھی ارمان ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لڑکی میری بہو بنے جسے زمانہ رَشک کر دیکھنے پر مجبور ہو اور میر زادی کہہ کر پکارتے ہوئے کسی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نہ ہو۔''

چندو نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ''میکوں منظور ہے۔''

(مجھے منظور ہے)

بی بی نے اُسے خوشی اور مان سے دیکھا، بولی۔ ''یہ ہوئی ناں عقل مندی کی بات...... اب اپنے دیوانے کو بھی سمجھاؤ کہ میری بات مان لے۔ تین قول دے کر مکرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

والے کو خدا بھی معاف نہیں کرتا۔"

چندو ماہی کی ملتمس نظریں اپنے دیوانے پر اُٹھیں۔ چند لمحے ایک ٹک دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "بی بی سائین کی بات مان جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔"

اُس کے چہرے پر تذبذب رقم ہو گیا۔ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر بولا۔ "جن پتوں پر تکیہ ہو، وہی ہوا دینے لگیں تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے بی بی اماں! میں آپ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر میری چندو ماہی کے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی تو میں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہوں گا۔"

ماں نے ایک نظر اپنی سرخی مائل کلائی کو دیکھا جس پر بیٹے کی مضبوط گرفت ثبت ہو گئی تھی۔ اسی گرفت نے سمجھا دیا تھا کہ سختی کرو گی تو شیشے کو توڑ بیٹھو گی۔ تبھی وہ پینترا بدلنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ "وہ محبت نہیں، جرم ہے جو دو گھروں کو برباد اور بدنام کر دے۔ وہ بے حیائی ہوتی ہے۔ میر ظفر حیات کے خون میں ایسی محبت نہیں پل سکتی۔ یہ مجھے یقین تھا۔ اسی یقین کی لاٹھی ٹیکتے ہوئے حویلی جا رہی ہوں۔ تم دونوں کو شام تک سوچنے کی مہلت دیتی ہوں۔ اکیلے بیٹھو گے تو میری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اگر تم لوگ خاندان کو بدنامی اور رسوائی سے بچانا چاہو تو حویلی آ جانا ورنہ جہاں جی چاہے، چلے جانا۔ میں چند دن رو دھو کر صبر کر لوں گی۔ عمر حیات! تمہاری بہنیں بھی سوچ لیں گی کہ اُن کا کوئی بھائی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اَب میں چلتی ہوں۔"

ماں بیٹے کو گنوانے نہیں، لینے کے لیے آئی تھی مگر چندو کی جھولی میں ڈال کر جانے لگی تھی۔ چندو اُس کے قدموں میں جھک گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ "بی بی سائین! آپ جو کہیں گی، ہم وہی کریں گے۔"

بی بی نے پیروں میں بیٹھی ہوئی چندو کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ دیکھا۔ وہی تھی جو کبھی آنکھوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔ وہی تھی جس کی تعریفیں آپوں آپ ہی اس کے لبوں سے پھوٹنے لگتی تھیں۔ اُسے یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ اُس نے میر ظفر حیات سے کہا تھا۔ "میر صاحب! اگر ممکن ہو تو آپ گامن سے چندو ماہی کو گود لے لیں۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ جہاں میری چار بیٹیاں ہیں، وہیں اُسے پانچویں سمجھ لوں گی۔"

میر صاحب نے ہنس کر کہا تھا۔ "تم نے گامن کی محبت کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ایسی بات تمہارے لبوں پر نہ آتی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ کتنے لاڈ اور شوق سے اپنی چندو کو کاندھے پر بٹھائے اسکول لے جا رہا تھا۔ پھر واپسی پر میں نے تمہیں دکھایا تھا کہ گامن کس طرح بے وقوفوں کی طرح ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اسکول کی چار دیواری کے اوپر سے اپنی چندو کو پڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہیں؟ کملی نہ بنو۔"

"میر صاحب! وہ وہاں رُل جائے گی۔ میں اُسے حویلی میں رانی بنا کر رکھوں گی۔ بہت پڑھاؤں گی۔"

میر صاحب نے سمجھایا تھا۔ "نہیں! تم اُسے اچھا ماحول دے سکتی ہو، زمانے بھر کی نعمتیں دے سکتی ہو مگر وہ پیار نہیں دے سکتیں جو گامن اُس پر نچھاور کر رہا ہے۔"

وہی چندو ماہی اُس کے سامنے آنسوؤں سے دھلا چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اُس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ گالوں پر ہاتھ رکھے، پیشانی چومی اور بے اختیار سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے بالوں کو درشتی سے پکڑ کر کھینچنا چاہا تھا تو بیٹا حائل ہو گیا تھا۔ اَب پیار سے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی تو بیٹے کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ دنیا ایسے ہی پل پل بدلتی ہے۔ کبھی اُٹھا کر پستی میں پٹخ دیتی ہے۔ کبھی پلکوں پر بٹھا کر عرش نشین کر دیتی ہے۔ فلک کی بلندیاں چھونے والی چندو ماہی نے کہا۔ "بی بی سائین! میری جان بھی آپ کے لیے حاضر ہے۔"

عمر حیات نے اپنا چہرہ ماں کے دوسرے شانے پر رکھ دیا۔ "اماں! مجھے یقین تھا کہ ساری دنیا بھلے میری دشمن ہو جائے، آپ میرا ساتھ دیں گی۔"

بی بی نے دونوں کو پیار کر کے آہستگی سے علیحدہ کیا اور شام تک گھر پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے صحن کا رُخ کیا جہاں عمر کی بہنیں چہل قدمی کرتے کرتے تھک کر ایک جانب بیٹھ کر محو گفتگو ہو گئی تھیں۔ ماں کمرے سے اکیلی نکلی تو دونوں کا دل ہول اُٹھا۔ بھاگ کر قریب آئیں۔ فکر سے پوچھنے لگیں۔ ماں کے چہرے پر شکست تحریر تھی مگر زبان 'سب ٹھیک ہے' کا راگ الاپ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ماں کے پیچھے چل پڑیں۔

عمر حیات نے سکھ کی سانس لی۔ چندو کو چارپائی پر بٹھا کر بولا۔ "فکر نہ کرو۔ میں ہوں ناں!"

اس نے سر ہلایا۔ بیٹھ کر بے دھیانی میں ڈوپٹے سے کھیلنے لگی۔ وہ بولا۔ "چندو ماہی! بی بی اماں دل کی بری نہیں۔ وہ کیا ہے کہ اولاد بغاوت پر اُتر آئے تو بھی والدین کو غصہ آتا ہے۔ اُتر بھی جاتا ہے۔ گامن بھی ایک دن سب

کچھ بھول کر تمہیں یاد کرنے بیٹھ جائے گا۔"

کسی کی نظروں میں گرنا اور بے توقیر ہونا چندو ماہی کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ سر ہلا کر بولی۔ "میں سمجھتی ہوں۔"

"تم میرے ساتھ حویلی میں رہو گی۔ پڑھنے کے لیے میری بہنوں کے ساتھ روزانہ شہر آیا کرو گی۔ میری ایک بہن ملتان میں پڑھتی ہے۔ میں دیکھوں گا، اگر میرے گھر والوں کا رویہ نامناسب ہوا تو تمہیں اس کے پاس ملتان بھیج دوں گا۔ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو میں تمہاری علیحدہ رہائش اور تعلیم کا مناسب بندوبست کر دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

اس نے عمر حیات کو بھرپور انداز میں دیکھا۔ لفظ لفظ جذباتی آمیز تھا۔ اس کی محبت پر فخر کا احساس ہوا، بولی۔ "تم میرے ساتھ ہو گے، جانتی ہوں مگر نہ جانے کیوں دل میں ڈر سا بیٹھا ہوا ہے۔ میں حویلی کو اپنا گھر سمجھوں گی۔ ویسے ہی، جیسے بابا کے گھر کو سمجھتی تھی مگر...... مگر کہیں یہ نہ ہو کہ مجھے دھتکار کر نکال دیا جائے۔"

عمر حیات نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ چوما۔ محبت پیش رفت کا سبق سکھاتی ہے۔ آگے بڑھا۔ اُس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھر کر وارفتگی سے بولا۔ "میری محبت پر بھلے یقین نہ رکھو مگر اپنے چاند جیسے چہرے پر بھروسا رکھو۔ اپنی آنکھوں پر یقین رکھو۔ ان کا شکار ہونے والا عمر حیات کبھی آزاد نہیں ہو پائے گا۔ اپنی ہر پرواز کے اختتام پر ستانے کے لیے اسی تاج محل کا رُخ کرے گا۔"

وہ عمر حیات کی گرفت سے نکلنا چاہتی تھی۔ دل کم بخت اس کے لمس کو سراہنے لگا تھا۔ کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو کر ساکت کھڑی اپنے وجیہہ دیوانے کو دیکھتی رہی۔ اس نے ماتھے پر بل کھا کر بکھری زلفوں کی لٹ کو چوما، بالوں میں جان پڑ گئی۔ دیوانے نے بند پلکوں پر اپنی دیوانگی بڑی نرمی سے ثبت کی۔ آنکھیں زندہ ہو گئیں۔ وہ ٹوٹ کر توڑنے والے کے سینے سے لگ گئی۔ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ یوں جیسے بدن کی جان سانسوں کی سیڑھی چڑھ کر ایک دم بلند ہونے لگی ہو۔

عمر حیات نے جذبات سے مغلوب آواز میں سمجھایا۔ "چندو! تمہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے جدا نہیں کر سکتی......"

اُس نے بات اُچک لی۔ شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "خدا بھی نہیں؟"

وہ ٹھٹک کر سوچ میں پڑ گیا۔ بھلے چندو کا سوال شرارت پر مبنی تھا مگر سوچ کے کئی در کھول رہا تھا۔ اس نے خدا کے بارے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔ بن دیکھے یقین کی دولت حاصل کر چکا تھا۔ جانتا تھا کہ خدا کے حکم کے مقابل میں اُس کی ہستی بہت کمزور تھی مگر چندو ماہی کی شرارت بھری آنکھوں کے وار کو روکنا ضروری تھا، بولا۔ "خدا سب کچھ کر سکتا ہے مگر تم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اگر اُس نے مجھ سے میری چندو ماہی کو چھیننا ہوتا تو میرے دل میں عشق کی رمق کیوں پیدا کرتا؟"

جواب بڑا توانا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے ٹھوڑی کو انگلی کے سہارے پر اُٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس؟...... مجھے یقین ہے کہ خدا نے میرے دل میں تمہاری محبت اِس لیے پیدا کی ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ تمہاری تعریف کو پسند کرتا ہے۔ بی بی اماں نے ٹھیک کہا ہے کہ ابھی ہماری شادی کی عمر نہیں ہے۔ بس! تھوڑا سا انتظار میری جان! اِدھر تم گریجویشن کرو گی، اُدھر حویلی میں توتیاں بجنے لگیں گی۔"

توتی شادی پر بجتی ہے۔ خوابیدہ رات کے سناٹے میں جان ڈال دیتی ہے اور جہاں تک اس کی آواز جاتی ہے، رات بیدار ہوتی جاتی ہے۔ چندو کے دل کے تار بھی آنِ واحد میں بج اُٹھے۔ شرم سے چہرہ تمتما گیا۔ بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر بول نہ پائی اور عجیب نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

وہ دل کے بل پر بولا۔ "چندو! آئی لو یو!"

وہ خاموش رہی۔

"جب چاہنے والا 'آئی لو یو' کہے تو اس کے دل کو زندگی دینے کے لیے یہی جملہ دہرانا پڑتا ہے۔ کیا تمہیں اتنی سی بات کا بھی علم نہیں ہے؟"

وہ ہولے سے بولی، گویا گنگنائی۔ "آئی لو یو!"

محبت کا یہ نامکمل اظہار کارِ عشق میں نئی توانائی ڈال دیتا ہے۔ ان کے جنوں پرداختہ بدنوں کو بھی ایک لحظہ میں قرار سا آ گیا۔ عمر حیات نے ہاتھ سے پیکٹ اِدھر اُدھر کر کے جگہ بنائی، اُسے نرمی سے چارپائی پر لٹا دیا اور باہر والا دروازہ بند کرنے چلا گیا۔ ابھی شام ہونے میں کچھ گھڑیاں باقی تھیں۔ بھلے تشنگی زیادہ تھی، سیرابیِ جاں کے لیے مہلت کم تھی مگر جو ساعتیں میسر تھیں، انہیں چوم کر اَمر کرنا ضروری تھا۔ آنکھوں پر بازو رکھے مسکراتی ہوئی چندو ماہی کے پہلو میں آیا۔ آنکھوں پر رکھی ہوئی گداز بانہہ پر جھک کر چومتے ہوئے بولا۔ "تمہیں پہلی نظر دیکھنے والا اوسان خطا کر بیٹھتا ہے اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جب ہنگامی انتشار کا لمحہ بیت گیا، تب کفِ افسوس ملنے لگا۔ تب تک تمہارے حسن کا جادو اپنا کام دکھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

چکا تھا۔ چندو! کیا تمہیں اِس بات کا احساس ہے؟"
اُس نے ہولے سے سر انکار میں ہلایا۔

وہ بولا۔ "ہاں! قیامت کو کیا پتا، وہ کس کس کو کیسے جلا دیتی ہے۔ ہے نا؟...... تمہیں کیا پتا تمہیں دیکھنے والے پر کیا گزرتی ہے۔ بی بی اماں پر میری منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا مگر وہ تمہاری شکل دیکھ کر اپنا غصہ بھول بیٹھیں۔"

وہ دل میں گھر کر جانے والے انداز میں چندو سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ سنا رہا تھا۔ "بی بی اماں دل کی بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی دل سے لگا کر رکھیں گی۔ تم شہزادی ہو، تمہیں شہزادیوں کی طرح رکھیں گی۔ تم پری ہو، تمہاری پریوں کی طرح پذیرائی کریں گی۔ ایک ذرا غصے کی تیز ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کریں تو ان کا حق سمجھ کر قبول کرنا۔"

وہ آہستگی سے بولی۔ "ہاں! مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میری ماں بھی ایسی ہی ہے۔"

تاجاں کا خیال آتے ہی دل سے ہوک نکلی۔ گامن کا غصے بھرا چہرہ چشم تصور پر سج گیا، بولی۔ "کیا تم گامن کو راضی کرلو گے؟ وہ بھی بی بی سائیں جیسا بڑا دل رکھتا ہے۔"

"میں پیر بخش ماچھی والے حادثے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ سمجھاؤں گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا جیسا لوگوں نے آ کر اُس کے کانوں میں ڈال دیا تھا۔ لوگ باتوں کی رائی اور رائی کا پہاڑ بنانے میں بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری کوششوں سے وہ ایک نہ ایک دن سب کچھ بھول کر تمہیں کلیجے سے لگا لے گا۔" عمر حیات کے لب و لہجے میں تیقن کی مضبوط مالا جھنک رہی تھی۔

"میر زادے! تم نے شاید نہیں دیکھا تھا، میں نے دیکھا تھا کہ میر زادیاں بڑی نفرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھے حویلی میں قبول نہیں کریں گی۔" وہ تردد آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

"نہیں چندو! وہ بھی دل کی بہت اچھی ہیں۔ دیکھنا! چند دنوں بعد وہ تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی خود سے دور نہیں ہونے دیں گی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں! بالکل ایسے ہی، جیسے مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے۔"

حسن کی عادت رہی ہے کہ وہ عشق کو چھیڑنے سے باز نہیں آتا۔ وہ بھی باز نہ آئی۔ ایک ذرا مسکرا کر بولی۔ "سوچ لو! آدمی کے بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔"

وہ بنا سوچے بولا۔ "سوچ لیا! تم بھی سن لو۔ آدمی کو مرنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔"

وہ ایک دم چونکی۔ آنکھوں سے بازو ہٹا کر ایک ذرا خفگی سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھنے بڑھی۔ ہاتھ آدھی مسافت طے کر کے رُک گیا۔ اُس مسکراہٹ سمیٹ کر ہاتھ کی پشت کو دیکھنے لگی۔ عمر حیات نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ رُک کیوں گئیں؟"

"کچھ نہیں...... ایسی باتیں نہ کرو۔ مرنے میں اتنی دیر ضرور لگا لینا کہ میری عمر پوری ہو جائے اور میں تمہیں مرتا نہ دیکھوں۔"

عمر حیات نے اُس کا ہاتھ تھام کر ساحل تک پہنچا دیا۔ پھر گالوں پر رگڑتے ہوئے بولا۔ "چندو! کیا تم اُس اسکول میں پڑھو گی جس میں پہلے پڑھتی تھیں؟"

اُس کی مستفسرانہ آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "وہی جس کے گیٹ پر سے میں نے تمہیں پک کیا تھا؟"

"اوہ ہاں!" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ "مگر میں اُس اسکول میں جانا نہیں چاہتی کیونکہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ اور میری کلاس میٹ مجھے طعنے دیں گی۔"

"کیوں؟" وہ چونکا۔ "تم نے ایسا کیا کیا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کیا تھا مگر وقت نے اُس کے گلے میں بدنامی کا طوق ڈال دیا تھا۔ اس اسکول میں اسکول بیگ اُٹھا کر داخل ہونے کا خیال بڑا روح فرسا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "کچھ کیا ہے یا نہیں، بدنام ہو گئی ہوں۔"

عمر حیات نے فوراً ہی دلاسا دیا۔ "اوکے...... یہ کوئی پرابلم نہیں۔" وہ اُس کی مجبوری سمجھ گیا تھا، بولا۔ "شہر میں اور بھی کئی گرلز اسکول موجود ہیں۔ پرائیویٹ ادارے بھی ہیں۔ جس اسکول میں فائزہ پڑھتی تھی، اس اسکول کا ماحول مجھے بہت پسند ہے۔ وہیں داخلہ لے دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

فائزہ اس کی تیسرے نمبر والی بہن تھی۔ اس نے نویں کلاس میں ہی بغیر کسی وجہ کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اُسے حصولِ تعلیم سے بالکل رغبت نہیں تھی۔ چندو خوش ہو گئی۔

عمر حیات بولنے کے ساتھ ساتھ قصرِ حسن میں قدم قدم بڑھ رہا تھا۔ اس نے بال کھول کر آدھے اُس کے چاند چہرے پر، آدھے اپنے چہرے پر پھیلا دیے تھے۔ اس کے چہرے پر سرکتی ہوئی زلفوں کو کبھی ہاتھ سے گردن کی طرف دھکیل دیتا، کبھی اُس کی آنکھوں پر بنی کی

صورت اکٹھا کر دیتا۔ اس کھیل میں تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ عمر حیات کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اس کی وارفتگی نے چندو ماہی کو توڑ پھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "چندو! آ جاؤں؟"

چندو چونکی۔ حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ ایک مختصر سے توقف کے بعد بولی۔ "کہاں؟"

وہ دل تک تو پہنچ چکا تھا۔ جان پر سایہ کشا ہو گیا تھا۔ پھر بھی آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ تجسس نے سر ابھارا۔ پوچھنے کی اجازت شرمگیں دل نے نہ دی۔ نہایت آہستگی سے آنکھیں موند کر اجازت دے گئی۔ وہ جان کی دہلیز پر آنے کی اجازت پاتے ہی پہنچ گیا۔ تب چندو کی سمجھ میں آیا کہ وہ جلتے ہوئے ہونٹوں پر انگارے رکھنے کے لیے اور قریب آنا چاہتا تھا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر تڑپی اور اس کی گرفت سے نکل گئی۔ دیوار تک گئی۔ ایک چارپائی دیوار کے ساتھ پہلوؤں کے بل کھڑی کی گئی تھی۔ اُسے تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تمہیں تو ذرا شرم نہیں آتی۔ حویلی میں لے جا کر اور دلیر ہو جاؤ گے۔ ہائے اللہ! میں کیا کروں؟"

وہ اپنی فتح یاب شکست کو سینے سے لگائے چارپائی پر کروٹ بدل گیا۔ اوندھے منہ لیٹا تو دو چھوٹے ڈبے پسلیوں میں چبھے۔ اُسے مطلق پروا نہ ہوئی۔ گھٹتی بڑھتی سانسوں کے بیچ بولا۔ "چندو! بس اتنا سا سہارا دیتی رہو گی تو دو چار سال کیا، عمر بھر انتظار کر لوں گا۔"

وہ ایک ادا سے بولی۔ "نہیں۔ حویلی میں ایسا نہیں چلے گا۔"

"میں مرد ہوں۔ سیدھی طرح ہاتھ نہیں آؤ گی تو انگلیاں ٹیڑھی کر لوں گا۔ زبردستی بھی کرنا پڑی تو کر گزروں گا۔"

وہ جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ ابھی بھرپور مرد نہیں تھا مگر اپنی مردانگی کا بھرپور انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ جتا رہا تھا کہ وہ اس کی ملکیت بن چکی ہے۔ ملکیت کے ساتھ کوئی بھی سلوک روا رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی آشفتگی چندو کے دل سے کھیل رہی تھی۔ فخر سے سربلند ہو گئی، بولی۔ "تنگ کرو گے تو بی بی سائیں کو بتا دوں گی۔"

وہ اچھل کر چارپائی سے اُترا۔ بچگانا انداز میں بولا۔ "نہ بابا! یہ ظلم نہ کرنا۔ میں تمہیں بلاؤں گا بھی نہیں۔"

وہ ہنستی ہوئی پلٹی۔ ایسے میں دھوکا کھا گئی۔ عمر حیات تب تک بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ چندو کے سنبھلنے تک اس کے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر جارحانہ انداز میں توڑنے لگا۔ اس کی باؤلی اور انجام سے بے خبر عمر اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ چندو کا بدن ریت کی دیوار ثابت ہو رہا تھا۔ دیوانے کی آشفتہ بے ساختگی اتنی جاندار مگر غیر متوقع تھی کہ چند ہی لمحوں میں چندو کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ جب عمر حیات نے ایک حد پر جا کر اپنی پیش قدمی روکی، اُسے خود سے علیحدہ کیا تو وہ ریت کی دیوار کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ بری طرح ہانپنے لگی۔

عمر حیات نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے۔ دہلیز تھامی اور خود پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہ کر بولا۔ "بس! بڑی آئی دھمکیاں دینے والی...... بی بی سائیں کو بتا دوں گی...... بتاؤ گی تو ہر بار ایسا ہی سلوک کروں گا۔"

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے کن انکھیوں سے اُس کی پشت کو گھور رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اُسے ایک دم کیا ہو گیا تھا؟...... عمر حیات نے اُسے مارا، پیٹا نہ ڈانٹا...... پھر وہ ادھ موئی کیسے ہو گئی؟ جب وہ اسے اسکول سے اپنے دوست کے خالی گھر میں لے گیا تھا، تب اس کی مار پیٹ نے بھی یوں بے حال نہیں کیا تھا۔ آنکھوں میں ایک دم پیار کی جوت جاگ گئی اور وہ دل میں بولی۔ "ہائے میر زادے! تم کتنے اچھے ہو۔ کاش! بی بی سائیں ہمارے درمیان حائل نہ ہوتیں اور اس خوب صورت دن کی کبھی شام نہ ہوتی۔"

اس کی عمر ابھی اتنی پختہ نہیں ہوئی تھی کہ سمجھا دیتی کہ زندگی کے ہر دن پر شام اُترتی ہے۔ اس شام کے اُترتے ہی وہ عمر حیات کے پیچھے چلتی ہوئی ڈرتی ڈرتی حویلی میں داخل ہوئی۔ بی بی سائیں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عمر حیات کی بہنوں نے سرد نظروں سے گھورا۔ اُس کی حیثیت اُس پر عیاں کرنے کی کوشش کی۔ عمر حیات نے سمجھایا تھا کہ چند دنوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل...... چبھنے والی نظریں ہٹ گئیں۔

بی بی نے باری باری بھی بہنوں سے کہا کہ وہ چندو کو اپنے کمرے میں لے جائیں۔ وہ چندو کو بیٹیوں کی طرح علیحدہ کمرا دینے سے گریزاں تھیں کیونکہ گھر میں چور بیٹھا ہوا تھا۔ کائیاں چور جوان تنہائی کا فائدہ اُٹھا کر، سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر علیحدہ کمرے سے بہت کچھ چرا کر لے جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر اُس نے بھی پر زور دیا۔ بڑی بہن کا نام صفیہ تھا، ملتان کے کالج میں پڑھتی تھی، اُس نے منہ بنا کر کہا۔ "بی بی اماں! آپ جانتی ہیں کہ میں کسی کی موجودگی میں سو نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سکتی۔ آپ اسے نورین کے ہاں ٹھہرا دیں۔"

اُس سے چھوٹی نورین تھی۔ شجاع آباد کے کالج میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ تنک کر بولی۔ "اماں! بہتر یہی ہوگا کہ اس کے لیے ایک سرونٹ کوارٹر خالی کروالیں۔"

سب سے چھوٹی مصباح، جسے گھر میں صبا کہا جاتا تھا، نخوت سے بولی۔ "میرے ایگزام سر پر ہیں۔ اگر مجھے ڈسٹرب کیا گیا تو میں فیل ہوجاؤں گی۔ پھر مجھ سے کوئی گلہ نہ کرے۔ ہاں!"

چندو تضحیک اور اہانت کے بار تلے دبی باری باری کن انکھیوں سے عمر حیات کی بہنوں کو دیکھ رہی تھی۔

بی بی سائین نے فائزہ کی طرف دیکھا۔ وہ دلچسپی آمیز نظروں سے چندو کو دیکھ رہی تھی، بولی۔ "میرا کمرا سب سے چھوٹا ہے مگر میرا دل سب سے بڑا ہے۔ اس کا بیڈ میرے کمرے میں لگادیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

بی بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نوکرانی کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ فائزہ نے چندو کا ہاتھ تھاما، بولی۔ "چلو! اپنے کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ یہ ظالم سماج ہے۔ زیادہ پڑھ لکھ گیا ہے اس لیے ان پڑھ دل کے جذبات نہیں سمجھتا۔"

چندو نے بی بی سائین اور عمر حیات کو باری باری اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اجازت مل گئی۔ فائزہ چہکی۔ "چلو ناں! میں بھی تو دیکھوں کہ آخر بھائی کی آنکھوں نے ایسا کیا دیکھ لیا کہ بے ایمان ہوگئیں۔"

بی بی نے ملامت انگیز نظروں سے اُسے گھورا تو وہ دبی دبی ہنسی اچھالتی ہوئی، چندو کو کھینچتی ہوئی نوکرانی کے پیچھے چل دی۔ اس کا کمرا فرسٹ فلور پر سب بہنوں کے آخر میں واقع تھا۔ میر ظفر حیات نے چاروں بہنوں کے کمرے ایک ہی سیدھ میں تعمیر کرائے تھے۔ فائزہ کا کمرا دس ضرب بارہ فٹ کا تھا۔ کمرے کے عقبی حصے میں ایک طرف باتھ روم جبکہ دوسری طرف ڈریسنگ باکس واقع تھا۔ دونوں کے بیچ ایک کم چوڑا دروازہ عقبی بالکونی میں کھلتا تھا۔ یہ بالکونی دوسری بہنوں کی بالکونیوں سے چھوٹی تھی جس کا آدھا حصہ آم کے بڑے پیڑ کی ایک صحت مند شاخ نے گھیر رکھا تھا۔

نوکرانی اور فائزہ نے مل کر بہتیری کوشش کی، ان گنت تراکیب آزمائیں مگر چندو کے بیڈ کی گنجائش نہ نکلی۔ چندو نے کہا۔ "میں ادھر قالین پر سوجاؤں گی۔"

فائزہ نے کندھے اُچکائے۔ نوکرانی نے صوفہ ہٹانے اور دیوار اور بیڈ کے درمیان چندو کا بستر لگانے میں دیر نہیں کی۔ پھر دونوں کے لیے دودھ لینے چلی گئی۔ فائزہ نے پوچھا۔ "میرا کمرا پسند آیا؟"

چندو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ امیرانہ آرائش سے مرعوب ہوکر بولی۔ "بہت خوب صورت ہے۔"

فائزہ بولی۔ "تم بھی بہت خوب صورت ہو۔ میں اگر مرد ہوتی تو اب تک بتا چکی ہوتی کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔"

وہ جھینپ گئی۔ شام ڈھلنے سے قبل فائزہ کے بھائی کی مردانگی نے اس کے حسن کی قدر و منزلت کو جس طرح تسلیم کیا تھا، وہ انداز بھولنے والا نہیں تھا۔ فائزہ کے لبوں سے تعریف اچھی لگی۔ سر جھکا کر بولی۔ "تم بھی کسی سے کم تو نہیں ہو۔"

نوکرانی دودھ سے لبریز دو گلاس ٹرے میں رکھ لائی۔ اس کے پیچھے پیچھے عمر حیات بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر بولا۔ "کیا گھر میں اور بیڈ نہیں تھا؟"

فائزہ نے جلدی سے کہا۔ "ایسی بات نہیں بھائی! دراصل کمرا چھوٹا ہے۔ دوسرے بیڈ کی جگہ نہیں بنی اس لیے قالین پر بستر لگانا پڑا۔ مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک رات چندو نیچے سوئے گی، دوسری رات میں...... کہتے ہیں کہ فرش پر سونے سے ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہوتی ہے۔ کیوں چندو؟"

اُس نے تنبیہی انداز میں سر ہلایا، بولا۔ "فائزہ! اس کا خیال رکھنا۔ اسے تنگ نہ کرنا ورنہ میں تمہاری چٹیا کھینچ لوں گا۔"

وہ کن انکھیوں سے چندو ماہی کو دیکھ کر ہنسی، بولی۔ "تنگ تو کروں گی۔ ضرور کروں گی۔ تم کرلو، جو کرنا ہے۔ ایک بات ہے جس کی خوشی ہو رہی ہے کہ چندو کے بہانے ہی سہی، تم نے میرے کمرے میں قدم تو رکھا۔ امید ہے آئندہ بھی بہانے بہانے سے آتے رہوگے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عمر حیات چند لمحے کھڑا فائزہ کو بے بسی آمیز انداز میں دیکھتا رہا پھر پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

چندو بھوکی تھی۔ سونے کے لیے لیٹی تو آنکھوں سے نیند روٹھ گئی۔ فائزہ پہلو کے بل لیٹی اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔ شاید اُس نے چندو کی بے چینی محسوس کرلی تھی، اس لیے کہنے لگی۔ "لگتا ہے تم نے شام کا کھانا نہیں کھایا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ فائزہ بیڈ سے اُتری اور دروازہ کھول کر کچن کی طرف چلی گئی۔ [illegible]

اس کی واپسی ہوئی۔ وہ اس کے لیے کھانا گرم کرکے لائی تھی۔ چندو کے سامنے ٹرے رکھ کر اس کے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ باتیں کرنے لگی۔ اپنے بارے میں بتانے لگی کہ اُسے کیا پسند تھا، کیا ناپسند...... وہ خاصی چالاک اور زود فہم لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیاں پڑھائی میں بہت اچھی ہوتی ہیں مگر اس نے نہ جانے کیوں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اس نے گفتگو میں احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ کوئی ایسا موضوع زیرِ بحث نہ آئے جو چندو کو دُکھی کردے۔

کھانے سے فارغ ہوئی۔ باتھ روم میں گئی۔ باہر نکلی تو بالکونی کے کھلے دروازے نے متوجہ کرلیا۔ دیکھا تو فائزہ ریلنگ پر جھکی دکھائی دی۔ کمرے کی ٹیوب لائٹ کی روشنی آم کے پیڑ تک پھیلتی تھی۔ آگے اندھیرا تھا۔ فائزہ اجالے اور اندھیرے کی پیوستگی کے مقام پر دوپٹے سے بے نیاز کھڑی تھی۔ اس کے غیر تراشیدہ بال بہت گھنے اور چمکدار سیاہ تھے جو ہوا سے الجھ کر اس کی کمر پر ناگن کی طرح ادھر اُدھر بل کھا رہے تھے۔ چندو بے اختیار بالکونی میں آگئی۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ دھیرے سے بولی۔ "فائزہ! تمہارے بال بہت لمبے ہیں۔"

فائزہ چونکی۔ گردن کو تھوڑا موڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ بولی۔ "ہاں! بی بی اماں جمعہ کے جمعہ میرے بال لسی اور ملتانی مٹی سے دھوتی ہیں۔"

"کیا سبھی بہنوں کا سر ایسے ہی دھوتی ہیں؟"

"نہیں! صرف میرے بال ہی۔" اس نے بتایا۔ "باقیوں کو بال بڑھانے کا شوق نہیں ہے۔ بڑی باجی بال کٹواتی ہے۔ چھوٹی کے بال دو موٹے ہوکر ٹوٹنے لگتے ہیں۔"

تاجاں ہمیشہ چندو کے بال لسی اور ملتانی مٹی سے دھویا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جامن کے پتے چٹنی کی طرح کوٹ کر ملتانی مٹی میں ملالیا کرتی تھی۔ اس سے بالوں کی چمک میں سونا پگھل کر شامل ہوجاتا تھا۔ وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی۔ "میرے بالوں کو میری ماں ایسے ہی دھویا کرتی تھی۔"

فائزہ نے اس کا دوپٹا کھینچ لیا۔ بال کھول کر ہاتھوں پر لیتے ہوئے پیار سے بولی۔ "واؤ...... کتنے نرم ہیں یہ۔ ریشم کے کچے تار...... فکر نہ کرو۔ میں تمہارا سر دھو دیا کروں گی۔"

"نہیں نہیں...... یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میں خود ہی دھو لیا کروں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔

فائزہ نے بال چھوڑ دیے۔ ہوا نے اپنی گرفت میں لے کر ادھر اُدھر بکھیر دیے۔ اس نے چندو کی کمر میں بازو حمائل کیا۔ ایک ہاتھ سے آم کے پتوں کو چھیڑتے ہوئے بولی۔ "تم اور میں دوست بن جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے ناں؟ دوست ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا کرتے ہیں۔ تم میرا اور میں تمہارا سر دھویا کروں گی۔ یہ تو مناسب رہے گا ناں؟"

اس نے ممنونانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ فائزہ فربہ وجود کی مالک تھی۔ صحت مند تھی۔ اس کے بھرے بھرے وجود نے چندو کو سکون زا لمس دیا تو دل اُتھل پتھل ہونے لگا۔ فائزہ اچھی لگنے لگی۔ اپنے پیٹ پر فائزہ کے گداز ہاتھ کی ہلکی سی کپکپاہٹ بھی اچھی لگنے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھا تو سکون کا احساس بیدار ہوگیا۔

اچھی لگنے والی کہہ رہی تھی۔ "چندو! بابا نے بڑے شوق سے ہم بہنوں کے لیے یہ کمرے بنوائے تھے۔ یہ بالکونی دیکھ رہی ہو ناں! یہ جنت کی کھڑکی ہے۔ ابھی اندھیرا ہے۔ صبح کے اجالے میں یہاں کھڑی ہوکر ان درختوں کو، تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی سبز فصلوں کو اور لان کے پھول پودوں کو دیکھوگی تو حیران رہ جاؤ گی۔ دل خوش ہوجائے گا۔ عام طور پر بڑی خوش گوار ہوا چھیڑتی رہتی ہے مگر جن دنوں فصلوں پر اسپرے کا سیزن ہوتا ہے، تب یہاں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ بہت بدبو آتی ہے۔ اور چندو! یہاں ایک بہت بڑی کمی ہے جس کی وجہ سے یہ سارا نظارہ ایک دم بے معانی سا لگنے لگتا ہے۔"

وہ حیرت سے مستفسر ہوئی۔ "وہ کون سی کمی ہے؟"

اس نے لمبی سانس لی۔ اُسے مزید اپنے قریب کیا۔ پیٹ پر ہاتھ کے دباؤ میں خفیف سا اضافہ کیا، بولی۔ "یہاں سارا دن کھڑی رہتی ہوں مگر کوئی آدم زاد دکھائی نہیں دیتا۔ دل ان گنت سوال کرتا ہے۔ جواب دینے کوئی نہیں آتا۔ بھلا درختوں سے کیا باتیں کی جاسکتی ہیں؟ بھلا گونگے بہرے پھولوں کے حسن کی کب تک تعریفیں کی جاسکتی ہیں؟"

چندو نے نہ سمجھنے کے باوجود خاموشی اختیار کی۔ اُسے دیکھا۔ وہ اپنی ترنگ میں کھڑی تھی۔ چہرہ اُٹھائے، آنکھیں موندے اور ہلکی سی لرزش پر بہکتے ہوئے وجود کو سنبھالے...... ایک ذرا توقف کے بعد بولی۔ "تم نے کبھی سوچا ہے کہ ایک پھول دوسرے پھول کی کیسے تعریف کرتا ہوگا؟ نہیں سوچا ناں!...... کوئی بھی نہیں سوچتا مگر میں سوچتی ہوں۔ ہم تعریف کرتے ہیں۔ پھول ہماری بات سنتے سمجھتے نہیں۔ اپنی مستی میں جھومتے رہتے ہیں۔ شاید ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھتے۔ انہیں بھلا پرواہی کب ہے کہ کوئی ان کے حسن اور خوشبو کو سراہے۔ ہے ناں؟"

فائزہ بہکے بہکے انداز میں بول رہی تھی اور چندو کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ تھوڑی عجیب بھی لگی۔ ایک شام کا تعلق تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جھجک آڑے آ رہی تھی اور چندو ماہی جو کہنا چاہتی تھی، کہنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ بلا سوچے سمجھے کہنے لگی۔ ”کیا تم چاہتی ہو کہ یہاں کوئی ایسا ہو جو پھول کی تعریف کرے؟“

فائزہ چونکی۔ ”ایں...... یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ تم کس پھول کی بات کر رہی ہو؟“

چندو نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ہم عمر تھی۔ ایک دم پیاری لگنے لگی۔ چندو نے اس کی جانب اپنا رُخ کیا۔ گال کو انگلی سے چھوا اور نرمی سے بولی۔ ”یہ پھول!“

فائزہ شرما گئی۔ دل میں خوش بھی ہوئی۔ اس سے لپٹ کر بانہوں کو پوری قوت سے کسنے لگی۔ بہکے بہکے انداز میں بولنے لگی۔ ”تم کتنی اچھی ہو چندو...... چندو ماہی...... چاند جیسی روشن، مچھلی جیسی چمکدار...... دنیا جھوٹ بولتی ہے۔ بکواس کرتی ہے کہ تمہاری پیدائش کے پیچھے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا۔ نہیں، تم مقدس ہو۔ بہت پیاری ہو۔ آئی لو یو!“

ہوا آم کے پتوں سے چھیڑ خانی کرتی ہوئی مچل کر ان کی طرف آئی۔ فرحت کا جانفزا لمس عطا کر گئی۔ فائزہ نے سرشاری میں اس کے گال چومے پھر اس کے حسن کی سوختہ جانی تک آ گئی۔ اس کے پیار میں مرد کی سی آشفتہ سری شامل ہوئی تو چندو نے ہلکی سی مزاحمت کی۔ وہ جھینپ کر تھم گئی پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ پُرسکون ماحول نقرئی گھنٹیوں کی آسودہ آوازوں سے گونج اُٹھا۔ جوانی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ دیوانی سی، جو آنِ واحد میں دیوانہ کر دیتی ہے۔ ہنس ہنس کر فائزہ کے پہلوؤں میں درد ہونے لگا تو جھک کر ہنسی دبانے کی کوشش کرنے لگی، بولنے لگی۔ ”چندو میں نے کہا تھا ناں!...... ہائے! میں اگر مرد ہوتی تو...... ہائے چندو!“

اس کا جملہ ادھورا تھا۔ ایسے جملے کبھی مکمل نہیں ہوتے۔ ادھورے جملے، ادھورے اظہار اور نامکمل پیار میں بڑا تجسس ہوتا ہے۔ بالکونی نے انہیں لمس آشنائی عطا کر دی تھی۔ چندو اپنے بستر میں لیٹنے لگی تو فائزہ نے کمر میں ہاتھ ڈال کر بیڈ پر کھینچ لیا۔ بولی۔ ”اِدھر ہی آ جاؤ ناں! جب ہم دونوں خوب صورت پھول ہیں، ایک دوسرے کی تعریف کر سکتے ہیں تو پھر علیحدہ کیاریوں میں مقید کیوں رہیں؟“

چندو اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور لڑکھڑا کر اس پر گری پھر جھینپتی ہوئی اس کے برابر لیٹ گئی۔ فاصلے ہمیشہ بڑوں کے رویوں سے نمو پاتے ہیں ورگرنہ بچپن اور جوانی کبھی اونچ نیچ کے فلسفوں کو قبول نہیں کرتی۔ چندو پہلی رات کی جھجک، حویلی والوں کے رویوں، خوف اور اپنے مستقبل کے اندیشوں میں گھری ہوئی تھی تبھی اس کی رات سوتے جاگتے گزری۔ فائزہ بڑی تن آسانی اور فراخ قلبی سے سونے کی عادی تھی۔ دونوں دن چڑھے بیدار ہوئیں۔ فائزہ گھبرا کر بولی۔ ”ہائے اللہ! آج تو نماز بھی رہ گئی۔“

چندو نماز نہیں پڑھا کرتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر دل ہی دل میں شرمسار ہوئی۔ فائزہ اس کے چہرے کے بدلاؤ سے قلبی کیفیت تاڑ گئی، بولی۔ ”کیا تم نماز نہیں پڑھتیں؟“

اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔ جھوٹ کا سہارا لے کر بولی۔ ”پڑھتی تو ہوں مگر کبھی کبھی!“

فائزہ مسکرا کر بولی۔ ”آئندہ پڑھا کرنا۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور زمانے کی گندگی ہماری روح کو آلودہ کر دیتی ہے۔ نماز جسم اور روح کو پاکیزہ کر دیتی ہے۔ یہ بات ہم سے اکثر بابا کہا کرتے تھے۔ ہائے چندو! میرے بابا بہت اچھے تھے۔ ہر صبح ہم سب بہنوں کے کمروں میں آیا کرتے تھے۔ جگا کر نماز پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ مگر...... مگر ہر صبح یوں محسوس ہوتا ہے کہ بابا مجھے جگانے کے لیے میرے کمرے میں آئے ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ایسے ہی وقت میں دروازے پر دستک ہوئی۔ فائزہ نے دروازہ کھولا۔ عمر حیات کو دیکھ کر شرارت سے ’کھی کھی‘ کرنے لگی۔ عمر حیات نے آنکھیں دکھائیں۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی نان اسٹاپ ہنسی کو بہ وقت روکتے ہوئے بولی۔ ”بھائی! اداس ہو گئے ناں ایک ہی رات میں...... سچی بات تو یہ ہے کہ چندو چیز ہی ایسی ہے۔ میں نہ کہتی تھی کہ اب تم بہانے بہانے سے یہاں آیا کرو گے۔“

اس نے مصنوعی خفگی سے اُسے ہلکی سی چپت رسید کی۔ صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ ”بکواس کرتی رہتی ہو۔ شرم کیا کرو۔ میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ چندو کا سامان میری پوٹھوہار میں پڑا ہے۔ رات کو یاد ہی نہیں رہا تھا ورنہ نکلوا کر کمرے میں بھجوا دیتا۔“

فائزہ اُس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ آنکھیں نچا کر بولی۔ ”بھائی! کیا یہ بتانا ضروری تھا؟ نوکر سے کہہ دیتے تو وہ سامان لا کر یہاں رکھ دیتا۔ اب کیا ہم آپ کی یاد دہانی پر وارے پر جائیں اور جیپ میں سے سامان نکال کر لائیں؟“

چندو نے فائزہ کے کندھوں کے اوپر سے عمر حیات کو دیکھا جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ فائزہ کی بات سن کر چندو کا دل فخر سے معمور ہو گیا۔ مسکرا کر اپنے دیوانے کو دیکھا اور پلٹ کر جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی جبکہ عمر حیات کو فائزہ نے زچ کر کے دروازے سے لوٹا دیا۔ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ باتھ روم کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولی۔ ”اے چندو! میں سب سمجھتی ہوں۔ تم نہیں بولتی ہو؛ تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ وہ آئی لو یو سننے کے لیے آیا تھا۔ تمہاری آنکھوں نے اُسے کہہ دیا ناں! دوبارہ یہاں آیا تو اُس کی ایسی کی تیسی کر دوں گی۔ ہائے چندو! سچی! تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔“

چندو سن رہی تھی۔ وفورِ تفاخر سے مسکرا رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ”میری صرف آنکھیں بولتی ہیں۔ تمہارا تو پورے کا پورا بدن بولتا ہے۔ جب سے کمرے میں آئی ہوں، سن رہی ہوں۔ آخر کسی کو تو سننا ہے!“

باتھ روم سے نکلی۔ بوڑھا نوکر چارے والی پلی میں اس کا جملہ سامان باندھ کر لے آیا۔ قالین پر رکھ کر پلی فارغ کرنے لگا۔ اس کے جانے کے بعد فائزہ نے بیڈ سے چھلانگ لگائی۔ جلدی جلدی ہاتھ مارنے کے بعد کچھ اُٹھا کر چندو کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ ”ہوں...... تو میر زادے نے اپنی چندو ماہی کو اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کروا دی۔ واؤ! کیا بات ہے۔ پر یہ تو مجھے پسند آ گیا ہے اس لیے یہ اَب میرا ہوا۔ تم اپنے دیوانے کے ہاتھ اور منگوا لینا۔“

چندو نے جھینپ کر رُخ پھیر لیا۔ آہستگی سے بولی۔ ”سب کچھ تمہارا ہے۔ جو جی میں آئے، اُٹھا لو۔“

رات سوچوں میں گزری تھی۔ پہلے دن کا اجالا کئی سہانی تعبیریں دکھا کر چھیڑنے لگا تھا۔ حویلی میں دسترخوان کی روایت کئی پشتوں سے بلا تعطل چلی آ رہی تھی۔ بڑے برآمدے کے ایک گوشے میں دبیز قالین پر دسترخوان سجایا جاتا تھا جہاں حویلی کے سبھی افراد دن میں تین وقت مجتمع ہوا کرتے تھے۔ فائزہ اور چندو کے نیچے اُترنے سے پیشتر ناشتے کی چوکی اُٹھ گئی تھی مگر نوکرانی نے دونوں کو ناشتا دسترخوان پر دیا۔ ساتھ میں سمجھا بھی دیا کہ آئندہ دیر ہو گی تو دوپہر تک بھوکا رہنا پڑے گا۔

چندو کو دیکھ کر صفیہ بال سنوارتی ہوئی وہاں آ گئی۔ پوچھنے لگی کہ اس کے چہرے پر نیل کیوں پڑے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے ناشتے میں مشغول رہی۔ فائزہ نے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی تو صفیہ نے ڈانٹ دیا۔ ایسے ہی وقت میں جب وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر اُٹھنا چاہتی تھی، بی بی کمرے سے نکل کر صحن کی طرف جاتے جاتے برآمدے میں رُک گئی۔ صفیہ کو مخاطب کر کے بولی۔ ”مجھے تمہارا رویہ اچھا نہیں لگا صفیہ! گھر آئے مہمان کو دل میں جگہ دینا ہماری خاندانی روایات کا حصہ ہے۔ بھول گئیں، میر صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر دشمن بھی چل کر گھر آ جائے تو اس کی دل شکنی نہ کی جائے۔“

صفیہ نے بالوں کو ایک جھٹکا دیا، منہ بنایا اور کہا۔ ”پر اماں! گھر آئے مہمان کی بات اور ہے، بن بلائے مہمان کا مقام اور ہے۔ آخر آنے والے کی اوقات بھی تو دیکھنی پڑتی ہے۔“

چندو کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

بی بی نے سخت انداز اختیار کیا۔ ”صفیہ! توبہ کرو۔ لڑکیاں ایسے نہیں بولتیں۔“

چندو نے جی کڑا کیا، کہا۔ ”باجی! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا دل دکھانے کے لیے یہاں چلی آئی مگر میں خود سے تو نہیں آئی، مجھے قسمت آپ کے در پر لائی ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں تو میں حویلی سے چلی جاتی ہوں۔“

”ہونہہ! چلی جاتی ہوں......“ صفیہ نے بہ اندازِ نفریں کہا اور اُٹھ کر پیر پٹختی ہوئی سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ بی بی نے چندو کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ نرم لہجے میں کہا۔ ”دل میلا نہ کرو۔ یہ ذرا تنک چڑھی ہے۔ بولنے سے پہلے سوچتی نہیں مگر دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔“

چندو کا دل بجھ سا گیا تھا۔ قدم قدم پر حیثیت کا طعنہ جان چیر جاتا تھا اور وہ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ چائے پی کر فائزہ نے اُسے ساتھ لیا۔ دونوں عقبی دروازے سے گزر کر لان میں آئیں۔ پھولوں بھری کیاریوں میں چہل قدمی کرتی رہیں پھر حویلی سے نکل کھڑی ہوئیں۔ تاحدِ نگاہ سرسبز و شاداب فصلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ چونا زدہ موٹے تنے والے آم، کیکر اور بلند قامت شیشم کے درختوں کی بہتات نے فضا کو بڑا خوشگوار بنا رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پر پیٹر انجن والا ٹیوب ویل نصب تھا جو اِس وقت بند تھا۔ اس کے بڑے سے حوض میں گھٹنوں تک شفاف پانی کھڑا تھا۔ فائزہ چپل اُتار کر، شلوار کے پائنچے چڑھا کر پانی میں جا کھڑی ہوئی۔ اُسے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر کے بولی۔ ”چندو! ٹھنڈا پانی کتنا مزہ دیتا ہے۔“

چندو نے لمبی سانس لی، کہا۔ ”ہاں! مگر شرط یہ ہے کہ جسم گرم ہو۔“

”ایں...... یہ کیا کہا تم نے؟“ فائزہ چونکی۔

”میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا من شانت ہو تو ہر شے اچھی لگتی ہے۔“ چندو نے جلدی سے بات بنائی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میں سمجھتی ہوں تمہارے دکھ کو چندو ماہی!'' فائزہ کے لہجے میں ہمدردی سی گھل گئی۔ ''دیکھو ناں! وقت کب ایک سا رہا ہے۔ مصیبت آخر ٹل جاتی ہے۔ تمہارا دُکھ اپنی جگہ، بھائی کی محبت اپنی جگہ۔ کوئی لڑکا اتنی شدت سے کسی لڑکی کو چاہے کہ اپنی زندگی، نام ونسب اور مستقبل تک کو داؤ پر لگا دے تو لڑکی ہر دکھ سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔''

چندو نے تھم کر اُسے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنی عمر سے بہت آگے نکل کر بولنے لگی تھی۔ اپنے بھائی کی محبت کے تذکرہ کرتے ہوئے ایک تفاخر کا احساس اس کی آواز میں شامل ہو گیا تھا۔

چندو آہستگی سے بولی۔ ''میر زادہ تو پاگل ہے۔''

''پھر تمہیں اور کیا چاہیے؟''

''تم درست کہتی ہو۔ مجھے میر زادے کے بعد زندگی سے کچھ بھی مانگنا نہیں چاہیے مگر نہ جانے کیوں میرا دل ڈر سے دھڑکتا رہتا ہے۔ دنیا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگنے دیتی اس لیے اپنی اور میر زادے کی جان کی امان مانگتی رہتی ہوں۔''

فائزہ کے گداز چہرے پر لحظہ بھر کو نامانوس سی درشتی لہرائی پھر معدوم ہو گئی۔ موضوع بدل کر فصلوں کی باتیں کرنے لگی۔ آموں کی قسمیں گنوانے لگی۔ گھنٹا بھر کی سیر کے بعد دونوں حویلی لوٹ آئیں۔

عمر حیات نے درست کہا تھا۔ پندرہ بیس دنوں میں ہی گھر والوں کے رویوں میں خاصا تغیر رونما ہو گیا تھا۔ صفیہ کے علاوہ سبھی بہنیں اُس سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔ اکٹھی بیٹھتیں تو ان میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمر حیات نے شہر کے ایک نجی ادارے میں چندو کا ایڈمشن کروا دیا تھا۔ پہلے دن اپنی پوٹھوہار پر شہر لے گیا تھا۔ چھٹی کے وقت لینے بھی گیا تھا۔ تبھی بی بی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے فوری طور پر حکم صادر کیا۔ ''صفیہ کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ وہ ملتان چلی جائے گی۔ نواز کی ڈیوٹی لگا دو۔ وہ نورین کے ساتھ چندو کو بھی شہر لے جایا کرے گا جبکہ تم اپنے کام پر توجہ دو گے۔''

عمر حیات نے بی بی کا حکم ماننے میں کسی تامل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نورین کالج میں پڑھتی تھی۔ اُسے ہر صبح نواز ایف ایکس پر چھوڑنے جاتا تھا۔ وہ چندو کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔ اس سے نہ صرف عمر حیات کا وقت بچ جاتا بلکہ اضافی خرچ بھی نہ ہوتا۔ پھر یہی معمول بن گیا۔ چندو ماہی کو نیا اسکول اچھا لگا۔ یہاں طالبات کی تعداد سرکاری اسکول سے بہت کم تھی مگر چندو کے لیے اچھی بات یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی اُس کی واقف کار نہیں تھی۔ چونکہ بڑے گھر کی گاڑی پر آتی جاتی تھی، اس لیے اس کی حیثیت کا از خود تعین کر لیا گیا تھا۔

فائزہ اپنی عادات اور رویے سے کسی طور بھی انڈر میٹرک نہیں لگتی تھی۔ وہ عمر حیات کی سب سے لاڈلی بہن تھی۔ جو کہتی، عمر حیات کو ماننا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بی بی کی بے حد مخالفت کے باوجود اس کے کمرے میں رنگین ٹی وی کے علاوہ وی سی آر بھی موجود تھا۔ دوسری بہنوں کو یہ سہولت میسر نہیں تھی۔ ان کا فلم دیکھنے کو جی چاہتا تو وہ فائزہ سے دو چار گھنٹوں کے لیے وی سی آر مستعار لے کر ایک آدھ فلم دیکھ لیا کرتی تھیں۔

فائزہ دن میں ایک آدھ فلم دیکھ لیتی تھی۔ ذوق اچھا تھا۔ نواز ڈرائیور کے ہاتھ دو جے چوتھے دن اپنی پسند کی نئی فلم منگوا لیتی تھی۔ جہاں فلم بینی نے اُس کی معلومات میں خاصا اضافہ کر دیا تھا وہاں اُس کے مزاج میں بے پناہ رومانس بھر دیا تھا۔ پہلے پہل تو چندو نے فلموں میں بالکل دلچسپی نہیں لی۔ فائزہ فلم دیکھتی رہتی جبکہ وہ سو جایا کرتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اُس نے ایک رومانی فلم شروع سے اختتام تک دیکھ لی۔ پہلی مرتبہ پتا چلا کہ اچھی فلم کس طرح انسان کو اپنے حصار میں لے کر گرد و پیش سے بے خبر کر دیتی ہے۔ اس کے کردار کئی دن تک چندو کے ذہن میں سرسراتے رہے۔ پیار کی نئی جہتیں اُسے گدگداتی رہیں۔ اس فلم کے بعد اُس نے ہر وہ فلم پوری دلچسپی کے ساتھ دیکھی جو فائزہ نے دیکھی۔ ہر فلم نے کوئی نئی بات سکھائی۔ کسی نے غم سے آشنا کیا۔ اختتام پر دونوں فلم پر اپنے اپنے انداز میں رائے دیتیں پھر سو جاتیں۔ اس کارِ مصروفیت نے انہیں پہلے سے بھی زیادہ قریب کر دیا۔

کبھی کبھار کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے بہ جز و عمر حیات حویلی میں اُس سے قدرے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ چونکہ زمین کے معاملات اُسے ہی دیکھنا پڑتے تھے اور دارے پر رات گئے تک ملنے جلنے والوں کو وقت دینا پڑتا تھا، اس لیے چندو کو کئی کئی دن اُس کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اگر اُسے فائزہ کی غیر معمولی توجہ اور دوستی میسر نہ آتی تو وہ شدید نوعیت کے احساسِ تنہائی کا شکار ہو جاتی۔ اُسے گامن کی بے طرح آ کرستانے والی یاد سے فائزہ بڑے غیر محسوس طریقے سے بچا لیا کرتی تھی۔ نورین خاصی لیے دیے رہتی تھی۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک کے فاصلے میں بہرحال اچھی ہم سفر ثابت ہوتی تھی۔

سال گزرتے دیر نہ لگی۔ سال بعد اُسے پہلی مرتبہ شہر جاتے ہوئے گامن، گامن کی ریہڑی اور تاجاں دکھائی دیے۔ کار نے انہیں نہر اور سپر بند کے سنگم والی پلی پر کراس کیا تھا۔ اس کا دل ایک دم تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا کہ کار رکوا کر تاجاں اور گامن سے مل لے مگر جب تک سنبھلتی، ریہڑی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ گردن موڑ کر تب تک ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ ایک لمبی آہ سینے میں اُتار کر وہ اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔

ان دنوں وہ میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت سے لطف اندوز ہو رہی تھی جن دنوں عمر حیات نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیاحت کا پروگرام بنا لیا۔ زمین کے بکھیڑوں کو دیکھنے کے لیے اس نے اپنے چھوٹے ماموں رضوان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ماموں رضوان پینتیس کے سن میں تھا۔ خاصا ہنس مکھ، وجیہہ اور باوقار شخص تھا، نیک منش بھی۔ فائزہ سے پتا چلا کہ وہ چودہ پندرہ برسوں سے ملتان شہر کے کسی سرکاری اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ عمر حیات کے علاوہ خاندان بھر میں کسی کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عمر حیات کی درخواست پر اسکول سے چھٹیاں لے کر حویلی آ گیا تھا۔

وہ ہر شام کو دارے پر بیٹھنے کے بجائے صحن میں چندو اور نوکروں سمیت سبھی افراد کو اکٹھا کر لیتا۔ بی بی بھی اپنا بڑا سا موڑھا نکلوا لیتی۔ رضوان سب کو مذہب پر بڑے دل آویز لیکچر دیتا۔ اس کی مذہبی معلومات پر چندو حیران ہو جاتی۔ ایسے میں وہ ایک ٹک اُس کے خوب صورت چہرے، سیاہ اور نفیس انداز میں تراشیدہ ڈاڑھی اور محراب دار فراخ پیشانی کو دیکھے جاتی۔ اپنی تعلیمی استعداد کے مطابق کچھ پوچھ بھی لیتی جس کا جواب رضوان بڑے مشفقانہ انداز میں دیتا۔ وہ ابتدائی چند دنوں میں ہی چندو کے دل میں کسی اونچی مسند پر براجمان ہو گیا اور اس کی دھیمی دھیمی آواز سیدھی دل میں اُترنے لگتی تھی۔ چندو ہر روز بے چینی سے شام کے ڈھلنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ شاید اس کی تدریس کا اعجاز تھا کہ وہ پنج گانہ نماز ادا کرنے لگی تھی۔ فائزہ پہلے سے ہی اس معمول پر کاربند تھی۔

ایک شام فائزہ نے رضوان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ماموں! آپ تو پورے مولوی بن گئے ہیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ بھئی! ہر انسان کو پورا نہ سہی، کم سے کم آدھا مولوی تو ہونا چاہیے تھا۔ ہر کلمہ گو اس قابل تو ہو کہ اپنے مرنے والے باپ کی نمازِ جنازہ پڑھا سکے۔ اُسے کسی کا منہ تو دیکھنا نہ پڑے۔ میں اسکول میں پڑھانے کے بعد محلے کی مسجد میں امامت اور ہفتہ وار خطابت کے فرائض سرانجام دیتا ہوں۔ صبح دم بیسیوں بچے میرے صحن میں چڑیوں کی طرح چہکتے ہیں۔ توتلی موتلی زبانوں سے قرآن پڑھتے ہیں تو سکون میرے دل میں اُتر جاتا ہے۔''

فائزہ ہنسی۔ ''وہ تو ٹھیک ہے ماموں! مگر آپ اپنے لیے کوئی مولوائن بھی تلاش کر لیں ناں!''

وہ مسکرایا۔ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ ایسے میں اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے دانوں کے گرنے کی رفتار دگنی ہو گئی۔ پھر آسمان کی طرف چہرہ اُٹھا کر بولا۔ ''بیٹیوں کو ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔''

چندو بولی۔ ''ماموں! کیا آپ شادی نہیں کریں گے؟''

''ایں...... کہاناں......''

نورین نے بات کاٹ دی۔ ''ماموں! کیا شادی فرض نہیں ہے؟''

''بیٹی! یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم جس موضوع پر بات کر رہے تھے، آپ اسی سے متعلقہ سوال پوچھیں۔'' رضوان نے بڑے پیار سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شادی کے موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چندو کے دل میں ایک بے عنوان سی ہمدردی پیدا ہوئی۔ رات کو فائزہ سے پوچھنے لگی۔

''ماموں رضوان کی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟''

فائزہ نے کہا۔ ''گیس کرو تو!''

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''میرا خیال ہے انہیں اپنے مطلب کی لڑکی نہیں ملی۔''

فائزہ نے سر ہلایا۔ ''نہیں چندو! ایسی بات نہیں ہے۔'' فائزہ کے لبوں پر آزردہ سی مسکراہٹ ابھری۔ ''ماموں شہر کے کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ ویسے تو اب بھی بڑے ہینڈسم ہیں مگر مولوی بننے سے قبل تو بہت زیادہ ہینڈسم، شوخ اور شرارتی ہوا کرتے تھے۔ خاندان بھر کی لڑکیاں انہیں دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھیں۔ مگر پھر ایک ٹریجڈی ہو گئی۔''

''وہ کیا؟'' چندو بیڈ پر اُٹھ بیٹھی۔

''شہر کے ایک نہایت غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی نے ماموں کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ سیکنڈ ائر میں پڑھا کرتی تھی۔ دونوں میں بڑا طوفانی قسم کا رومانس چلا۔ میرے ننھیال کو پتا چلا تو بھونچال آ گیا۔ جانتی ہو کیوں؟'' فائزہ نے اُس کے تجسس کو ہوا دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کیوں؟'' اس نے فائزہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اس لیے کہ لڑکی غریب تھی۔''

''نہیں...... '' فائزہ بولی۔ ''بلکہ اس لیے کہ لڑکی کا باپ موچی تھا۔ عمر گیٹ میں تھڑے پر بیٹھ کر جوتے گانٹھتا تھا۔ چونکہ میرا ننھیال اونچے نام ونسب والا خاندان تھا، اس لیے وہ کمین کا رشتہ لینے پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ بی بی اماں سمیت سبھی افراد نے ماموں کے خلاف محاذ کھڑا کرلیا۔ نانا ابو نے جوان اولاد کا خیال کیے بغیر انہیں سارے خاندان کی موجودگی میں جوتوں سے پیٹا۔ گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ ماموں نے یہ تضحیک برداشت کی۔ لب پر کوئی شکوہ نہ رکھا اور گھر سے چلے گئے۔ تعلیم چھوٹ گئی۔ ایک دم امارت سے غربت میں گر گئے۔ اپنی محبوبہ کے پاس گئے۔ تب تک میرے نانا جان نے غریب موچی کو بلا کر اُس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ اس نے ماموں کو انکار کردیا۔ محبوبہ بھی رُخ پھیر گئی۔ تب ماموں مجنوں ہوگئے۔ پاگلوں کی طرح شہر کی گلیوں میں پھرنے لگے۔ اس دوران بوڑھے موچی نے بیٹی کو اپنے بھتیجے سے بیاہ کر علی پور بھیج دیا اور ماموں دلبرداشتہ ہوکر گھر لوٹنے کے بجائے ملتان چلے گئے۔''

چندو بے آواز سانسیں لے رہی تھی۔ جلدی سے بولی۔ ''پھر؟''

''پھر کیا؟'' فائزہ نے منہ بسورا۔ ''ماموں بہت دل گرفتہ ہوگئے تھے۔ ملتان میں انہیں سرکاری نوکری مل گئی۔ بارہ سال غائب رہے۔ دو تین سال قبل انہیں نانی اماں تلاش کر کے گھر لے آئیں۔ وہ ایک رات گھر رہے، پھر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد سال چھ ماہ میں ایک چکر لگا لیتے ہیں گھر کا۔ ہمارے گھر بھی آجایا کرتے ہیں۔ بابا سمیت خاندان کے ہر شخص نے بہت کوشش کی کہ وہ شادی کے لیے رضامند ہوجائیں مگر وہ نہیں مانے۔ شادی کا تذکرہ ہوتے ہی اُٹھ جاتے ہیں یا سختی سے روک دیتے ہیں۔''

''کیا تمام عمر ایسے ہی رہیں گے؟'' چندو حیرانی آمیز دکھ سے بولی۔

''لگتا تو ایسے ہی ہے۔''

''کیا خیال ہے ہم کوشش کر دیکھیں۔ ہوسکتا ہے مان جائیں۔'' چندو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ویری گڈ آئیڈیا!! اگر ہم انہیں منانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو بلاشبہ خاندان میں ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔''

''خیر...... یہ تو الگ بات ہے۔ مجھے وہ بہت پیارے انسان لگتے ہیں تبھی یہ خیال میرے دل میں آیا۔'' چندو نے کہا۔

''او کے ڈارلنگ!'' فائزہ نے ایک ادا سے آنکھیں چندھیا کر کہا اور ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول سے کھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ بولی۔ ''چندو! پرسوں سے فلم آئی پڑی ہے۔ دیکھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ کیا خیال ہے، عیاشی کرلی جائے؟''

چندو فوراً ہی ہم خیال ہوگئی۔ اس نے قالین پر بیٹھ کر بیڈ کے نیچے سے وڈیو کیسٹ نکالی اور وی سی آر میں ڈال دی۔

علی الصباح دونوں لان میں بیٹھی تھیں۔ رات کی فلم زیر بحث تھی۔ فائزہ کو ہیروئن کا لباس پسند آیا تھا۔ چندو کو ہیرو کے بولنے کا انداز اچھا لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں فائزہ کی نظر رضوان پر پڑ گئی۔ حلق کے بل چیخی۔ ''ماموں! کم آن پلیز!''

وہ حویلی سے نکل کر دارے کی طرف جارہا تھا۔ کیکر کی مسواک سے دانت صاف کررہا تھا۔ آواز سن کر پلٹا اور لان میں آگیا۔ فائزہ نے گھاس پر اپنی چادر پھیلادی۔ وہ چادر اکٹھی کر کے گھاس پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔ ''نہیں بیٹا! ایسا نہیں کرتے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔''

فائزہ مسکرائی۔ ''کیا بیٹی بھی یہ کہہ سکتی ہے کہ اُس کا باپ اس قابل نہیں ہے؟''

وہ لاجواب سا ہوگیا، بولا۔ ''مجھے بلایا تھا، خیریت تھی؟''

فائزہ نے کن انکھیوں سے چندو کو دیکھا۔ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''چندو ماہی آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔''

اس کی استفہامیہ نظروں نے چندو کا احاطہ کیا۔ پوچھا، ''ہاں بیٹی! بتاؤ، کیا پرابلم ہے؟''

چندو گڑبڑا گئی۔ فائزہ کو غصہ بار نظروں سے گھورنے لگی۔ رضوان نے اپنا سوال دہرایا تو وہ سر جھکا کر بولی۔ ''ماموں! میں ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے یقین ہوجائے کہ آپ میری درخواست مان لیں گے تو میں کچھ کہنے کی جرأت کرتی ہوں ورنہ لب بستہ رہتی ہوں۔''

رضوان نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں بیٹا! بولو۔ میں تمہاری درخواست پر غور کروں گا۔''

''غور نہیں...... عمل!'' وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔

''او کے! کوشش کروں گا۔''

''نہیں ماموں! ایسے نہیں...... میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ آپ میری بات مانیں گے۔''

رضوان چونک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ مسواک والا ہاتھ ساکت ہوگیا۔ سر جھکا کر بولا۔ ''چندو! تم بہت پیاری ہو۔ اللہ تمہیں اور حسن دے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھ سے کیا

چاہتی ہو مگر بیٹی! میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ بری طرح چونکی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر سننے والے نے سمجھ بھی لیا تھا، بولی۔ ''ماموں! کیا پہلے بھی کسی بیٹی نے آپ سے یہ مطالبہ کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں! میرے خاندان کو شاید اس کے علاوہ مجھ سے کچھ درکار نہیں ہے۔''

''یعنی آپ نے کئی بیٹیوں کو انکار کردیا ہے۔ مجھے بھی کر دیجیے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔'' چندو نے پینترا بدلا۔ ''آپ مانیں یا نہ مانیں، میں کہنا چاہتی ہوں کہ آپ شادی کرلیجیے۔''

اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''نہیں!''

چندو اور فائزہ بحث پر کمربستہ ہوگئیں۔ وہ گفتگو میں ان سے ہارنے والا نہیں تھا مگر دم بہ دم پسپائی اختیار کرتا جاتا تھا۔ گھنٹا بھر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ دھوپ سر پر آگئی۔ رضوان لڑکیوں کو مطمئن نہ کرسکا کہ ایک عورت کی بے وفائی یا حالات کی ایک مرتبہ کی بے رُخی کو پتھر پر کندہ کر کے تارک الدنیا ہوجانا چاہیے۔ بے بس ہوگیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو ایک دم بگڑ کر منکر ہوگیا۔

چندو کا چہرہ دھوپ میں تمتمانے لگا تھا۔ عارض اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہوگئے اور لب بے حد سرخ...... ایسے میں اُس کا حسن قاتل بن جایا کرتا تھا۔ اُس نے تھک کر اپنے ہاتھ جوڑے اور شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''ماموں! اگر آپ میری بات مان لیتے تو مجھے نئی زندگی مل جاتی۔ اس خاندان میں مقام مل جاتا۔''

اُس نے کچھ اس بے بسی سے کہا کہ رضوان دل تھام کر رہ گیا۔ اُسے دیکھنا ہی قیامت ثابت ہوا۔ کئی لمحوں تک ایک ٹک دیکھتا رہا پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ ''او کے! اگر تمہیں میری شادی سے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے تو میں سر جھکا لیتا ہوں۔''

اچانک دھوپ میں بارش برسنے لگی۔ اُس کا چہرہ گل و نور کی آماجگاہ بن گیا۔ جوش سے فائزہ کے گلے لگ گئی، لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''دیکھا فائزہ! ماموں نے میری بات مان لی ناں!''

فائزہ کے روم روم سے خوشی پھوٹ رہی تھی، بولی۔ ''تم بڑی لکی ہو چندو!''

رضوان کی نظریں چندو کے خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے پر کچھ دیر جمی رہیں، پھر ہٹ گئیں۔ وہ بھی اُٹھ گیا۔ گراسی پلاٹ سے نکل کر روش پر جا کھڑا ہوا۔ پلٹ کر دیکھے بغیر بولا۔ ''زندگی میں پہلی بار مجھے ہارنے میں بھی لطف آیا۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، فائزہ بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ ماموں اتنی جلدی مان گئے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے ننھیال نے آج تک بھرپور کوشش ہی نہیں کی تھی۔''

''نہیں چندو! ایسی بات نہیں ہے۔ بابا نے بڑی کوشش کی تھی۔ دو دن یہاں رکھا۔ اس دوران یہی قصہ چھڑا رہا مگر ماموں لاتعلقی سے بیٹھے ہوں ہاں کرتے رہتے تھے۔ سچ کہتی ہوں۔ تمہاری آنکھیں بولتی ہیں اور مقابل کو بولنے پر مجبور کردیتی ہیں۔''

چندو نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور پھر دونوں بی بی اماں کو خوشخبری سنانے کے لیے اُٹھ گئیں۔

رضوان کی شادی کے لیے رضامندی کی خبر حویلی میں آگ کی طرح پھیلی۔ رضوان کی دل سے تکریم کرنے والوں کو جہاں خوشی تھی وہاں حیرت بھی تھی کہ جو بات خاندان کے بڑے نہ منوا سکے، وہ چندو نے منوالی تھی۔ فائزہ نے چندو کو کریڈٹ دینے میں رائی بھر بخل سے کام نہ لیا۔ شام کو حسب معمول جمنے والی محفل میں ہمیشہ خاموش بیٹھ کر رضوان کی باتیں سننے والی بی بی اماں بچوں کی طرح خوشی سے چہک رہی تھی۔ دل میں چھپے ہوئے اس کے ارمان لبوں پر مچل رہے تھے۔ اس نے چشم تصور میں چھوٹے بھائی کے سر پر سہرا باندھ لیا تھا۔ اب نوکروں اور بیٹیوں کو خیالی پلاؤ پکا کر پیش کررہی تھی کہ کیسے حویلی سجائی جائے گی، کتنی دھوم دھام سے برات روانہ ہوگی اور کیا کچھ پکایا کھلایا جائے گا۔

صفیہ نے رنگ میں بھنگ ڈالا۔ ''اماں! آپ تو ایسے پروگرام ترتیب دیے بیٹھی ہیں جیسے ماموں کی شادی حویلی میں ہوگی۔''

بی بی نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''کیا حویلی میں میرے ویر کی شادی نہیں ہوسکتی؟''

''ہوسکتی ہے مگر نانا جان اور بڑے ماموں آسمان سر پر اُٹھالیں گے۔''

بی بی کو ایک ذرا چپ لگی پھر ہاتھ نچا کر بولی۔ ''اُٹھاتے رہیں۔ پروا نہیں۔ میں اپنے ویر کو اپنے ہاتھوں سہرا باندھوں گی۔ برات لے کر جاؤں گی۔ یہ خوشی میری حویلی میں ہی منائی جائے گی۔ آج اگر میر صاحب زندہ ہوتے تو جشن کا سماں ہوتا۔ فخر سے ان کی چھاتی پھول گئی ہوتی۔''

نورین نے چٹکی بھری۔ ''فکر نہ کریں بی بی جی! اب آپ کی سانس پھول جائے گی۔ نانا جان کو آپ ہم سے بہتر جانتی ہیں۔ گالیاں دینے پر آتے ہیں تو صبح سے شام ہوجاتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے مگر مجال کہ ایک لمحے کو چپ ہوں۔"

فائزہ اور صبا نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تو بی بی بجھ سی گئی۔ اپنے پیٹ کی جائیوں سے جیت نہیں سکتی تھی۔ بھائی نے اپنی بہن کو مشکل میں دیکھا تو مدد کے لیے میدان میں کود پڑا۔ "آپ سب لوگوں کا کہنا بجا مگر میں بھی چاہوں گا کہ میری شادی باجی کی حویلی میں سرانجام پائے۔"

سبھی رضوان کا منہ تکنے لگیں۔ چہرے پر عزم اور سچائی دکھائی دی تو حیران ہوئیں۔ فائزہ نے پوچھا۔ "ماموں! آپ نے یہ فیصلہ کیا سوچ کر کیا ہے؟"

وہ متانت سے بولا۔ "میں کوشش کے باوجود ابھی تک اماں اور بابا کی مہربانی کو بھول نہیں پایا اور اب ان لوگوں کو زحمت نہیں دینا چاہتا۔"

چندو نے محسوس کیا کہ رضوان کے لہجے میں سنگین نفرت کے پرتو جھلملا رہے تھے۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا محبت اتنے ہی طاقتور جذبے کا نام ہے کہ برسوں بعد بھی اس کا زہر بجھ نہیں پایا۔ ننھی ننھی چھیڑ خانیوں کے بیچ نورین نے سب کو خاموش کرا کر تجسس مہمیز کرتے ہوئے کہا۔ "خیالی پلاؤ پکانے سے پہلے یہ تو سوچ لیا جائے کہ دلہن کہاں ہے؟"

سبھی کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ شادی کی فلم میں ہیروئن کا کردار غائب تھا۔ بی بی نے کہا۔ "میں نے دلہن کے بارے سوچ لیا ہے۔ چاند سی دلہن لاؤں گی اپنے ویر کے لیے۔ کئی لڑکیاں میری نظر میں ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک......"

ایسے ہی وقت میں رضوان نے سر جھکا کر کہا۔ "نہیں باجی! سب کام آپ کی مرضی سے ہوں گے مگر دلہن کون ہوگی؟ یہ فیصلہ میں کروں گا۔"

بی بی مارے خفت کے خاموش ہو گئیں۔

فائزہ نے پوچھا۔ "کیا آپ کی نظر میں کوئی ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو سبھی لڑکیاں اپنے اپنے انداز میں کریدنے لگیں۔ جب مایوس ہو کر بیٹھ رہیں تو رضوان نے کہا۔ "دو چار دنوں میں عمر حیات آ جائے گا۔ میرے ملتان جانے سے پہلے اسی جگہ پر آخری محفل سجے گی جس میں بتا دوں گا کہ میری نظر میں کون ہے۔ تب تک اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا، پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ "آج میں آپ کو دوستی کے آداب اور باہمی تعاون کے بارے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اسلام اخوت اور بھائی چارے کی تلقین کرتا ہے۔ امن اور سلامتی......"

پھر اس نے کسی کو بیچ میں ٹوکنے اور موضوع بدلنے کی مہلت نہ دی اور بڑے دل نشین انداز میں بات سے بات نکالتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ محفل دس بجے تک جمی رہی۔

چندو اور فائزہ نے عشا کی نماز پڑھی۔ فائزہ کو چائے کی طلب ہوئی۔ چندو کو کچن میں بھیج کر رضوان کا بتایا ہوا وظیفہ دہرانے لگی۔ چندو چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر کچن سے نکلی۔ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ایسے وقت میں رضوان بی بی کے کمرے سے نکلا۔ اُسے دیکھ کر رُک گیا۔

اس نے دوپٹا درست کیا اور پوچھا۔ "ماموں! چائے پئیں گے؟"

رضوان نے جواب دینے کے بجائے ٹرے میں سے ایک کپ اُٹھا لیا۔ پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "چندو! سونے سے پہلے چائے مت پیا کرو۔ ٹھیک طرح نیند نہیں آتی اور صحت بگڑ جاتی ہے۔ دودھ پیا کرو۔"

"جی!" اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے چندو کا نام لیا تھا ورنہ ہمیشہ 'بیٹی' یا 'بابا' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ بولا۔ "فائزہ بیٹی کیا کر رہی ہے؟"

"چائے کا انتظار کر رہی ہے۔"

"ٹرے مجھے دو اور تم اپنے لیے چائے بنا کر کمرے میں آ جاؤ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔" اس نے چندو کے ہاتھ سے ٹرے تھامی اور سیڑھیاں چڑھ گیا جبکہ چندو نے کچن کا رُخ کیا۔

اپنا کپ اُٹھائے کمرے میں آئی تو فائزہ کو بیڈ پر جبکہ رضوان کو صوفے پر براجمان پایا۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔ وہ فائزہ کے پہلو سے لگ بیٹھی۔ رضوان دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ٹی وی، وی سی آر اور فلمی دنیا انسانی خواہشات کو بتدریج بڑھاتی جاتی ہیں۔ انسان خواہشات کی دلدل میں دھنستا جاتا ہے اور اپنے خالق سے دور ہوتا جاتا ہے۔"

چندو بولی۔ "ماموں! کیا مخلوق کا اپنے خالق سے ناتا ٹوٹ بھی سکتا ہے؟"

رضوان بری طرح چونکا۔ اُسے کئی لمحے دیکھنے کے بعد بولا۔ "یہ تم نے کیوں پوچھا؟"

"سوری ماموں! شاید میں غلط بول گئی۔"

"ہاں! تم نے واقعی غلط بات کہہ دی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ انسان بے پروائی اور غفلت کا مرتکب ہو سکتا ہے مگر ربّ کائنات بڑا مہربان، سمیع اور بصیر ہے۔ وہ اپنے بندے کی پل پل کی خبر رکھتا ہے اور بار بار توبہ کی طرف راغب کرتا ہے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور...... ایک نہیں کئی ایک...... میں اپنی علمی استعداد کے مطابق ضرور جواب دوں گا۔"

"جس شخص کے ماں باپ اُس پر ناراض ہوں، شکل دیکھنے کے روادار نہ ہوں، کیا وہ خدا کا ناپسندیدہ شخص ہوتا ہے؟"

سوال آسان تھا۔ پوچھنے والی کے چہرے کے تاثرات مشکل تھے۔ سوچ میں پڑ گیا۔ دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ چائے پیتا رہا۔ کپ خالی ہو گیا تو آہستہ سے میز پر رکھ کر منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف منہ کر کے پھونک ماری۔ وہ جواب کی منتظر تھیں مگر کافی دیر خاموشی رہی پھر ایک لمبی سانس لے کر رضوان نے کہا۔ "چندو! والدین کو ناراض کرنے والا خدا کو یقیناً ناراض کر بیٹھتا ہے مگر تم دل میلا نہ کرو اور تھوڑا وقت گزرنے دو۔ خدا تمہیں ضرور موقع دے گا کہ تم اپنے ماں باپ کو منا لو۔ ہاں! جب کبھی خدا ایسا چانس دے، تب بزدلی نہ کرنا اور اَنا کی بھینٹ بھی نہ چڑھنا۔ ماں باپ اور خدا، بھی مان جائیں تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔"

چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار رضوان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سحر چھپا تھا کہ کوشش کے باوجود نظر ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ اس نے مزید کہا۔ "چندو! تمہیں بہت بہادر بننا ہوگا ورنہ تم زندگی سے ہار جاؤ گی۔ زندگی سے ہارنا اور مرنا ایک جیسے عمل نہیں ہیں۔ یاد رکھنا، تم پر جھپٹنے کے لیے کئی مصیبتیں منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ ایک کے بعد ایک...... مگر مجھے یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ آخرکار تم جیت جاؤ گی، ایک نہ ایک دن...... اور پھر تم بہت ظلم کرو گی۔ بہت سی نیکیاں بھی تمہارے کھاتے میں پڑیں گی...... اور ایک نیکی...... صرف ایک نیکی تمہیں زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر لے جائے گی۔ کب؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے اختیار رضوان کی طرف کھنچ گئی۔ اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔ رضوان نے اُس کا دوپٹا بالوں کی طرف دھکیلا۔ پیشانی پر لکھی ہوئی کوئی نادیدہ تحریر لفظ لفظ پڑھتا رہا۔ ہاتھوں کو باری باری پکڑ کر دیکھتا رہا۔ انگلیوں اور انگوٹھوں کی پوروں کو ٹٹولتا رہا پھر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "چندو! محبت کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

وہ شرما گئی۔ سر جھکا کر بولی۔ "سچی ہو تو عبادت، ورنہ گناہ۔"

"سچ اور جھوٹ کا تعین کیسے ہوگا؟" رضوان کی باتیں سیدھی دل پر چوٹ لگانے لگی تھیں۔

"جس محبت میں لالچ اور ہوس نہ ہو، وہ سچی ہوتی ہے۔"

"لالچ؟...... ہوس؟...... یہ کیا ہیں؟"

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ بولی۔ "میں آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی ماموں!"

اس نے وفورِ شفقت سے کہا۔ "چندو! محبت انہی دو جذبوں کا ہی تو نام ہے۔ لالچ کیا؟ دیکھنا، ملنا، سوچنا اور پانا...... بس۔ اور ہوس کیا؟ کھو دینے کی رغبت۔" اس نے چندو کی آنکھوں میں جھانکا پھر از خود نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں! محبت اپنی ہستی کو فنا کر دینے کا نام ہے، مگر کیا تمہاری ہستی تمہاری تخلیق ہے جسے تم اپنی مرضی سے کسی اُجلے نظر آنے والے چہرے پر قربان کر دو؟...... نہیں! محبت کسی ایک کے لیے ہر انسان کو نظر انداز کرنے کا نام ہے، مگر کیا حقوق العباد کا یہی فلسفہ ہے؟...... نہیں! محبت کچھ اور ہے۔ کیا ہے؟ میں لفظوں میں اس جذبے کا احاطہ تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت خدا تک، اپنے تخلیق کار تک پہنچنے کی پہلی سیڑھی ہے۔ اب تم سوچ رہی ہو گی کہ محبت انسان سے کی جاتی ہے، خدا کا اس سے کیا تعلق؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ فائزہ بھی اِس دوران اُٹھ کر قریب آ گئی۔ کسی صوفے پر بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چندو کے گھٹنوں سے کمر ٹکا کر قالین پر بیٹھ گئی اور توجہ سے سننے لگی۔

رضوان کہہ رہا تھا۔ "جب تم کسی بھی تخلیق کے حصار میں داخل ہو گی تو تم براہِ راست تخلیق کار سے جڑ جاؤ گی۔ یہیں کہیں فنا فی الذات اور فنا فی اللہ کی منزلیں ہیں۔ تم جس کسی پر بھی اپنی صلاحیتیں مرکوز کرو گی، تمہاری نظروں اور خالق کے بیچ تخلیق حائل نہیں رہے گی۔ وہ ٹرانسپیرنسی بن جائے گی اور تمہیں چند قدم آگے دھکیل دے گی۔"

چندو اور فائزہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

رضوان نے کہا۔ "خالق کی تخلیقات کا سلسلہ لامحدود ہے۔ یعنی تمہاری قوتوں کا ارتکاز ایک وقت آنے پر پوری دنیا کو ٹرانسپیرنٹ کر دے گا۔ تب تمہیں وہ سب کچھ بھی نظر آنے لگے گا جو باقی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا۔ یہی محبت کا ماحصل ہے۔"

چندو نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "کیا میں محبت کر سکتی ہوں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

فائزہ نے کہنی ماری۔ چندو نے نظر انداز کیا۔ رضوان نے فائزہ کی حرکت دیکھ لی۔ ایک ذرا مسکرا کر بولا۔ ''یہ بے معنی سوال ہے۔ محبت ایک لمحے کا ماحصل ہے۔ وہ لمحہ کس کو کب ملتا ہے، یہ اُوپر والا جانتا ہے۔''

''کیا آپ اس محبت کا تذکرہ کررہے ہیں جو آپ نے موچی کی بیٹی سے کی تھی؟'' فائزہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

رضوان کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ چہرہ پل بھر کو متغیر ہوا۔ سنبھل کر بولا۔ ''ہاں! شاید وہی محبت تھی جو اُس نے کی تھی۔''

''مگر اُس نے تو آپ سے بے وفائی کی تھی۔''

''یہ تمہیں کس نے کہہ دیا؟ وہ کون ہوتی تھی بے وفائی کرنے والی؟'' رضوان کے جملے سخت تھے مگر لہجہ بے حد نرم اور ملائم تھا، بولا۔ ''کوئی اپنا کر بادشاہ کرتا ہے۔ کوئی چھوڑ کر بادشاہ کرتا ہے۔ یعنی یہ طے ہوا کہ محبت کرنے والے کا کردار بے معانی ہوتا ہے۔ اصل کردار محبت ہے اور محبت بادشاہ گر ہوتی ہے۔ سنو! بادشاہی کیا ہے؟ کیا امارت کا نام ہے؟ سخاوت کا؟ نہیں...... حقیقی بادشاہی اُوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ نیچے مجاز بنتا ہے۔ مجاز کیا ہے؟ جھوٹ؟...... نہیں۔ حال اور مستقبل کا کسی بھی نقطے پر سنگم ہے۔ موچی کی بیٹی، جو اس وقت ریں ریں کرتے ہوئے چار بچوں کی افلاس ماری ماں ہے، نے مجھے بادشاہ کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میری بھول ہو۔ میں ابھی تک ویسا ہی تہی داماں ہوں، جیسا پہلے تھا مگر کچھ تبدیلی رونما ضرور ہوئی ہے۔ مجھے کچھ نیا نظر آنے لگا ہے۔''

''کیا نظر آنے لگا ماموں؟'' چندو حیرت سے بولی۔

''میں اسے لفظوں میں نہیں ڈھال سکتا۔''

''آپ مجھے کچھ بتا رہے تھے۔'' اس نے یاد دلایا۔

''ہاں! مجھے نظر آرہا ہے کہ تم چھوٹی مصیبتوں سے نکل کر بہت بڑی مصیبت میں گھرنے والی ہو۔ تم لاعلم ہو۔ میں لاعلم نہیں ہوں۔ تم رائی بھر مصیبت سے ڈر گئی ہو جبکہ آگے بڑے پہاڑ ایستادہ ہیں۔''

چندو کا دل دہشت سے دھڑکنے لگا۔ جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔

''چندو! تم پناہ میں نہیں، نباہ میں ہو۔ عنقریب مفاہمت کا یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے گا اور تم بے آسمان ہو جاؤ گی۔ بے زمینی کا شکار پہلے ہی ہو۔ محبت، جس کا دم بھرتی ہو، گالی بن کر دماغ کے پردے پھاڑنے لگے گی۔ ہاں! تمہیں اپنے حسن کی تاب و تمکنت بھی عذاب محسوس ہوگی۔ زندگی سے موت مانگو گی مگر...... یا خدا رحم! زندگی کے دامن میں موت بھی تو نہیں ہوتی ناں! یہ تو بہت کنگال ہوتی ہے۔'' رضوان کا لہجہ بھرا سا گیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چندو کا حال 'کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' جیسا ہوگیا۔ اختیار کانپتی گرفت میں رضوان کا ہاتھ بھینچ کر بولی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے ڈر لگنے لگا ہے ماموں!''

رضوان کی آنکھوں میں ترحم جاگا۔ دھیرے سے بولا۔ ''کاش! میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا۔ ہاں! ایک کام کرسکتا ہوں۔ سن لو۔ کبھی سمجھ آجائے گا۔ انسان زندگی ہارتے ہوئے خدا پر ایمان کی دولت گنوا بیٹھتا ہے۔ پھر آگے کا نہیں رہتا، پیچھے کا بھی نہیں۔ تم جس وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤ کہ خدا نہیں ہے، مشکل تو ہے مگر تب صدقِ دل سے خدا کی وحدانیت پر یقین کر لینا۔ پھر دیکھنا، وہ کیسے تمہارا ہاتھ تھامتا ہے۔ وہ تم پر کسی بھی شخص کو سائبان کر دے گا۔ ضروری نہیں کہ وہ شخص نیکوکار ہو۔ بہت برا بھی ہوسکتا ہے مگر، تمہیں بادشاہ کردے گا اور تمہارے ہر دکھ کا مداوا ہوجائے گا۔ تمہیں اپنے والدین کو منانے کا موقع بھی مل جائے گا۔ یہ مت سوچنا کہ تمہارے والدین کون ہیں؟ وہی ہیں، جنہوں نے تمہیں پالا پوسا۔ بس! کوئی اور نہیں...... وہ راضی ہوگئے، سمجھو خدا راضی ہوگیا۔ تب محبت تمہارا دیدار کرنے آئے گی۔''

چندو نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''عمر حیات؟''

رضوان کے چہرے پر سایہ سا لہرایا، بولا۔ ''عمر حیات مجھے تمہاری زندگی میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تو بچھڑنے والا ہے، ہمیشہ کے لیے۔ میں جس کا تذکرہ کر رہا ہوں، وہ کوئی اور ہے۔''

چندو کا دل بیٹھ گیا۔ گلے میں کانٹے چبھنے لگے۔ بولی۔ ''ماموں! بددعا تو نہ دیں پلیز!''

رضوان کے لبوں پر بے رحم مسکراہٹ ابھری۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس نے 'تڑاخ' سے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر زور سے مارے، بولا۔ ''میں کون ہوتا ہوں بددعا دینے والا...... یا خدا رحم!...... میں شاید غلط کہہ گیا۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔ اپنے لیے دعائیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں فیصلہ کار نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو تمہاری کوئی مدد نہ کر پاتا۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب بھی وقت کی ہتھیلی پر لکھا ہے۔ کبھی پڑھ لینا۔ اور سنو! میں جس محبت کی بات کر رہا ہوں، وہ ابھی بہت دور ہے...... بہت دور۔ ابھی نظر نہیں آئے گی۔''

فائزہ نے ترحم آمیز نظروں سے چندو کی طرف دیکھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور رضوان سے پوچھا۔ ”چندو اُسے کیسے پہچانے گی؟“

”عاشق اور بادشاہ کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔“ رضوان نے وثوق سے کہا۔ ”عشق تو ذات ہے۔ پہچان ہے۔ پہچان کے خال و خد نہیں ہوتے مگر کامل وجود ہوتا ہے جسے اپنا تعارف نہیں کرانا پڑتا۔“

”پھر بھی؟“

”وہ بھٹکتا ہوا آئے گا۔ اس کی حالت ایسی ہی ہوگی جیسے کسی بھی ہارے ہوئے سپاہی کی ہوتی ہے۔“

”کیا چندو کی اُس سے شادی ہوگی؟“

رضوان کے لبوں پر عجیب اور بے عنوان مسکراہٹ اُبھری۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔

کوئی جواب نہ پا کر چندو نے کہا۔ ”فائزہ! خاموش ہو جاؤ۔ کیا میرے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ تمہارا بھائی مجھ سے بچھڑنے والا ہے۔“

رضوان نے آنکھیں موندے انکار میں سر ہلایا، کہا۔ ”نہیں بابا! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟“

فائزہ بولی۔ ”ماموں! میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کے نزدیک وہ بادشاہ ہے جس پر اللہ راضی ہو جاتا ہے۔ کیا چندو بھی بادشاہ ہوگی؟“

وہ ٹھٹک کر آزردگی سے بولا۔ ”ہاں! یہ بادشاہ ہوگی مگر اسے عشق نہیں، وقت مسند پر بٹھائے گا۔ یہ خود پر ظلم کرنے والوں کی گردنوں پر پاؤں رکھے گی۔ اور ہاں! اسے ایک بادشاہ بھی زندگی کی کسی نہج پر ملے گا۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے۔“

فائزہ نے دل پر ہاتھ رکھا، بولی۔ ”ماموں! ایک بات اور...... ذرا سا کھل کر بتا دیں کہ چندو کے ساتھ کس قسم کے حالات پیش آنے والے ہیں؟“

یہ سوال مشکل تھا۔ شاید جواب اُس سے بھی کہیں کٹھن تھا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ چہرے پر اذیت کے آثار اُبھرے۔ بے بسی آمیز بیزاری سے بولا۔ ”بیٹی! میں زبان نہیں دے سکتا ان مناظر کو جنہیں میری چشمِ تصور دیکھ رہی ہے۔ یا خدا رحم!...... بس! کچھ اور بتانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ”تم سو جاؤ۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ میں نے صبح کھاد لینے شہر جانا ہے۔“

”محبت، جو چندو کو ملے گی، اس کی کوئی نشانی؟ پلیز ماموں......“

فائزہ نے پائنچہ تھام لیا۔

وہ چند لمحوں تک آنکھیں موندے کھڑا رہا۔ پھر باری باری دونوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ غم بار تھی۔ داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اُٹھا کر اپنی بند آنکھ پر رکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ پھر ایک لفظ ادا کر کے خاموش ہو گیا۔ وہی لفظ محبت کی نشانی تھی۔ چندو کے دل پر نقش ہو گئی۔

چندو مزید بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان گنگ ہو گئی اور سر جھک گیا۔ سسکنے لگی۔ فائزہ خاموشی سے اُٹھ کر بیڈ پر جا لیٹی۔ چندو ماہی کچھ دیر تک اپنے نصیبوں کو روتی رہی۔ رضوان کی باتوں کو دل میں دہراتی رہی پھر نڈھال قدموں چلتی ہوئی بیڈ تک آ گئی۔ فائزہ کے پہلو میں بے جان انداز میں گر گئی۔ رضوان کی باتوں نے اُس کا دل دہلا دیا تھا۔ وہ جوتشیوں، پیروں فقیروں اور نجومیوں کی دنیا سے ناشنا سا تھی۔ ان کی کہی ہوئی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتی تھی مگر دل بے اختیار رضوان کی باتوں کو پلو سے باندھ بیٹھا تھا۔ فکر دور کی باتوں کی زیادہ نہ تھی اور قریب کے دکھ سے جان سلگنے لگی تھی۔ عمر حیات کے بچھڑنے کی خبر خون چوس رہی تھی۔ وہ شب بھر ٹھیک طرح سو نہ پائی۔ علی الصباح جائے نماز پر گر گئی۔ گڑگڑا کر رحم کی استدعا کرنے لگی۔ جھولی پھیلا کر دینے والے سے محبت کی بھیک مانگنے لگی۔

فائزہ نے اُس کے ہچکیوں کی تال پر جھٹکے لیتے وجود کو بانہوں میں بھر لیا۔ پیار سے کہا۔ ”ماموں مذاق بھی کر لیا کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ میرا بھائی تمہیں چھوڑ دے؟ نہیں چندو! وہ تمہارے حسن کا دیوانہ ہے اور تمہارا حسن بجھنے والا تو نہیں ناں! بھائی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو واقعہ ابھی تک رونما نہیں ہوا، ہوتا نظر بھی نہیں آتا، اس پر دل کو دکھی کرنے کا کیا فائدہ؟“

وہ سسک کر بولی۔ ”ہائے فائزہ! اگر عمر حیات مجھ سے روٹھ گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔“

فائزہ بنا کچھ بولے اُسے سینے سے لگا کر بہلاتی رہی۔

چندو عمر حیات کی واپسی تک کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتی رہی۔ برف پیروں سے انگاروں پر چلتی رہی۔ اس کی کوشش کے باوجود رضوان نے اُس رات کے بعد اُسے علیحدگی میں وقت نہ دیا۔ اس سے کھنچا کھنچا رہا۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتی، دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ رضوان نے نہ تو اُس سے مذاق کیا تھا اور نہ جھوٹ ہی بولا تھا۔ جو بھی کہا تھا، اپنے علم اور کسی اندرونی طاقت کی بنا پر ہی کہا تھا۔

عمر حیات گھر پہنچا تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ عشا کے وقت گھر پہنچا تھا۔ بی بی کے کمرے میں سبھی گھر والے

اس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ مزے مزے سے اپنے پندرہ روزہ ٹرپ کی دلچسپیوں کا احوال سنانے لگا۔ پھر تھک گیا اور جماہیاں لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی محفل برخاست ہو گئی۔

فائزہ نے پہلے سے دیکھی ہوئی ایک فلم وی سی آر میں ڈال دی۔ چندو کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی رہیں مگر ذہن کے پردوں پر عمر حیات ثبت تھا۔ وہ خاصا نکھر گیا تھا۔ رنگت بھی دودھ کی طرح صاف ہو گئی تھی۔ دل اُس کی طرف کھنچ رہا تھا۔

ایک بجے فلم ختم ہوئی۔ فائزہ نے جماہی لی۔ کہا۔ ”سو جا میری جان! فلم ختم ہو گئی ہے۔“

”فائزہ! کیا میں میر زادے سے ملنے چلی جاؤں؟“

”کیا مطلب؟“ فائزہ کی سستی ہوا ہو گئی۔ ”اگر بی بی کو پتا چل گیا تو مار مار کر بھرکس نکال دیں گی۔“

”پلیز فائزہ! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ تم نے ماموں رضوان کی باتیں سنی تو تھیں۔“ اس کے لہجے میں التجا گھل گئی۔

”ایسی باتوں کو دل پر نہیں لیا جاتا بھئی! آرام سے سو جاؤ۔ کل دن میں اپنے دیوانے سے مل لینا۔ اُسے بھی قرار آ جائے گا، تمہیں بھی۔“ فائزہ نے کروٹ بدل لی۔

چندو تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر بولی۔ ”فائزہ! چند منٹ کی اجازت مانگ رہی ہوں۔ پلیز! زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔“

وہ قدرے بیزاری سے بولی۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ! مگر جلدی آ جانا۔ خیال رکھنا۔ بی بی اماں کے کان بہت تیز ہیں۔“

وہ اچھل کر بیڈ سے اُتری۔ قدموں کی آہٹ کے خوف سے ننگے پیروں چلتی ہوئی گراؤنڈ فلور پر بی بی کے ساتھ والے کمرے کے دروازے تک آ گئی۔ انگلی کی ضرب سے مدھم سی دستک دی۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ تھکا ہوا دیوانہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے پھر دستک دی۔ وہ بیدار ہو گیا۔ آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر آیا۔

اُسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ کمرے میں لا کر سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگا۔ ”خیر تو ہے؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

اس نے عمر حیات کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وارفتگی سے چوم کر رونے لگی۔ وہ مزید گھبرا گیا۔ وہم ہوا کہ کسی نے اس کی عدم موجودگی میں کچھ ایسا ویسا تو نہیں کہہ دیا تھا۔ دروازہ بند کر کے اُسے بیڈ تک لایا۔ بٹھا کر ہولے ہولے پوچھنے لگا۔ وہ رضوان سے ہونے والی گفتگو سنانا چاہتی تھی مگر یوں لگا جیسے اُس کی قوت گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ [illegible] بتا سکی تو بے چارگی سے بولی۔ ”تم مجھے چھوڑ دو گے؟“

اس کے لبوں پر جاندار تبسم ٹھہر گیا۔ بھانپ گیا کہ وہ اُس کی غیر موجودگی پر اداس ہو گئی تھی۔ بانہوں میں بھر کر پیار کرنے لگا۔ ایسے میں اچانک اُسے محسوس ہوا کہ چندو کا بدن غیر معمولی سرد تھا۔ وہ اس کی وارفتگی کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اندیشوں بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”میر زادے! میں نے کیا پوچھا ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں تمہیں...... کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟“

وہ نفی میں سر ہلا کر رونے لگی۔ عمر حیات ہر طور سے یقین دلانے میں ناکام رہا تو زچ ہو کر بولا۔ ”چندو! میں لمبے سفر سے آیا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔ مجھے پریشان نہ کرو اور صاف صاف بتاؤ، کیا بات ہے؟“

وہ کھڑی ہو گئی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ ماموں رضوان نے جس لڑکی سے محبت کی تھی، وہ باپ کا نام رکھتی تھی مگر کمین زادی تھی۔ اسی بنا پر ٹھکرا دی گئی۔ میری پیشانی پر تو باپ کا نام تک لکھا ہوا نہیں ہے۔ مجھے حویلی کی دلہن نہیں بنایا جائے گا۔“

عمر حیات نے چندو کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔ سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟“

”خدا کے بعد تمہی پر تو دل بھروسا رکھتا ہے۔“

”پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟“

”اپنی اوقات دیکھتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں۔“

”اگر تمہاری اوقات اتنی ہی پست ہوتی تو میں تمہیں اپنی پلکوں پر نہ بٹھاتا۔ اب جاؤ، سو جاؤ، اور مجھے بھی سونے دو۔ فضول نہ سوچا کرو۔“ اس نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”دھکے تو نہ دو۔“

اس نے چندو کے کان سے منہ لگایا۔ ”اپنی خیر مناؤ اور بھاگ جاؤ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر ضبط کیے کھڑا ہوں۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ تڑخ کر جواب دیتی۔ مگر اس وقت سست قدموں سے میر زادے کی تنہائی سے نکل آئی۔ فائزہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ جونہی دروازہ بند کر کے بیڈ پر لیٹی تو فائزہ نے اُسے دونوں ہاتھ لیا۔ لبوں کو چھو کر بولی۔ ”دیوانے نے یہاں محبت کا سجدہ کیا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ فائزہ نے سوال بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گال کو چھوا۔ اس کے انکار پر مسکرائی۔ شرارت سے بولی۔ ”پھر کیا کہا اس نے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

فائزہ اُسے گدگدانے لگی۔ چھیڑتے ہوئے پیش قدمی کرنے لگی۔ لب جان آ کر تھم گئی۔ چندو نے پیار سے ڈانٹا۔ ”ایسا کچھ نہیں کہا تیرے بھائی نے...... ہٹو! مجھے سونے دو۔“

اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ سوچنا چاہتی تھی۔ سوچنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ اُسے ایک طرح سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ عمر حیات کو کھونے والی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں اور کیسے اُسے چھوڑے گا۔ کسی کے بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ یوں جیسے کسی کے مرنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ مگر اسباب کو مدنظر رکھ کر آنی کو ٹالے جانے کی کوشش تو کی جا سکتی تھی۔ پھر اُس نے رضوان کے کردار اور عمر حیات کے ہیجان کو ترازو کے پلڑوں میں رکھا۔ دماغ کہتا تھا کہ عمر حیات کی بات مانی جائے۔ دل کہتا تھا کہ رضوان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی، اس کی بات کو سچ سمجھا جائے۔ ترازو کے پلڑے برابر ہو گئے۔ کشمکش نے سانسیں دوبھر کر دیں۔ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔

اگلے دن رضوان نے حساب کتاب عمر حیات کے حوالے کیا۔ شام تک جانے کی تیاری میں مصروف رہا۔ عشا کی نماز پڑھ کر چندو اور فائزہ بھی لگے بندھے معمول کے مطابق صحن میں آ گئیں۔ سبھی جمع تھے مگر وہ نہیں تھا جو رونقِ محفل ہوا کرتا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد اپنے کمرے سے نکلا۔ اس نے اپنا سیاہ رنگ کا بیگ اُٹھا رکھا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ صحن سے سیدھا اپنی منزل کی طرف چلا جائے گا۔

جب اپنے مخصوص موڑھے پر بیٹھ گیا تو بی بی نے گلہ کیا۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے رضوان! دو چار دن تو ٹھہر جاتے۔“

”باجی! ہر آنے والے کو جانا ہے۔ جلد یا بدیر۔ پھر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی اُداسی رچی ہوئی تھی۔ ”عمر! گاڑی تیار ہے؟“

”جی ماموں! نواز آپ کو ملتان چھوڑ آئے گا۔“

”ناحق تکلیف کی۔ میں شہر سے ویگن پکڑ لیتا۔“

”اس وقت شہر سے کوئی ویگن نہیں ملتی۔“ عمر حیات نے کہا۔ ”ویسے بھی اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ اگر گھر میں گاڑی نہ ہوتی تو مجبوری تھی۔“

لڑکیاں کچھ اور سننا چاہتی تھیں۔ صفیہ بولی۔ ”ماموں! آج آپ کا یہاں آخری دن ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جاتے ہوئے بتائیں گے کہ آپ نے کس لڑکی کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں تم لوگوں کی بے چینی دیکھ رہا ہوں۔“

عمر حیات سیاق و سباق سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کے استفسار پر بی بی نے چندو کے کارنامے کو تھوڑا بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ عمر حیات کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ چندو کو دیکھ کر فخر سے بولا۔ ”تم نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔“

رضوان نے اُس کی بات سنی ان سنی کی، بولا۔ ”ہاں! میں تھوڑی دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ لوگوں کی خوشی یا دُکھ کی مجھے کوئی پروا نہیں ہو گی کیونکہ ان مرحلوں سے میری زندگی عرصہ پہلے گزر چکی ہے۔ شاید اپنے خاندان میں بہت کم آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں صرف ایک ہی سوال میری تاک میں رہتا ہے۔ ’شادی کب کرو گے؟‘ میں اگر شادی نہیں کرنا چاہتا تو کیوں سب لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ سمجھ نہیں آتا۔ سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ لوگ سمجھ جائیں تو آپ کا فائدہ ہو گا ورنہ میرا کسی بھی صورت نقصان نہیں ہو گا۔“

چندو گڑبڑا سی گئی۔ کوئی خوشی کی خبر اس تمہید کے ساتھ نہیں دیا کرتا۔ یوں لگا جیسے اُس کی محنت اکارت گئی تھی۔ رضوان بدل گیا تھا۔ وعدہ خلافی پر مائل تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”چندو ماہی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ زرینہ، غریب موچی کی بیٹی، کے بعد یہ دنیا بانجھ نہیں ہو گئی۔ دنیا محبت سے خالی نہیں ہو گئی۔ اس نے بہت دلیلیں دیں۔ بہت اونچی باتیں کیں۔ یہ بھی کہا کہ کیا خدا نے انسان کو صرف ایک ہی انسان سے محبت کا حکم دیا ہے؟ کیا ایک انسان کے لیے اپنا تن من دھن تج دیا جائے تو تخلیقِ انسان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے یا ایک کے مرنے کے بعد دوسرے آنے والے کے لیے دل کے دروازے بند کر دیے جائیں؟...... مجھے اس کی کی ہر بات ماننا پڑی کیونکہ میرے پاس اِسے قائل کرنے کے لیے اس وقت کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی۔“

فائزہ نے پوچھا۔ ”تو کیا آپ نے اب کوئی ٹھوس دلیل تلاش کر لی ہے؟“

رضوان نے اثبات میں سر ہلایا، کہا۔ ”بلاشبہ!“

اس کی آواز میں کچھ ایسا نیا پن تھا کہ سبھی متفکر ہو گئے مگر کسی نے اُس کی بات میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بولتا رہا۔ ”زرینہ میری محبت تھی اور مجھے آج بھی اس محبت پر کوئی ندامت نہیں۔ اس پر بھی شرمندہ نہیں ہوں کہ اُس نے مجھے چھوڑ کر اپنا گھر بسا لیا۔ بچے جن لیے۔ دنیا والوں کے نزدیک بچے جننا ہی تو محبت کا حاصل ہے۔ ہر باپ بچہ پیدا کر کے ہواؤں میں اُڑنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اُس نے کوئی تیر مارا ہو، کوئی نیا کام کیا ہو مگر وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا کے نوے

فیصد مرد باپ بنتے ہیں اور مر جانے پر اپنا نام تک کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ نام، جس کے لیے انہوں نے نر بچے جنے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے تو نام کی ضرورت نہیں، اولاد کی احتیاج نہیں اور میں اپنے کھنڈر پر زندگی گزار کر خاموشی سے مر جانا چاہتا ہوں۔ پھر تم لوگوں کو میری شادی کی فکر کیوں ہے؟“

ایک عجیب سا حزن اُس کے لہجے میں گھل گیا۔ توقف کے بعد سر اُٹھا کر بولا۔ ”یہاں رہ کر مجھے پتا چلا کہ عمر حیات نے بے نام و نسب والی لڑکی کے لیے اپنے گھر بار کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ میں نے اپنی باجی کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ منافقوں کی دنیا ہے۔ بڑی بہن ماں کے رتبے پر فائز ہوتی ہے اور ماں...... ایک ماں کو بھی اولاد کی خوشیوں پر نام و نسب کو ترجیح دیتے دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے۔ میری ماں کو تو ہین کا احساس ہوا تھا جب میں نے اپنے لیے موچی زادی چنی تھی۔ باجی کو ملال ہے کہ اُس کے بیٹے نے ایک حرامزادی کو حویلی کی رانی بنانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔“

بی بی نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔ بولا۔ ”میں پوری ذمے داری سے سچ بول رہا ہوں، کوئی دخل نہ دے۔ جب میں چلا جاؤں، تب سب لوگ اپنی بھڑاس نکال لیجیے گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ دنیا منافقوں کی جنت ہے۔ بہنیں بھائی کو چاہتی ہیں مگر بھائی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتیں اور بھائی! وہ ایک ہی وقت میں دو کشتیوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہے۔ ماں کی محبت کو بھی سمیٹنا چاہتا ہے۔ جائداد کو مٹھی میں رکھ کر محبت کی دولت پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ چندو ماہی اور عمر حیات ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اُوپر طے پانے والے فیصلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کون ہارتا ہے؟ کون جیتتا ہے؟ یہ اوپر والا ہی جانتا ہے۔ اپنی بساط پر انسانوں کو مہرے بنا کر کھیلتا ہے۔“

سبھی ایک ٹک اُسے دیکھ رہے تھے۔ چاند اُس پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ اُس کے خال و خد کو اجال کر بڑا پراسرار بنا رہا تھا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اُتار کر بولا۔ ”چندو بضد تھی کہ میں شادی کر لوں۔ گھر بسا لوں۔ جب میں نے ہاں بھری تو سبھی لوگوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ ہر چہرہ منافقت کے رنگوں سے سج گیا۔ کسی کو میری خوشی سے کچھ لینا دینا نہیں، سبھی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ میری زندگی کے لیے بہترین فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے مشورے کو مان لیا جائے۔“

چندو نے فوراً مزاحمت کی۔ ”ماموں! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ ہم واقعی آپ کو خوش اور آسودہ دیکھنا چاہتے ہیں۔“

فائزہ نے تائید کی پھر سبھی نے اپنا دفاع کیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں ابھی ثابت کرنے والا ہوں کہ آپ لوگ میری خوشی کے لیے ہرگز سنجیدہ نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ میری خوشی کی خاطر کون اپنی جان دے سکتا ہے؟“

اُس کا سوال نہ صرف غیر دانش مندانہ تھا بلکہ غیر متوقع بھی تھا۔ عمر حیات متردد ہوا۔ ”ماموں! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میری خوشی کی قیمت ادا کرنی پڑے تو کیا آپ لوگ ادا کریں گے؟“

بی بی نے جھٹ کہا۔ ”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ حکم کرو میرے ویر! میری جان بھی حاضر ہے۔“

اس نے عمر حیات کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ”ماموں! سچ کہتا ہوں۔ مجھے سب کچھ لٹا کر آپ کو خوش دیکھنا پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گا۔“

اُس نے باری باری سبھی کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ ہر کسی نے کم و بیش انہی الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ رضوان نے سب کچھ سن کر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ بیگ کے چوڑے ربن سے کھیلتا رہا۔ فیصلہ کن انداز میں سر اُٹھا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ فرض کیا کہ مجھے یقین آ گیا ہے۔ آپ لوگوں نے یہ یقین بھی دے دیا ہے کہ نہ صرف انسان کے لیے ایک محبت پر اکتفا کرنا لازم نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ میں زرینہ کی محبت سے دست بردار ہو کر کہتا ہوں کہ میں چندو ماہی کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں اور آپ لوگوں کی قربانی کا منتظر ہوں۔“

چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بم پھٹ جاتا تو شاید اتنی حیرت اور دکھ نہ ہوتا جتنا دکھ رضوان کی بات سن کر ہوا تھا۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخی۔ ”ماموں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

عمر حیات ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رضوان کو دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے کوئی بات تک نہیں نکل پائی تھی۔

”ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ زرینہ، چندو، عمر حیات...... کسی ایک پر اکتفا کرنا دانش مندی نہیں۔ دوسرے کی خوشی پر اپنی خوشی کو قربان کرنا قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہے۔ آپ سب لوگ قربِ الٰہی کی تمنا میں یہ قدم اُٹھائیں اور مجھے سچی خوشی دے دیں۔ یہی مجھے چندو نے سمجھانے کی کوشش کی تھی، فائزہ نے بھی۔“

سبھی ہونقوں کی طرح رضوان کو دیکھ رہے تھے۔ اُس نے کتنی بے محل بات کہہ دی تھی!...... وہ ایک ایک چہرے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھ کر بولا۔ ”کیوں؟ کیا جان دینے والوں میں اتنا بھی حوصلہ نہیں کہ یہ چھوٹی سی قربانی دے دیں۔ جان دینا تو اعلیٰ ظرفوں کا کام ہوتا ہے۔ بادشاہوں کی شان ہوتی ہے۔“

عمر حیات کا سر جھک گیا، بولا۔ ”ماموں! یہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور مانگ لیں۔“

چندو کراہی۔ ”ماموں! میں آپ کو پوجنے لگی تھی۔ دیوتا سمجھ کر۔ آپ تو عام انسان سے بھی پست قامت نکلے۔“

بی بی نے کہا۔ ”رضوان! کیا تم اپنے ہوش میں ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟...... مجھے جیتے جی مارنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

وہ بہت ظالمانہ انداز میں مسکرایا۔ ”باجی! نشیمن اجڑنے والا ہے۔ تار ٹوٹنے والے ہیں۔ میں اس حویلی کی رونقیں ماند نہیں کرنا چاہتا۔ تم لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں نے میری خاطر کیا قربانی دینی ہے۔ میں نے قربانی کا سبق پڑھا ہے۔ تبھی تم سب کے لیے اپنی جان کی قربانی دے رہا ہوں مگر تم لوگ قبول کرنے سے گریزاں ہو۔“

چندو اُسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ جتنا اچھا لگتا تھا، اتنا ہی برا لگنے لگا تھا۔ عمر حیات نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”ماموں! اس موضوع پر کوئی بات نہ کیجیے۔ مجھے آپ کی اصلیت جان کر دُکھ ہو رہا ہے۔ آپ کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ میں آپ کا بھانجا ہوں۔ چندو بھی آپ کو ماموں کہتی ہے۔ بیٹیوں جیسی ہے۔ کاش! آپ نے اس گری ہوئی خواہش کا اظہار نہ کیا ہوتا۔“

لفظ لفظ میں اہانت تھی مگر سننے والے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بیگ اُٹھا کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”چندو! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

چندو نے غیظ بھرے انداز میں کہا۔ ”ماموں! میں آپ کی بہت عزت کرتی تھی۔“

وہ بے رحمی سے مسکرایا، بولا۔ ”مگر اب نہیں کرتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ عمر حیات! تم میری خاطر اپنی محبت سے دستبردار ہو سکتے ہو؟“

عمر حیات نے اُسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ برآمدے میں رُک کر پلٹے بغیر بولا۔ ”بی بی اماں! میں سونے لگا ہوں۔ آپ اپنے بھائی کو روانہ کر دیجیے گا۔“

رضوان بیگ اُٹھائے کھڑا تھا۔ قدم بیرونی دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”چندو! بس...... قربانی، محبت اور حقوق العباد...... بہت بلند آدرش ہیں مگر جو شخص اپنی جان پر نہ کھیل سکے، اُسے کسی کے جذبات سے کھیلنے کا بھی کوئی حق نہیں ہوتا۔ یا خدا رحم! یا خالق مدد!“

اس کا لہجہ بڑا عجیب یاس بھرا تھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھایا۔ ”خدا حافظ“ کہا اور اطمینان سے چلتا ہوا حویلی سے نکل گیا۔ جس وقت پوٹھوہار جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی، سبھی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ تب سمجھ میں آئی کہ تازیانہ مارنے والا چلا گیا تھا۔

شاید ہمیشہ کے لیے!......

صفیہ نے لمبی سانس لی، کہا۔ ”ماموں کو اتنی بڑی بات کہتے ہوئے ذرہ بھر حیا نہ آئی۔“

بی بی نے ڈانٹا۔ ”چپ رہو۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟“

چندو کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

فائزہ بولی۔ ”بی بی اماں! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ماموں بہت بڑے انسان ہیں۔ ایسے شخص سے اتنی گھٹیا بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

نورین تلملا کر بولی۔ ”میرا بس چلے......“

فائزہ نے جھٹ لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہا۔ ”نہیں۔ اس سے آگے کچھ بھی مت کہنا۔ آپ لوگوں نے سوچا نہیں ورنہ سمجھ جاتے کہ ماموں کتنی بڑی بات کہہ گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ اُنہیں شادی کے لیے کبھی مجبور نہ کیا جائے ورنہ ایسا ہی تازیانہ ماریں گے۔“

چندو سے بیٹھے رہنا محال ہو رہا تھا۔ گھسٹتے قدموں اپنے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے رضوان کی بات سن کر شدید دھچکا لگا تھا۔ فائزہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ اُسے روتا دیکھ کر بولی۔ ”چندو! ماموں کے بارے میں غلط مت سوچو ورنہ نقصان اُٹھاؤ گی۔ کیا تمہارا دل مانتا ہے کہ رضوان ماموں نے اتنی فضول بات دل سے کہی ہو گی؟“

اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

فائزہ بولی۔ ”تو پھر روتی کیوں ہو؟ ماموں نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ محبت وحدانیت کی قائل ہے اور انسانی زندگی کے لیے ایک ہی محبت کافی ہوتی ہے اور بس...... نجانے لوگ اتنی سیدھی سی بات کو سمجھنے سے قاصر کیوں ہوتے ہیں۔“

فائزہ کی بات دل کو لگی۔ واقعی رضوان کی زبان پر کس کا نام آیا تھا۔ آنکھوں نے اُسے نہیں مانگا تھا۔ کیا اُس نے صرف اپنا پلو چھڑانے کے لیے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا؟...... اس بات پر یقین کرنے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ پھر

کیا تھا؟...... وہ کیا سمجھانا چاہتا تھا؟...... اس نے کس قربانی کا ذکر کیا تھا جو وہ حویلی کے مکینوں کی خاطر دینے کو تیار تھا؟...... ابھی ذہن کو اتنی پختگی حاصل نہیں تھی کہ سمجھ آتی۔ چندو سمجھنے کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ نہ سمجھ کر پھر رونے لگی۔ لڑکیاں جوانی میں ایسی ہی جذباتی ہوا کرتی ہیں۔

⮜☆⮜

عمر حیات پوٹھوہار کا انجن اسٹارٹ چھوڑ کر دوڑتا ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ چندو ماہی کے کمرے میں پہنچا۔ فائزہ اور چندو اُس کی یوں آمد پر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ فائزہ نے پوچھا۔ ”بھائی! خیر تو ہے؟“

وہ پھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔ ”ہاں! چندو نے ملتان بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ پورے بورڈ میں...... میں گزٹ دیکھ کر آیا ہوں۔ اس کی تصویر بھی چھپی ہے۔“

چندو کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ”سچ؟“

اس نے جیب سے فوٹو کاپی نکالی۔ لہرائی اور جھومنے کے انداز میں پیروں کے بل لہرا گیا، بولا۔ ”تو کیا میں جھوٹی موٹی اتنا خوش ہو رہا ہوں۔ مبارک ہو چندو! پورے شہر میں تمہاری دھوم مچ گئی ہے۔“

اس نے جلدی سے فوٹو کاپی چھینی۔ دوسری پوزیشن دو لڑکیوں نے لی تھی۔ تیسری تصویر اُس کی تھی۔ دھندلی تو تھی مگر پہچانی جاتی تھی۔ اپنا نام پڑھ کر یقین آ گیا۔ جی چاہا کہ ایک دم عمر حیات سے لپٹ جائے مگر حیا مانع آئی۔ بے اختیار فائزہ سے چمٹ گئی۔ اُسے بانہوں میں بھینچ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ عمر حیات اُس پر فخر سے مسرور نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا کیونکہ ابھی اُسے اتنی بڑی خبر بی بی اماں کو سنانی تھی۔

دیہات میں ایسی خبروں کو پر لگ جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دارے پر مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ عمر حیات نے نواز کو بھیج کر مٹھائی کے کئی ٹوکرے منگوا لیے تھے۔ ہر ایک کا منہ میٹھا کروا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چندو نے نہیں، اُس نے میدان مارا تھا۔

فائزہ اپنی بہنوں کے جھرمٹ میں آنے والیوں کی مبارک باد وصول کر رہی تھی۔ باہر جشن تھا۔ چندو کے کمرے میں سسکیاں گونج رہی تھیں۔ اُسے گامن، تاجاں اور سرداراں کا خیال آ گیا تھا۔ آج اگر وہ ان میں ہوتی تو وہ یہ خبر سن کر کتنے خوش ہوتے۔ خدا جانے یہ خبر ان تک پہنچی بھی تھی یا نہیں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نیچے آ گئی۔ ایک نوکرانی کو عمر حیات کو بلا لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد کلف لگے

کپڑوں میں عمر حیات اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ حیرانی سے سمجھا رہا تھا۔ ”اتنی بڑی خوشی پر رونا دھونا برا لگ رہا ہے۔“

وہ بولی۔ ”میر زادے! مجھے بابا کے پاس لے چلو۔ ایک بار...... اسے دیکھ لوں۔ اسے بتا دوں کہ اس کی چندو ماہی نے آج بورڈ میں تیسری پوزیشن لی ہے۔“

”چندو! خوشی کی رونی میں کرک پڑ جائے گی۔“

”بھلے پڑ جائے، مجھے لے چلو...... ایک بار!“ اس نے التجا کی۔ عمر حیات رد نہ کر سکا۔ بولا۔ ”چادر پہن کر نیچے آ ؤ۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد پوٹھوہار جیپ بیٹ خیر پور کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پکی سڑک سے اُترتے ہی عمر حیات کو بریک لگانے پڑے۔ تنگ راستہ گامن کی ریہڑی نے مسدود کر دیا تھا۔ جیپ کو دیکھ کر گامن نے لگامیں کھینچ لیں۔ عمر حیات پر نگاہ پڑتے ہی آنکھوں میں برہمی عود کر آئی۔ تاجاں توت کا بنا ہوا ٹوکرا تھامے ریہڑی پر بیٹھی جیپ کو دیکھ رہی تھی۔

چندو جلدی سے نیچے اُتری۔ ریہڑی کے پاس گئی۔ خوشی سے چلائی۔ ”بابا! میں نے بورڈ میں تیسری پوزیشن لی ہے۔“

اچانک اُس کا پاؤں زمین پر پڑے ہوئے سرکنڈوں سے الجھا اور وہ منہ کے بل نیچے گر گئی۔ جلدی سے اُٹھی۔ گامن کی طرف بڑھی۔ گامن نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی لہرائی، زور سے کہا۔ ”پراں دفع تھی وَنج نی تاں مار چھڑیساں!“

(پرے دفع ہو جاؤ ورنہ مار دوں گا)

وہ چابی کے کھلونے کی طرح رُک گئی۔ جسم میں خوشی سے بھر جانے والی چابی ختم ہو گئی۔ تڑپ کر بولی۔ ”بابا! مو مجھی تھئی وڈی ہاں! کلیجے نال لا گھن...... نی تاں مر ویساں!“

(بابا! بہت اداس ہوں۔ سینے سے لگا لے ورنہ میں مر جاؤں گی)

گامن کی آنکھوں میں نفرت بھر گئی اور عمر حیات کو مخاطب کر کے بولا۔ ”میر زادے! میرا امتحان نہ لے اور اسے یہاں سے لے جا۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

عمر حیات نے دروازہ کھول کر زمین پر قدم رکھا، کہا۔ ”گامن! غصہ تھوک دے۔ چندو نے پورے علاقے میں دھوم مچا دی ہے۔ فخر سے تمہارا سر بلند کر دیا ہے۔“

”ہاں ہاں! میرا سر تو اُسی دن فخر سے بلند ہو گیا تھا جس دن یہ پیرو ماچھی کے ساتھ منہ کالا کر کے میرے بوہے (دروازے) پر جج لائی تھی۔ پر میرا اس سے کیا تعلق ہے؟“ گامن کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ ”اور تو اسے

یہاں کیوں لایا ہے؟''

اُس نے گدھے کو سرکنڈوں میں دھکیلنا چاہا مگر گدھا اَڑ گیا۔ اس نے لگام کو دو تین جھٹکے دیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ریہڑی کو موڑنا چاہا مگر اتنی جگہ نہیں تھی۔ بے بسی آمیز نفرت سے بولا۔ ''میر زادے! خدا کا واسطہ مان اور چلا جا۔ اس کمینی کو بھی لے جا۔ یہ میرے لیے مرگئی ہے اور مردے کبھی زندہ نہیں ہوا کرتے۔''

چندو ماہی کے بدن میں ایک ذرا جان آئی۔ جلدی سے ریہڑی کے پاس آئی۔ تاجاں کے پیر تھام کر ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ''اماں! بابا کو سمجھاناں! میں اس کی چندو ماہی ہوں۔ کیا گھر آئی بیٹیوں کو اس طرح دھتکارا جاتا ہے؟''

تاجاں نے پیر کھینچ لیے۔ منہ پھیر لیا، کہا۔ ''تم اُدھلی ہوئی ہو۔ اُدھلی ہوئی کی کوئی ماں نہیں ہوتی۔ کوئی پیکا نہیں ہوتا۔''

وہ کٹ کر رہ گئی۔ گامن کے اکلوتے پاؤں کی طرف بڑھی۔ گامن نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی بجلی کی سی مستعدی سے چندو کے ہاتھ پر دے ماری۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھی۔ ہاتھ کو اوپر تلے کئی جھٹکے دیے۔ زور سے چلائی، پھر بڑھی۔ گامن کا ہاتھ برق کوندے کی طرح نیچے آیا اور چندو کی کلائی جھنجھنا اُٹھی۔ درد اُسے پیچھے ہٹا نہیں سکتا تھا اور گامن آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

چھڑی کی چار پانچ ضربوں نے نڈھال کر دیا۔ تھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ عمر حیات دوڑ کر پاس آیا۔ کمر میں بازو حمائل کر کے اُٹھایا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں 'بابا' اور 'اماں' پکارتی ہوئی اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچھلی کی طرح تڑپی مگر جیپ تک گھسٹتی گئی۔ عمر حیات نے اُسے سیٹ پر پھینکا تو بے جان انداز میں آدھی آنکھیں کھولے گامن کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بولتی رہیں مگر گامن کے کانوں کو نفرت کے پگھلے ہوئے سیسے نے بند کر رکھا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا۔ عمر حیات نے گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے پکی سڑک پر آنے میں چند لمحے لگائے۔ چاند کو گرہن لگ گیا۔ دل پر دکھ کا داغ لیے لوٹی تھی۔ شام کو پتا چلا کہ گامن کی چھڑی نے بڑی انگلی کا جوڑ ہلا دیا تھا۔ غنیمت رہا کہ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ شام کو علاقے کے معروف ہڈی جوڑ کو بلا لیا گیا۔ اُس نے مشاقانہ انداز میں ہاتھ کو سہلا کر ہڈی اپنی جگہ پر کھسکائی اور چوبی پیمانہ باندھ کر پٹی کر دی۔ درد تھم گیا مگر گامن کا رویہ مضطرب کرتا رہا۔

ہفتہ بھر کے بعد رزلٹ کارڈ مل گیا۔ اسی رات فائزہ نے چند دن پیشتر منگوائی جانے والی فلم نکال کر وی سی آر میں لگا دی۔ چندو کے پہلو میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ دبا کر بولی۔ ''چندو! یہ فلم میں نے خاص طور پر تمہیں دکھانے کے لیے منگوائی تھی۔ آج موقع ملا۔''

چندو خوش ہوئی، بولی۔ ''کوئی خاص بات؟''

''یہ ساری کی ساری خاص ہے۔ دیکھو گی تو جسم میں آگ لگ جائے گی۔''

چندو سمجھ نہ پائی۔ فلم کا انٹرو شروع ہوا تو وہ منہ بنا کر بولی۔ ''اوہ! یہ تو انگریزی فلم ہے۔ خاک سمجھ میں آئے گی۔''

فائزہ نے اُسے کھینچ کر مزید قریب کیا۔ ریموٹ کنٹرولر تھام کر ٹی وی کو میوٹ موڈ پر کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سننے والی نہیں؛ دیکھنے والی فلم ہے۔''

چندو نے بے اختیار فائزہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ قربت نئی بات نہیں تھی مگر آنکھیں نئی نئی لگیں جو نہ سمجھ میں آنے والی شرارت سے لبریز تھیں۔ ایسے ہی وقت میں فلم پر سنہرے بالوں والا ایک نسوانی چہرہ نمودار ہوا۔ چندو بولی۔ ''ہیروئن سوہنی تو ہے۔''

فائزہ نے اُس کے گداز بدن کی قربت سے فائدہ اُٹھایا، چھیڑا اور کہا۔ ''ہیرو کو بھی دیکھنا۔''

''تم نے دیکھ رکھی ہے؟''

''کئی مرتبہ۔ ہر مرتبہ دیکھتے ہوئے نئی لگتی ہے۔''

چندو تھوڑا نیچے کھسکی۔ فائزہ کے سینے پر سر رکھ کر ٹی وی اسکرین کو گھورنے لگی۔ سنہرے بالوں والی ہیروئن کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کھڑکی کے پار پہاڑی ڈھلان اور اونچے درخت نظر آ رہے تھے جن پر روئی کے گالوں کی طرح برف گر رہی تھی۔ لینڈ اسکیپ بڑا دل کش تھا۔ ہیروئن کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کسی کی منتظر تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے والے بخارات کے مرغولوں سے بے پناہ سردی کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ دیر حسرت آمیز نظروں سے پہاڑی ڈھلوان کو دیکھنے کے بعد پلٹی۔ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر اپنا سراپا دیکھتی رہی۔ اپنے لانبے سونے کے تاروں جیسے بالوں سے الجھتی رہی۔ اس نے سفید رنگ کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ کسی خیال کے تحت اُس نے گاؤن کی ڈوری کھولی۔ ایسے ہی وقت میں کیمرا اُس کے مچھلی جیسے پیروں پر فوکس ہوا۔ چند لمحوں بعد پیروں پر گاؤن گر گیا۔ پھر اسکرٹ بھی نظر آیا اور کیمرا آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔

بلندی پر بتدریج ہوا کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ پہاڑی چڑھتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینا پڑتی ہیں۔ چندو اور فائزہ

ٹکٹکی باندھے اسکرین کو دیکھ رہی تھیں۔ کیمرے کے سلوموشن میں اٹھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی سانسیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ بساڑی پر پہنچ کر چندو نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ تھکے تھکے انداز میں کہا۔ ''فائزہ! اسے نکال دو۔ یہ گندی فلم ہے۔''

فائزہ نے اُسے بانہوں میں بھرا۔ تھوڑا بھینچا۔ بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو تو سہی!''

ایسے ہی وقت میں ڈھلوان سے اُترتا ہوا گھڑسوار دکھائی دیا۔ اس نے بڑا سا ہیٹ اور عجیب الوضع کوٹ پہن رکھا تھا۔ چندو کی سانسوں کو تھوڑا اعتدال ملا مگر جب وہ گھوڑا باندھ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا ہٹ کے اُس کمرے میں پہنچا جس میں ہیروئن ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو دلاسے دے رہی تھی، چندو کی سانس رُکنے کو آ گئی۔ بے اختیار بولی۔ ''وہ...... وہ دیکھو فائزہ! ہیرو تو سیدھا اندر گھسا آ رہا ہے۔''

فائزہ کے ہاتھ میں مردانگی رَچنے لگی۔ وہ غیر محسوس انداز میں چندو کے حسن کی سلطنت میں پیش قدمی کرتے ہوئے بولی۔ ''تو کیا ہوا؟ بولو مت، دیکھتی جاؤ، کیا ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر اُس نے بایاں ہاتھ چندو کے لبوں پر رکھ دیا۔ ہیرو نے کمرے میں پہنچ کر ایک ذرا ہیروئن کو دیکھا، پھر ہیٹ اُتار کر ایک طرف پڑی ہوئی کرسیوں پر اُچھال دیا۔ اس کے بعد چندو زیادہ دیر تک نہ تو ٹی وی دیکھ سکی، نہ فائزہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن سکی بلکہ فائزہ کو بے دردی سے جھٹک کر بیڈ سے چھلانگ لگا کر اُتر گئی۔ کن انکھیوں سے ٹی وی کی جلتی ہوئی اسکرین کو دیکھا اور تیزی سے بالکونی کی طرف دوڑی۔ چند لمحوں بعد وہ آم کے پتوں میں آدھی چھپ کر کھڑی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ آنکھوں میں ٹی وی اسکرین روشن تھی۔ اس نے سر جھٹکا۔ پیروں کو زور زور سے ریلنگ پر مارا۔ ایسے میں فائزہ نے پیچھے سے آ کر بانہوں میں بھر لیا۔ گردن اور کندھے کے بیچ اپنے جلتے ہوئے لب رکھے۔ مخمور لہجے میں سرگوشی کرنے لگی۔ ''اندر چلو ناں...... ابھی تو بہت کچھ دیکھنے کو باقی ہے۔''

وہ بہ وقت تمام بولی۔ ''نہیں فائزہ! تم دیکھو۔ میں یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے۔ اندر چلو۔ کوئی اور فلم لگا لیتے ہیں۔''

وہ نہیں مانی۔ فائزہ اُسے چھیڑنے کے بعد کمرے میں چلی گئی۔ بالکونی کے کھلے دروازے سے ٹی وی اسکرین سے پھوٹنے والی روشنی کا عکس نکل کر ریلنگ کے پاس پڑ رہا تھا۔ وہ کھڑی دیکھتی کرتا رہا۔ چندو دیکھتی رہی۔ پھر آم کے ٹھنڈے پتوں کو ہیجانی انداز میں اپنے گالوں پر رگڑنے لگی۔ چند خراشیں بھی لگیں مگر اُسے تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ دہکتے ہوئے ماس پر پتے غیر معمولی ٹھنڈے لگ رہے تھے۔ عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ ریلنگ پر تھرکتی ہوئی روشنی کے معدوم ہونے تک وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ فائزہ رخسار کے نیچے کھلی ہتھیلی رکھے سو رہی تھی۔ اس کا بھولا بھالا چہرہ نظروں کو بھلا لگا۔ بے اختیار جھکی۔ گال چوما اور اُسے پھلانگ کر بیڈ پر دیوار کی طرف جا لیٹی۔ چور نظروں سے بند ٹی وی کو دیکھا۔ اسکرین سیاہ تھی مگر اُس پر گویا وہی منظر ثبت تھا جسے دیکھ کر چندو کمرے سے بھاگ نکلی تھی۔ اُس نے بے اختیار آنکھیں موند لیں۔ غضب ہوا کہ بند آنکھوں میں پھر وہی فلم چلنے لگی۔

جوانی کی آگ بے قابو ہوتی ہے۔ جتنا پانی ڈالا جائے، اتنی بھڑک اُٹھتی ہے۔ وہ اپنی ذہنی رو کو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی فلم کے بیچ کھڑی رہی۔ فائزہ نے کروٹ بدلی۔ قریب ہوئی۔ چندو دیوار کی طرف کھسک گئی۔ فائزہ چند منٹ بعد پھر اس کی طرف بڑھی۔ چندو کے پاس پیچھے ہٹنے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی، ناچار پہلو بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ انگریزی فلم کی ہیروئن بدل گئی۔ ہیرو بدل گیا۔ عمر حیات گھوڑا باندھ کر سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا۔ انسانی ذہن عجیب کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔ جذبات سے کھیلتے ہوئے جسم کو توڑنے پھوڑنے لگتا ہے۔ وہ نیند میں ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ شور کرتی سانسوں میں کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ فائزہ نے کہا تھا کہ ابھی دیکھنے کے لیے فلم میں بہت کچھ باقی ہے۔ اس 'بہت کچھ' کی تلاش میں عمر حیات کی بانہوں میں جھولتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

تجسس کا نشہ ابھی ٹوٹ نہیں پایا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک گونجی۔ اس کی نیند خواب کی جھولی میں پڑی ہمک رہی تھی۔ نہ ٹوٹ سکی۔ دروازے تک آنے والے نے زور زور سے دروازہ دھڑدھڑایا۔ تیسری زوردار دستک نے اسے جگا دیا۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے دروازے کی سمت دیکھا۔ اپنے دونوں اطراف دیکھا۔ فائزہ نظر نہیں آئی۔ وہ کمرے میں بھی نہیں تھی۔ شاید باتھ روم میں گئی تھی۔

وہ اپنے بال درست کرتی ہوئی بیڈ سے اُتری۔ آج تک کوئی دروازے تک نہیں آیا تھا۔ بے اختیار لبوں سے نکلا۔ ''یا اللہ خیر!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایسے میں اُس کی نگاہ دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اس وقت دروازے پر کوئی خیریت دستک کناں نہیں ہوسکتی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کون؟''

''دروازہ کھولو!'' عمر حیات کی دہاڑتی ہوئی آواز سن کر وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اتنے غصے میں تو وہ اُس دن بھی نہیں تھا جس دن پہلی مرتبہ اُسے اپنے دوست کے مکان میں لے کر گیا تھا۔ اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لائٹ آف تھی۔ اُسے احساس ہوگیا کہ فائزہ باتھ روم میں نہیں تھی۔ کمرے میں بھی نہیں تھی۔

اس نے ہاتھ بلند کیا۔ چٹخنی اُتاری۔ پھر دروازے کا لاک ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ گھبرا کر بولی۔ ''خیر تو ہے؟''

دروازے کے عین سامنے عمر حیات کھڑا خون آشام نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔ اس کے عقب میں فائزہ اور صفیہ کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں پر بھی 'خیریت' درج نہیں تھی۔

عمر حیات نے قدم بڑھایا۔ چندو مارے گھبراہٹ کے راستہ دینا بھول گئی۔ عمر حیات نے اُسے زور کا دھکا دیا اور دندناتا ہوں بیڈ تک آیا۔ پلٹ کر دانت پیس کر بولا۔ ''تمہارے کمرے میں تھوڑی دیر پہلے کون تھا؟''

وہ سمجھ نہ پائی، بولی۔ ''فائزہ تھی۔ اور یہاں کس نے آنا تھا؟''

عمر حیات کی شعلہ بار نظریں فائزہ کی طرف اُٹھیں۔ غرایا۔ ''وہ تو صفیہ کے کمرے میں تھی۔ تمہارے کمرے میں کوئی مرد تھا جس کی آواز صفیہ اور فائزہ کو سنائی دی تھی۔ کون حرامزادہ یہاں تھا، تھوڑی دیر پہلے؟''

وہ بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ فائزہ سے پوچھ لو۔ وہ میرے ساتھ سوئی تھی۔''

فائزہ جھٹ سے بولی۔ ''مجھے کیا پتا؟ میں تو باجی کے کمرے میں سو رہی تھی۔''

عمر حیات کے جبڑوں کے اعصاب کھنچ گئے۔ ہونٹ فرطِ اشتعال سے لرزنے لگے۔ ہاتھ بڑھایا۔ چندو کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر کھینچا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ پائی اور اس کے پیروں میں قالین پر گرگئی۔ جلدی سے اُٹھی اور کراہی۔ ''کیا ہوا ہے؟ خدا کے لیے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی!''

عمر حیات اُسے پکڑے پیروں پر گھوما۔ بیڈ کی محرابی پشت کی طرف انگلی اُٹھا کر بولا۔ ''وہ قمیص کس کی ہے؟''

چندو نے دیکھا۔ جہاں وہ لیٹی تھی، وہیں بیڈ کے محرابی تختے پر آسمانی رنگ کی مردانہ قمیص لٹک رہی تھی۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ بولی۔ ''مم...... مگر مجھے تو نہیں پتا...... یہ...... کس کی ہے؟''

اس نے فائزہ کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں عمر حیات کا زناٹے دار تھپڑ اُس کے رخسار پر پڑا۔ وہ تڑپ کر گری۔ بال آزاد ہوگئے مگر عمر حیات کے اوپر تلے کے تین چار ٹھڈوں نے اُدھ موا کر دیا۔ عمر حیات نے پھر بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ گھسیٹتا ہوا قمیص تک لایا۔ قمیص اُتار کر کانپتے ہاتھوں سے ٹٹولی۔ چندو کی پاسپورٹ سائز تصویر والا پرس، تین چار سو روپے اور ایک رقعہ برآمد ہوا۔ اس نے رقعہ کھولا۔ پڑھا۔ سرخ آنکھوں سے چندو کو دیکھا پھر اُسے گھسیٹتا ہوا کھلے دروازے سے گزر کر بالکونی میں لے گیا۔ ریلنگ پر جھکا اور نیچے دیکھا مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔

کمرے میں آکر اُسے بیڈ پر پٹختے ہوئے بہنوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم دونوں اپنے کمرے میں جاؤ۔''

اس کا لہجہ آتش بار تھا۔ دونوں بہنیں سہم کر دوڑ گئیں۔ وہ چند لمحوں تک کمرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کردیا تھا۔ اپنے کمرے سے سرچ لائٹ اٹھائی اور دوڑتا ہوا حویلی کے پچھواڑے میں آیا۔ آم کے پیڑ تلے جھک کر سرچ لائٹ کی روشنی میں کچھ دیکھنے لگا۔ جلد ہی اُسے پیڑ پر چڑھنے اور اُترنے والے مرد کے پیروں کے نشان مل گئے۔ بھاری کھیڑی کی ایڑی نرم زمین میں جابجا کھب گئی تھی۔ اس نے سر اُٹھا کر پیڑ کی طرف دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی پیڑ پر پھیلی۔ بالکونی کے پاس سے گزرتی ہوئی بڑی شاخ پر ایک مفلر اٹکا دکھائی دیا۔ یہ بالکونی سے نظر نہیں آیا تھا۔ پچھلے پہر کی خنکی کے باوجود اُس کا بدن پسینے میں تر ہوگیا۔

اس نے پھر اپنی توجہ کھرے پر مرکوز کی اور قدموں کے نشانات کے متوازی چلتا ہوا حویلی کی دیوار تک گیا۔ عزت کا نقب زن دیوار پھاند کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ اس نے دیوار پھاندی۔ نقش پا پر چلتا ہوا حویلی سے کافی دور آگیا۔ پھر کھرا پختہ سڑک پر چڑھ کر مٹ گیا۔ وہ حویلی میں جانے کے بجائے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اقامت پذیر امام بخش کھوجی کے ڈیرے پر پہنچا۔ اُسے جگا کر اپنے ساتھ لایا۔ اس نے ہنرمندانہ انداز میں کھرے کو پرکھا پھر متردد انداز میں بولا۔ ''نہیں میرزادے! میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا

کہ یہ کس کا کھرا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ یہ بیٹ کے کسی چور ڈاکو کا کھرا نہیں ہے۔''

عمر حیات کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''چاچا! پھر دیکھ، ہو سکتا ہے، کوئی نشانی مل جائے۔''

اس کے اصرار پر بوڑھا کھوجی پھر آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ایڑیوں اور پنجے کے دباؤ، قدموں کے باہمی فاصلے اور پب کے رُخ کو جانچتا رہا، پھر مایوسی آمیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''میرزادے! یہ علاقے کے کسی بھی اُچکے کا کھرا نہیں ہے۔ یہ باہر سے آیا ہے یا پہلی واردات پر نکلا ہے۔ صبح آس پاس کے لونڈوں کو چلا کر دیکھنا پڑے گا۔''

عمر حیات نے بے بسی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ وہ میری نظروں سے چھپ نہیں سکے گا جس نے میری حویلی کی دیوار پھاندنے کی جرأت کی ہے۔ تم جاسکتے ہو۔''

کھوجی کے تجسس آمیز سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے جاکر نواز کو جگایا۔ کھوجی کو گھر پہنچانے کا حکم دیا اور خود چندو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی سسک رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر چونکی اور عمر حیات کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ عمر حیات نے اُس پر ایک سرد نگاہ ڈالی اور ٹی وی کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹی وی آن کیا پھر وی سی آر چلا کر 'پلے' کا سوفٹ ٹچ بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں بعد اسکرین پر ایک ہوش رُبا منظر روشن ہوگیا۔

وہ فلم نہیں تھی۔ قیامت تھی۔ قیامت کو سمجھنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے مگر وہ کافی دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ کانوں کی لویں تک دہکنے لگیں۔ زہر بار نظروں سے چندو کو دیکھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس نے وی سی آر بند کرکے کیسٹ نکالی۔ اُسے ایک نظر دیکھ کر چندو پر اُچھال کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ گیلری سے نکل کر ریلنگ پر جھک گیا۔ اسی وقت دارے پر روشنیاں دائروی شکل میں گھومیں اور سامنے والی دیوار پر ساکت ہو کر بجھ گئیں۔ نواز جیپ پر کھوجی کو گھر پہنچا کر واپس آگیا تھا۔ عمر حیات حلق کے بل چیخا۔ ''نواز! جلدی سے میرے پاس آؤ۔''

اس کی درشت آواز رات کے سناٹے میں خطرے کا بگل بجا گئی۔ گیلری میں کمروں کے دروازے یکبارگی کھلے۔ چاروں بہنوں نے سراسیمہ انداز میں بھائی کی پشت کو دیکھا۔ وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے [illegible]

کھڑا تھا۔ لڑکیوں نے سر نکال کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر صفیہ نے ہمت کی، کہا۔ ''بھائی! ہوش سے کام لو۔ تمہاری آواز حویلی کے مینار گرادے گی۔''

اس نے پلٹ کر بڑی بہن کو دیکھا۔ آنکھوں میں نہ دیکھی جاسکنے والی وحشت کا راج تھا۔ صفیہ نے فائزہ کو اندر دھکیلا اور دروازہ بند کردیا اور بند دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

نواز بھاگتے قدموں سے فرسٹ فلور پر آیا۔ اس کے پیچھے بی بی بھی چلی آئی۔ عمر حیات غرایا۔ ''نواز! تم انگریزی فلم لے کر آئے تھے؟''

نواز ان پڑھ آدمی تھا۔ سہم کر بولا۔ ''میں پرچی پر لکھی ہوئی فلم لاتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ فلم انگریزی ہے یا اردو۔''

''آخری مرتبہ تم پرچی لے کر کب شہر گئے تھے؟''

''تین چار دن پہلے جی!''

''تمہیں وہ پرچی کس نے دی تھی؟ فائزہ بی بی نے؟''

''نہیں جی...... چندو بی بی نے دی تھی۔''

''وہ پرچی تمہارے پاس محفوظ ہے یا تم نے ضائع کر دی؟'' عمر حیات زخمی سانپ کی طرح پھنکارا۔

نواز نے پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھا۔ جلدی جلدی جیبیں خالی کیں۔ کانپتے ہاتھوں سے پرچی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پرچی مل گئی۔ ڈرتے ڈرتے عمر حیات کی طرف بڑھائی۔ عمر حیات نے پرچی دیکھی۔ آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔ تصدیق طلب انداز میں بولا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ پرچی تمہیں چندو نے ہی دی تھی؟''

نواز نے دل پر ہاتھ رکھا۔ مؤدبانہ انداز میں سر ہلایا۔ عمر حیات نے اسے دارے پر جانے کا حکم دیا۔ بی بی خاموش کھڑی بیٹے کے متغیر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ نواز کے جانے کے بعد مستفسر ہوئی۔ ''خیر تو ہے؟''

اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بی بی پر ڈالی۔ بلند آواز میں فائزہ کو بلایا، پوچھا۔ ''تم آج اپنے کمرے میں کیوں نہیں سوئیں؟''

وہ سہم کر بی بی کے پیچھے چھپ گئی، بولی۔ ''باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئیں۔''

صفیہ نے دروازے سے جھانک کر تائید کی۔ ''مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا اس لیے فائزہ کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

بی بی کے ماتھے پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تن گیا۔ اوپر تلے کئی سوال کیے۔ عمر حیات نے بی بی کو جواب دینے کے بجائے فائزہ سے پوچھا۔ ”کیا تم میں سے کسی نے بھی اُس بے غیرت کو نہیں دیکھا؟“

فائزہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس کی آواز بھی نہیں پہچانی؟“

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نہیں بھائی! وہ جو کوئی بھی تھا، بہت مدھم آواز میں بول رہا تھا۔“

اس نے ایک جھٹکے سے ریلنگ چھوڑ دی، بولا۔ ”بی بی اماں! ان سب کو اپنے کمرے میں لے جائیں اور وہیں سلا دیں۔ اوپر کوئی نہ آئے۔“

چاروں بہنوں نے کمروں سے نکلنے اور سیڑھیاں اُترنے میں دیر نہیں کی۔ بی بی نے عمر حیات کی کلائی تھام لی۔ پریشانی سے بولی۔ ”تجھے میری قسم عمر حیات! صاف صاف بتا، یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے۔“

وہ چند لمحوں تک پھنکارتا رہا۔ تیز تیز سانسیں لیتا رہا پھر دھیمی آواز میں بتانے لگا۔ ”چندو نے مجھے مار دیا ہے۔ آہ ہا! وہ حرام کی پھوئی ہی نکلی بی بی اماں!“

اس کی وحشت بھری آنکھوں میں موت کی خنکی پھیل گئی۔ بی بی کے اصرار پر بتانے لگا۔ ”فائزہ اور صفیہ نے مجھے بتایا کہ چندو کے کمرے سے کسی مرد کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں جلدی سے یہاں آیا۔ تین چار بار دستک دینے پر چندو نے دروازہ کھولا۔ اس دوران میری حویلی میں نقب لگانے والا بزدل چوہا اپنی قمیص بیڈ پر بھول کر بالکونی کے راستے بھاگ گیا۔ وہ پچھواڑے کی دیوار پھاند کر سڑک تک گیا۔ وہیں تک اُس کا کھرا ملا اور کھوجی نے اُس کا کھرا ابھی نہیں پہچانا۔ چندو اس بے غیرت کے ساتھ حیا سوز فلم دیکھ رہی تھی اور اپنا منہ کالا کر رہی تھی۔“

بی بی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ فرطِ دکھ سے بولی۔ ”ہائے میر جی! آپ کے جانے کے بعد مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ اس پاک صاف حویلی میں گندگی کی پوٹ تعفن پھیلانے لگی ہے۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔“

ساتھ ہی عمر حیات کو کھینچا۔ وہ ڈگمگا گیا۔ بی بی کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا مگر وہ کھینچ کر نیچے لے گئی۔ اُسے کمرے میں دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”عمر! یہ وقت جوش کا نہیں، ہوش کا ہے۔ اگر شور مچاؤ گے تو حویلی کی عزت نیلام ہو جائے گی۔ ہم پر انگلیاں اُٹھیں گی۔ دو چار دنوں میں اس گناہ کی پوٹ سے اس طرح جان چھڑا لینا تا کہ ہم پر کوئی حرف نہ آئے۔ ابھی سو جاؤ اور اس کے بارے زیادہ نہ سوچو کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھی۔“

وہ بے جان انداز میں بیڈ پر گر گیا اور وہ دس پندرہ منٹ لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دراز کھولی۔ میر ظفر حیات کا جرمن پستول اُس کی دراز میں پڑا رہتا تھا۔ اُٹھایا، میگزین چیک کی اور دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ بی بی نے جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا تا کہ وہ جوش میں کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اُٹھائے۔ وہ عقبی کھڑکی کھول کر گیلری میں آیا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا فرسٹ فلور پر چندو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ چندو کو دیکھ کر اُس کے چہرے کی رگیں کھنچ گئیں۔ وہ مہ نیہوڑائے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ عمر حیات اُس کے سامنے پہنچ کر پہلو کے بل بیٹھ گیا۔ ہتھیلی قوم پر ٹکائی اور پستول کی نال سے چندو کا چہرہ اُٹھایا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ رو رو کر آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔ فرطِ خوف سے بولی۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کے لیے میرا یقین کرو، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں آیا۔“

وہ پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ خوف ناک پستول نے اُس کی رہی سہی سکت بھی چھین لی۔

عمر حیات نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ”جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے چندو! تم نے فلم نہیں دیکھی۔ کوئی تمہارے کمرے میں نہیں آیا۔ کسی نے تمہیں چھوا نہیں اور تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔ ہیں؟“

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ہکلا کر بولی۔ ”مم...... میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں قسم......“

عمر حیات نے نال کا دباؤ بڑھایا، بولا۔ ”نہیں چندو! کوئی قسم کھانے کے بجائے صرف اتنا بتا دو کہ یہ قمیص کس کی ہے؟“

اس نے خوف سے معمور نظریں صوفے پر پڑی ہوئی آسمانی رنگ کی قمیص پر گاڑ دیں اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

”آم پر مظفر کس کا اُکا ہوا ہے؟ قالین پر اور آم کے نیچے زمین پر کیچڑی کے نشان کس کے ہیں؟ تم نے فلم نہیں دیکھی تو منگوائی کس لیے تھی؟ ...... مگر تمہیں کسی بھی سوال کا علم نہیں ہے۔ ہے ناں؟“ عمر حیات کی آواز لرزش پا رہی تھی۔ ”مگر مجھے پتا چل گیا ہے کہ تمہارے جسم میں آگ لگی ہے جسے بجھانے کے لیے کوئی اس کمرے میں آتا ہے۔ آج پتا چلا کہ تمہارے جیسی لڑکیاں کس طرح انسانوں کی عزت سے جذبات سے کھیلتی ہیں۔ کھیل لیا ناں! ہاں...... اب میں بھی کھیلوں گا۔ تم سے محبت کرنے کی شرمساری کا قلق ختم کروں گا۔ چلو! قمیص اُتارو......“

اس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ غرایا۔ ”کیا کہا ہے میں نے؟ دیر نہ کرو...... قمیص اُتارو۔“

وہ ایڑیوں کے بل پیچھے کھسکی۔ وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر آگے بڑھ آیا۔ نال کا رُخ سینے کی طرف کیا اور اپنا حکم دہرایا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے، بولی۔ ”نہیں، نہیں...... تم تو میرا یقین کر لو۔“

اپنی آنکھوں جو دیکھ چکا تھا، سمجھنے کے لیے وہی کافی تھا۔ اس نے پستول ایک طرف رکھا۔ ہاتھ گریبان کے ربن پر ڈالے۔ ایک جھٹکا دیا۔ گریبان پھٹ گیا۔ چندو کی برداشت جواب دے گئی۔ تڑپ کر اُٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے اُسے پیچھے دھکیل کر بولی۔ ”آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ جب میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں کوئی نہیں آیا، میں نے فلم نہیں منگوائی تو تم کیوں ماننے پر تیار نہیں ہو؟ تمہی بتاؤ، یہاں تمہاری اجازت کے بغیر کوئی آ سکتا ہے کیا؟“

اس کی آواز میں بتدریج دکھ کے ساتھ غصہ آمیزش کرنے لگا۔ عمر حیات بپھر گیا۔ اُٹھا اور وحشیانہ انداز میں اُس پر پل پڑا۔ دو چار تھپڑوں نے ادھ موا کر دیا۔ وہ چیخی۔ منت سماجت کی۔ چاہا کہ اُس کی بات سن لی جائے مگر عمر حیات پر جنون طاری تھا جس نے چندو کو بے دم کر دیا اور وہ لہراتی ہوئی بیڈ پر گر گئی۔ عمر حیات کی وحشت نے رُخ بدل لیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کا لباس تار تار ہو گیا۔ جب تک چندو سنبھلتی، اس کا بدن بے لباس ہو کر عمر حیات کی جنونی ہوس کی جھیل میں ٹراؤٹ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عمر حیات کی گرفت سے نکالنے کے لیے پھڑپھڑائی مگر ہار گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح کہتا جاتا تھا۔ ”اس! تمہارے بدن میں آگ لگتی ہے۔ میں اِسے بجھا دیتا ہوں تا کہ تم پھر کسی کی محبت کا گلا نہ گھونٹ سکو۔ تم حرام کی پھوئی ہو۔ تمہیں آنکھوں پر بٹھانے کے بجائے غلاظت کے ڈھیر پر پھینکا جانا چاہیے۔“

انگریزی فلم میں جب ہیرو اور ہیروئن جذبات کی پہاڑی پر چڑھے تھے، وہ بالکونی میں بھاگ گئی تھی۔ خواب میں جب عمر حیات لب جان آیا تھا اور آگ بھری جھیل کے کنارے اُسے لے گیا تھا تو وہ تھم گئی تھی کیونکہ وہ نہ تو پہاڑ کی بلندی سے پستی میں گرنا چاہتی تھی اور نہ آگ کی جھیل میں گر کر فنا ہونا چاہتی تھی۔ وہاں اُسے اختیار حاصل تھا۔ عمر حیات کی مردانگی کے آگے بے بس تھی۔ تبھی گر گئی۔ عمر حیات نے اُسے بار بار شکست دی۔ اُسے نظروں سے ہی نہیں، عزت کی مسند سے بھی بڑی بے رحمی سے گرا دیا۔ پھر اس کا یرغمالی جنون تھم گیا۔ بیڈ سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ سفاک لہجے میں بولا۔ ”وارڈ روب سے لباس نکال کر پہن لو۔“

وہ مردوں کی طرح پڑی تھی۔ جھنجوڑنے پر کراہی۔ ”نہیں...... اب مجھے لباس کی ضرورت نہیں رہی۔ تم اپنے احسانات کی قیمت وصول کر چکے ہو۔ جاؤ...... میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“

وہ غرایا۔ ”میں نے کسی احسان کی قیمت نہیں لی، تمہیں تمہارا نیچ پن دکھایا ہے۔ اُٹھو! جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو اس نے بالوں سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے کھینچ لیا۔ وہ کولھوں کے بل دھپ سے گری۔ نفرت سے دانت بھینچ کر بولی۔ ”کیا مصیبت ہے، جاتے کیوں نہیں ہو؟ جاؤ...... میری جان چھوڑ دو۔“

وہ درشتی سے بولا۔ ”میں تمہارا وجود ایک لمحے کو بھی اس حویلی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں اسی وقت حویلی سے جانا ہے۔ اگر کپڑے پہن لو گی تو ٹھیک ورنہ ایسے ہی باہر پھینک آؤں گا۔“

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی پھر نڈھال انداز میں کھڑی ہو گئی۔ وارڈ روب تک گئی۔ تھوڑی دیر بعد اپنی چادر میں لپٹ کر دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔ پرس سنبھالتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں حرام کی پھوئی تھی مگر صرف تخلیق کے وقت...... تم زندگی بھر کے حرام کار ہو۔ مردار ہو۔ مردے نوچنے والے غلیظ گدھ ہو۔ تم اپنی عزت کو لوٹنے سے بھی باز نہ آنے والے شیطان ہو۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔ تمہاری اونچی حویلی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ آخ تھوہ!“

اُس نے عمر حیات کے چہرے پر تھوک دیا۔ وہ دانت پیس کر اس کی طرف بڑھا مگر اچانک تھم گیا کیونکہ اُسے چندو کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول نظر آ گیا تھا۔

وہ غرائی۔ ”تمہارا باپ عظیم انسان تھا مگر تم مکروہ اور گھٹیا انسان ہو۔ اب مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کرو گے تو گولی مار دوں گی۔“

عمر حیات پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ پستول لہرا کر اُسے دور رہنے کی تنبیہ کی اور بولی۔ ”تم کیا برے؟ تمہاری بہنیں تم سے بھی گندی نکلیں۔ فائزہ...... اُسے بہن کی طرح پیار کیا میں نے...... ہر وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

سینے سے لگا کے رکھا۔ اُس نے ہی اتنا بڑھا دھوکا دیا مجھے...... ہائے اللہ! تم لوگ تو مجھ سے بھی گندے ہو...... شٹ...... ماموں رضوان نے درست کہا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میرے ساتھ حویلی میں یہ سلوک ہونے والا ہے۔ کاش! انہوں نے مجھے بتا دیا ہوتا تو میں اپنی نظروں میں گرنے سے بچ جاتی یا میں ان کی بات سمجھ کر حویلی سے اُسی وقت رخصت ہوگئی ہوتی۔"

عمر حیات کے لبوں سے مغلظات کا فوارا ابل پڑا۔ پستول کی خوف ناک جھلک نے روکے رکھا ورنہ بعید نہیں تھا کہ وہ اُس کا خون کر دیتا۔ وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ نیچے برآمدے میں بی بی کھڑی اُلجھے اُلجھے انداز میں سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر جلدی سے قریب آئی، بولی۔ "کیا ہوا چندو؟ تم اس وقت کہاں جارہی ہو؟ اوہ...... تم نے یہ پستول کیوں اُٹھا رکھا ہے۔ ادھر لاؤ، گولی چل جائے گی۔"

اس نے نفرت سے کہا۔ "مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ تم ماں نہیں ہو۔"

ایسے ہی وقت میں عمر حیات سیڑھیاں اُتر کر عقب میں آ گیا۔ وہ بھانپ گئی۔ ناگن کی طرح تڑپ کر پلٹی تو عمر حیات کو ناچار رُکنا پڑا۔ بی بی کے دروازے میں فائزہ کی جھلک دکھائی دی۔ چندو چند قدم پیچھے ہٹی۔ برآمدے کے شیڈ کے نیچے کھڑی ہو کر بولی۔ "ہاں بی بی! تم ماں نہیں ہو کیونکہ تمہاری حویلی میں میری عزت لٹ گئی ہے۔ کس نے لوٹی؟ تمہارے میرزادے نے، اونچے شملے والے میر ظفر حیات کے اکلوتے بیٹے نے...... تف ہو تمہارے اونچے شملوں پر...... اور فائزہ! مجھے تو یہ تک نہیں علم تھا کہ فلمیں کیا ہوتی ہیں۔ تم نے ہی رنگین دنیا دکھائی تھی ناں! ہاں...... تم نے ہی مجھ سے اس گندی فلم کا نام لکھوایا تھا اور نواز کو دے آنے کا کہا تھا تاکہ وہ واپسی پر لیتا آئے گا۔ اور...... اور...... میں بالکونی میں کھڑی رہی، تم فلم دیکھتی رہیں۔ تم میرے کمرے سے کب نکلیں؟ تمہارے بعد وہاں کون آیا؟ کیسے آیا؟ قیص بیڈ تک کیسے پہنچی؟ ان سوالوں کے جواب ذہن میں رکھنا۔ کبھی تمہارے بے غیرت بھائی کو ان جوابوں کی ضرورت پڑے گی۔ اور...... اور...... میں نادان نہیں ہوں مگر دنیا کی سب سے بڑی سزا بھگت چکی ہوں۔"

اس کی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں، چہرہ متورم تھا اور جسم ٹوٹا پھوٹا مگر لہجہ آتش بار تھا۔

بی بی نے الجھے ہوئے انداز میں بیٹے اور بیٹی کو دیکھا، چندو سے کہا۔ "آدھی رات کا وقت ہے۔ اس وقت نہ جاؤ، صبح چلی جانا۔"

وہ سلگ کر بولی۔ "کیوں؟ جو لٹنا تھا، لٹ گیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ پھر یہی ہوگا کہ کوئی اور شیطان مجھے پکڑ کر اپنے بستر پر لے جائے گا۔ اور بس؟"

وہ پلٹی۔ ایک نگاہ سبھی پر ڈال کر صحن سے گزر کر بیرونی دروازے تک آئی۔ اپنے تعاقب میں سر جھکا کر چلتے ہوئے عمر حیات کو دیکھا اور پستول اُس کی طرف اچھال دیا۔ وہ کسی اور سوچ میں تھا۔ پستول کو پکڑ نہ سکا جس کی وجہ سے وہ فرش پر گر کر چند قدم دور تک پھسلتا گیا۔

دروازے کے باہر اندھیرے کا راج تھا مگر چندو کے جلتے ہوئے ذہن کو اندھیرے کی پروا نہیں تھی۔ سبھی ملازمین جاگ رہے تھے اور دارے کے برآمدے کی بڑی چارپائیوں پر نواز سے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ وہ سیدھ میں چلتی گئی۔ باہر والی سڑک پر پہنچ کر ایک ذرا رُکی، پلٹی، حویلی کے بام و در اور روشن قمقموں کو بے تاثر آنکھوں سے دیکھا پھر پکی سڑک پر چلتی گئی۔ بے زمین و آسمان زندگی نئی نہج مانگ رہی تھی مگر اُس کے پاس راستہ تو کجا، کوئی دلاسا تک نہیں تھا۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی عین سڑک کے بیچ کھڑے عمر حیات کو دیکھ کر چونکی۔ وہ شارٹ کٹ پگڈنڈی پر چل کر اس سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ پہلو بچا کر نکلنے لگی تو عمر حیات نے بازو تھام لیا۔ وہ گرفت کو بری طرح جھٹک کر آگے بڑھی۔ وہ پھر سامنے آ گیا، بولا۔ "چندو! صبح چلی جانا۔ اِس وقت تم کہاں جاؤ گی؟"

اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا، بولی۔ "یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"پلیز!"

"کہا ناں! ہٹ جاؤ، میرے راستے سے۔ مجھے تم جیسے غلیظ انسان کو دیکھنا بھی برا لگ رہا ہے۔ شکر کرو کہ میں نے تمہیں گولی نہیں ماری۔ تمہارے چار احسان یاد آگئے تھے ورنہ......"

"میں غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ اَب بھی سمجھ نہیں آرہی: کچھ بھی۔ تم صبح تک رُک جاؤ۔ بتا جاؤ کہ اصل چکر کیا تھا۔" عمر حیات کے لہجے کی استدعا درشتی میں بدل گئی۔

اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ عمر حیات نے گرفت مضبوط کر لی۔ چندو کی بات ادھوری رہ گئی تو اس نے چیخ کر اپنی۔ دوسرے ہاتھ کا زوردار چانٹا عمر حیات کے منہ پر مارتے ہوئے گالیاں دینے لگی۔ چیخنے لگی۔ اُسے باور کرانے لگی کہ بھلے رات دم توڑ رہی ہو، راہ چلتی لڑکی پر ہاتھ اُٹھایا جائے تو وہ چیخ چیخ کر بدنام کر دیتی ہے۔ عمر حیات نے کلائی چھوڑ کر رخسار پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ ایسے ہی وقت میں عمر دراز کی غصے سے پھٹتی ہوئی آواز گونجی۔ "رُک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔"

اس نے پروا نہیں کی۔ چلتی گئی۔ عمر حیات اُسے ڈرا کر روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب تک گولی چلانے کا فیصلہ کرتا، وہ شوٹنگ رینج سے باہر ہوگئی تھی۔ گولی چلی مگر اُسے نہیں لگی۔ لڑکیاں کم زور دل کی مالک ہوتی ہیں مگر اُسے دشمن پستول کی خوفناک آواز نے پلٹ کر دیکھنے پر بھی مجبور نہ کیا۔ گولی کے بعد اپنے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز سن کر اُس نے اپنی رفتار تیز کر لی مگر وہ سر پر پہنچ گیا۔ چادر کا پلو تھام کر غرایا۔ "تمہیں اپنی زندگی سے دشمنی ہے کیا؟"

وہ پلٹے بغیر رُک کر بولی۔ "ہاں! پہلے اس زندگی سے پیار کرتی تھی کیونکہ اس پر ایک دیوتا مہربان تھا۔ اَب اس میں شیطان گھس آیا ہے۔ زندگی کے مرنے سے ہی اُس سے نجات حاصل ہوگی۔"

رات پچھلے پہر میں تھی۔ اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دیہات کی رات بہت کالی اور خاموش ہوتی ہے۔ اسی خاموشی میں بی بی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ عمر حیات کو پکار رہی تھی۔ پھر سڑک پر کئی لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں گونجیں۔ چند لمحوں بعد برآمدے میں سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے نوکر فائر کی تیز آواز سن کر ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ عمر حیات حلق کے بل چیخا۔ "تم سب لوگ دفع ہو جاؤ...... چلو بھاگو!"

کسی نے اُس کے حکم پر کان نہیں دھرا بلکہ اُسے دبوچ لیا۔ وہ کسرت کے عادی اور صحت مند لوگ تھے۔ عمر حیات کو بے بس کر کے نرغے میں لیے واپس چل پڑے۔ نواز گردن موڑ کر بولا۔ "بی بی سائیں نے کہا ہے کہ رات حویلی میں گزار لو۔ صبح، جہاں کہو گی، وہیں میں پہنچا آؤں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان سے دور ہوتی گئی۔ جہاں حویلی والی سڑک شہر جانے والی سڑک سے ملتی تھی، وہاں پہنچ کر رُک گئی۔ جسم ٹھنڈا ہو کر دُکھنے لگا تھا۔ سانسیں پھول گئیں۔ جی چاہا کہ سڑک کے بیچوں بیچ چاروں شانے چت لیٹ جائے۔ سو جائے۔ بھلے کوئی گاڑی کچل ڈالے۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ غصہ اُترا تو خوف سوار ہو گیا۔ اندھیرے اور خاموشی نے دل پر ہیبت طاری کر دی۔ دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شہر تک پیدل نہیں جا سکتی تھی۔ جاتی بھی کیوں؟ وہاں اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ سوچا: گامن کے گھر چلی جائے۔ گامن کی نفرت بھری آنکھیں چشم تصور میں ابھر آئی تھیں۔ دل بھر آیا۔ از خود نفی میں سر ہل گیا۔

اس کی ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ عمر حیات کی درندگی نے نہ صرف اُس کا بدن تھکن سے چور کر دیا تھا بلکہ اُس کے ذہن کو بھی درماندہ کر دیا تھا۔ وہ تھک کر سڑک کے کنارے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس علاقے میں شام ڈھلنے کے بعد کوئی سواری نہیں ملتی تھی اس لیے اُسے صبح تک یہیں بیٹھ کر تانگے کا انتظار کرنا تھا۔

اچانک چونک گئی۔ حویلی کی جانب سے کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ تھرکتی ہوئی لائٹس کی روشنی اس پر پڑی۔ وہ کھڑی ہوگئی۔ بے ساختہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کیکر کے تنے سے لگ گئی۔ چند لمحوں بعد عمر حیات کی پوٹھوہار جیپ موڑ مڑ کر رُک گئی۔ وہ نوکروں کی گرفت سے نکل کر ایک بار پھر اُس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی غلطی پر پچھتائی کہ اُسے پستول پھینکنا نہیں چاہیے تھا۔ اس نے کبھی چلایا نہیں تھا مگر اس کی دہشت قریب آنے والے کو روکنے کی طاقت رکھتی تھی۔

عمر حیات اُترا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ وہ چلائی۔ "میرے قریب مت آنا ورنہ جان سے ماردوں گی۔"

وہ ایک ذرا رُکا، پھر چل پڑا۔ قریب آ کر بولا۔ "چندو! واپس چلو۔ مجھ سے غلطی ہوگئی جس کا ازالہ کردوں گا۔ چلو!"

چندو نیچے بیٹھی۔ اِدھر اُدھر اندھیرے میں ہاتھ مارا۔ ایک پتھر مل گیا۔ اُٹھا کر چیخی۔ "مجھے کسی ازالے کی ضرورت نہیں...... دفع ہو جاؤ ورنہ سر پھاڑ دوں گی۔"

عمر حیات نے سر سے بلند ہوتا ہوا ہاتھ دیکھا اور رُک گیا۔ اپنا پستول نکال کر اُس پر تان کر غرایا۔ "بے وقوفی مت کرو، تماشا نہ بناؤ اور میرے ساتھ چلو ورنہ یہیں ڈھیر کر دوں گا۔"

وہ عمر حیات سے ڈرتی تھی۔ آج نہیں ڈر رہی تھی۔ پوری قوت سے ہاتھ گھمایا اور عمر حیات کے سر کا نشانہ لے کر پتھر چھوڑ دیا۔ اُسے چندو کے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔ پتھر بھاری نہیں تھا مگر نوکیلا تھا۔ سیدھا پیشانی پر لگا۔ آنکھوں کے سامنے سورج طلوع ہو گیا۔ لہرایا اور پیشانی پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ چندو نے ایک اور پتھر تلاش کر لیا۔ بپھری ہوئی بلی کی طرح غرائی۔ ''تم کمینے اور گھٹیا انسان ہو۔ تمہاری حویلی میں کوئی انسان نہیں رہتا۔ اس لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ جو تم نے اپنی مردانگی دکھا لی، وہی میرے لیے کافی ہے۔''

عمر حیات بہت ضدی فطرت کا تھا۔ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ پیچھے ہٹنے کے بجائے ایک ہاتھ ماتھے پر رکھے اپنا ولایتی پستول لہراتا ہوا آگے بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں بستی سمن سے آنے والی سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ چونک کر رُک گیا۔ اوپر نیچے ہوتی ہیڈ لائٹس کو دیکھ کر بولا۔ ''چندو! کوئی آ رہا ہے۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر مصیبت کھڑی کر دے گا۔ چلو، جیپ میں بیٹھو۔ اگر تم حویلی میں جانے پر تیار نہ ہوئیں تو جہاں کہو گی، وہیں چھوڑ آؤں گا۔''

وہ دونوں ہاتھ فضا میں لہرا کر اُسے دور ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے چلائی۔ عمر حیات نے ڈپٹ کر کہا۔ ''خاموش رہو ورنہ گولی مار دوں گا۔ چندو! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم بہت بڑی بات کہہ کر حویلی سے نکلی ہو۔ اگر تمہارا کسی شخص سے تعلق نہیں تھا تو پھر حویلی میں کسی اور کا کسی مرد سے تعلق ضرور تھا جس نے تمہیں بدنام کرنے کے لیے اتنا بڑا کھیل کھیلا۔ تم حویلی چل کر اپنا بیان ثابت کرو ورنہ میں سب کو بھون دوں گا۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں اپنا بیان ثابت کرنے کی۔ تم جسے بھوننا چاہتے ہو، جاؤ بھون ڈالو۔ مجھے کیا پروا؟''

''مگر مجھے ہے۔ دیکھو چندو! اگر تم نے کوئی گناہ نہیں کیا تو تمہیں گناہ گار ثابت کرنے والا حویلی میں موجود ہے۔ اس کی پردہ کشائی ضروری ہے جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی۔ دیکھنا، میں اُسے صبح ہونے سے پہلے گولی مار دوں گا خواہ وہ میری بہن ہی کیوں نہ ہوئی۔''

اس نے پوری شدت سے سر نفی میں ہلایا، بولی۔ ''مجھے کسی کو مروانا نہیں ہے۔ میں بے حیائی کی موت مر چکی ہوں۔''

''مگر میں اپنے دشمن کو پہچاننا چاہتا ہوں۔ ابھی تو مجھے اُس شخص کو تلاش کرنا ہے جس نے میری حویلی کی دیوار پھاندنے کی جرأت کی ہے۔''

اس کی برداشت جواب دے گئی۔ حلق کے بل چیخی۔ ''چٹے تھی وَنج! کیوں میڈے پچھے پَے گیا ایں......''

(دفع ہو جاؤ! کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو)

عمر حیات خود پر قابو نہ رکھ پایا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔

گولی سیدھی چندو کی ران میں جا لگی۔ پورے تن میں آگ سی بھر گئی اور اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی دلدوز تھی۔ عمر حیات جیسے ہوش میں آ گیا۔ بے ساختہ پلٹا۔ بھاگ کر جیپ کی طرف جانا چاہتا تھا مگر دیر ہو گئی تھی۔ سمن کی طرف سے آنے والا ڈبل ڈور ڈالا جیپ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر رُک چکا تھا۔ عمر حیات نے برقی مستعدی سے پوٹھوہار میں بیٹھنا چاہا مگر ایک غراتی ہوئی آواز نے اُس کے قدم تھام لیے۔ ''اوئے خبردار! اگر حرکت کی تو گولیوں سے بھون دوں گا۔''

ہیڈ لائٹس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ دیکھ نہیں سکا کہ اُسے دھمکی دینے والا کون تھا اور اس کے پاس کس قسم کا اسلحہ تھا۔ بولا۔ ''تم کون ہو؟''

وہی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تمہیں پتا چل جائے گا۔ پستول پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کر لو۔ جلدی کرو ورنہ میں جلدی کر دکھاؤں گا۔ اور یہ تم نے کس کو گولی ماری ہے؟''

''کسی کو نہیں...... تم جاؤ! یہ ہمارا گھر کا معاملہ ہے؟'' عمر حیات کو جان کے لالے پڑ گئے تھے اس لیے اس نے بلا تامل اپنا جرمن پستول سڑک پر گرا دیا۔

''گھر کے مسئلے سڑک پر حل نہیں کیے جاتے بیٹا۔ اوئے جانو! اُسے دیکھو...... وہ کیکر کے نیچے پڑی ہے۔ دیکھو! مر گئی ہے یا زندہ ہے؟''

ایک شخص پچھلا دروازہ کھول کر نکلا۔ پوٹھوہار کے قریب آیا۔ سڑک پر پڑا ہوا پستول اُٹھا کر بولا۔ ''حرکت کرو گے تو پورا برسٹ جسم میں اُتر جائے گا۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر جیپ کا دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا چندو کے پاس پہنچا۔ ہلا جلا کر دیکھا۔ زندگی کے سہارے پر نبض چل رہی تھی، وہ ہوش میں تھی مگر خوف کے مارے ساکت پڑی تھی۔ اس نے ٹارچ کی مدد سے اُسے دیکھا بھالا۔ گولی ران کو چھو کر نکل گئی تھی۔ ماس جل گیا تھا۔ بارود کے جلے ہوئے ماس میں شدید چبھن اور جلن ہوتی ہے۔ گولی کی دہشت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اُسے کندھے پر ڈال کر ڈالے کے عقبی کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''یہ پتا نہیں کہ کون ہے مگر ہے ایک دم پٹاخہ!''

''اسے بعد میں دیکھ لوں گا۔ چل بے لاٹو! گھوم جا......!''

ڈالا ریورس ہوا۔ عمر حیات کو مارنا ضروری نہیں تھا مگر نہ جانے ڈالے میں ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے شخص کے دل میں کیا خیال آیا کہ اُس نے گن کی نال کھڑکی سے نکالی، عمر حیات کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ 'ٹھائیں' کی زوردار آواز کے ساتھ ہی گولی پسلیاں توڑتی ہوئی عمر حیات کے دل میں دھنس گئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا مگر دل نے ساتھ نہ دیا اور وہ چیخ سینے میں لیے لہرا کر جیپ سے ٹکرایا اور سڑک پر گر کر تڑپنے لگا۔

پچھلے کیبن میں فرش پر پڑی ہوئی چندو کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں پھاڑے عمر حیات کے پستول کا جائزہ لینے والے جانو کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہوا؟''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں میری بلبل! جس نے تمہیں گولی ماری، اُسے صاحب نے گولی مار کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ چلو اُٹھو اور سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔''

اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ''ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا؟''

ران میں لگی ہوئی گولی کی تکلیف جھیلنا دل گردے کا کام تھا جو وہ کر رہی تھی مگر عمر حیات کو گولی لگنے کی خبر سن کر اپنے حواس برقرار نہ رکھ پائی اور اُٹھنے کی کوشش میں لہرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ جانو نے ٹارچ جلائی، اُسے دیکھا اور اپنے کندھوں پر لٹکتی ہوئی اجرک اُتار کر اوڑھا دی۔ گردن باہر نکال کر اونچی آواز میں بولا۔ ''صاحب! بے ہوش ہو گئی ہے۔''

ڈالا تیزی سے پوٹھوہار کے آگے سے گزرا اور شہر جانے والی سڑک پر رواں دواں ہو گیا۔ جو اپنے پیروں پر نہیں چل سکتے، انہیں وقت اپنی مرضی سے چلانے لگتا ہے۔ زندگی کے سفر کو تو جاری رہنا ہی ہوتا ہے۔

ران میں درد کی کٹیلی لہر نے اُسے بیدار کیا تھا۔ حیرت بھری آنکھوں سے در و دیوار کو دیکھنے لگی۔ نامانوس جگہ تھی اور کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چند لمحوں تک کراہتی رہی۔ پھر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ران میں تکلیف کا احساس بڑھ گیا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو زیریں دھڑ پر اجرک پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے کھسکایا تو اپنی ٹانگ کو سفید رنگ کی بالشت بھر چوڑی پٹی میں جکڑے دیکھا۔ پٹی کے نیچے شلوار غائب تھی۔ دھیرے دھیرے سب کچھ یاد آ گیا۔ دل میں حبس سا بھر گیا۔ عمر حیات کی موت کا دل کو صدمہ تھا۔ باوجود کہ اُس نے مرنے سے پہلے اُس کی محبت کو مار دیا تھا۔ ایک ایک کر کے حویلی کے سبھی افراد یاد آئے۔ پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے حویلی میں بہت اچھا اور کبھی نہ بھولنے والا وقت گزارا تھا۔ دل سے ہوک نکلی۔ ''کاش! یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔''

ہر شکست یا روا قعے کے بعد انسان ایسا ہی سوچتا ہے مگر ہونی کو ٹال نہیں سکتا۔

گولی کا درد جلد ہی بوجھل کر کے مٹ گیا مگر اپنی توہین اور بے عزتی کا احساس بہ دستور دامن گیر رہا۔ اس نے پہلی مرتبہ مردانگی دیکھی تھی۔ دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ رہی۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کے آگے تاحدِ نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا مگر وہ جس جنگل سے نکل کر آئی تھی، ابھی اس کے حصار سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔

اس کا ذہن تھک گیا۔ آنکھیں موند کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ وہ کس دنیا میں تھی؟ کس کی تحویل میں تھی؟ اندازہ نہ کر سکی مگر خوفزدہ تھی۔ جو لوگ عمر حیات کو سڑک پر بغیر کسی دشمنی کے اتنی دیدہ دلیری سے گولی مار سکتے تھے، وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ بدن کو ناگاہ جھرجھری آ گئی۔ دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں اُسے پھر اُس عذاب سے گزارا نہ جائے جس سے گزر کر وہ اپنی نظروں سے گر گئی تھی۔ دل اندیشے کی تال پر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عمر حیات نے

فائدہ

ریلوے ٹکٹ چیکر مسافر سے۔ ''اس تھیلے میں کیا ہے؟''

مسافر۔ ''جناب اب آپ سے کیا چھپانا۔ اس تھیلے میں میرا بیٹا ہے۔ اس کا وزن صرف تیس کلو ہے۔''

ٹکٹ چیکر۔ ''تم نے اس کا ٹکٹ لیا ہے؟''

''مسافر۔ ''جناب نہیں لیا۔ ویسے بھی اس کی ضرورت نہیں۔ آپ اس بچے کو سامان تصور کر لیں۔ اس سے ریلوے کو 10 کلوگرام کا فائدہ ہوگا۔''

ٹکٹ چیکر۔ ''ٹھیک ہے، تصور کر لیا کہ اس تھیلے میں سامان ہے۔ 10 کلوگرام کے فائدے کی وضاحت کرو۔''

مسافر۔ ''جناب ریلوے کی طرف سے ہر مسافر کو چالیس کلو سامان ساتھ لے کر سفر کرنے کی اجازت ہے جبکہ میرا بیٹا تیس کلوگرام کا ہے۔ 10 کلو کا فائدہ ہوا کہ نہیں...؟''

مرسلہ: بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرد بننے میں سال سے زیادہ وقت گزار لیا تھا کیونکہ وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ ان لوگوں کے دل میں اس کی محبت کا پیدا ہونا معجزے سے کم نہ تھا اور معجزے روز روز رونما نہیں ہوتے۔

دروازہ آہستگی سے کھلا۔ لانبے قد والا شخص اندر داخل ہوا۔ چندو کی چارپائی کے قریب آ کر رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ چندو اُس کا حلیہ دیکھ کر سہم گئی۔ لمبا قد، توانا کسرتی بدن، خون کی طرح سرخ آنکھیں اور ڈراؤنی مونچھیں...... وہ حلیے سے چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے اسے پہلے کہیں دیکھ رکھا تھا۔ یادداشت پر زور دیا تو یاد آیا کہ اُسے چندو نے بے ہوش ہونے سے قبل ڈالے کے عقبی حصے میں دیکھا تھا۔ وہ بولا تو اُس کی آواز میں عجیب طرح کا کھردرا پن شامل تھا۔ ”تم کون ہو؟“

”مم...... میں چندو ہوں......“

”چندو؟...... ارے واہ! تمہیں دیکھ کر یہی نام ذہن میں آتا ہے۔ خیر! وہ کون تھا؟ تمہارا عاشق تھا یا تمہیں اغوا کرنا چاہتا تھا؟“ اس کی پاٹ دار آواز چندو کا دل دہلا رہی تھی۔

”وہ عمر حیات تھا۔“ اس کا لہجہ غم بار تھا۔

”تمہارا کیا لگتا تھا؟“

”وہ میرا......“ وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کا عمر حیات سے کیا تعلق تھا؟...... اس تعلق کا کیا عنوان تھا جو بننے سے قبل ہی ٹوٹ گیا تھا؟...... جواب نہ بن پڑا تو خاموش ہو گئی۔ خوفناک چہرے والے نے اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی مگر وہ مسلسل لب بستہ رہی۔

وہ زِچ ہو کر بولا۔ ”کیا تم سن رہی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا، کمزور سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے بس یہی علم ہے کہ اُس کا نام عمر حیات تھا۔ بس! مجھے سونے دو۔“

”کیا درد ہو رہا ہے؟“

”ہاں! مگر...... میں کہاں ہوں اور تم کون ہو؟“ اس نے اپنی آنکھیں دانستہ طور پر بند رکھیں۔ اسے اُس خوفناک چہرے سے ڈر لگنے لگا تھا۔

”جہاں بھی ہو؛ خیریت سے ہو۔ گولی گوشت کو جلا کر نکل گئی تھی۔ اگر ماس میں اٹک جاتی تو زہر پھیل جاتا اور آپریشن کر کے گولی نکالنا پڑتی۔ اب خیر سلا ہے۔ تم ہفتہ بھر میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا، بولی۔ ”تم کون ہو؟“

”میرا نام رمضان علی ہے۔ میں ہی تمہیں بے ہوش حالت میں اُٹھا کر یہاں لایا تھا۔“

چندو نے آنکھیں کھول دیں۔ اُسے اپنے بدن کو دلچسپی آمیز نظروں سے گھورتے پا کر گھبرا گئی، بولی۔ ”تم لوگوں نے عمر حیات کو گولی کیوں ماری؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟“

اس کے لہجے میں گلہ اور برہمی مترشح تھی۔

”اس نے تمہیں کیوں گولی ماری تھی، تم نے اُس کا کیا بگاڑا تھا؟“ رمضان علی نے جواب دینے کے بجائے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر استفسار کیا۔ وہ خاموش رہی۔ ایسے میں دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ چندو نے بے ساختہ دیکھا۔ رمضان علی سے بھی نکلتے ہوئے قد کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر رمضان علی مودبانہ انداز میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گیا۔ نو وارد چندو کے قریب آیا، بولا۔ ”جانو! ہوش میں آنے کے بعد اِس نے کچھ بتایا؟“

چندو نے اُسے آواز سے پہچان لیا۔ غراتی ہوئی دہشت ناک آواز...... وہ ڈالے کے کیبن میں اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور اسی نے ہی عمر حیات کو گولی ماری تھی۔ رمضان علی عرف جانو مودبانہ انداز میں چندو سے ہونے والی گفتگو اُس کے گوش گزار رہا تھا جبکہ چندو سر جھٹک کر عمر حیات کی موت کے دکھ سے پیچھا چھڑانے اور نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ غراتی ہوئی آواز والا شخص دیکھنے میں خوفناک نہیں تھا۔ بہت نفیس اور قیمتی سوٹ زیب تن کیے چارپائی پر پاؤں ٹکائے کھڑا شخص کوئی بڑا زمیندار معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے جانو کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا۔ گھٹنے پر کہنی، اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے چندو پر جھک گیا، بولا۔ ”ہوں...... تو تم چندو ہو۔ تمہارا نام رکھنے والا کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ ہوں؟“

وہ خاموش رہی۔ وہ اُس کے بدن کے نشیب و فراز کو دلچسپی آمیز نظروں سے ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں گولی مارنے والا کون تھا؟“

اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں، کہا۔ ”وہ عمر حیات تھا۔ میر ظفر حیات کا اکلوتا بیٹا۔ آپ لوگوں نے بڑا ظلم کیا جو اُسے مار دیا۔“

”ہوں......“ شاید ہر بات پر ’ہوں‘ کہنے کی اُس کی عادت رہی تھی، تبھی ہنکارا بھر کر بولا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے میر ظفر حیات کے وارث کو مارنا نہیں چاہیے تھا مگر میں اُسے جانتا نہیں تھا۔ اکلوتی شاخ کو کاٹنا بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔ خیر، جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب میرا پچھتاوا اُس میں روح

نہیں پھونک سکتا۔“

اس کا لہجہ نرم ہو کر دہشت ناک نہیں رہا تھا، وہ بولی۔ ”تم کون ہو؟“

اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری، بولا۔ ”مجھے دنیا میں ’تم‘ کہنے والا زیادہ سانسیں نہیں لے سکتا مگر اس بہت میں تمہارے چار اور جرم بھی معاف کرتا ہوں کیونکہ تمہیں دیکھ کر میرا دل اُچھل پچھل ہونے لگا ہے۔ تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔ تمہارے جیسی لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“

چندو نے گھبرا کر منہ پھیر لیا، بولی۔ ”تم میرے بابا کی عمر کے ہو اور میں تمہاری بیٹی جیسی ہوں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”ہوں...... پڑھی لکھی لگتی ہو۔“

”ہاں! میں نے میٹرک کیا ہے۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ اس ہوس مارے ادھیڑ عمر شخص کی موجودگی سے اُسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

”یہ ایسا محفوظ علاقہ ہے جہاں کوہ قاف سے اُترنے والی پریاں تمام عمر محفوظ رہتی ہیں۔“

وہ سمجھ نہ پائی۔ دوبارہ بتایا گیا۔ ”تم اس وقت ایسی جگہ پر ہو جس کے آس پاس چاروں طرف میلوں ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ تمہیں یہاں سے بھاگ کر شاید بیس میل سے بھی کہیں زیادہ لمبا سفر طے کرنا پڑے گا؛ کسی آبادی تک پہنچنے کے لیے۔“

وہ آنکھیں موند کر خدا سے مدد مانگنے لگی۔

وہ بولا۔ ”یہ تم منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑا رہی ہو؟“

اس نے ٹانگ ہلائی۔ ران میں درد نہیں ہوا۔ اس نے ہمت کی اور ٹانگ سمیٹ لی۔ درد کی ایک لہر لمحہ بھر کو پورے بدن کا احاطہ کر کے معدوم ہو گئی۔ اس نے دوسری ٹانگ بھی سمیٹ لی۔ بولی۔ ”تم مجھے یہاں کیوں اٹھا لائے ہو؟“

وہ ایک ذرا مسکرایا۔ دروازے تک گیا۔ جھانک کر باہر دیکھا۔ جانو کو آواز دے کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”چندو! تمہیں گولی لگی تھی جس کا علاج ضروری تھا ورنہ تم خون بہنے کی وجہ سے وہیں مر جاتیں۔ تمہاری روح پر بھی کوئی بوجھ تھا جسے اُتارنا ضروری تھا ورنہ تمہاری جوانی قبل از وقت بوڑھی ہو جاتی۔ قسمت نے سڑک کنارے اتنا خوب صورت بدن مجھے انعام میں دیا، کیا وہیں چھوڑ آتا؟“

اسے بخوبی احساس ہو گیا کہ وہ اچھے آدمی کی تحویل میں نہیں تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ ”میں اب ٹھیک ہوں۔ تمہاری مہربانی پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اَب مجھے جانے دو۔“

اس کی زبان خاموش رہی۔ آنکھیں بول پڑیں۔ سمجھا گئیں کہ وہ اُس کے حصول کے لیے ایک قتل کر آیا تھا اس لیے خالی خولی شکریے سے کام چلنے والا نہیں تھا۔

جانو کمرے میں داخل ہوا۔ مودبانہ لہجے میں بولا۔ ”حکم صاحب!“

”اس کے کھانے پینے اور دوا دارو کا خیال رکھنا۔ شہر سے تین چار جوڑے کپڑوں کے بھی منگوا لینا اس کے لیے...... اور اسے دن میں دو مرتبہ اس بہروپیا ڈاکٹر سے چیک کرواتے رہنا۔ اسے مکان میں چلنے پھرنے کی آزادی حاصل ہو گی تاکہ میری واپسی تک یہ پھول کملا نہ جائے۔ ہاں! اگر یہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے یا شور مچا کر کسی کو متوجہ کرے تو بے شک گولی مار دینا۔“ اس کا نرم لہجہ عنقا ہو گیا۔ غراہٹ عود کر آئی۔ چندو کے بدن کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس کی منت سماجت کرتے ہوئے آزادی کے لیے پھڑپھڑانے لگی مگر وہ اُس پر تنبیہی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے جانو بھی چلا گیا۔

چندو کی کھلی آنکھیں چھت کی چوبی کڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ نقاہت، سر درد اور خوف کے مارے ذہن اچانک خالی ہو گیا تھا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اُس کی ٹانگ اُس کا وزن سہارنے کے قابل تھی۔ اس نے چارپائی پر پڑی ہوئی اجرک اپنے بدن کے زیریں حصے پر باندھ لی۔ ننگ چھپ گیا۔ ایک قدم چلی۔ درد ہوا تو چارپائی پر ٹک گئی۔ پٹی خاصی کس کر بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے جلد کھنچ گئی تھی۔ آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا۔ بہ دقت تمام چارپائی کے سرہانے پڑی ہوئی چوبی تپائی تک پہنچی۔ گلاس میں پانی بھر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ پانی پی کر سوچ میں پڑ گئی۔

اُسے یہاں لانے والا کہیں جا رہا تھا۔ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوتا تب بھی فکر کی بات تھی کیونکہ جلد واپس آنے کا ارادہ ظاہر کرنے والا اُسے خوفناک شکل والے نوکر کے حوالے کر کے جا رہا تھا۔ عمر حیات نے اُسے حویلی چھوڑنے سے پہلے وہ کچھ دکھا دیا تھا جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ڈر رہی تھی کہ اس جیسی رات پھر لوٹ نہ آئے۔

وہ دس پندرہ منٹ تک بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھ کر دیوار تک گئی۔ پسینے سے چہرہ تر ہو گیا۔ فرطِ ضبط سے ہونٹوں پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

دانتوں کے نشان ثبت ہو گئے۔ پھر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی اور ہاتھ سے ران پر بندھی ہوئی پٹی کو سہلانے لگی۔ ڈاکٹر نے گھٹنے سے کچھ اوپر سے شلوار کاٹ پھینکی تھی۔ گھٹنے اور پنڈلی کی برہنگی عجیب محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں اپنی بے لباس بے بسی کا احساس رُلانے لگا۔ توہین ہونے پر پشیمانی بڑھ گئی۔

نصف گھنٹے بعد جانو اُس کے لیے کھانا لایا۔ اُسے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم چل پھر سکتی ہو۔ اچھی بات ہے۔''

اس نے اُس کے سامنے میز رکھی۔ کھانا سجا دیا، بولا۔ ''کھاؤ میری چندو رانی! زندگی کھانے کا ہی تو نام ہے۔''

وہ خوش دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا جو اُس کے حلیے سے میل نہیں کھاتی تھی۔ کھانے کو دیکھ کر اُس کی بھوک جاگ گئی۔ وہ کن انکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گئی جبکہ وہ چارپائی پر پھیل کر بیٹھ گیا، بولا۔ ''تمہارا باپ کون ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ حیرت سے بولا۔ ''کیا مطلب؟ کیا تمہارا باپ مر چکا ہے؟''

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ قدرے غصے سے بولا۔ ''پانچ سیر کا سر ہلاتی ہو، چھٹانک بھر کی زبان نہیں ہلاتیں۔ منہ سے بکو۔''

اس نے نوالہ چباتے ہوئے اُسے دیکھا۔ اپنا خوف چھپا کر بولی۔ ''نہیں بکتی۔ تمہیں کیا، میرا باپ کوئی بھی ہو؟''

اُسے تاؤ آ گیا۔ دانت پیس کر بولا۔ ''تم اِس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔''

اس نے ہنکارا بھرا اور سہم کر خاموش ہو گئی۔ جانو نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کیے جن کا جواب اُسے نہ ملا تو زِچ ہو کر بولا۔ ''تم نجانے کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہو۔''

اس نے کندھے اُچکائے، پانی پیا اور بولی۔ ''میں اگر تمہارے رحم و کرم پر ہوں تو گولی مار دو۔ ورنہ خاموشی سے چلے جاؤ۔''

وہ غصے میں اُٹھا۔ تھپڑ مارنا چاہتا تھا مگر ہاتھ اُٹھا کر رُک گیا۔

وہ بولی۔ ''مارو۔ رُک کیوں گئے؟ میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔''

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ چندو سمجھ گئی کہ وہ اپنے صاحب کی وجہ سے اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہتا تھا، بولی۔ ''جاؤ ناں! تمہاری شکل بہت ڈراؤنی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

اُس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ کوئی جواب دیے بغیر برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ کھانا کھاتے ہی چندو پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ سر جھٹک کر اُٹھی۔ دروازے تک آئی۔ جھانک کر دیکھنے لگی۔ ایک سیدھ میں واقع تین عدد کمرے، ان کے آگے دس فٹ چوڑا برآمدہ، برآمدے کے ایک گوشے میں کچن نما کمرا جبکہ دوسرے کونے میں چند سیڑھیاں...... یہ طرزِ تعمیر خالصتاً دیہاتی تھا۔ صحن کچا تھا اور زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ بیر کا ایک گھنا درخت صحن کے عین وسط میں ایستادہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ماحول میں کوئی شور نہیں تھا جبکہ صحن کے پار کوئی منڈیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ آس پاس کوئی گھر واقع نہیں تھا۔ جانو کسی کمرے میں تھا۔ اُس کے علاوہ کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ سوچا کہ اس کے پہرے پر صرف رمضان علی عرف جانو ہی تعینات کیا گیا تھا۔ دل کو کچھ تسلی ہوئی کہ وہ ایک آدمی کو دھوکا دے کر یہاں سے نکل سکتی تھی۔

اُسے رات کا انتظار تھا۔ تب تک شاید اُس کے زخم کی حالت بھی کچھ درست ہو جاتی اور وہ تیز چلنے کے قابل ہو جاتی۔ ہمت کر کے برآمدے میں، پھر صحن میں نکلی۔ اُس کا اندازہ درست تھا۔ اطراف میں دور دور تک کوئی گھر نہیں تھا۔ پانچ سات فٹ بلند چار دیواری کے پار کہیں کہیں درخت دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آہستہ رَوی سے چلتی ہوئی سامنے والی دیوار تک گئی۔ دیوار کے ساتھ چھوٹے سائز کا چکنی مٹی کا تنور بنا ہوا تھا۔ اُس پر چڑھ کر دیوار کے پار جھانکنا چاہتی تھی مگر ٹانگ کے زخم نے اجازت نہ دی۔ پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ برآمدے کے ہشت پہلوی سرخ ستون کے ساتھ جانو کندھا ٹکائے ایک ٹانگ پر کھڑا اُسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اپنی جانب متوجہ پا کر بولا۔ ''اگر تم چاہو تو تنور پر چڑھ سکتی ہو۔ چھت پر جا سکتی ہو۔ تمہیں اجازت حاصل ہے۔ ہاں! اگر باہر قدم رکھو گی تو گولی تمہارا سینہ چھلنی کر دے گی۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ رُخ بدل کر صحن کی نکڑ میں واقع باتھ روم کی طرف چل دی۔ تھوڑی سی چہل قدمی نے اُسے تھکا دیا تھا اس لیے وہ کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جانو اُس کے لیے چائے کا پیالہ اٹھا لایا۔ اُس نے پیالہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ جانو بولا۔ ''رات کے وقت ڈاکٹر تمہیں دیکھنے آئے گا۔ اس وقت میں یہاں موجود ہوں گا۔ احتیاط سے کام لینا اور کوئی ایسی بات نہ کرنا جو ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا کرے۔ سن رہی ہو ناں؟''

اس نے سر ہلایا، وہ بولا۔ ''مجھے لوگوں کے حلق سے بھی آواز نکالنے کا ہنر آتا ہے مگر میں تم پر ترس کھاتے ہوئے سختی نہیں کرتا جس کا تم ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہو۔''

اس نے پھر سر ہلا دیا۔ جانو کا پارہ چڑھا۔ صاحب کا خیال آتے ہی فوراً اُتر بھی گیا، بولا۔ ''صاحب نے ہفتہ بھر کے بعد واپس آنا ہے۔''

وہ چائے کا خالی پیالہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اور کچھ؟''

جانو نے سر کھجایا۔ اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کچھ اور چاہیے؟''

''ہاں! مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت چاہیے۔''

''ناممکن! کچھ اور؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ ''تو پھر مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ چندو نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ عشا کے بعد کسی وقت ڈاکٹر آیا۔ وہ سو رہی تھی۔ دستک پر بیدار ہوئی۔ دروازہ کھولنے تک تین چار مرتبہ دستک دی جا چکی تھی۔ جانو کے عقب میں ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ وہ حلیے سے ڈاکٹر کے بجائے کوئی شعبدہ باز یا جادوگر دکھائی دیتا تھا۔ نہایت منحنی وجود کا مالک ڈاکٹر بہ مشکل اٹھارہ بیس برس کا تھا۔ چینٹ نما قمیص، جھانکتی ہوئی پنڈلیاں اور گہرے نیلے رنگ کا پاجامہ...... بغل میں بڑا سا بیگ دبا ہوا تھا جو لامحالہ طور پر میڈیکل کٹ کا کام کرتا تھا۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مضحکہ خیز انداز میں چندو کو سلام کیا اور جانو کے پیچھے چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

اُس کی آواز اس کے حلیے کی طرح خاصی مضحکہ خیز تھی۔ ٹھیٹھ پنجابی زبان میں مخاطب ہوا۔ ''آپ ادھر چارپائی پر لیٹ جائیں۔''

وہ لیٹ گئی۔ ڈاکٹر گلہری کی طرح اُچھل کر چارپائی کی پائینتی پر چڑھ بیٹھا۔ اجرک ہٹا کر پٹی کھولنے لگا۔ پٹی خون سے ... خون جم گیا تھا۔ پٹی اُترتے وقت درد ہونے لگا۔ ... سسکی نکلی۔ ڈاکٹر نے کھلی انگلیوں والا پنجہ لہرایا۔ ''بس جی بس! تھوڑا بہت درد تو ہوتا ہی ہے ناں...... بس! چلو جی ... کھل بھی گئی پٹی اور پتا بھی نہیں چلا۔''

اس نے زخم کی صفائی کی۔ نئی پٹی باندھی۔ کندھے پر ٹیکہ لگایا اور چند گولیاں اور کیپسول نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ترکیب استعمال سمجھانے لگا۔ وہ دوا سے زیادہ دوا دینے والے کو توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے منحنی چہرے اور نوکیلی ناک کے نیچے مونچھوں کی ہلکی لکیر بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''کیا تم نے ڈاکٹری کا کورس کر رکھا ہے؟''

وہ ہنس کر بولا۔ ''او نہیں جی! دو چار سال کمپوڈری کی۔ پھر اپنی دکان کھول لی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ میں بڑی شفا دے رکھی ہے۔ کیا آپ کو ٹیکے کا درد ہوا؟'' اس نے دیدے گھما کر پوچھا پھر جواب سنے بغیر بول پڑا۔ ''نہیں ہوا۔ یہی خدا کی دین ہے مجھے۔ جیسا بھی ٹیکہ ہو، ذرا بھی درد نہیں کرتا۔''

جانو نے پوچھا۔ ''اوئے کمپوڈر کی اولاد! یہ بتا کہ زخم کتنے دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا؟''

''ناں کر بادشاہ! میرا باپ تو ہل کو ٹنے والا بندہ ہے۔ کمپوڈر تو میں ہوں۔'' پھر اپنا سامان سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''نکالو میری فیس...... یہ دو چار دنوں میں ڈنڈا سروس ہو جائے گی۔''

جانو نے ہنس کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ اُسے چارپائی پر بیٹھے دیکھ کر بولا۔ ''کیا چائے پیو گی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا، وہ بولا۔ ''یہ ڈاکٹر بڑا سیانا ہے۔''

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ زیرِ لب اُسے گالی دیتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ مقفل کر گیا۔

وہ جاگتی رہی۔ اپنے پرس سے رزلٹ کارڈ نکال کر حسرت آمیز نظروں سے دیکھتی رہی۔ عمر حیات نے اُسے کالج میں داخل کرانے کی خوش خبری سنائی تھی۔ کہا تھا کہ اس نے 'اے پلس' گریڈ میں میٹرک پاس کیا ہے۔ وہ جہاں چاہے گی، وہاں آسانی سے ایڈمشن مل جائے گا۔ اس کی محنت نے ہر دروازہ کھول دیا تھا مگر قسمت نے ہر دَر بند کر دیا۔ زندگی کے دامن میں عصمت بچی تھی جو لٹا بیٹھی تھی اور بے آبرو ہو کر حویلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ قسمت کا وار خاموش اور کائیاں ہوتا ہے۔ چالاک سے چالاک شخص بھی اس وار کو خطا نہیں کر سکتا۔ چندو کیا تھی؟ اس نے تو ابھی زمانہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے پرس میں چند مڑے تڑے نوٹ بھی پڑے تھے جو اس نے اپنے جیب خرچ سے بچا رکھے تھے۔

کافی دیر تک سوچوں میں مستغرق رہی پھر دروازے پر آئی۔ اُس کا جائزہ لیا۔ دیسی ساخت کے بلیوں والے کواڑ بہت مضبوط تھے۔ اس کی کوئی کوشش بند دروازے کو کھول نہیں سکتی تھی۔ کمرے میں اس دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشن دان تک نہیں تھا۔ سپاٹ دیوار پر مایوسی کے عالم میں ہاتھ پھیرتی ہوئی چکراتی رہی پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی کہ کس طرح اس قید خانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے نجات حاصل کرے۔ اسے یہ خیال نہیں آرہا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ کہاں جائے گی؟ دنیا بہت بڑی ہے۔ کروڑوں چھتوں سے چھتیں ملی ہوئی ہیں مگر ایک لاوارث، جوان اور خوب صورت لڑکی کو کہیں جائے پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ وہ جس طرف بھی ڈگمگا کر گرتی، ہوس بھری گود اُسے دبوچنے کے لیے موجود ہوتی۔

وہ پانی پینے کے لیے اُٹھی۔ دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہوگئی۔ ایسے میں صحن میں ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ اس نے دروازے سے چمٹ کر ایک عمودی درز پر آنکھ ٹکائی۔ صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی میں ایک پستہ قامت مگر فربہ تن والے شخص کو کرسی پر بیٹھا دیکھا۔ چند لمحوں بعد جانو دوسری کرسی اُٹھائے پہنچ گیا۔ اس نے کرسی رکھی تو ایک بار پھر ویسا ہی کھٹکا ہوا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ یہ کون تھا؟...... اس موٹے شخص کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”یار جانو! میں نے چھوری کو ایک نظر دیکھا تھا جب میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر کو لایا تھا۔ ہائے! کیا غضب کی چھوری ہے یہ۔ صاحب کی قسمت کے کیا کہنے۔ نوروز بھٹی کا مال پسند نہیں آیا اور خالی ہاتھ واپس آرہے تھے کہ یہ سچا سودا ہاتھ لگ گیا۔ بے دام، بے مول......“

جانو نے آہ بھری۔ ”ہاں بھئی لاٹو! مال تو ایک دم کھرا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آج تک کسی نے اُسے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا۔ صاحب کی موج ہوگئی۔ دو چار دن کھیلے گا۔ پھر باسی روٹی لاکھوں میں بیچ کر نئی تلاش کرنے لگے گا۔ آہ! ہماری قسمت...... ہم اسے دیکھ کر ہی من کا رانجھا راضی کر لیتے ہیں۔“

چندو کو ان کی باتیں زہر لگیں مگر خواہش کے باوجود چارپائی پر نہ جاسکی۔ درد کی وجہ سے مسلسل کھڑے رہنا محال تھا اس لیے گھٹنے ایک رُخ موڑ کر پہلو کے بل بیٹھ گئی۔ درز سے چپکی رہی۔ لاٹو کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ صاحب کے پاس کام کرتے ہوئے مجھے پانچ اور تمہیں تین سال ہوگئے مگر ہمارا کچھ نہیں بنا۔ نہ جیب بھری، نہ پیٹ اور نہ ہی دو چار عیاشی کے دن ہاتھ آئے۔ جان کی بازی ہم لگاتے ہیں اور بینک صاحب کا بھرتا رہتا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنے لیے بھی کچھ کر لیں۔“

جانو چونکا۔ ”کیا مطلب؟ کھل کر بات کرو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

ان کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی مگر ماحول پر چھائی ہوئی غیر معمولی خاموشی کے سبب چندو کو صاف سنائی دے رہی تھی۔

”یار! صاحب لاہور رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بڑا چالاک اور ظالم شخص ہے مگر وہ ہمارا پیچھا کرسکتا ہے اور نہ ہی ہمارے بغیر اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اُسے چھوڑ دیں اور کسی طرف منہ کر جائیں۔“

جانو استہزائیہ ہنسی ہنسا۔ ”واہ لاٹو واہ! صاحب نے ہمیں کوئی باندھ تھوڑا رکھا ہے۔ جب چاہے، چلے جائیں، اُسے کیا پروا؟ وہ اور بندے رکھ لے گا۔ ہم اپنی مرضی سے اُس کی نوکری کر رہے ہیں کیونکہ وہ ہمیں ڈبل تنخواہ دیتا ہے اور پولیس سے بھی بچاتا ہے۔“

”سنو تو سہی یار!“ لاٹو نے تھوڑی برہمی سے کہا۔ ”ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہیں ہر وقت ہم جیسوں کی ضرورت رہتی ہے۔ تم نے کبھی نور پور کا نام سنا ہے؟ ادھر مظفر گڑھ ضلعے میں ہے۔“

”نور پور؟ نہیں تو...... تمہارے منہ سے ہی سن رہا ہوں۔ وہاں کیا ہے؟“

”میں وہاں رہنے والے ایک گاگر نیش کو جانتا ہوں۔ بہت بڑا آدمی ہے؛ ایک دم دھانسو! پورے ضلع کی پولیس اس کی مٹھی میں ہے۔ اُدھر لاہور میں بھی اس کا کاروبار اور کوٹھی ہے۔ اس کا نام یارن خان ہے۔ ہاتھ کا بہت سخی ہے۔ ہمیں اس کے پاس چلے جانا چاہیے۔ ایک جگہ ٹک کر کام کرنے کا موقع ملے گا تو اپنے لیے بھی کچھ بنا لیں گے۔ ساری عمر ہمارے ہاتھوں میں بندوق اُٹھانے کی طاقت نہیں رہے گی۔ ہمیں بھی آرام کی ضرورت پڑے گی۔ اگر ہم ابھی سے کچھ سوچ لیں گے تو بڑھاپے میں کوئی کام دھندا اور بیوی بچے......“

”بیوی بچے! واہ لاٹو واہ...... بڑی دور کی کوڑی لانے لگے ہو آج تو......“ جانو نے پہلو کی جیب سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور لمبا کش لے کر طنز سے بھرپور لہجے میں بولا۔ ”اپنی اوقات میں رہو، نہیں تو سیدھا جیل جاؤ گے۔“

”یار جانو! میں غلط نہیں کہتا۔ یارن خان بہت بڑا آدمی ہے۔ صاحب کی طرح دلالی نہیں کرتا بلکہ دلالوں کے منہ میں راتب ڈالتا ہے۔ وہ لمبے ہاتھ مارتا ہے۔“

جانو نے دلچسپی لی، کہا۔ ”اگر اس نے ہمیں نہ رکھا تو؟“

”کیوں نہیں رکھے گا؟“ لاٹو نے فخر سے کہا۔ ”تم ہامی تو بھرو، اگلا کام میرا ہے۔“

جانو نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں صاحب کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ وہ پانچ سات دنوں بعد آئے گا تو ہم اُس سے اجازت لے کر یارن خان کے پاس چلے جائیں گے۔“

لاٹو کی ہنسی بڑی سفاک تھی، بولا۔ ”جانو! تم کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔ ساری عمر یہی مار ماری کرتے رہو گے اور کسی دن پولیس مقابلے میں مارے جاؤ گے یا جیل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، کھانس کھانس کر پھٹے (پھانسی) چڑھ جاؤ گے۔ او بھلے آدمی! یارن خان ہمیں زیادہ نہیں تو پانچ لاکھ روپے جاتے ہی تھما دے گا۔ کیا خیال ہے؟ یہ چھوری اتنے کی تو ہو گی ہی...... ہیں؟ اگر تمہیں یارن خان کی نوکری پسند نہ آئی تو ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔ اندرونِ سندھ کے ایک وڈیرے سے بھی میرے تعلقات ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا؟“

”اوہ! تو یوں بول ناں باوے! ہم صاحب کو دھوکا دے کر چندو کو یارن خان کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ہیں؟“

”چندو کون؟ کیا اس چھوری کا نام چندو ہے؟“ لاٹو نے کرسی چھوڑ دی۔

”ہاں! مگر اس طرح تو صاحب ہماری جان کا دشمن ہو جائے گا۔“

”نہیں ہوگا پیارے! ہم کوئی اناڑی تھوڑا ہیں۔ ہم یہ کام بھونڈے طریقے سے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں بچا کر کریں گے۔ سمجھے؟“

”سمجھ گیا، آگے بولو۔“

”میں یارن خان کے پاس جاؤں گا۔ اُس سے معاملہ طے کروں گا۔ پے منٹ کے بعد یعنی دو چار دن بعد وہ اپنے بندے بھیج کر مال یہیں سے وصول کرلے گا تو ہم یہاں ایسا ماحول بنا دیں گے کہ جب ہماری اطلاع پر صاحب یہاں آئے گا، اسے ہماری کہانی پر یقین آجائے گا۔ دو چار ماہ بعد ہم یہ نوکری چھوڑ کر یارن خان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس سے یہ ہوگا کہ صاحب ہمارا دشمن نہیں بنے گا۔“

”ہوں! اب تم نے سیانی بات کی ہے ناں! اور ہماری کہانی کیا ہوگی؟“ جانو نے پوچھا۔

”یہی کہ چندو کے پچھلے واہر (مسلح جتھا) لے کر آدھی رات کو یہاں پہنچ گئے اور ہمیں گن پوائنٹ پر بے بس کر کے اپنی چھوکری کو لے گئے۔ جاتے ہوئے ہماری موٹر سائیکل کے ٹائروں سے ہوا نکال گئے اور فیول پائپ کھول گئے تاکہ ہم ان کا تعاقب نہ کرسکیں۔ بس! اتنی سی کہانی ہے۔“

جانو کو پلاننگ پسند آئی۔ دونوں اس فرضی کہانی کو حقیقت کا ٹچ دینے لگے۔ جھوٹ کی نوک پلک سنوارنا ہی تو اصل کام ہوتا ہے۔ پانچ لاکھ کی متوقع رقم معمولی نہیں تھی۔ دو حصوں میں بٹ کر بھی خطیر ہی رہتی۔

ان کے طویل قامت صاحب کا نام ملک افراسیاب تھا۔ لاہور میں خاصے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ جانو کو اُس نے اپنا باڈی گارڈ جبکہ بشیر علی عرف لاٹو کو اس نے اپنا ڈرائیور رکھا ہوا تھا۔ دونوں کو خاصی تگڑی تنخواہیں دیتا تھا۔ وہ دونوں پولیس کو ڈکیتی اور چوری کی وارداتوں میں مطلوب تھے۔ انہیں پولیس سے تحفظ دے کر من چاہے غیر قانونی کام لیتا تھا۔ وہ چند بڑے صنعت کاروں اور شہر کے بڑوں تک رسائی رکھتا تھا۔ ان کی راتیں رنگین کرنے کے لیے صوبے کے دور افتادہ علاقوں سے حسن کی سوغاتیں خرید کر لاتا تھا۔ کوڑیوں کے مول خریدا جانے والا مال پالش کر کے جوہریوں کے ہاتھ ہیروں کے مول بیچا کرتا تھا۔ اس کوئلوں کی دلالی میں جہاں اُسے منہ پر ملنے کے لیے تازہ کلنک ملتی تھی وہاں مہینے میں دو چار دن تازہ شباب کی دل بستگی کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ رہتا تھا اور جنت بھی کھسک نہ پاتی تھی۔ اس ریگستانی مورچے کی طرح اس نے مختلف علاقوں میں اپنے بارہ چودہ ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ موضع سمن میں نوروز بھٹی اُسے سال میں ایک آدھ مرتبہ مال فراہم کرتا تھا۔ ملک افراسیاب لاٹو اور جانو کے ہمراہ اسی سلسلے میں سمن گیا تھا مگر مال اور مال کا بھاؤ دیکھ کر مایوس ہوگیا تھا۔ نوروز بھٹی نے بیٹ سے جس لڑکی کو اغوا کر رکھا تھا، وہ ان پڑھ اور نہایت بھدی آواز والی تھی۔ صرف خوبصورتی سے کام نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ منڈی میں خوش نما اداؤں اور خوش کلامی کو بھی میزان پر تولا جاتا تھا۔ واپسی پر اندھے کے ہاتھ بٹیرا لگ گیا۔ چونکہ بٹیرا زخمی تھا، اس لیے اُسے شوکیس میں سجانے سے قبل تندرست کرنا ضروری تھا اس لیے افراسیاب اُسے اس محفوظ ٹھکانے پر لایا تھا اور دونوں وفادار ساتھیوں کے سپرد کر کے لاہور چلا گیا تھا۔ چندو کو ان باتوں کا علم لاٹو اور جانو کے مابین چھڑی رہنے والی گفتگو سے ہوا تھا۔

ان دونوں نے ملک افراسیاب کے آنے سے قبل چندو کو یارن خان کے ہاتھ بیچنے کا منصوبہ بنا لیا۔ چندو دل پر ہاتھ رکھے اُٹھی اور پژمردگی سے لیٹ گئی۔ سمجھ گئی تھی کہ وہ شاخ پر بیٹھی ہوئی وہ فاختہ تھی جس کے سر پر عقاب بیٹھا ہوا تھا اور زمین پر مشاق شکاری کی نشانہ زن بندوق موت کا دہانہ کھولے اُس پر اُٹھ چکی تھی جبکہ مدد کرنے والا سانپ دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ نجانے کب تک صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر چندو اپنے تاریک مستقبل کے بارے سوچتے سوچتے تھک کر سوگئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صبح ڈاکٹر کے آنے سے قبل وہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر چکی تھی۔ اس دور اُفتادہ جگہ پر جانو کے ہاتھ کے کھانے کو غنیمت جان کر پیٹ میں اتارا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر نے پٹی بدلی۔ زخم پر کوئی بام لگائی اور زخم بھرنے کی نوید سنائی۔ ٹیکہ لگایا اور سابقہ دوا جاری رکھنے کا حکم دے کر چلا گیا۔ دن چڑھے مکان کے باہر موٹر سائیکل رُکنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کھلے دروازے سے صحن میں لاٹو کی شکل دکھائی دی۔ اس کا رنگ خاصا سیاہ اور نقوش بھدے تھے۔ آنکھیں حلقوں سے ابلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ جسم خاصا فربہ تھا۔ وہ چلتا تو اُس پر لٹو کا گمان ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُس کا نام 'لاٹو' پڑ گیا تھا۔ اس نے کھانے کا سامان اور ریڈی میڈ ملبوسات کے پیکٹ اُٹھا رکھے تھے۔ چندو کے کمرے میں آیا۔ اُسے بہ نظر شوق دیکھا۔ ملبوسات چارپائی پر پھینک کر بولا۔ ”چندو! یہ کپڑے پہن لو اور جانو کی اجرک فارغ کردو۔“

اس نے سر ہلایا۔ لاٹو کے جانے کے بعد اس نے ایک پیکٹ کھولا۔ سوٹ خاصا قیمتی اور مکمل تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے لباس تبدیل کرلیا۔ اس کے علاوہ دو اور سوٹ پیکٹوں میں بند تھے۔ اسے توقع تھی کہ رات کو بنائے گئے منصوبے کے تحت لاٹو یارن خان کے پاس جائے گا مگر وہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے یا تو اپنا پلان منسوخ کردیا تھا یا اس میں کوئی تبدیلی کرلی تھی۔

گولی کا زخم اب صرف چھیڑنے سے دکھتا تھا۔ وہ صحن میں کچھ دیر ٹہلتی رہی پھر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔ اُسے دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں ٹوکا۔ چھت پر کھڑے ہو کر اردگرد دیکھتے ہی اس کے اندازے کی توثیق ہوگئی۔ مکان کے چاروں طرف تاحدِ نگاہ ویرانی کا راج قائم تھا۔ اونچی نیچی ریگستانی زمین پر کہیں کہیں چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور درخت دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کتابوں میں ریگستانوں کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ فائزہ کے کرم سے فلموں میں دو تین مرتبہ اس سے ملتے جلتے مناظر دیکھے تھے۔ اپنی آنکھوں سے ریگستان کی بیابانی کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اسے یہ اندازہ تو تھا کہ مکان کے آس پاس کوئی دوسرا مکان نہیں ہے مگر اس قدر ویرانی کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اسے مکان میں چلنے پھرنے اور چھت پر جانے کی آزادی ملنے کی وجہ یہی تھی کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کسی پناہ گاہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ گھنٹا بھر چھت پر رہی۔ اس دوران کوئی ذی نفس، انسان تو کجا، کوئی جانور تک دکھائی نہیں دیا۔ چھت سے اُتری تو دیوار کے سائے میں کرسی ڈال کر بیٹھے جانو پر نظر پڑی۔ اس کی گود میں ایک خوفناک بندوق پڑی تھی۔

چندو کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ مسلسل خوف اور دہشت میں رہتے ہوئے وہ ایک دم پُرسکون ہوگئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے حالات سے مفاہمت کرلی تھی اور بھاگ نکلنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگی ہو۔ کم و بیش ایک ہفتے کی مہلت اُسے میسر تھی۔ یعنی جب تک ملک افراسیاب نہ لوٹتا یا اس کے غدار نوکروں کا منصوبہ پروان نہ چڑھتا، وہ محفوظ تھی۔ زندگی انسان کو ایک کے بعد ایک خوش فہمی دیتی ہے۔ زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی خوش فہمی سونے تک برقرار رہی مگر آدھی رات کو ایک زوردار دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ جانو دروازہ کھول کر اس کی چارپائی تک آیا تھا۔ وہ خوف کے مارے منہ پر ہاتھ رکھے اُٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے بھیانک چہرے والے جانو کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے پنڈلی پکڑ لی۔ پچکار کر بولا۔ ”ڈر کیوں گئی ہو میری جان! کھا تو نہیں جاؤں گا۔“

وہ کانپ اُٹھی، بولی۔ ”چھوڑ دو مجھے! تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟“

وہ مکروہ ہنسی ہنسا۔ ”نہیں میری بلبل! تم دو چار دن کی مہمان ہو۔ چلی جاؤ گی تو شاید عمر بھر تمہاری شکل نہیں دیکھ سکوں گا۔ اس لیے مجھے میزبانی کا تھوڑا سا موقع دے دو۔“

چندو کی آنکھوں میں عمر حیات کی جنونی گرفت گھوم گئی۔ تڑپ کر پیچھے ہٹی، بولی۔ ”میں تمہارے صاحب کو بتا دوں گی۔“

”ہا...... ہاہا...... اُسے بتانے تک تم یہاں نہیں رہو گی۔ بہت دور جا چکی ہوگی۔ اس لیے تو میں حسن کی تھوڑی سی خیرات لینے آیا ہوں۔“ جانو کے لہجے میں زہر بھرے سانپ کلبلا رہے تھے۔

چندو نے ایک جھٹکے سے اپنی پنڈلی چھڑائی۔ چارپائی سے اتر کر دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے باہر لاٹو کو بانہیں پھیلائے کھڑا دیکھا تو جہاں کی تہاں رہ گئی۔

وہ مکروہ انداز میں ہنسا۔ ”کوئی بات نہیں چھوری! جانو پسند نہیں تو یہ خادم حاضر ہے۔ آؤ میرے پاس...... آ جاؤ...“

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

مات

تنویر ریاض

مسلسل ذہنی آزار اور خوف کے سائے... کسی بھی معاشرے کو پنپنے نہیں دیتے۔ وہ لوگ بھی ایک اَن دیکھی پستی کی جانب محوِ سفر تھے کہ اچانک... ایک موڑ نے انہیں آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور یہ سارا کھڑاگ گویا نہلے پہ دہلا ثابت ہوا کیونکہ... حبس زدہ موسم جب برسنے پر آجائے تو کچھ اس طرح کُھل کر برستا ہے... کہ برسوں کی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔

جیسے ہی وہ دکان کے اندر داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی مصطفیٰ صادق نے زوردار نعرہ لگایا۔ ”خوش آمدید، خوش آمدید... آج تمہیں میری یاد کیسے آگئی؟“ یہ کہہ کر اس نے بجلی کا سوئچ آن کردیا۔

”آہستہ بولو۔ کہیں پڑوسی تمہاری آواز نہ سن لیں۔“ لوچین دکان کے عقبی حصے کی طرف آتے ہوئے بڑبڑایا جہاں صادق بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ گیا جو اس کا بھاری بھرکم وجود برداشت نہ کرسکی اور اس میں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

چرچراہٹ کی آواز آنے لگی۔ لوپین نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے، گردن اور ہتھیلیوں کا پسینا صاف کیا اور بولا۔ ”اسے کہاں نچوڑوں؟“

مصطفیٰ صادق کو اس کے بھولپن پر ہنسی آگئی۔ اس نے لطیف انداز میں کہا۔ ”میرے دوست تم اس وقت ریگستان میں ہو، بہتر ہوگا کہ اسے سنبھال کر رکھ لو۔ شاید پانی کی ضرورت پیش آجائے۔“

”میرا پیاس کے مارے دم نکلا جارہا ہے اور تم نے مجھے چائے تک کو نہیں پوچھا۔“ اس نے مقامی یوریغر زبان میں پوچھا۔ وہ پبلک سیکیورٹی بیورو کے ان چند افسروں میں سے تھا جس نے چار سال پہلے ترپان آنے سے پہلے یہ زبان سیکھ لی تھی اس کے دیگر ساتھی چینی شہری تھے اور کیونکہ تمام سرکاری خط کتابت اور بات چیت چینی زبان میں ہوتی تھی اس لیے انہوں نے مقامی زبان سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جبکہ لوپین کو اس سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ سڑکوں اور بازاروں میں ہونے والی لوگوں کی گفتگو سمجھ سکتا تھا جو عام طور پر مقامی زبان میں ہوتی تھی۔

”اگر اس چھوٹی سی تواضع سے میرے دوست کی جان بچ سکتی ہے تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ہوسکتی۔“ صادق نے کھولتے ہوئے پانی میں چائے کی پتی ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا ہے کہ مجھے دوست کہہ کر نہ پکارا کرو۔“ لوپین نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارے پڑوسیوں نے سن لیا تو وہ تم پر بھی اسی طرح شک کرنا شروع کردیں گے جیسا مجھ پر کرتے ہیں۔“

”وہ میری سیاست کو سمجھتے ہیں۔ اگر انہوں نے دوست کہتے ہوئے سن بھی لیا تو یہی سمجھیں گے کہ تمہاری خوشامد میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ بہرحال میں محتاط رہنے کی کوشش کروں گا۔ چائے بس تیار ہونے ہی والی ہے۔ ویسے مجھے اتنی جلدی تمہاری آمد کی توقع نہیں تھی۔“

”ہاں، اب میں پہلے کے مقابلے میں وقت کا زیادہ ہی پابند ہوگیا ہوں۔ ویسے تم بھی دوسرے دکانداروں کے مقابلے میں کچھ کم محنت نہیں کرتے اور دیر تک دکان کھلی رکھتے ہو۔ میں پچھلے کچھ دنوں سے تمہیں تھکا ہوا بھی محسوس کر رہا ہوں۔“

”مجبوری ہے میرے دوست۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میری تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی لڑکی کو پلان کی تو منگنی بھی ہوچکی ہے۔ اس کا منگیتر یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”مجھے اس کی شادی کی فکر ستائے جارہی ہے، میں اپنی دوسری بیٹیوں کے لیے بھی اچھے رشتے تلاش کررہا ہوں لیکن میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے دن رات محنت کررہا ہوں تاکہ جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہوسکوں اگر میں بھی تمہاری طرح پولیس والا ہوتا تو مزے سے کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لے رہا ہوتا۔“

”اس کے لیے کسی ٹی ہاؤس میں جانے کی ضرورت نہیں ہے تم یہاں بھی اپنے لیے تفریح کا سامان مہیا کرسکتے ہو۔ مجھ جیسا چاہنے والا حریف شاید ہی آسانی سے مل سکے۔“

صادق اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے اٹھ کر ایک بکس میں سے شطرنج کی بساط نکالی اور اسے میز پر بچھادیا۔ پھر اس نے چینی کی پیالیوں میں چائے انڈیلی اور ایک پیالی لوپین کو تھمادی۔ وہ آنکھیں بند کرکے اس کی خوشبو سونگھنے لگا پھر بولا۔ ”اتنی عمدہ چائے کے لیے تمہارا شکریہ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو تم لوگ اتنے زیادہ خلوص اور اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہو تو دوسری جانب حد سے زیادہ جذباتی بھی ہوجاتے ہو۔ اس کے ثبوت میں گزشتہ شب کا واقعہ بیان کروں گا جب تمہاری قوم کے کچھ نوجوانوں نے ہاؤسنگ کمیشن کے دفتر پر حملہ کرکے اسے شدید نقصان پہنچایا۔“

”کیا واقعی یہ ان کی حرکت تھی؟“ صادق نے شطرنج پر مہرے جماتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ پکڑے گئے ہیں تو ان کی شناخت بھی ہوگئی ہوگی۔“

”نہیں۔“

”پھر وہ مقامی لوگ نہیں ہوں گے۔“

”ممکن ہے کیونکہ کسی نے ان نوجوانوں کو نہیں دیکھا، البتہ شبہ کیا جارہا ہے کہ ایک عورت نے عمارت کے شیشے توڑ کر ریکارڈ تتر بتر کردیا اور دیواروں پر تمہاری زبان میں نعرے لکھ دیے جن میں ابلیکی کو ہیرو قرار دیتے ہوئے اس کی شان میں مدح سرائی کی گئی ہے۔ مجھے شاید وہاں اسی لیے بھیجا گیا کہ میں ان نعروں کی زبان سمجھ سکتا ہوں۔“

”ان میں یہ نعرہ تو درج نہیں تھا، چینی کیمونسٹ پارٹی زندہ باد۔“

”نہیں۔“

”پھر تمہاری شکایت درست معلوم ہوتی ہے۔“ صادق نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سوچا پھر اپنی

چال چلتے ہوئے بولا۔

”یہ احتجاج بلاجواز نہیں ہے۔ تمہیں بھی اس کی وجہ معلوم ہے کیا تم کمشنر وو چن کو نہیں سمجھا سکتے کہ وہ ہاؤسنگ کمیشن کو ابلیکی کے آبائی مکان کو مسمار کرنے سے باز رکھے۔“

”میں ایک معمولی سا پولیس والا ہوں۔“ لوپین نے اپنا چہرہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کمشنر میری بات نہیں سنے گا۔“

”کمشنر کسی کی بات نہیں سنتا۔ ہمیں اس سے کئی شکایات ہیں۔ ہمارے گھر اور گلیاں تباہ ہورہی ہیں۔ پانی کی شدید قلت ہے اور پوری آبادی کے لیے ایک زنگ آلود پمپ لگا ہوا ہے۔ ہم روایتی گھروں میں رہنے کے عادی ہیں لیکن اب ہمیں کثیر المنزلہ عمارتوں میں رہنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور ہم یہ سب برداشت کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

”لیکن اس کے ساتھ تمہیں بجلی اور فلش سسٹم کی سہولت بھی تو ملے گی۔“ لوپین نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”ہماری ایک قدیم تہذیب ہے اور ہم ہر اچھی چیز کو اس کی خامیوں کے ساتھ قبول کرلیتے ہیں لیکن ابلیکی کے مکان کو مسمار کرنے کے معاملے میں کمشنر وو چن بہت زیادتی کررہا ہے۔ یہ گویا میری قوم کے سینے میں چاقو اتارنے کے مترادف ہے۔ ابلیکی کے مکان پر میری قوم کے ہر فرد کا حق ہے۔“

”ہاں، میں نے اس جگہ کے بارے میں مقامی اخبارات میں پڑھا ہے۔ تمہاری نئی نسل اسے ایک زیارت گاہ اور فخر کی علامت سمجھتی ہے۔“

”پھر تو تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ یہ مکان نئی ہاؤسنگ اسکیم کے احاطے میں نہیں آتا اور نہ ہی وہاں سے پانی اور بجلی کی لائنیں گزرتی ہیں۔ تاریخی ورثہ کے تحفظ اور بحالی کا کمیشن یہ کہہ چکا ہے کہ اس مکان کو مسمار کرنا محض ایک ثقافتی ورثہ کو برباد کرنے کے برابر ہوگا۔“

”کیا کمشنر وو چن یہ بات نہیں جانتا؟“ لوپین نے پوچھا۔

”وہ بنیادی طور پر ایک خبیث شخص ہے۔ اس بے رخی کے لیے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”میں پولیس والا ہونے کے باوجود تمہاری طرح بے اختیار ہوں لیکن اپنے کام کے سلسلے میں روزانہ کئی لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ممکن ہے کہ یہ محض افواہ ہو لیکن ان کا کہنا ہے کہ جس زمین پر ابلیکی کا مکان واقع ہے۔ وہ ہاؤسنگ اسکیم میں تو نہیں آتی لیکن سڑک کی تعمیر کے لیے کافی اہم ہے۔“

”کیا تم اس سڑک کی بات کررہے ہو جو کان کنی کی سہولت کے لیے پہاڑوں کے درمیان بنائی جائے گی۔“

لوپین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں اسی سڑک کی بات کررہا ہوں لیکن تم یہ سن کر خوش نہیں ہوئے۔ کیا تمہاری قوم کے لوگ اس کاروبار سے فائدہ نہیں اٹھا رہے، کم از کم ان لوگوں کو ضرور سہولت ہوجائے گی جن کی پہاڑوں میں زمینیں ہیں۔“

”ترپان کے ہر یوگر خاندان کی پہاڑوں میں زمین ہے۔ ہم یہاں برسوں سے رہ رہے ہیں۔ اگر کوئی بیجنگ کا رہنے والا احمق یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہم سے زیادہ ان زمینوں کے بارے میں معلوم ہے تو ہمیں بھی اس کے غرور سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

”بالکل!“ لوپین نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے پاس بھی کچھ زمین ہے؟“

”ہاں، میری زمین جنوبی ڈھلوان کے ساتھ ہے، لیکن میں کئی سالوں سے وہاں نہیں گیا کیونکہ وہ بالکل بے مصرف ہے، وہاں نہ تو سبزہ اگتا ہے اور نہ ہی کسی پھل کی کاشت ہوسکتی ہے۔“

”ممکن ہے کہ کانکن کمپنیاں اس سے کچھ فائدہ حاصل کرسکیں۔ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح کسی کمپنی کو وہاں کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے!“

”انہیں اس زمین سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور وہ کچھ عرصہ بعد وہاں سے چلی جائیں گی۔ اس کے عوض جو رقم ملے گی وہ میری ضروریات کے لیے ناکافی ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ اس رقم سے تمہیں اپنی بیٹیوں کا جہیز بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔“

”مجھ جیسے لوگ صرف کام کرکے ہی زندگی کی گاڑی گھسیٹتے رہتے ہیں۔ ہماری زندگی میں آرام وسکون نہیں ہوتا۔“ صادق نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم جس سڑک کی بات کررہے ہو۔ اسے تو گھاٹی کے دوسری طرف سے گزرنا تھا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ایسی صورت میں کمیشن کو گھاٹی کے پار کی زمین خریدنا پڑتی لیکن نئے منصوبے میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ شہر کی حدود میں کمیشن کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ کسی عمارت کو ناکارہ قرار دے کر اسے مسمار کردے۔ اسی لیے اب سڑک کا روٹ تبدیل کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیا گیا ہے۔"

"ایسی صورت میں روڈ کمیشن کو عام لوگوں کے بجائے ہاؤسنگ کمیشن کو زمین کی قیمت کی ادائیگی کرنا ہوگا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟" صادق نے قیاس آرائی کی۔

لوپین نے شطرنج پر نظریں جمائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے شک ہے کہ اس صورت حال سے ہاؤسنگ کمشنر وو چن فائدہ اٹھا سکتا ہے کیونکہ روڈ کمشنر بینگ جی کے ساتھ اس کے تعلقات کسی سے پوشیدہ نہیں۔"

"مصطفیٰ صادق۔" لوپین نے شطرنج کی بساط سے نظریں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم ان دونوں پر بدعنوانی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی عمارت کو منہدم کر کے اپنی جیبیں بھر لیں جس سے لوگوں کی جذباتی وابستگی ہے کیا وہ نہیں جانتے کہ یوریفر، چین کی سب سے بڑی ثقافتی اقلیت ہیں۔"

"اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں لیکن تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ ہمارے جوانوں کے سینوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ نوجوان عموماً ایسی ہی جذباتیت کا مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔"

"ممکن ہے کہ ایسا ہوتا ہو لیکن یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اگر ابلیکی کے مکان کو نقصان پہنچا تو ترپان کے لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے۔"

"میں نے بھی ایسی بات سنی ہے۔ تم ایک سمجھ دار اور تجربہ کار شخص ہو۔ کیا تم بھی اس پر یقین رکھتے ہو؟"

"ہاں اگر کمشنر کو نہ روکا گیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اگر وہ میئر کا بھتیجا نہ ہوتا تو اسے اس کام سے روکا جا سکتا تھا۔" صادق نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ میئر کا لاڈلا نہیں ہے۔"

"معاف کرنا اگر یہ بات نہ ہوتی تو میئر اس مکان کو ناکارہ قرار دینے کی کارروائی روک سکتا تھا لیکن اس نے اب تک ایسا نہیں کیا۔"

صادق نے لوپین کی پیالی میں مزید چائے ڈال دی۔ لوپین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ "میئر ایک سیاسی آدمی ہے اور اس کے بھی کچھ عزائم ہیں لہٰذا وہ کمشنر وو چن کو انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ کمشنر کے صوبائی حکومت میں بڑے مضبوط تعلقات ہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ اگر کسی طرح کمشنر کو اس ارادے سے باز رکھا جائے تو میئر کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"کیا واقعی؟" صادق نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ اس بات کو ترجیح دے گا اور مجھ جیسے لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا ایک ہی حاکم ہونا چاہیے، میں نے ہمیشہ بزرگوں کی عزت کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترپان کے بپھرے ہوئے نوجوان بھی تمہاری عزت کرتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔" صادق نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ نوجوان اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تو پولیس کو بھی جوابی کارروائی کرنا پڑے گی جس کے نتیجے میں ان کا مستقبل اور زندگی تباہ ہو سکتی ہے۔"

"ایسا ہو سکتا ہے۔"

"میں ترپان کی سڑکوں پر خون خرابا ہوتے نہیں دیکھ سکتا، اگر کسی ایک نوجوان کو بھی نقصان پہنچا تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ میں اس معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں ان بدمعاشوں سے بھی بات کرنے کے لیے تیار ہوں جنہوں نے گزشتہ رات ہنگامہ کیا تھا۔"

"کیا تم یہی بات کہنے کے لیے یہاں آئے تھے؟" صادق نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں ہمیشہ کی طرح تمہارے ساتھ شطرنج کھیلنے آیا تھا۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم بہت احتیاط سے منصوبہ بندی کرنے والے شخص ہو لیکن بعض اوقات تم آگے کا نہیں سوچتے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" لوپین نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" صادق نے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"یہ بتاؤ کہ جب تم میرے ساتھ شطرنج کھیلتے ہو تو ہمیشہ میری ہی جیت کیوں ہوتی ہے؟"

"اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ احتیاط سے بنایا ہوا منصوبہ بھی بعض اوقات کامیاب نہیں ہوتا اور دوسری یہ کہ شاید یہ بھی میرے منصوبے کا حصہ ہو کہ تمہیں ہی جیتنا چاہیے۔"

☒☒☒

اس شام علاقے کے سات نوجوان مصطفیٰ صادق کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دکان پر جمع ہوئے۔ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے اس لیے اس کے بلانے پر چلے آئے، مصطفیٰ نے ان کی خاطر چائے اور خشک میوے سے کی۔ سراغ رساں لوچین نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، اس کا ہاؤسنگ کمشنر کے منصوبے پر کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ اس کی وجہ سے ان کے اپنے لیے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس نے ان نوجوانوں کو دیگر ممکنہ راستے اختیار کرنے کے بارے میں تجاویز دیں۔ ان نوجوانوں کے دل میں بھڑکتی آگ کے شعلے ان کی آنکھوں میں لرز رہے تھے۔ لوچین نے ان کے لیڈر کو ایک دو مرتبہ براہ راست مخاطب کیا تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اس کا نکتہ سمجھ گیا ہو۔ اس کے علاوہ ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

جب سراغ رساں لوچین کا لیکچر ختم ہوا تو وہ سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اس خاطر تواضع کے لیے مصطفیٰ صادق کا شکریہ ادا کیا اور لوچین سے نظریں ملائے بغیر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد صادق نے دروازے کی طرف دیکھا اور لوچین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ تمہاری باتوں کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔''

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ اتنا کافی ہے۔'' صادق ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک غریب دکان دار ہوں، مجھ جیسا چھوٹا انسان اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔''

''ہاں'' لوچین نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں ہی معمولی لوگ ہیں اور ان بدمعاشوں کو سمجھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔''

⊠⊠⊠

دو دن بعد ایک بار پھر مصطفیٰ صادق کی دکان کا دروازہ کھلا اور سراغ رساں لوچین نتھنے سکیڑتا ہوا اندر داخل ہوا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کررہا ہو۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا جہاں مصطفیٰ صادق ایک گاہک کے ساتھ مصروف تھا۔ اس بوڑھی عورت نے ناگواری سے لوچین کو دیکھا اور اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ لوچین نے جیب سے رومال نکال کر اپنی گردن کا پسینا پونچھا اور اس عورت کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''اس وقت تم نے بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔'' وہ صادق کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میرا مطلب ہے کہ تم نے اس عورت کی موجودگی میں مجھے دیکھ کر دوست کا نعرہ نہیں لگایا۔''

''لگتا ہے کہ تمہارے معمولات تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔ پچھلی بار تم میری توقع سے پہلے آگئے تھے اور آج تو مجھے تمہارے آنے کی بالکل بھی امید نہیں تھی۔'' وہ چائے کی کیتلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

''میں شطرنج کھیلنے یا چائے پینے نہیں آیا بلکہ میرے پاس ایک خبر ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں بھی بتادوں۔''

''اچھا تو بتاؤ، میں سن رہا ہوں۔''

''گزشتہ شب ایک مائننگ کمپنی کے دفتر میں توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے گئے، تمام کاغذات بکھرے پڑے ہیں اور دیواروں پر نعرے لکھے ہوئے ہیں۔''

''کیا کوئی بدمعاش پکڑا گیا؟''

''نہیں میرے دوست۔'' لوچین نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔''

''تمہارا خیال ہمیشہ درست ہوتا ہے۔'' صادق بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم اصل مجرموں تک پہنچ جاؤ گے۔''

اگلی صبح سراغ رساں ہاؤسنگ کمشنر وو چن کے دفتر میں خود ہی پیش ہوگیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کے برعکس کمشنر کا دفتر ائر کنڈیشنڈ تھا۔ کمشنر وو چن نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے پسینے میں شرابور لوچین کو اپنے سامنے دیکھ کر ناک سکیڑ لی۔ شاید اسے لوچین کا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''اس طرح حاضر ہونے کی معذرت چاہتا ہوں۔'' لوچین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا پھر اس نے رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''آج بہت گرمی ہے۔''

''یہ صحرائی علاقہ ہے۔'' کمشنر نے تلخی سے کہا۔ ''اور جب تک ہمارا تبادلہ کسی شہر میں نہیں ہوجاتا۔ ہمیں یہاں کے ناخوشگوار حالات کو برداشت کرنا ہوگا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ڈھال لو۔''

''اسی لیے مجھے ترقی دے کر سراغ رساں بنادیا گیا ہے تاکہ میں سادے کپڑوں میں رہ کر کام کرسکوں۔ یونیفارم کی وجہ سے بڑی بے عزتی ہوتی تھی۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' کمشنر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے یہ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وردی میں تمہاری بے عزتی ہوتی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق تم مقامی لوگوں

میں اچھا خاصا وقت گزارتے ہو۔ تم ان کی زبان روانی سے بولتے ہو۔ ان کے ساتھ ہوٹلوں میں بیٹھ کر شطرنج کھیلتے اور ان کی دکانوں پر جاتے ہو۔ اس سے صرف ایک ہی سوال ذہن میں آتا ہے کہ تمہاری وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں۔''

لوچین سے فوراً ہی کوئی جواب نہ بن پڑا پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ایک پولیس والے کی سرگرمیوں سے کمشنر کو بھی دلچسپی ہوسکتی ہے اور مجھے تمہاری رائے جان کر افسوس ہوا۔ میں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد اپنے آپ کو شہر کے حالات اور واقعات سے باخبر رکھنا تھا جو کہ میرے فرائض کا حصہ ہے لیکن تمہاری باتیں سننے کے بعد ایسا لگ رہا ہے کہ شاید میں غلطی پر تھا۔''

کمشنر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے پاس ایسی اطلاعات ہیں جن کے بارے میں تمہیں یقین ہے کہ ان سے مجھے دلچسپی ہوسکتی ہے، اگر ایسی کوئی بات ہے تو شروع ہوجاؤ۔''

''جی ہاں بالکل۔'' لوچین نے احتیاط سے اپنا رومال تہ کیا اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے یہ خبر سن لی ہوگی کہ دو دن پہلے گولڈن چانس مائننگ اینڈ منرل کمپنی کے دفتر کو تباہ کردیا گیا تھا۔''

''نہیں۔ میں ایسے مسائل میں الجھا ہوا تھا جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سو فیصد پولیس کیس ہے۔''

''جی ہاں۔ لوچین نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ایک شہری نے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور مجھے اس کی تفتیش کے لیے بستر چھوڑ کر جائے واردات پر جانا پڑا۔ کیونکہ میں ان نعروں کو پڑھ سکتا ہوں جو دیواروں پر لکھے ہوئے تھے۔ ایسے مواقع پر میرے ذہن میں تمہاری طرح یہ سوال اٹھتا ہے کہ میں نے یہ زبان کیوں سیکھی تھی۔ بہرحال میں نے وہ نعرے پڑھ لیے جو ان کے ہیرو ابلیکی کی شان میں لکھے گئے تھے۔''

''ابلیکی!'' کمشنر ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''وہ جاہل ٹھگ جو صدیوں پہلے ایک خستہ حال قبیلے میں چلا گیا تھا اور ان کی بھیڑیں چرالیں۔ اس لحاظ سے تو وہ بہت ہی خوش قسمت ہے کہ لوگ آج بھی اس کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔''

''تم جو چاہے کہہ لو۔ یہ حقیقت ہے کہ یہاں کے لوگ اسے دیوتاؤں کی طرح پوجتے ہیں۔ بہرحال میں نے صورت حال کا جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہوئی۔ میں نے باوردی پولیس والے بھی ان بدمعاشوں کو تلاش کرنے کے لیے بھیجے۔''

''کیا وہ کسی کو پکڑنے میں کامیاب ہوسکے؟''

''بدقسمتی سے نہیں۔ انہوں نے کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑا جس کے ذریعے ان کی شناخت ہوسکے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ میں نے اس جگہ کی حفاظت کا بندوبست کردیا ہے، جب تک کمپنی کے عہدے دار نہیں آجاتے ہم وہاں کی نگرانی کرتے رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے، سب کام قانون کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔ بہرحال میں بہت مصروف ہوں، تم جلد از جلد اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔''

''بہتر جناب۔'' لوچین نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنی جیب سے دو مڑے ہوئے کاغذ نکالے اور انہیں کھول کر میز پر پھیلا دیا اور ہاتھ پھیر کر ان کی شکنیں دور کرنے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے کپڑوں پر استری کر رہا ہو۔ اس نے گولڈن چانس کمپنی کے لیٹر ہیڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں وہاں اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہا تھا تو مجھے بکھرے ہوئے کاغذات کو سمیٹنے کا خیال آیا۔ اس دوران اچانک ہی میری نظر اس کاغذ پر چلی گئی، گو کہ اخلاقاً مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن تجسس سے مجبور ہوکر میں نے اسے پڑھنا شروع کردیا اگرچہ میں ایک پولیس والا ہوں اور مجھ میں اتنی اہلیت نہیں کہ ان معاملات کو سمجھ سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ رپورٹ ان معدنی ذخائر کے بارے میں ہے جن کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔''

کمشنر نے لمحہ بھر کے لیے لوچین کو گھورا پھر کاغذ پر نظریں جمادیں۔ پہلے اس کا انداز سرسری تھا لیکن ابتدائی سطور پڑھنے کے بعد اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے دونوں صفحات ختم کرنے کے بعد انہیں دوبارہ غور سے پڑھا پھر اس نے لوچین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اس رپورٹ میں تو حیرت انگیز انکشاف کیا گیا ہے اور اس کے مطابق مصطفیٰ صادق کی زمین میں سونا موجود ہے۔''

لوچین نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں نے بھی اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم جیسے عالم فاضل شخص نے بھی اس کی تصدیق کردی۔''

کمشنر تلخ لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کمپنیاں شاید ان پہاڑوں میں تانبا اور لوہا تلاش کررہی ہیں۔''

''جی ہاں، اس رپورٹ سے پہلے کسی کو بھی یہ معلوم

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں تھا کہ تریان کی نزدیکی پہاڑیوں میں سونے کے ذخائر موجود ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارا اس معاملے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم جیسا انتہائی مصروف اور ذمے دار شخص اپنی حدود سے باہر نکل کر نہیں سوچ سکتا۔"

"ظاہر ہے۔"

"لیکن شاید تم گولڈن چانس کمپنی کی شہرت سے واقف نہیں ہو۔ وہ قابل اعتبار لیکن انتہائی محتاط لوگ ہیں اور اس رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کریں گے جب تک کہ اس کی تصدیق نہ ہوجائے۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" کمشنر نے پوچھا۔

"میں کان کنی کے طریقۂ کار کے بارے میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ کام شروع کرنے سے پہلے مزید چھان بین ضرور کریں گے اور جب انہیں پورا یقین ہوجائے گا کہ اس زمین میں سونا موجود ہے تبھی وہ آگے بڑھیں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

لوپین نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "میں نے دوران تعلیم تھوڑا بہت علم معدنیات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے اس رپورٹ میں دیے گئے اعداد و شمار کو سمجھ سکتا ہوں اور جب گولڈن چانس کمپنی کو یقین ہوجائے گا تو وہ اس زمین کو حاصل کرنے کے لیے مصطفیٰ صادق کو معقول معاوضہ دے سکتی ہے۔"

کمشنر دو چین لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مصطفیٰ صادق کو ابھی تک اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"جی ہاں وہ اپنی زمین پر سونے کی موجودگی کے بارے میں لاعلم ہے۔"

"کیا تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو؟"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور اس سے میرے برسوں پرانے تعلقات ہیں۔ پچھلے دنوں میری اس سے زمین کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ صادق نے مجھے بتایا کہ پہاڑیوں میں اس کی خاندانی زمین ہے جہاں وہ برسوں سے نہیں گیا اور اس نے ایک مائننگ کمپنی کو وہاں معدنیات تلاش کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہورہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

"نہیں جناب۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ میں صرف ایک پولیس والے کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں اور اگر کوئی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کرے تو اس کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس توڑ پھوڑ کے نتیجے میں کمپنی کے دفتر کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی حالت درست ہونے اور معمول کے مطابق کام شروع ہونے میں ایک ہفتے سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔"

کمشنر نے دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا انہیں اس رپورٹ کی گمشدگی کا علم نہیں۔"

"یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن بکھرے ہوئے کاغذات اور دفتر کی حالت دیکھ کر انہیں اس رپورٹ کے غائب ہوجانے کا شبہ نہیں ہوگا۔"

"یہ ایک کارآمد کاغذ ہے اور کوئی بھی ہوشیار شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"بالکل۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" سراغ رساں لوپین نے معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ تم یہ کاغذ میرے پاس لے کر کیوں آئے ہو؟" کمشنر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "ہم دونوں نے کبھی اکٹھے کام نہیں کیا اور نہ تم میرے ماتحت رہے ہو۔ تم سیدھے مصطفیٰ صادق کے پاس کیوں نہیں گئے جس سے تمہارے دوستانہ تعلقات ہیں اور جس زمین کو وہ بے وقعت سمجھتا ہے اس میں چھپے ہوئے خزانے کے بارے میں اسے کیوں نہیں بتایا، تم دوسرے لوگوں اور خاص طور پر مجھے اس میں کیوں شامل کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ مصطفیٰ صادق اتنا بے وقوف نہیں ہے، اگر میں نے اس سے کوئی بات کی تو وہ ضرور سوچے گا کہ ایک پولیس والے کو اس کی زمین سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے جبکہ حال ہی میں وہ مجھے بتا چکا ہے کہ وہ بے کار زمین ہے۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ وہاں سے کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے اور پھر وہ گولڈن چانس کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ اگر تم نے کوئی پیشکش کی تو وہ جان جائے گا کہ یہ زمین قیمتی ہے؟"

"ہاں۔"

"اگر میں کوئی پیشکش کروں تب بھی وہ یہی سوچے گا جبکہ وہ مجھے نہیں جانتا اور نہ ہی میں اس کا دوست ہوں کہ وہ مجھ پر بھروسا کر سکے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"پھر مجھے اس معاملے میں کیوں شامل کر رہے ہو کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ سرکاری فنڈ استعمال کرکے مصطفیٰ صادق سے یہ زمین منہ مانگے داموں خرید لوں اس امید پر کہ گولڈن چانس کمپنی مجھے اس کی زیادہ قیمت دے گی یا شاید تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس زمین کو ناکارہ قرار دے دوں۔ تم ایک پولیس والے ہو اور ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں میرے اختیارات شہر کی حد تک ہیں۔ اس سے باہر کی جائداد کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"جی جناب۔ میں یہ بات جانتا ہوں اور آپ سے متفق ہوں کہ اس زمین کو ناکارہ قرار دینا ممکن نہیں اور نہ ہی تم اسے خرید سکتے ہو۔"

"پھر میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟" کمشنر غصے سے دہاڑا۔

"میری یہ نیت ہرگز نہیں تھی جناب۔ جیسا کہ تم نے خود کہا کہ کوئی ہوشیار شخص ان معلومات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ تم اس سلسلے میں منفرد پوزیشن رکھتے ہو۔"

"وہ پوزیشن کیا ہوسکتی ہے؟" کمشنر دانت بھینچتے ہوئے بولا۔

"یہ محض ایک خیال ہے۔ ممکن ہے کہ تم اس سے اتفاق نہ کرو لیکن اس کے لیے تمہیں یا کمیشن کو کوئی قیمت ادا نہیں کرنا پڑے گی بلکہ تم اپنی سرکاری حیثیت میں مصطفیٰ صادق کو اس زمین کے بدلے وہ کچھ دے سکتے ہو جس کی اسے شدت سے خواہش ہے۔"

▭▭▭

اسی روز سہ پہر میں مصطفیٰ صادق کو ہاؤسنگ کمشنر کے دفتر سے بلاوا آگیا۔ اس کے پڑوسیوں کی خواہش تھی کہ وہ جانے سے انکار کردے۔ ہاؤسنگ کمشنر بے شک بڑا افسر تھا لیکن اس کے پاس پولیس کے اختیارات نہیں تھے اور وہ مصطفیٰ صادق کو اپنے دفتر آنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا لیکن مصطفیٰ صادق نے کہا۔ "مجھے تجسس ہوگیا ہے۔ کمشنر کو میرا نام کیسے معلوم ہوا، وہ ایک معمولی دکاندار سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟" اس کے پڑوسیوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا لہٰذا وہ خاموش ہوگئے۔ مصطفیٰ صادق نے لباس تبدیل کیا اور کمشنر کے دفتر کی جانب روانہ ہوگیا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

وہاں وہ سراغ رساں لوپین کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے اور اسی سلسلے میں مجھے یہاں بلایا گیا ہے۔''

لوپین کے کچھ کہنے سے پہلے کمشنر نے اسے رعب دار آواز میں بیٹھنے کا حکم دیا اور بولا۔ ''سراغ رساں لوپین یہاں سرکاری حیثیت میں نہیں بلکہ اسے میں نے ترجمان کے طور پر بلایا ہے تاکہ تم بہ آسانی اپنی زبان میں گفتگو کر سکو۔''

''حیرت ہے کہ ہاؤسنگ کمیشن کے پاس اپنا ترجمان بھی نہیں ہے۔'' مصطفیٰ صادق بڑبڑاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا لیکن اس کی نظریں لوپین کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''مصطفیٰ صادق۔'' کمشنر نے بھاری آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلایا ہے کہ تمہاری زمین کے بارے میں کچھ بات کر سکوں۔''

صادق نے پلکیں جھپکائیں اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں میری زمین سے یکایک کیوں دلچسپی ہو گئی؟ اس علاقے میں اور بھی زمینیں ہیں۔ یہ ان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گولڈن چانس کمپنی نے تمہاری زمین میں سونا دریافت کیا ہے اور میں تم سے وہ زمین خریدنا چاہتا ہوں۔''

لوپین نے اس کا ترجمہ مقامی زبان میں کرنا چاہا لیکن صادق اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری زمین میں سونا ہے؟''

''ہاں میرے پاس یہی اطلاع ہے۔'' کمشنر نے کہا۔

''حیرت ہے، تمہیں یہ اطلاع کہاں سے مل گئی جبکہ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''

''ایک سرکاری افسر اور عام دکان دار میں یہی فرق ہوتا ہے۔'' کمشنر فخریہ انداز میں بولا۔ ''ہمارے پاس جو اطلاعات ہوتی ہیں وہ تم لوگوں تک دیر سے پہنچتی ہیں۔''

صادق نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے سچ مانے لیتا ہوں۔ کیا واقعی وہ سونا تمہارے لیے بہت اہم ہے؟''

کمشنر نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ظاہر ہے ورنہ میں تمہیں یہاں کیوں بلاتا۔ میں فالتو شخص نہیں جو بلاوجہ اپنا وقت ضائع کروں۔''

صادق نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں لیکن یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف ہے اور میں اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری آبائی زمین جسے ہمیشہ سے بے کار سمجھا جاتا رہا اچانک ہی قیمتی ہو گئی۔'' یہ کہہ کر اس نے سر ہلایا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ کمشنر نے چونک کر لوپین کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''یہ ایک مقامی کہاوت ہے کہ چھپکلی کو سانپ بننے میں ہزاروں سال لگ جاتے ہیں۔''

''ہاں۔'' صادق مسکراتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ لو۔ بالآخر ایسا ہو ہی گیا۔''

کمشنر ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''ہم یہاں سانپ اور چھپکلی پر گفتگو نہیں کر رہے بلکہ میں تمہاری زمین خریدنے کی پیشکش کر رہا ہوں۔''

صادق کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ زمین بیچنے کے لیے یہ مناسب وقت نہیں ہے۔ مجھے کم از کم اتنا وقت تو ملنا چاہیے کہ میں اس زمین سے ملنے والے متوقع فائدے کے بارے میں غور کر سکوں۔ ہمیں گولڈن چانس کمپنی کی تجاویز کا انتظار کرنا چاہیے، اگر تم اس کے بعد کی صورت حال پر بات کرنا چاہو گے تو مجھے دوبارہ یہاں آنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

کمشنر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ گولڈن چانس کمپنی کے مقابلے میں میری پیشکش تمہارے لیے زیادہ اطمینان بخش ہو گی۔''

''ممکن ہے لیکن مجھے معلوم تو ہو جائے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔''

''نہیں صادق، تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''لیکن جناب اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو......''

''پہلے میری پیشکش سن لو۔ تم اپنی زمین مجھے دے دو۔ اس کے عوض میں تمہارے ہیرو ابلیکی کا مکان واپس کر دوں گا۔''

حیرت کے مارے صادق کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے سراغ رساں لوپین کی جانب دیکھا جس نے اس کی سہولت کے لیے کمشنر کے الفاظ مقامی زبان میں ترجمہ کر کے بیان کر دیے۔

''اچھا!'' صادق نے یوں سر ہلایا جیسے پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ وہ متشکرانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ ایک فیاضانہ پیشکش ہے۔ میں شکر گزار ہوں کہ ہاؤسنگ کمیشن نے تسلیم کر لیا کہ میری قوم کے لیے ابلیکی کا یہ مکان کتنا قیمتی ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟'' کمشنر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم نے خود کہا کہ یہ ایک فیاضانہ پیشکش ہے۔ میں تمہیں ایک ایسی زمین کے عوض جس کی قیمت کا تعین ہونا ابھی باقی ہے، وہ چیز لوٹا رہا ہوں جو تمہاری قوم کے لیے انمول ہے۔''

''جناب!'' صادق مودبانہ انداز میں بولا۔ ''تم نے اس مکان کی قدر و قیمت کے بارے میں جو کچھ کہا وہ بالکل سچ ہے۔ ہمارے لیے اس یادگار کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا لیکن میری بھی تین بیٹیاں ہیں اور مجھے ان کی شادیاں کرنا ہیں، اس زمین پر ان کا بھی حق ہے اور میں اسے محض ایک ثقافتی ورثہ کے عوض فروخت نہیں کر سکتا۔''

''صادق!'' کمشنر کے جواب دینے سے پہلے لوپین بول پڑا۔ ''کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ابلیکی کے گھر پر قوم کے ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔''

''ہاں۔'' صادق نے کہا۔ ''اسی لیے مجھے فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ ایک حق کو حاصل کرنے کے لیے دوسرے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس سے کس طرح اتفاق کروں۔''

''اگر تم نے ایسا کیا تو اپنی قوم کی نظروں میں ہیرو بن جاؤ گے۔'' کمشنر نے کہا۔ ''گو کہ یہ ذاتی نوعیت کا معاملہ ہے لیکن میں سب پر ظاہر کر دوں گا کہ مجھے تم نے اس بات پر راضی کیا کہ ابلیکی کے مکان کو منہدم کرنے کے بجائے ثقافتی ورثہ کے تحفظ کی تنظیم کے حوالے کر دیا جائے۔''

صادق افسردگی سے بولا۔ ''یہ میرے لیے اطمینان کی بات ہے لیکن میں نہیں سمجھتا......''

کمشنر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم اس پر راضی نہ ہوئے تو میں سب کو بتا دوں گا کہ مصطفیٰ صادق کے پاس ابلیکی کے مکان کو بچانے کا موقع تھا لیکن اس نے لالچ کی وجہ سے اسے ضائع کر دیا۔''

صادق کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑے گا۔ تم صرف اس امید پر میری پیشکش ٹھکرا رہے ہو کہ گولڈن چانس کمپنی تمہیں اس سے بہتر پیشکش کر سکتی ہے لیکن وہ تمہیں پیسوں کے سوا کیا دے سکتے ہیں اور اس کا مطلب یہی ہوا کہ تم چند سکوں کی خاطر اپنی قوم کے ہیرو ابلیکی کے مکان کا سودا کر رہے ہو۔''

''لیکن ابلیکی کے مکان سے میرا کیا تعلق ہے؟'' صادق حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہاری پوری قوم اس مکان سے گہری عقیدت اور جذباتی تعلق رکھتی ہے اور وہ سب لوگ اس مکان کو منہدم کرنے کے فیصلے پر خاصے مضطرب ہیں۔ میں نے جو پیشکش کی ہے۔ اس کے بعد اس مکان کی قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں آ گیا ہے پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

یہ سن کر صادق کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ بے بسی سے کمشنر کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تمہاری قوم کے لوگوں کو جب یہ بات معلوم ہو گی تو وہ تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے؟''

''نہیں۔'' صادق سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔''

''ان کا ردعمل اس سے بھی زیادہ شدید ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے یہ موقع ضائع کر دیا۔''

''لیکن میری بیٹیاں...... اگر میں نے اپنی قوم کی خاطر یہ قربانی دے دی تو میری بیٹیوں کا کیا بنے گا۔ جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہو سکے گی۔ ان کے بچے اس زمین سے ہونے والی آمدنی سے محروم ہو جائیں گے۔ تمہیں اس بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔''

''سر!'' سراغ رساں لوپین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ایک تجویز ہے۔''

''وہ کیا؟'' کمشنر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ صادق بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بوڑھے دکاندار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہاری زمین میں سونا نہ ہوتا تب بھی تم کسی نہ کسی طرح اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرتے۔''

''لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔'' مصطفیٰ صادق نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہاں سونا نہ ہوا تو......'' لوپین نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تب بھی مجھے اس زمین کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ملنی چاہیے۔'' صادق نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''ستر ہزار کافی ہوں گے۔'' لوپین نے سرگوشی کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جسے کمشنر نے سن لیا اور وہ غصے سے بولا۔

"کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں یہ زمین پیسے دے کر خریدوں؟"

"جی ہاں۔" لوپین نے مودبانہ انداز میں کہا۔

"بہت خوب۔ زمین کی قیمت بھی ادا کروں اور اس کے ساتھ ہی ایلیکی کے مکان کو منہدم کرنے کے بجائے تاریخی ورثہ کے طور پر محفوظ بھی کر لیا جائے۔"

"ستر ہزار کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔" لوپین نے کہا۔ "اور جب اسے تینوں لڑکیوں میں تقسیم کیا جائے گا تو ہر ایک کے حصے میں بہت معمولی رقم آئے گی لیکن اس طرح کم از کم ان کی عزت نفس تو قائم رہے گی اور ان کی شادیاں آسانی سے ہو سکیں گی۔" پھر اس نے مصطفیٰ صادق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس سودے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لیکن وہ سونا......" صادق نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"بھول جاؤ اسے اور نہ ہی کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہے۔ تم اپنی زمین ہاؤسنگ کمشنر کو فروخت کر رہے ہو جو اس علاقے میں رہنے اور جائداد بنانے کا خواہش مند ہے۔ لوگوں کی تسلی کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس سودے کی وجہ سے کمشنر کے ساتھ تمہارے تعلقات قائم ہو گئے اور اس نے تمہاری سفارش پر ایلیکی کے مکان کو مسمار کرنے کے بجائے تاریخی ورثہ کے تحفظ اور بحالی کے کمیشن کے حوالے کر دیا ہے اور اس طرح لوگوں کے دل میں تمہاری وقعت بڑھ جائے گی۔"

لوپین کی تقریر ختم ہوئی تو کمشنر نے صادق سے پوچھا۔ "کیا تم اس معاہدے کے لیے تیار ہو؟"

صادق نے سراغ رساں لوپین کی طرف دیکھا پھر کمشنر کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔"

ایک ہفتہ بعد صادق کو لوپین کی شکل نظر آئی۔ وہ اس کی دکان کے دروازے پر کھڑا متجسس نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا صادق نے اسے دیکھتے ہی آواز لگائی۔ "اندر آجاؤ، وہاں کیوں رک گئے؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری دکان میں میرے لیے گنجائش ہے یا نہیں۔" وہ کاؤنٹر کے پاس آ کر بولا۔ "گزشتہ ایک ہفتے کے دوران تم سے کم از کم چھ مرتبہ ملنے کی کوشش کی مگر ہر بار تمہیں لوگوں کے ہجوم میں گھرا ہوا پایا۔"

"بس یہ لوگوں کی محبت ہے کہ وہ مسلسل اظہار ممنونیت کے لیے چلے آرہے ہیں۔"

"تم نے اپنی قوم کی بہت بڑی خدمت کی ہے پھر کیوں نہ وہ اس کا اعتراف کریں۔" لوپین نے رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

"اور تمہاری بیٹیاں...... وہ بھی یقیناً بہت خوش ہوئی ہوں گی۔"

"وہ تمہاری بہت شکر گزار ہیں۔ بڑی لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ علم معدنیات میں ڈگری لینا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے رہی ہے کیونکہ اس کے منگیتر کو بھی اس ڈگری کی وجہ سے اچھی ملازمت مل گئی ہے۔"

"ہاں۔ آج کل اس مضمون کی بہت مانگ ہے۔" لوپین نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خود بھی اس سے بہت دلچسپی ہے لیکن میرے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑتا۔ پولیس والا جو ٹھہرا۔"

صادق نے کندھے اچکائے اور چائے بنانے کے ارادے سے کیتلی کی جانب بڑھا لیکن لوپین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بولا۔ "میں اس لیے آیا تھا کہ اگر تمہیں لوگوں کی مبارکباد وصول کرنے سے فرصت مل گئی ہو تو کیوں نہ ہم کہیں باہر چل کر بیٹھیں تاکہ تمہیں تفریح کے چند لمحات میسر آسکیں۔ یہاں تو لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہو سکتی۔"

"میں تمہاری دعوت رد نہیں کر سکتا۔ ایک منٹ ٹھہرو، میں شطرنج لے کر آتا ہوں۔"

صادق نے ٹوپی سر پر رکھی اور دکان کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کی بغل میں شطرنج کا بکس دبا ہوا تھا۔ اس نے دکان بند کی اور لوپین کے ہمراہ ٹی ہاؤس کی جانب چل دیا۔ راستے میں اس نے لوپین سے پوچھا۔

"کمشنر کا کیا حال ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ گزشتہ ملاقات کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

ٹی ہاؤس پہنچ کر لوپین نے نسبتاً ایک الگ تھلگ گوشہ منتخب کیا اور وہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ ٹی ہاؤس میں موجود لوگوں نے صادق کو دیکھ کر دائیں ہاتھ کا انگوٹھا فضا میں بلند کیا جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہے ہوں لیکن لوپین کی وجہ سے کوئی اس کے قریب نہیں آیا۔ صادق نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کاؤنٹر پر بیٹھے چائے خانے کے مالک کو اشارہ کیا تو وہ اس کے احترام میں خود ہی چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صادق نے میز پر شطرنج کی بساط بچھائی اور مہرے ترتیب سے رکھنے لگا۔ لوچین نے بھی اس کی تقلید کی۔ صادق نے ادھر ادھر دیکھا اور محتاط انداز میں بولا۔ ”لوچین، تم ہمیشہ آگے کی سوچتے ہو۔ بتاؤ جب کمشنر کو یہ معلوم ہوگا کہ اس زمین میں سونا نہیں ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟“

لوچین نے ایک بسکٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے تو اسے گولڈن چانس کمپنی کی نااہلی پر غصہ آجائے گا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود انہوں نے اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا اور وہ اس اندرونی کشمکش میں مبتلا ہوجائے گا کہ وہ اس چوری شدہ رپورٹ کو ظاہر کرے یا نہیں کیونکہ ایسی صورت میں اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ رپورٹ اس کے ہاتھ کیسے لگی، ظاہر ہے کہ وہ اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتا لہٰذا وہ یہی چاہے گا کہ اس رپورٹ کا تذکرہ کسی سے نہ کرے۔“

”آخر وہ کب تک انتظار کرے گا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے کوئی عملی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔“ صادق نے کہا۔

”ممکن ہے کہ جب اس کی بے صبری حد سے زیادہ بڑھ جائے تو وہ اپنے طور پر خفیہ طریقے سے کمپنی کے کسی ذمے دار فرد سے رابطہ کرے۔ وہ اس رپورٹ کا موازنہ اپنے ریکارڈ سے کریں گے جس سے معلوم ہوجائے گا کہ تمہاری زمین میں سونا ہے یا نہیں اور اگر یہ ثابت ہوگا کہ وہ رپورٹ جعلی ہے تو کمشنر کا غصہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے گا۔“

”وہ تم پر اپنا غصہ اتارے گا کیونکہ تم ہی وہ کاغذ لے کر اس کے پاس گئے تھے؟“

”ہاں، ایسی صورت میں میری ذمے داری بڑھ جائے گی، مجھے ان بدمعاشوں کو تلاش کرنا ہوگا جنہوں نے کمپنی کے دفتر پر حملہ کیا اور وہاں یہ جعلی رپورٹ پھینک کر چلے گئے۔ میں کمشنر کو یقین دلا دوں گا کہ پولیس ان مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں ضرور لے کر آئے گی۔“

”سب سے پہلے تو وہ تم پر ہی شبہ کرے گا کہ تم نے ایک جعلی رپورٹ پر بھروسا کیا اور اسے لے کر کمشنر کے پاس چلے گئے۔ کیا یہ تمہاری حماقت نہیں تھی؟ مجھے لگتا ہے کہ کہیں وہ تمہارا دشمن نہ بن جائے۔ اگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو تب بھی اسے کسی کو موردِ الزام تو ٹھہرانا ہی ہوگا۔“

”میں ایک پولیس والا ہوں اور علم معدنیات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ رپورٹ اصلی تھی یا نقلی اور جہاں تک کمشنر کا تعلق ہے تو میرے خیال میں وہ زیادہ عرصہ یہاں نہیں رکے گا۔ آج کل بدعنوان افسروں کے خلاف پولیس کارروائی کر رہی ہے اور ہم نے مائننگ کمپنیوں کو خبردار کردیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہیں جو ذاتی فائدے کے لیے اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں اور جعلی کاغذات کے ذریعے کمپنیوں سے بھاری رقومات وصول کر رہے ہیں۔ اگر کمشنر نے زیادہ شور شرابا کیا تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس پر الزام آسکتا ہے کہ اس نے یہ جعلی رپورٹ بنوا کر کمپنی سے مالی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

باتوں باتوں میں لوچین نے غلط چال چل دی اور اسے مات ہوگئی۔ مصطفیٰ صادق بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”مانتا ہوں کہ تم ایک ہوشیار سراغ رساں ہو لیکن شطرنج کے کھیل میں مجھ سے نہیں جیت سکتے۔ دیکھ لو تمہیں مات ہو ہی گئی۔“

لوچین مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اپنے دوست کو کیا بتاتا کہ اس نے کمشنر جیسے شاطر انسان کو شہ مات دے دی تو اس کے لیے شطرنج کی بازی جیتنا کیا مشکل تھا۔ وہ یہ راز اپنے سینے میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا کہ اسی نے گولڈن چانس کمپنی کے دفتر کے معائنے کے دوران بکھرے ہوئے کاغذات میں سے سادہ لیٹر ہیڈ چرایا اور اس پر مصطفیٰ صادق کی زمین کے بارے میں جعلی رپورٹ ٹائپ کردی جس میں سونے کے ذخائر کی موجودگی کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ہی علم معدنیات سے دلچسپی تھی اور جانتا تھا کہ رپورٹ میں کیا لکھتا ہے کیونکہ یہ ابتدائی نوعیت کی کارروائی تھی۔ اس لیے اسے اعداد و شمار کا سہارا لینا نہیں پڑا۔ پھر وہ یہ رپورٹ لے کر کمشنر کے پاس گیا اور اسے زمین خریدنے کی ترغیب دی۔ اس کے بدلے کمشنر نے ابلیچی کے مکان کو منہدم کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اس طرح مصطفیٰ صادق کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا بلکہ اسے اپنی بیٹیوں کے جہیز کے لیے کچھ رقم بھی مل گئی۔ وہ اپنے دوست کی مدد کرنا چاہتا تھا اور اس نے جو بے ایمانی کی تھی، اس پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ لوچین نے چائے کی پیالی اٹھائی اور صادق کی پیالی سے ٹکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری کامیابی کے نام۔“

مصطفیٰ صادق کو بالکل بھی اندازہ نہ ہوسکا کہ شطرنج کے کھیل میں اس سے ہارنے والا کتنا بڑا کھلاڑی ہے۔

خواجہ ابومحمد چشتی کی عمر پینسٹھ سال کی ہوچکی تھی اور ان کی بہن عصمت خاتون چالیس سال پورے کرچکی تھیں لیکن شادی دونوں ہی نہیں کرسکے تھے۔ خواجہ ابومحمد ذکرِ الٰہی میں ایسے ڈوبے کہ انہیں کسی اور چیز کا خیال ہی نہ رہا اور عصمت خاتون نے اپنے درویش بھائی کی خدمت کو خود پر فرض کرلیا۔ وہ سوچتیں اگر میں شادی کرلوں گی تو بھائی کی خدمت کون کرے گا۔

خواجہ محمد اپنی نیک اور پرہیزگار بہن کو دیکھتے تو بڑا دکھ ہوتا۔ انہوں نے کئی بار بہن پر زور دیا کہ شادی کرلو مگر بہن نے ہر بار انکار کردیا۔

آخر بھائی نے زیادہ زور دیا اور شادی پر اصرار کیا، بولے۔ ”عصمت! آخر تو شادی کیوں نہیں کرتی؟“

عصمت خاتون نے جواب دیا۔ ”بھائی! اگر میں شادی کرلوں گی تو آپ کی خدمت کون کرے گا؟“

بھائی نے کہا۔ ”تو میری خدمت نہ کر۔ اب میں تجھ سے خدمت نہیں لوں گا۔“

بہن نے نظریں جھکائے رکھیں، جواب دیا۔ ”بھائی! ہمارے خاندان کی نسل آپ سے چلے گی۔ میں اگر شادی کر بھی لوں گی تو اس سے کسی اور شخص کی نسل چلے گی، شادی تو آپ کو کرنا چاہیے تھی۔“

عارف کامل

ضیا تسنیم بلگرامی

تیرگی خواہ آس پاس ہو یا دلوں کے اندر... رستہ چلنے والے ٹھوکر ضرور کھاتے ہیں... ایسے میں اگر کوئی روشن ضمیر سہارا بن جائے تو منزل تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے۔ عارفانہ کلام کے شیدائی ابو یوسف بھی ایک ایسے ہی ولی کامل تھے جن کی ایک بھرپور نگاہ دلوں میں حشر بپا کردینے کے لیے کافی تھی۔ آپ اپنے ماموں ابو محمد چشتی کے سجادہ نشین ٹھہرے اور بے شمار انسانوں کو فیضِ عام پہنچایا۔

علم کے سمندر میں غوطہ زن ایک کامل ولی کی روداد حیات

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھائی نے کہا۔ ”میں بھی کرلوں گا شادی۔ بس ذرا حکم ربی کا منتظر ہوں۔“

بہن نے جواب دیا۔ ”اس حکم ربی کی میں بھی منتظر ہوں۔“

ابو محمد چشتی سوال و جواب سے تنگ آکر چپ ہو رہے اور یہ مسئلہ کئی دن کے لیے ٹل گیا۔

آخر ایک رات، ابو محمد چشتی نے اپنے باپ شیخ ابو احمد چشتی کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو سرزنش کی اور کہا۔ ”ابو محمد! تو عصمت خاتون کی شادی کردے۔“

خواجہ ابو محمد نے جواب دیا۔ ”پدر بزرگوار! میں نے عصمت پر کئی بار یہ دباؤ ڈالا کہ وہ شادی کرلے لیکن وہ شادی پر آمادہ ہی نہیں ہوتی۔ اب میں اس کو کس طرح راضی کروں؟“

باپ نے کہا۔ ”یہ کام تیرا ہے کہ تو اپنی بہن کو شادی پر آمادہ کرے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب عصمت کی شادی ہو جانا چاہیے۔ میں اسے بھی ہدایت کر رہا ہوں۔“

خواجہ ابو محمد نے جواب دیا۔ ”بابا جان! آپ ہی اس مشکل کو حل فرمائیں۔ میں تو بے بس ہو چکا ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”اچھا تو اٹھ کر عصمت سے اس موضوع پر بات کر وہ راضی ہو جائے گی۔“

خواجہ ابو محمد نے پوچھا۔ ”حضرت! اب اس چالیس سالہ خاتون سے شادی کون کرے گا؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”جا، مغرب کا سفر اختیار کر، دوران سفر سید محمد سمعان نامی سیدزادہ تجھ کو ملے گا۔ بس یہی شخص تیری بہن کا شوہر ہوگا۔“

ابو محمد نے بیداری کے بعد فوراً اپنی بہن سے ملاقات کی اور کہا۔ ”عصمت! میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اب تم شادی کرلو کیونکہ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔“

بہن نے حیا و شرم سے جواب دیا۔ ”ہاں، اب میں شادی کے لیے تیار ہوں کیونکہ میں مرحوم بابا جان کے حکم کے خلاف نہیں جاسکتی۔ انہوں نے آج خواب میں مجھے حکم دیا ہے کہ میں شادی کرلوں۔“

ابو محمد خوشی سے از خود رفتہ سے ہو گئے اور دوسرے دن علی الصباح مغرب کی طرف کوچ کیا۔ کئی دن کی تلاش اور جستجو کے بعد انہیں محمد سمعان نامی سیدزادے مل گئے۔ وہ بھی ابو محمد کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں کا تعارف ہوا اور محمد سمعان، ابو محمد کے ساتھ ان کے گھر چلے آئے۔ یہاں عصمت خاتون سے ان کی شادی کردی گئی۔ شادی کے بعد بہن نے کہا۔ ”بھائی! اب میں آپ کو بھی مجبور کروں گی کہ سنت نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے شادی کرلیں۔“

ابو محمد نے مسکرا کر کہا۔ ”بہن! ذرا بتانا تو سہی اس وقت میری کیا عمر ہوگی؟“

بہن نے جواب دیا۔ ”یہی کوئی پینسٹھ سال۔“

ابو محمد نے فرمایا۔ ”اب اس عمر میں، میں شادی کرلوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟“

بہن نے جواب دیا۔ ”لوگ کچھ بھی کہیں گے، آپ تو سنت نبوی ﷺ پوری کریں گے۔“

ابو محمد نے فرمایا۔ ”عصمت خاتون! اگر مجھے دنیا کی شرم نہ ہوتی تو میں قطعی شادی کرلیتا۔“

بہن نے کہا۔ ”بھائی! آپ کو دنیا کی شرم کا تو بڑا خیال ہے لیکن رسولؐ کی شرم کا ذرا بھی خیال نہیں۔ میں تو آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ کل قیامت کے دن، جب رسول مقبول ﷺ آپ سے یہ پوچھیں گے کہ تو نے میری شادی والی سنت پر عمل کیوں نہیں کیا تو آپ کیا جواب دیں گے؟“

ابو محمد نے ذرا جز بز ہو کر پوچھا۔ ”لیکن اس شادی سے مجھے کوئی فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے؟“

بہن نے فوراً جواب دیا۔ ”ہاں کیوں نہیں، شادی کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے آپ کی نسل چلے گی۔ آپ اپنا سجادہ نشین یا نائب چھوڑ سکیں گے۔“

ابو محمد نے معنی خیز ہنسی میں جواب دیا۔ ”بہن! تو سخت غلط فہمی میں ہے۔ شادی کے بعد نہ تو مجھ سے نسل چلے گی اور نہ ہی میرا سجادہ نشین یا نائب پیدا ہوگا۔ میرا خلیفہ تو تیرے بطن سے پیدا ہوگا عصمت خاتون۔“

بہن نے شرما کر دریافت کیا۔ ”میرے بطن سے؟ یعنی میرا بیٹا آپ کا نائب اور سجادہ نشین ہوگا؟“

ابو محمد نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے جو کچھ کہہ دیا...... کہہ دیا۔ تو ایک ایسے یگانہ روزگار بچے کی ماں بنے گی کہ چہار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بجے گا۔“

بہن کا خوشی سے حال ہی کچھ اور ہو گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر دریافت کیا۔ ”بھائی! کیا سچ؟“

”عصمت خاتون! میں جھوٹ نہیں بولتا۔“

پھر ابو محمد نے بہن کے اصرار اور سنت نبوی ﷺ کے احترام میں شادی کرلی۔ لوگ ہنسے بھی لیکن انہیں تو رسول ﷺ کی سنت پر عمل کر کے دکھانا تھا۔

☆☆☆

سال بھر کے بعد عصمت خاتون کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش کی خبر ابو محمد کو ملی تو بھاگ کر اپنی بہن کے پاس پہنچے اور انہیں مبارک باد دی۔ بہن نے کمزور آواز میں مبارک بادی کا شکریہ ادا کیا اور بھائی سے کہا۔ ”بھائی! یہ آپ ہی کا بیٹا ہے میں نے تو عرصہ پہلے یہ منت مانی تھی اور یوں بھی آپ یہ بشارت دے چکے ہیں کہ میرا بیٹا آپ کا جانشین ہوگا۔ یہ کتنا خوش قسمت ہے کہ میرے ولی بھائی کی جانشینی کا شرف حاصل کرے گا۔“

ابو محمد نے نومولود کے کان میں اذان دی اور فرمایا۔ ”میں نے تیرا نام ابو یوسف رکھا۔“ پھر بہن سے فرمایا۔ ”بہن اب یہ نومولود ابو یوسف ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ میرا جانشین ہوگا۔ اس کی پرورش اور تربیت بھی اسی نہج سے ہوگی۔“ بہن کا خوشی سے حال ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔

ابو یوسف اپنے ماموں ابو محمد کی نگرانی میں پرورش پا رہے تھے۔ ابو محمد کے مواعظ ان کے کان میں پڑ رہے تھے اور یہ کان کی راہ سے دل و دماغ میں اترتے چلے جا رہے تھے۔ ابو محمد کی پوری کوشش یہ تھی کہ انہیں جو کچھ بھی معلوم ہے اس کو اپنے بھانجے میں منتقل کردیں۔ ابو یوسف بھی حیرت انگیز طور پر اکتساب کر رہے تھے۔ انہیں غربا اور فقرا سے محبت تھی اور امرا سے تو دور دور ہی رہتے تھے۔ ولی ماموں اپنے ولی بھانجے کی ایک ایک بات پر نظر رکھتے تھے۔

ابو محمد شاندار وعظ کہہ رہے ہوتے اور ابو یوسف اس میں یوں گم ہو جاتے کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ کچھ عرصے بعد شیخ ابو یوسف نے اپنی ماں کے پاس سکونت اختیار کی۔ باپ کی بھی یہی خواہش تھی کہ بیٹا ان کے پاس ہی رہے۔ یہ اپنے والدین کے پاس رہنے لگے مگر بہن کو یہی فکر دامن گیر رہتی کہ ان کے بیٹے ابو یوسف کو اپنے ماموں ابو محمد کی مریدی کا شرف حاصل کرنا ہے۔ آخر ماں نے اپنے بیٹے کو ٹوک دیا، کہا۔ ”ابو یوسف! میرا خیال ہے اب تجھ کو اپنے ماموں کے پاس چلے جانا چاہیے۔“

ابو یوسف نے جواب دیا۔ ”میں تو اپنے ماموں کے پاس کافی رہ چکا ہوں، میرا خیال ہے کہ اب وہاں جانا فضول ہے کیونکہ مجھے جو اکتساب کرنا تھا، کرچکا۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹے! توبہ کر توبہ، یہ کیسی بات کہہ دی تو نے۔ تو نے اپنے ماموں سے سب کچھ کس طرح اکتساب کرلیا۔ شاید تجھ کو اپنے ماموں کی بزرگی اور علمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔“

ابو یوسف نے سادہ لوحی سے عرض کیا۔ ”ماں! گستاخی معاف، ماموں آپ کے بھائی ہیں۔ اس لیے آپ انہیں اس سے زیادہ سمجھتی ہیں جتنے وہ ہیں لیکن میں انہیں کچھ زیادہ بڑا عالم نہیں سمجھتا۔“

ماں کے لیے یہ باتیں ناقابل برداشت تھیں، بولیں۔ ”مجھ کو تجھے اپنے پاس بلا کر نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے تجھے یہاں رکھ کر غلطی کی ہے۔ افسوس تو اپنے فاضل اور بزرگ ماموں کے پاس کافی وقت گزار چکا ہے مگر تو ان کے مرتبے اور مقام سے ابھی تک لاعلم ہے۔“

ابو یوسف ماں کی افسردگی سے آزردہ ہو گئے، بولے۔ ”ماں! آپ آزردہ نہ ہوں۔ میں نے آپ سے جو کچھ بھی کہا اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں آپ کو دکھ پہنچاؤں۔ میں نے سچ سچ وہ ساری باتیں کہہ دیں جو میرے دل میں تھیں کیونکہ میں ریاکاری نہیں جانتا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”اچھا، اب تو اپنے ماموں کے پاس جا اور ان سے بیعت کر۔ اب میں تیری زبان سے ایسی کوئی بات بھی نہیں سننا چاہتی جس سے سوء ظنی کی بو آتی ہو۔“

فرماں بردار بیٹے نے بے چون و چرا ماں کے حکم کی تعمیل میں گھر چھوڑ دیا اور اپنے ماموں کے پاس چلے گئے لیکن ان کے دل میں اپنے ماموں کے علم و فضل کے بارے میں اب بھی شکوک موجود تھے اور انہیں خود بھی اس کا علم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

ابو یوسف اپنے ماموں کے پاس پہنچے تو ابو محمد نے انہیں بغور دیکھا اور پوچھا۔ ”اے ابو یوسف! کیا بات ہے؟ تو فکر مند کیوں نظر آتا ہے؟“

ابو یوسف نے رک رک کر جواب دیا۔ ”ماموں! مجھے ماں نے آپ کے پاس بیعت کے لیے بھیجا ہے۔“

ابو محمد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”تیری ماں نے تو تجھے بیعت کی خاطر میرے پاس بھیج دیا لیکن تیرا دل یہ وسوسہ تو رشک و شبہے میں گرفتار ہے۔“

ابو یوسف نے گھبرا کر عرض کیا۔ ”ماموں! خدا کے لیے میرے دل سے وسوسوں کو دور فرما دیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

ابو محمد نے نہایت شفقت سے اپنے قریب کرلیا اور سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ ”ابو یوسف میرے بچے تو کس وہم و گمان میں ہے۔ کرتا کچھ میں نہیں آتا کہ تیرے دل میں وسوسے آتے ہی کیوں؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابو یوسف کو رونا آ رہا تھا، بولے۔ ”ماموں! میرے سینے کو وسوسوں سے پاک کر دیجیے۔“

ابو محمد نے جواب دیا۔ ”یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ تو مجھ سے سوال کر میں ان کے جواب دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو تیرے سوال اور میرے جواب تیرے دل کو پاک صاف کر دیں گے۔“

ابو یوسف نے بے معنی سا سوال کر دیا۔ ”ماموں! یہ مسواک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

ابو محمد نے مسواک پر زبان کھولی تو ایک گھنٹے تک اس پر تقریر کرتے رہے۔ ابو محمد کی تقریر کا انداز اتنا دل نشین اور پراثر تھا کہ ابو یوسف کو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا اور ان کا دل اپنے ماموں کے علم و فضل کا قائل ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد ابو یوسف نے پوچھا۔ ”ماموں! کچھ لباس کے بارے میں ارشاد فرمائیں؟“

ابو محمد نے لباس پر تقریر شروع کی تو اس پر بھی ایک گھنٹا صرف ہو گیا۔ لباس، لباس کا مفہوم، اہل دنیا کا لباس، تارک دنیا کا لباس، محبوب کا لباس، عاشق کا لباس، آخرت کا لباس غرضیکہ لباس کو اتنے شرح و بسط اور ایک دوسرے سے مختلف معانی و مطالب کے ساتھ بیان کیا کہ ابو یوسف پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، بولے۔ ”ماموں! بس کیجیے میرا دل شک و شبے سے پاک ہو گیا، وسوسے دور ہو گئے۔ اب آپ اس ناچیز کو مرید کر لیجیے۔“

ابو محمد نے اپنے بھانجے کو مرید کر لیا اور تلقین کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ابو یوسف! میں نے تجھ کو ناصر الدین کا خطاب دیا۔ اب تو ابو یوسف بھی ہے اور ناصر الدین بھی۔ تو اے ناصر الدین! سارا علم صرف خدا کو ہے، بندہ اسی حد تک جانتا ہے جس حد تک خدا تعلیم فرما دیتا ہے۔ بے شک وہی علیم و خبیر ہے۔“

پھر فرمایا۔ ”اے ناصر الدین! آ، میں تجھے کچھ اور سیر کرا دوں۔“

ابو یوسف دم بخود اپنے ماموں کے ارشادات اور اشارات پر بے چوں و چرا عمل پیرا تھے۔ جواب میں کہا۔ ”ارشاد ماموں! فرمایے، کیا ارشاد ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”ناصر الدین! سات بار میرا نام تو لے۔“

ابو یوسف نے سات بار ابو محمد، ابو محمد دہرایا اور اپنے ماموں کی صورت دیکھنے لگے۔

ابو محمد نے فرمایا۔ ”اب تو آسمان کی طرف دیکھ۔“

ابو یوسف نے آسمان کی طرف دیکھا تو انہیں وہ کچھ نظر آنے لگا جو اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ درمیان کے سارے حجابات دور ہو چکے تھے۔

اب انہوں نے حکم دیا۔ ”اے ناصر الدین! اب ایک بار پھر سات بار میرا نام لے۔“

ابو یوسف نے ایک بار پھر ان کا نام سات بار لیا۔ ابو محمد نے حکم دیا۔ ”اب زمین کی طرف دیکھ۔“

ابو یوسف نے جیسے ہی زمین کی طرف دیکھا۔ تحت الثریٰ تک ان کی نظروں میں آ گیا۔ درمیان کے سارے حجابات دور ہو چکے تھے۔

اس کے بعد آپ نے ابو یوسف کو اسم اعظم سکھایا۔ ابو محمد نے یہ اسم اعظم حضرت خواجہ خضرؑ سے سیکھا تھا۔ اسم اعظم کے سیکھتے ہی تمام علوم لدنی اور اسرار ربانی ان پر ظاہر ہو گئے۔

اس کے بعد ابو محمد نے اپنا خرقہ اپنے بھانجے کو پہنا دیا اور خلافت اور اجازت سے سرفراز فرما کر اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ اس کے بعد فرمایا۔

”اے ناصر الدین! اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے اس لیے تمہارے لیے ضروری ہے کہ فقر و فاقہ اختیار کرو اور فقیروں کی ہم نشینی میں وقت گزارو۔ تمام فقرا کے سردار رسول مقبول ﷺ ہیں اس لیے ہم پر ان کی پیروی فرض ہے۔“

اس کے بعد ابو یوسف نے چار سال تک گوشہ نشینی اختیار کی۔ آپ عبادت و ریاضت میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ تین چار فاقوں کے بعد صرف تین لقمہ کھانا کھاتے اور کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ لباس میں جگہ جگہ پیوند لگے تھے۔

آپ کو محفل سماع سے بڑا لگاؤ تھا۔ آپ کی محفل سماع میں ہر شخص شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں فقرا، علما اور مشائخ کو شریک ہونے کی اجازت تھی لیکن اگر سماع کے دوران میں کوئی دنیادار شخص شریک محفل ہو جاتا تو فوراً سماع رکوا دیتے پھر اس دنیادار کے چلے جانے کے منتظر رہتے اور وہ جیسے ہی جاتا آپ دوبارہ محفل سماع کو گرم کروا دیتے اور اگر کوئی دنیادار اصرار کر کے محفل سماع میں موجود ہی رہتا تو آپ اس کی موجودگی میں سماع شروع کروا دیتے اور اس کے بعد جو اس دنیادار کا حشر ہوتا، وہی جانتا۔ محفل کے اختتام تک یہ دنیادار یا تو پاگل ہو جاتا یا پھر مجذوب ہو جاتا اور دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا۔

ابھی آپ کی عمر صرف بیس سال تھی۔ آپ نے سیر و سیاحت شروع کر دی تھی۔ ایک دن آپ اسی طرح گھوم پھر رہے تھے کہ انہیں

ایک محل دکھائی دیا۔ یہ آہستہ آہستہ اس محل کی طرف بڑھے۔ محل کی امیرزادی سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے اس کو دیکھ لیا پھر محل کے دربان کی طرف بڑھے اور اس سے پوچھا۔ ”اے شخص! تو اس محل میں کیا کرتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں اس محل کا دربان ہوں کچھ ارشاد فرمائیں گے؟“

آپ نے امیرزادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا تو اس لڑکی سے واقف ہے؟“

دربان نے ہنس کر جواب دیا۔ ”حضرت! واقف ہونا کیا معنی، یہ میرے آقا کی بیٹی ہے۔ میری آقازادی۔ کیا میری آقازادی سے کوئی کام ہے؟“

ابو یوسف نے بے نیازی سے کہا۔ ”اپنے آقا کو خبر کر دے کہ ایک درویش اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

دربان سوچ میں پڑ گیا کہ وہ ابو یوسف کا پیغام اپنے آقا تک پہنچائے یا نہ پہنچائے۔

آپ نے پوچھا۔ ”تو سوچنے کیا لگا؟“

دربان نے جواب دیا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا کیا جواب دوں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں تجھ سے اپنی بات کا جواب نہیں چاہتا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے اپنے آقا کے گوش گزار کر دے۔“

دربان ڈرا سہما ہوا اندر چلا گیا۔ اس درویش کے تیور اور لہجے میں معلوم نہیں کیا بات تھی کہ دربان نہ چاہنے کے باوجود اس کی تعمیل پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آقا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آقا نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تو یہاں کیوں چلا آیا؟“

دربان نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ ”حضور والا! ایک درویش آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ پھر ذرا شرما کر عرض کیا۔ ”افسوس کہ اس نے آقازادی کو معلوم نہیں کس طرح دیکھ لیا جو وہ اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔“

آقا کو غصہ آ گیا۔ وہ مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”وہ کون نامعقول ہے جو میری بیٹی کے بارے میں مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اسے۔“

دربان نے عرض کیا۔ ”تو پھر آپ میرے ساتھ آئیں۔“

دونوں آگے پیچھے چل کر ابو یوسف کے سامنے جا پہنچے۔ آقا نے نوجوان درویش کو ذرا غور سے دیکھا اور اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس درویش میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو غیر معمولی تھی۔

آقا نے سعادت مندانہ سوال کیا۔ ”ہاں جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا تھا؟“

ابو یوسف نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے تجھے یوں یاد کیا تھا کہ تیرے محل میں، میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ معلوم نہیں تیری نظر میں وہ حسین ہے بھی یا نہیں لیکن میں نے اسے اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔“

آقا کو درویش کی بات پر غصہ تو بے حد آیا لیکن ضبط و برداشت سے کام لیا۔ ابو یوسف نے مزید کہا۔ ”اے شخص! میں تیری لڑکی کو پسند کرنے لگا ہوں۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ اسے تو میرے حوالے کر دے۔“

امیر نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! میرے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی کہ میں اپنی بیٹی کو آپ کی زوجیت میں دے دوں لیکن پھر بھی بشریت کا تقاضا یہ ہے کہ میں آپ کی پیش کش پر اچھی طرح غور کر دوں اور آپ مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔“

ابو یوسف نے کہا۔ ”مجھ سے بات صاف صاف کر۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے پاس ایک آدمی بھیج رہا ہوں، وہ آپ سے بات کرے گا۔“

ابو یوسف نے فرمایا۔ ”وہ آدمی مجھ سے کیا بات کرے گا؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”آپ کی خواہش کے موضوع پر باتیں کرے گا۔“

ابو یوسف نے فرمایا۔ ”بیٹی تیری ہے اس پر اختیار تیرا ہے اور بات کرے گا کوئی اور شخص، خوب!“ پھر ارشاد فرمایا۔ ”اب اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے تیرا مطلب پا لیا، اچھا خدا حافظ۔“

آپ وہاں سے چلے آئے۔ آقا ادھر سے مطمئن ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد آقا کو اطلاع ملی کہ اس کی بیٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آقا بھاگا بھاگا اپنی بیٹی کے پاس پہنچا۔ وہ پیٹ کے درد سے تڑپ رہی تھی۔

آقا نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ اس کو کیا ہو گیا؟“

لڑکی کی ماں نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیا ہو گیا۔ خدا کے لیے اس کو کسی معالج کو دکھاؤ۔ ہائے میری بچی، خدا رحم کرے۔“

آقا نے ایک ساتھ کئی معالج بلوا لیے اور لڑکی کا علاج شروع ہو گیا لیکن علاج کے ساتھ ہی اس کے درد میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

آقا کو ایک دم ابویوسف کا خیال آگیا۔ وہ بدحواس بھاگتا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور اپنی بپتا سنائی۔ آپ نے فرمایا۔ ''بھائی! اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں کیا کرسکتا ہوں؟''

آقا نے عاجزی سے کہا۔ ''حضرت! میں اس کو آپ سے منسوب کردوں گا۔ خدا کے لیے اس کے حق میں دعا فرمادیجیے۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔''

آپ نے نرمی سے سمجھایا۔ ''یہ تیری غلط فہمی ہے ورنہ تیری بیٹی کی بیماری کا مجھ سے کیا تعلق؟''

آقا نے کہا۔ ''لیکن میں کس طرح مان لوں آپ کی بات۔ خدا کے لیے آپ دعا کردیجیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اے عاقبت نااندیش امیر! اگر تو سننا ہی چاہتا ہے تو سن لے۔ میں نے جب تیری بیٹی کو دیکھا تھا تو میں نے اس کے چہرے پر اس بیماری کو بھی دیکھ لیا تھا چنانچہ میں نے فوراً ہی اپنے رشتے کی بات اس لیے کی تھی کہ اگر وہ میرے لیے محرم ہوجاتی تو میں اس کو اپنے سامنے بٹھا کر اپنے رب سے درخواست کرتا کہ میری زندگی کا نصف اس کو مرحمت فرمادے اس طرح وہ مزید زندگی پاجاتی لیکن اب ایسا نہیں ہوسکتا، تو اس پر صبر کرلے۔''

آقا رونے لگا اور اپنی عاقبت نااندیشی پر افسوس کرنے لگا۔ جب وہ گھر پہنچا تو پتا چلا کہ اس کی بیٹی کا انتقال ہوچکا ہے۔ پورے محل میں ایک کہرام برپا تھا۔

☆☆☆

آپ اپنی عمر کے چھتیسویں سال میں داخل ہوگئے تو کسی نے بتایا کہ آپ کے پیرومرشد ماموں ابومحمد کا آخری وقت ہے۔ آپ ان سے ملاقات کرلیں۔

ابویوسف اس خبر کو سن کر اپنے ماموں کے پاس چلے گئے۔ ابومحمد نے اپنے بھانجے کو شفقت کی نظر سے دیکھا اور اپنے پاس بٹھالیا۔ نحیف آواز میں پوچھا۔ ''ابویوسف کیسی گزر رہی ہے؟''

ابویوسف نے جواب دیا۔ ''اچھی گزر رہی ہے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

ابومحمد نے فرمایا۔ ''ابویوسف! میں زندگی بھر تجھے نصیحتیں کرتا رہا ہوں۔ ممکن ہے بعض نصیحتیں تجھے گراں بھی گزری ہوں۔''

ابویوسف نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ ''نہیں ماموں جان، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے تو آپ کی ہر بات اور ہر نصیحت کو حرزِ جان سمجھ کر قبول کیا ہے۔''

ابومحمد نے فرمایا۔ ''خدا تجھے صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ کیا تو جانتا ہے کہ میں تجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟''

ابویوسف نے جواب دیا۔ ''غیب کا علم تو صرف خدا کو ہے۔ آپ ارشاد فرمائیں گے تو میں بھی جان لوں گا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔''

ابومحمد نے فرمایا۔ ''اپنا کان میرے منہ کے پاس لا کیونکہ میری قوتِ گویائی دوری کی متحمل نہیں ہوسکے گی۔''

ابویوسف نے اپنا ایک کان ان کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ابومحمد نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''اے ناصرالدین! میں ایک بار پھر تجھے یہی نصیحت کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ تیرے لیے یہ ضروری ہے کہ تو فقر و فاقہ اختیار کر اور فقیروں کی صحبت میں رہ، کیونکہ تمام فقرا کے سردار حضرت سرورِ کائنات ﷺ ہیں۔ ہمارے جملہ پیر دستگیر فقرا ہی کے زمرے میں تھے اور ہم پر ان کی پیروی فرض ہے۔''

ابویوسف نے جواب میں رقت زدہ لہجے میں عرض کیا۔ ''ماموں جان! جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ آپ کی ہر بات اور ہر نصیحت میرے لیے حرزِ جان ہے۔ میں اس پر دل و جان سے عمل پیرا رہوں گا۔''

ابومحمد نے پرسکون لہجے میں فرمایا۔ ''اے ناصرالدین! اب میں سکون سے ہوں، خدا تجھے اپنی امان میں رکھے۔''

کچھ عرصہ بعد ابومحمد کا وصال ہوگیا۔ ابویوسف اس صدمے سے نڈھال ہوگئے۔

ابومحمد کے وصال کے بعد ابویوسف نے گوشہ نشینی اختیار کی اور حجرے میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ حجرے سے بہت کم نکلتے تھے۔ اب آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ لوگ دور دراز علاقوں سے آ آ کر آپ کے حجرے کے سامنے رو پڑتے۔ آپ کو اندر اطلاع دی جاتی کہ فلاں فلاں علاقوں سے اتنے لوگ آئے ہوئے ہیں اور آپ کا دیدار کرنا چاہتے ہیں۔

آپ پوچھتے۔ ''یہ لوگ میرا دیدار کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

اطلاع کرنے والا مطلع کرتا۔ ''اس سوال کا جواب تو وہی لوگ دے سکیں گے جو آپ کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں ابھی ان سے نہیں مل سکتا۔ اگر وہ چاہیں تو دو ہفتے ٹھہر جائیں پھر ملاقات بھی ہوجائے گی۔''

اطلاع دینے والا خاموش ہوگیا اور آپ بے چوں و چرا اٹھ کر باہر تشریف لے گئے اور وہاں اپنے عقیدت مندوں کا ہجوم دیکھ کر

بہت خوش ہوئے باہر سخت گرمی پڑ رہی تھی اور یہاں لوگوں کی سہولت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ گرمی کے دن تھے اور باہر چلچلاتی دھوپ میں لوگ بھوکے پیاسے پڑے ہوئے تھے۔ آپ کو باہر نکلا ہوا دیکھ کر مریدوں اور ارادت مندوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اپنا اپنا دکھ بیان کرنا شروع کردیا۔

ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''پھر تامل کس بات کا؟''

اس نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ خود ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں کس بلا کی گرمی پڑ رہی ہے۔ آپ کے عاشق اس تپتی زمین اور چلچلاتی دھوپ میں بھوکے پیاسے آپ کی زیارت کی امید میں کھڑے رہتے ہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو چاہتا کیا ہے، کچھ بتا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''یہ کہ اگر کھانے کا نہیں تو ٹھنڈے پانی کا انتظام تو ہوجائے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''مگر یہ انتظام ہو تو کس طرح؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''آپ اللہ والے لوگ ٹھہرے جس جگہ عصا ماردیں گے ٹھنڈے پانی کا چشمہ جاری ہوجائے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ کیسی بات کہہ رہا ہے تو۔ خدا کی مشیت میں دخل دے رہا ہے۔ میں کوئی مویشی نہیں ہوں، ایک عام سا بندہ ہوں۔''

مرید نے اصرار کیا۔ ''میں خدا کی مشیت میں کیوں دخل دوں گا آپ اس کے برگزیدہ بندے تو ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں پانی کے چشمے کے لیے دعا کرتا ہوں، ممکن ہے خدا قبول فرمالے۔''

رات گزری...... صبح ہوئی تو ایک معجزہ سب کا منتظر تھا...... قریب ایک بڑے پتھر میں لکیر نمایاں نظر آرہی تھی جہاں سے پانی کا چشمہ ابل رہا تھا پھر یہ پانی فوارے کی طرح ابلنے لگا اور کچھ ہی دیر میں اس فوارے میں اتنی شدت پیدا ہوگئی کہ گویا وہ چشمہ نہیں آبشار تھا۔ لوگ دیوانہ وار چشمے پر جھک گئے اور چلوؤں سے اپنی پیاس بجھانے لگے کوئی وضو کرنے لگا۔

آپ کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے پھر اندر چلے گئے۔ لوگ چشمے میں اس طرح منہمک ہوئے کہ انہیں ابویوسف کے چلے جانے کا بڑی دیر بعد احساس ہوا۔ انہیں بڑی شرمندگی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ ایک ذرا سے پانی کے چکر میں وہ ابویوسف کو کیوں نظرانداز کرگئے۔

یہ ننھا چشمہ اتنی تیزی سے بہتا رہا کہ دوسرے دن وہ ایک شاندار چشمے کی صورت اختیار کرگیا اور آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے اس کے ٹھنڈے پانی کی وجہ سے وہاں مستقلاً سکونت اختیار کرلی۔ کچھ عرصے بعد اس چشمے کا پانی مختلف امراض میں دیا جانے لگا اور خوش عقیدہ لوگ اس سے فائدے حاصل کرتے رہے۔

آپ کے حجرے کے دروازے پر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا تھا۔ آپ اسی پر بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوجاتے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے انہیں معلوم نہیں کیا کام یاد آگیا کہ وہ اٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ آپ کے اٹھتے ہی معلوم نہیں کس طرح یہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر زمین پر آرہا اور پھر یہ ابویوسف کے پیچھے پیچھے لڑھکنے لگا۔ آپ کے مریدوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو حیرت زدہ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

آپ اپنے حجرے سے کافی دور جاچکے تھے اور حجرے کے در کا پتھر آپ کے پیچھے یوں لڑھک رہا تھا گویا کسی نے لڑھکا دیا ہو۔ اس تماشے کو دیکھنے کے لیے مریدوں کی جماعت پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ یہ لوگ آپس میں زور زور سے باتیں بھی کررہے تھے۔ آپ نے اپنے پیچھے لوگوں کی بھنبھناہٹ سی محسوس کی تو پلٹ کر دیکھا۔ ایک مرید نے عرض کیا۔ ''یا پیرومرشد! اس پتھر کو دیکھیے اسے کیا ہوگیا ہے؟''

آپ نے پوچھا۔ ''اس کو کیا ہوگیا ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''یہ آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں؟''

آپ نے لڑھکتے ہوئے پتھر سے کہا۔ ''قف مکانک۔''

پتھر جہاں تک آچکا تھا اور جس انداز میں تھا۔ اسی انداز میں رک گیا۔ ایک عرصے بعد بھی یہ پتھر اسی جگہ اسی حالت میں موجود رہا اور لوگوں کا کہنا ہے کہ بعد میں ابویوسف اور خواجہ خضر یہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

آپ دنیا کی سیر و سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے دورانِ سفر بڑی مشہور علمی اور روحانی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس طرح گھومتے پھرتے ہرات پہنچے۔ یہاں آپ کی شہرت آپ سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ ہرات کے ایک درویش نے آپ کی شاندار پذیرائی کی اور خواہش کی کہ آپ اس کو میزبانی کا شرف بخشیں چنانچہ آپ اس کے مہمان ہوگئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

درویش صبح سے شام تک آپ کی خدمت میں حاضر رہتا اور کسبِ فیض کرتا رہا۔
ایک دن وہ معمول سے پہلے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دونوں ہاتھ ملنے لگا۔
آپ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تو کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں بڑی الجھن کا شکار ہو گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں اور کیا نہ کروں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''الجھن کی کوئی ضرورت نہیں، اصل واقعہ بتا۔ ممکن ہے اس کا کوئی حل نکل آئے۔''
درویش نے شرماتے ہوئے عرض کی۔ ''حضرت! میری لڑکی نے ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ بس اسی خواب نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''تیری لڑکی نے خواب میں کیا دیکھا ہے؟''
درویش بدستور پس و پیش کا شکار تھا، بولا۔ ''حضرت! میں کیا عرض کروں، میں بہت پریشان ہوں۔''
آپ نے ترشی سے فرمایا۔ ''لیکن اس پریشانی کا حاصل؟ میں کہہ جو رہا ہوں کہ تو اپنی پریشانی مجھے تو بتا۔''
درویش نے کہا۔ ''حضرت! میری بیٹی نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ بس اس کی تعبیر سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں، آپ ہی بتائیں اس کی تعبیر؟''
آپ نے دریافت کیا۔ ''تیری بیٹی نے کیا خواب دیکھا ہے؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''اس نے خواب دیکھا کہ چودھویں کا چاند اوپر سے اتر کر اس کی گود میں آ گیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں تجھے اپنی زوجیت میں لینا چاہتا ہوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''پھر اس کی کیا تعبیر نکالی ہے تو نے؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''میں نے اس خواب کی جو تعبیر نکالی ہے اس کو بیان کرنے کی میں ہمت نہیں کر پا رہا ہوں۔''
آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ''پھر بھی، اس میں ہمت کی کیا بات ہے؟''
درویش نے نظریں نیچی کر لیں، بولا۔ ''حضرت! میں لڑکی کا باپ ہوں اگر وہ میری بیٹی نہ ہوتی تو میں بڑی آزادی سے اس خواب کی تعبیر بتا دیتا۔''
آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں تیری تعبیر سے واقف ہوں۔ اب وہ تعبیر مجھ سے سن لے۔ وہ چاند، جو تیری بیٹی کی گود میں گرا ہے، میں خود ہوں۔ تیری بیٹی میری بیوی بنے گی۔ تو اس تعبیر سے خوب واقف ہے لیکن بتاتے ہوئے شرماتا ہے۔''
درویش اور زیادہ شرما گیا، بولا۔ ''بجا فرمایا آپ نے لیکن یہ بات میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب جبکہ آپ بھی وہی تعبیر بتا رہے ہیں جو میرے دل میں تھی تو کیا میں امید کروں کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اے مردِ خدا! میں ہرات میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ میں اپنی متاہلانہ زندگی کے سلسلے میں مشیتِ ایزدی پوری کروں۔ یہ بشارت مجھے بہت پہلے دی جا چکی تھی۔''
درویش فرطِ خوشی سے نیم پاگل ہو گیا، بولا۔ ''حضرت! میں تو کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ جیسے عالی مرتبہ شخص کو اپنی بیٹی کے سلسلے میں خیال تک میں لاؤں۔ کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ کیسی عدمِ اعتمادی کی بات کر رہا ہے۔ میں تیار ہوں۔''
درویش کو معلوم نہیں کیوں اب بھی شبہ تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''حضرت! پھر میں یہ خوش خبری اپنی بیٹی کو بھی سنا دوں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ضروری ہے تو ضرور سنا دے۔''
درویش نے عرض کیا۔ ''یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ خواب بھی اسی نے دیکھا ہے۔ وہ خود بھی اس کی تعبیر جاننے کے لیے بے چین ہے۔''
درویش اندر اپنی بیٹی کے پاس چلا گیا اور اپنی بیٹی سے کہا۔ ''بیٹی! تو نے جس چاند کو خواب میں دیکھا تھا وہ تیرے گھر میں آ چکا ہے اور عنقریب تیری گود میں گر جائے گا۔'' لڑکی شرما گئی۔
کچھ دنوں بعد لڑکی کا عقد ابو یوسف سے کر دیا گیا۔ آپ اپنی دلہن کو لے کر وطن واپس چلے گئے اور کچھ عرصے بعد اس لڑکی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مودود چشتی رکھا گیا اور اس لڑکے نے چشتی خاندان کا نام روشن کر دیا۔ آپ کو سماع سے بڑی دلچسپی تھی۔ جن صوفیا کو موسیقی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ انہیں آپ کے سماع پر بڑا اعتراض تھا۔ اسی عہد کے صوفی خواجہ ابوبکر شبلی کو سماع سے کوئی رغبت نہ تھی اور وہ عموماً سماع سے دور ہی رہتے مگر جب کسی ایسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوتا جس میں ابو یوسف بھی موجود ہوتے تو یہ قوالی ضرور سنتے اور ابوبکر شبلی کے مریدوں کو یہ بات بہت زیادہ گراں گزرتی تھی کہ ان کے پیر و مرشد ایک بلند مقام رکھنے کے باوجود ابو یوسف چشتی کے مسلک کو

اختیار کر لیتے ہیں اور قوالی سننے بیٹھ جاتے ہیں۔
یہ بات ایک عرصے تک چہ میگوئیوں کی شکل میں گونجتی رہی۔ ایک دن چند مریدوں کے ساتھ ابوبکر شبلی، ابو یوسف چشتی سے ملنے گئے۔ اس وقت ابو یوسف چشتی سماع کی محفل میں بیٹھے تھے۔ یہ بھی اپنے مریدوں کے ساتھ محفلِ سماع میں بیٹھ گئے۔ ابھی قوالی شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک مرید نے ابوبکر شبلی کے کان میں کہا۔ ''پیر و مرشد! کیا آپ واپس نہیں جائیں گے؟''
ابوبکر شبلی نے جواب دیا۔ ''واپس کیوں نہیں جاؤں گا لیکن کچھ دیر بعد۔''
مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! محفلِ سماع تھوڑی دیر میں گرم ہو جائے گی، قوالیاں سننا ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔''
ابوبکر شبلی نے جواب دیا۔ ''بھائی! تو ابھی اس بات سے لاعلم ہے کہ میں ابو یوسف کے پاس قوالیاں کیوں سننے لگتا ہوں۔''
مرید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مسلک میں قوالی شامل نہیں ہے۔''
اس سرگوشی کو ابو یوسف چشتی بھی سن رہے تھے۔ ابوبکر شبلی سے پوچھا۔ ''شبلی! یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''
شبلی نے جواب دیا۔ ''حضرت کیا عرض کروں؟ میرا مرید مسلک کی باتیں کر رہا ہے۔''
ابو یوسف نے فرمایا۔ ''اس مرید کو میرے پاس بھیج دو۔''
شبلی نے مرید سے کہا۔ ''اے خوش قسمت انسان! چشتی کے پاس چلا جا۔ تیرے وسوسوں کو وہی دور کریں گے۔''
مرید کو ابو یوسف کے پاس جانے میں تامل ہوا لیکن شبلی نے ذرا سختی سے کہا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ تجھے ابو یوسف چشتی اپنے پاس بلا رہے ہیں۔'' مرید مرعوب ہو کر ابو یوسف کے پاس چلا گیا۔
ابو یوسف نے مرید سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تو شبلی سے کیا کہہ رہا تھا؟''
مرید نے سر جھکا لیا، بولا۔ ''میرے پیر و مرشد اور آپ کے مسلک میں فرق ہے چنانچہ میرے پیر و مرشد کے ارادت مند اپنے مرشد کی اتباع میں سماع پسند نہیں فرماتے اس لیے میں اپنے مرشد سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہم محفلِ سماع میں موجود رہیں گے؟''
ابو یوسف چشتی نے فرمایا۔ ''اگر میں کہوں کہ سماع تیرے مسلک میں ہو یا نہ ہو تجھے سننا پڑے گا تو تو کیا کرے گا؟''
مرید نے جواب دیا۔ ''اگر میرے مرشد مجھے یہ حکم دے دیں گے کہ مجھے محفلِ سماع میں نہیں بیٹھنا ہے تو میں فوراً اٹھ کر چلا جاؤں گا۔''
ابو یوسف نے مسکرا کر فرمایا۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے۔'' اس کے بعد قوالوں کو حکم دیا کہ قوالی شروع کی جائے۔
حکم کا ملنا تھا کہ قوالی شروع ہو گئی۔ ابو یوسف نے شبلی کے مرید سے کہا۔ ''ادھر، میری طرف دیکھ۔''
مرید نے ابو یوسف پر نظریں گاڑ دیں۔ ابو یوسف نے بھی اس کو نہایت جذبے و شوق سے دیکھا۔ ان کی نظروں میں معلوم نہیں کیا اثر تھا کہ مرید تڑپنے لگا اور سماع نے اس سوز اور تڑپ میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد جب ابو یوسف نے اس شخص کو حکم دیا کہ وہ محفلِ سماع سے نکل جائے تو وہ رونے لگا، بولا۔ ''حضرت! اس سوز اور لذتِ عشق کو بجھائیے نہیں۔ میں اس محفل سے نکل کر کہاں جاؤں گا۔''
ابو یوسف نے فرمایا۔ ''سماع سننا تیرے مرشد کے مسلک ہی میں نہیں، تب پھر تو یہاں کیوں موجود ہے؟''
مرید نے وجد میں تڑپ کر جواب دیا۔ ''اے ابو یوسف! باتوں میں الجھا کر میرا مزہ نہ کرکرا کرو۔ اب میں بات تک کرنے کے لائق نہیں ہوں۔'' وہ شخص کئی گھنٹے یوں ہی تڑپتا اور آہیں بھرتا رہا۔
کافی دیر بعد جب قوالیاں ختم ہوئیں اور محفلِ سماع برخاست ہو گئی تو شبلی بھی ہوش میں نہیں آئے۔ ان کا مرید بھی بے حال کسی شرابی کی طرح ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ ابو یوسف نے اپنے ارادت مندوں کو حکم دیا کہ انہیں آرام سے لٹا دیا جائے۔
چنانچہ شبلی اور ان کے مرید کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد شبلی ہوش میں آ گئے اور اسی طرح سر پکڑ کر بیٹھ گئے گویا پورے جسم میں تھکاوٹ ہی تھکاوٹ ہو۔ نڈھال، ہلکان۔
شبلی کے بعد ان کا مرید بھی ہوش میں آ گیا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی ہذیان بکنا شروع کر دیا۔ ''اے ابو یوسف! تم کہاں چلے گئے؟ یہ تم نے میرا کیا حال کر دیا ہے۔''
ابو یوسف نے جواب دیا۔ ''اے شخص ہوش میں آ۔ محفلِ سماع برخاست ہو چکی ہے۔ لوگ جا چکے ہیں، اب تو بھی واپس آ جا۔''
مرید نے عاجزی سے کہا۔ ''اے ابو یوسف! ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری آنکھوں میں، میں نے معلوم نہیں کیسا جلوہ دیکھ لیا تھا کہ ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا اور اسی ایک نظر نے مجھ کو محفلِ سماع میں موجود رہنے کا حوصلہ اور شوق عطا کیا۔ خدا کے لیے وہی نظر اور، ورنہ میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔''
شبلی نے اپنے مرید سے فرمایا۔ ''اے سادہ لوح انسان! تو نے ان آنکھوں کا سحر دیکھ لیا۔ ابو یوسف جس کو بھی نظر بھر کے دیکھ لیں وہ محفلِ سماع سے اٹھ نہیں سکتا۔ ابو یوسف کی نظروں میں معلوم نہیں کون سا سحر ہے جو اس شخص کو بے بس اور مجبور کر دیتا ہے جو ان سے ایک بار

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی نظریں ملالیتا ہے۔"

مرید نے تائید کی۔ "بے شک، بے شک۔ ان نظروں نے میرے سینے میں محبت کی ایک ایسی آگ جلادی ہے جو شاید عمر بھر یوں ہی جلتی رہے۔ اب تو میں اس در کو چھوڑنے سے رہا۔"

شبلی نے ابو یوسف کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ "کیوں، ابو یوسف یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔ تم میرے مریدوں کو توڑنے لگے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "شبلی! جس طرح دین میں کوئی جبر نہیں، اسی طرح ہم صوفیوں کے ہاں بھی کوئی جبر نہیں۔ جس کا جو مسلک اختیار کرنے کو جی چاہے اختیار کرلے۔"

مرید نے پوچھا۔ "اگر میں آپ سے صدق دل سے کہوں کہ آپ مجھ کو اپنا مرید بنالیں تو کیا آپ اس سے انکار کردیں گے؟"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "نہیں، میں انکار تو نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور سوچوں گا کہ ایک پیر کی موجودگی میں کسی دوسرے پیر سے رجوع ہونا کہاں تک جائز ہے؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "ابو یوسف! میرا تو خیال ہی اپنے دل سے نکال دو۔ میں اپنے تمام مریدوں سے کہہ دوں گا۔ وہ میرے علاوہ بھی جس پیر کو چاہیں اپنا بنالیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

مرید نے شکر گزار نظروں سے اپنے مرشد کو دیکھا اور ابو یوسف سے عرض کیا۔ "حضرت! آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ میرے مرشد نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں آپ کی مریدی کا شرف حاصل کرسکتا ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "لیکن میں تجھے مرید نہیں کرسکتا۔"

مرید نے اصرار کیا۔ "آخر کیوں؟ آپ مجھے مرید کیوں نہیں بنائیں گے؟...... اس کا کوئی سبب؟"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ابوبکر شبلی ایک مرشد کامل ہیں۔"

مرید کی حالت غیر تھی، بولا۔ "لیکن حضرت! وہ ایک نظر جس نے مجھے سرتاپا عشق کی آگ میں غوطہ دے دیا تھا۔ وہ نظر کہیں اور کیوں نہیں ملتی؟"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "صرف ایک نظر کی خاطر تو ترک مرشد نہیں کیا جاتا۔"

مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! میں اس لذت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا جو مجھے آپ سے ملی ہے؟"

شبلی نے کہا۔ "ابو یوسف! اگر کوئی مرید آپ کے پاس آئے گا تو میں اس میں خوشی محسوس کروں گا کیونکہ میں ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ عشق اور سوز کی دولت لٹنوں کے پاس ہے جو وہ دوسروں کو عطا کریں گے۔ آپ کی نظروں کا سحر کوئی مجھ سے پوچھے۔ ان نظروں میں معلوم نہیں کیا ہے کہ آدمی مست اور سرشار ہو کر موت تک سے آنکھیں لڑانے پر تیار ہوتا ہے۔"

شبلی کا مرید ابو یوسف کے قدموں میں بیٹھ گیا اور آخری بار خوشامد کی۔ "حضرت! مجھے اپنا مرید کرلیجیے اور مجھے اس لذت اور کیفیت سے مستقلاً آشنا کردیجیے جو آپ کی نظروں کے علاوہ کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔"

ابو یوسف نے شبلی سے کہا۔ "شبلی! تم اپنے اس مرید کو یہاں سے لے کیوں نہیں جاتے؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "جناب! آپ نے اس شخص کو جس مزے اور لذت سے آشنا کردیا ہے اب یہ ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے اس پر رحم کردیجیے۔"

ابو یوسف نے مرید سے کہا۔ "دیکھ! میں نے جو بات ایک بار کہہ دی ہے، وہی زندگی بھر کہتا رہوں گا۔ میں نے جب ایک بار یہ بات بہانگ دہل کہہ دی ہے کہ میں تجھے اپنا مرید نہیں بناؤں گا تو تجھے اپنی ضد سے دستبردار ہوجانا چاہیے۔"

مرید نے درخواست کی۔ "اچھا چلیے، میں آپ کو اس پر مجبور نہیں کرتا کہ آپ مجھے اپنا مرید بنالیں بلکہ میری ذرا سی یہ درخواست ہے کہ آپ مجھ پر ایک بار پھر وہی نظر ڈال دیجیے جس نے مجھے ابھی تک ایک کیف، ایک سرور بخش رکھا ہے۔"

ابو یوسف نے جواب دیا۔ "وہ نظر بار بار نہیں ڈالی جاسکتی۔ ہاں میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب تو میری محفل سماع میں آیا کرے گا تو میں تجھ پر تیری مطلوبہ نظر ڈال دیا کروں گا۔"

مرید اس جواب سے مایوس تو ضرور ہوا مگر ابو یوسف کی بات مان لی اور اپنے پیر و مرشد شبلی کے ساتھ ہی واپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ بڑے اہتمام اور پابندی سے آپ کی محفل سماع میں شریک ہونے لگا۔

☆☆☆

ابو یوسف چشتی کہیں تشریف لے جارہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ ایک عمارت تعمیر ہوتے دیکھی۔ اس کو دیکھ کر قدم خود بہ خود رک گئے لوگوں سے پوچھا۔ "حضرات! یہ کس کا گھر تعمیر ہو رہا ہے؟"

ایک شخص نے جواب دیا۔ "خدا کا گھر، یہ مسجد ہے۔"

آپ نے چند آدمیوں کو شہتیر چڑھاتے دیکھا وہ پوری قوت سے شہتیر کو اوپر لے جانے کی کوششیں کررہے تھے۔ آپ ان کے پاس کھڑے ہوگئے اور شہتیر کے اوپر چڑھائے جانے کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد دس آدمیوں کی مدد سے شہتیر اوپر پہنچادی گئی۔ آپ نے اس کو غور سے دیکھ کر فرمایا۔ "ارے بھائیو! یہ تو غلط رکھی ہے۔ اس کو ایک طرف چار پانچ انگل کھسکنا چاہیے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو......"

آدمی بہت تھکے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔ آپ نے ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ "اے بھائی! ذرا میری ایک بات تو سننا۔" وہ شخص آپ کے پاس چلا گیا۔ آپ نے دیوار پر رکھے ہوئے شہتیروں کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "ابھی کچھ کسر باقی ہے۔ ابھی یہ دیوار پر صحیح طریقے سے نہیں رکھا گیا جو نقصان دہ ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہہ دے کہ اس کا یہ عیب دور کردیں۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "حضرت! اب تو جو ہوگیا سو ہوگیا۔ یہ چار انگل نکلا ہوا شہتیر کہیں اور نہیں جاسکتا کیونکہ ہم دس آدمیوں کا جو حال اس کے چڑھانے اور رکھنے میں ہوا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ شہتیر کو ہلا جلا کر اور زیادہ غلط کردوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اچھا تیری خوشی اگر اسی میں ہے کہ شہتیر جس طرح غلط رکھا ہوا ہے اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے تو اب کوئی اصرار نہیں کیا جائے گا۔"

اس کے بعد آپ دیوار کے اوپر چڑھ گئے اور تن تنہا شہتیر کو ٹھیک کردیا، بولے۔ "جس کام کو میں تنہا کرسکتا ہوں اس کے لیے دوسروں کو کیا تکلیف دی جائے۔"

کئی لوگ نیچے سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اتنے بڑے شہتیر کو ابو یوسف نے اس کی صحیح جگہ پر رکھ دیا اور نیچے آگئے، بولے۔ "میں نقص کو دیکھ سکتا ہی نہیں اور رہی یہ بات کہ میں نے اتنے بڑے شہتیر کو اکیلے کس طرح ٹھیک کرلیا تو اس میں تعجب کی بات ہی کون سی ہے؟ خدا اپنے بندوں ہی سے کام لیتا ہے، معمولی بھی غیر معمولی بھی۔"

آپ کا یہ کارنامہ ایک عرصہ تک زائرین کی زیارت گاہ بنا رہا۔

☆☆☆

آپ کو بچپن میں قرآن پاک حفظ کروانے کی کوشش کی گئی تھی جو کسی نتیجے کے بغیر رک گئی تھی۔ اس کے بعد آپ عبادت اور ریاضت میں اتنے مصروف ہوگئے کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا کافی عمر گزارنے کے بعد بھی آپ کے دل و دماغ میں یہ خلش سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ افسوس قرآن پاک حفظ نہیں کرسکا۔ کئی بار دوبارہ حفظ کی کوشش بھی کی لیکن بات جہاں تھی وہیں رہی آگے نہ بڑھ سکی۔

ایک رات وہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں وعظ فرمارہے تھے۔ موضوع کلام الٰہی اور اس کی برکات تھا۔ آپ دیر تک اس موضوع پر بولتے رہے لیکن وعظ کے دوران میں مستقل یہ احساس طاری رہا کہ ابو یوسف جس موضوع پر تو وعظ کہہ رہا ہے تو خود اس پر پوری طرح حاوی نہیں ہے۔ تو نے تو ابھی تک کلام الٰہی کو حفظ بھی نہیں کیا۔ انہیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ بچپن کا ذہن ہر چیز اچھی طرح اور جلدی یاد کرلیا کرتا ہے جبکہ اس پختہ عمر میں یہ کام دشوار ہوجاتا ہے۔ آپ بڑی دیر تک اشک ندامت بہاتے رہے اور گڑگڑا کر خدا سے التجا کی کہ ان کی مشکل آسان کردی جائے۔

عشا کے بعد نصف شب سے تہجد پڑھنا شروع کردی لیکن اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ وہ جہاں اور جس حال میں بھی تھے ان کے دل و دماغ میں قرآن پاک اور اس کے حفظ نہ کرسکنے کا احساس ندامت طاری تھا۔

فجر سے ساعت ڈیڑھ ساعت پہلے آپ بستر پر چلے گئے اور سوچتے سوچتے سوگئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پیر و مرشد اور ماموں ابو محمد تشریف لائے ہوئے ہیں اور ان کے چہرے کو بغور دیکھ کر پوچھ رہے ہیں کہ "اے ابو یوسف تو ملول کیوں ہے اور تیرے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر کیوں ہیں؟"

ابو یوسف کو پرسش احوال پر اور زیادہ رونا آگیا، بولے۔ "ماموں جان! میں اس ندامت اور افسوس سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں کہ ابھی تک قرآن پاک حفظ نہیں کرسکا۔ اس زخم کو میں کس طرح مندمل کروں؟"

ابو محمد نے فرمایا۔ "تو اب حفظ کرلے۔ اس میں افسوس کس بات کا؟"

ابو یوسف نے عرض کیا۔ "حضرت! اب میں کس طرح حفظ کروں، جب یہ کام میرے لیے بچپن میں مشکل تھا تو اب تو اور زیادہ مشکل ہوچکا ہے۔ میں سوچ سوچ کر ہی پریشان ہو رہا ہوں۔ بتائیے میں یہ کام کس طرح انجام دوں؟"

ابو محمد نے فرمایا۔ "اے ابو یوسف! تو فجر کی نماز کے بعد سو بار سورۂ فاتحہ پڑھ کر اپنا کام شروع کردے اللہ نے چاہا تو بہت جلد قرآن پاک حفظ ہوجائے گا۔"

ابو یوسف نے فرط عقیدت سے اپنے ماموں کے ہاتھ کو بوسہ دیا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ ہی دیر بعد موذن کی آواز سنائی دی۔ آپ اٹھے، وضو کیا، نماز ادا کی اور اپنے ماموں کے ارشاد کے بموجب سو بار سورۂ فاتحہ کا ورد کر کے کلام پاک کے حفظ کی کوشش شروع کر دی۔ انہیں جلد ہی اس حیرت انگیز بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ جو کچھ بھی یاد کرتے ہیں خلاف توقع بہت جلد یاد ہو جاتا ہے چنانچہ دس دن میں پورا کلام پاک حفظ ہو گیا۔

جس دن قرآن پاک پوری طرح حفظ ہوا تھا۔ آپ کو ٹھنڈے پانی کی خواہش ہو رہی تھی۔ آپ نے خوب جی بھر کے پانی پیا اور نفس سے کہا۔ ”اے نفس! آج میں اپنی کامیابی کی خوشی میں، دو رکعت میں پورا قرآن ختم کرنا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تو بھی میرا ساتھ دے۔“

اس کے بعد آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور دو رکعت میں کلام پاک ختم کرنے کی نیت باندھ لی۔

آپ نے بیس پارے پڑھ ڈالے اور کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر بیس کے بعد نیند غلبہ کرنے لگی اور اس غلبے میں اس پانی کی آسودگی کو بڑا دخل تھا جو آپ خوب جی بھر کے پی چکے تھے۔ آپ سجدے میں گئے تو آنکھ لگ گئی اور اس غضب کی نیند آئی کہ صبح تک سوتے رہے۔ جب آنکھ کھلی تو اپنے نفس پر سخت غصہ آیا۔ فرمایا۔ ”اے نفس! تو نے مجھے دھوکا دیا۔ میں بھی تجھے پریشان کروں گا۔“

اندر سے آواز آئی۔ ”اے ابو یوسف! اس میں میرا کیا قصور۔ آپ نے جی بھر کے پانی جو پی لیا تھا۔ اس نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اچھا، اگر یہ بات تھی تو میں تجھ کو یہ سزا دوں گا کہ آئندہ میں جی بھر کے پانی ہی نہیں پیوں گا۔“ اس اعلان کے بعد آپ نے بیس سال تک جی بھر کے پانی نہیں پیا اور اپنے نفس کو مستقل اذیتیں پہنچاتے رہے۔

☆☆☆

آپ پچاس سال کی عمر تک خواجہ ابو اسحاق شامی کے مزار پر حاضری دیتے رہے پھر اچانک خیال آیا کہ یہاں اعتکاف کے لیے چھوٹا سا حجرہ ہونا چاہیے لیکن یہاں کی سرزمین پتھریلی تھی۔ آپ یہاں زیر زمین حجرہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے مزدوروں کو کام پر لگایا تو چند دنوں کی کوشش کے بعد یہ جواب دیا گیا کہ اس پتھریلی زمین پر کدال کام نہیں کر رہے ہیں اس لیے زیر زمین حجرہ تعمیر نہیں ہو سکتا۔

آپ آنکھیں بند کر کے اس کا حل سوچنے لگے۔ اچانک دل کے کانوں نے ایک آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اے ابو یوسف! یہ کام بھی تو ہی اچھا انجام دے گا۔ اللہ کے نام سے اٹھ اور کدال لے کر کھدائی شروع کر دے۔“

آپ نے فجر کے بعد کدال سنبھالی اور اس پتھریلی زمین کی کھدائی شروع کر دی۔ حیرت انگیز طور پر ظہر تک کھدائی کا کام مکمل ہو گیا پھر اس جگہ زیر زمین ایک حجرہ تعمیر کیا گیا اور آپ نے اسی حجرے میں بارہ سال تک قیام کیا۔ یہیں آپ پر بے خودی طاری رہنے لگی۔ وضو کرتے کرتے بے خود ہو جاتے اور کسی بات کا ہوش ہی نہ رہتا۔ جب ہوش آتا تو بقیہ وضو کرتے چنانچہ ایک دوسرے صوفی خواجہ عبداللہ انصاری نے جب آپ کو اس طرح بے خود ہوتے دیکھا تو تحسین کرتے ہوئے فرمایا۔ ”چشتیوں کی ہمیشہ یہی وضع اور روش رہی ہے۔“

آپ اپنی عمر کے آخری حصے میں بھی اسی حجرے میں رہے اور آپ کے مریدوں اور مداحوں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ حجرے کے دروازے پر دونوں طرف دو سانپ پھن اٹھائے دربانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ارادت مند انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے۔

بعض ارادت مندوں نے اندر پہنچ کر آپ سے شکایت کی کہ ”حضرت! آپ کے اکثر مرید اور مداح آپ سے ملے بغیر ہی چلے جاتے ہیں آپ ان سانپوں کو یہاں سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میں دنیاداروں اور وقت برباد کرنے والوں سے نہیں ملنا چاہتا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں سانپ انہیں خوب پہچانتے ہیں اور انہیں اندر نہیں آنے دیتے۔“

مرید نے پوچھا۔ ”یہ انہیں کس طرح روکتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ان لوگوں کے دلوں پر ان کا خوف طاری ہو جاتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔“

لیکن آپ کے وصال کے بعد یہ دونوں سانپ بھی غائب ہو گئے۔ اس عہد کے دوسرے صوفیوں نے بتایا کہ دو سانپ دراصل دو جن تھے جو ابو یوسف چشتی کے مرید اور دربان تھے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زیر زمین حجرے میں آپ کے پاس رجال غیب آیا کرتے تھے اور آپ کی ان سے تادیر صحبتیں رہتی تھیں۔ ان رجال غیب میں اجنہ بھی شامل تھے۔

خانوادہ چشتیہ کی بنیادیں جن بزرگوں پر قائم ہیں، ان میں ابو یوسف چشتی کا نام نامی بھی خاصی شہرت اور مقام رکھتا ہے۔

آپ نے 3 رجب 459ھ میں وصال فرمایا۔ ”عارف کامل بودہ“ سے آپ کا سن وفات نکلتا ہے۔

ماخذات

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔
سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
ریاض الریاحین، ابی جعفر۔ سفینۃ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ

ٹرکی کی چوری

نجمہ موذی

جب کبھی حالات معمولی چیز کو غیر معمولی بنا دیں تو بہت سے دلوں میں اندیشے جنم لینے لگتے ہیں۔ نک ویلوٹ کے کارناموں میں ایک بات بہت منفرد اور مشترک ہے کہ ہمیشہ معمولی چیزوں کی چوری اور انتہائی غیر معمولی حالات و واقعات کا جنم... اس پیشہ ور کو بھی یہ چوری کچھ غیر معمولی سی لگی... جب چٹخارے دار روسٹڈ ٹرکی کو جلا کر خاک کرنا پڑا تو وہ یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ مارنے والے واقعی بہت اونچا ہاتھ مارتے ہیں مگر قانون کے ہاتھ چاہیں تو ان اونچے ہاتھوں کو کان پکڑوا دیں۔

دانہ ڈال کر شکار کھیلنے والوں کی بے بسی

کا دلچسپ تماشا

نک نے پہلی ہی نظر میں اس عورت کو پسند کر لیا تھا۔ وہ چھوٹے قد کی خوب صورت اور نرم مزاج عورت تھی۔ اس کی مسکراہٹ انتہائی پُرکشش تھی۔ طرزِ تکلم بھی خاصا دل ربا تھا۔ وہ مسکرا کر بات کرنے کی عادی تھی۔ نک اس کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اگر ان کی ملاقات زمانہ قدیم میں ہوئی ہوتی تو شاید وہ عورت کی خاطر جان کی بازی لگا دیتا لیکن اس مہذب دور میں اس قسم کی قربانی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور یوں بھی وہ عورت ایک بھنی ہوئی مسلم ٹرکی چوری کروانا چاہتی تھی، نک کو فوراً یہ خیال آیا کہ اس ٹرکی کے اندر ضرور کوئی قیمتی چیز یا جواہرات بھرے ہوئے ہوں گے۔ عورت نے جس نے اپنا نام ہوپ بیسنگو بتایا تھا، نک کے خیالات پڑھ لیے تھے۔

”میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس ٹرکی کے اندر کوئی چیز چھپائی نہیں گئی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ایک عام قسم کی بھنی ہوئی ٹرکی ہے اور اس میں گوشت کے سوا کوئی چیز نہیں۔ مارکیٹ میں اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پندرہ ڈالرز ہوگی، یعنی ایک معمولی چیز۔“

”ٹھیک ہے۔“ نک نے کہا۔ ”تمہیں یہ تو معلوم ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگا کہ میری فیس پچیس ہزار ڈالرز ہے۔"

"مسٹر ویلوٹ فیس کی فکر نہ کرو لیکن اس کام میں ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ٹرکی ایک شکرانے کی پارٹی میں پیش کی جارہی ہے اور تم نے اسے پارٹی والی صبح چوری کرنا ہے۔"

"اوہ۔ تمہارا مطلب یہ ہے اس ٹرکی کی جگہ کوئی دوسری ٹرکی رکھنا ہوگی۔"

"نہیں، دوسری ٹرکی نہیں رکھنی۔ تم نے صرف پارٹی میں پیش کی جانے والی ٹرکی کو چوری کرنا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس چوری کا انکشاف نہیں ہونا چاہیے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ناممکن کو ممکن بنانا تمہارا کام ہے مسٹر ویلوٹ۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے ورنہ ہم چند چور اچکوں کو دو چار ہزار ڈالرز دے کر چوری کرواسکتے تھے۔"

نک چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "یہ پارٹی کب اور کہاں دی جارہی ہے؟"

"مسٹر سیڈرک روز کے گھر میں۔ یہ ان کا ایڈریس ہے۔" وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ جگہ فلاڈلفیا کے مضافات میں ہے، شکرانے کی پارٹی آج سے ٹھیک سات دن بعد دوپہر کے دو بجے دی جارہی ہے۔ اس میں کل آٹھ افراد شریک ہوں گے۔ مسٹر سیڈرک، ان کی بیوی، ان کے دو شادی شدہ بچے (ایک بیٹا، ایک بیٹی) اور ایک پوتا اور پوتی ہیں۔ کھانا ملازمہ تیار کرے گی اس کا نام ایمیلیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نک نے کہا۔

"کام ہوجائے گا نا؟ ہمیں مایوس تو نہیں کروگے؟"

"میں نے اپنے مؤکلوں کو کبھی مایوس نہیں کیا۔"

ہوپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"تمہارے پاس میرا فون نمبر ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے فون کردینا۔"

یہ بات چیت جمعرات کے دن ہوئی تھی۔ جمعے کے دن گلوریا کو تہ خانہ صاف کرنے کا خیال آیا۔ وہاں اسکیز (برف پر پھسلنے والی لکڑیاں) کا ایک جوڑا رکھا تھا۔ جو نک نے برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ گلوریا نے انہیں سیڑھیوں میں رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ صفائی کے بعد انہیں واپس رکھ دے گی۔ اتنے میں نک، جو سیڑھیاں اتر رہا تھا، اسکیز پر پیر پڑنے سے پھسل گیا اور اس کا گھٹنا اتر گیا۔

چند گھنٹوں کے بعد وہ ٹانگ پر پلاسٹر چڑھائے بیٹھا تھا۔

گلوریا اس کے پلاسٹر کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "شکر ہے دوسری ٹانگ بچ گئی۔"

"شکر کرنے کا یہ انداز بھی خوب ہے۔ بہرحال یہ چوٹ پچیس ہزار کی چوٹ دے گئی ہے۔"

"اوہ۔ کیا تم نے کوئی کام ہاتھ میں لیا ہوا تھا؟"

"ہاں بدقسمتی سے۔" نک نے منہ بنا کر کہا۔ "ذرا فون دینا۔ پارٹی کو صورتِ حال سے آگاہ کردوں۔"

گلوریا نے فون لا کر اس کے قریب رکھ دیا۔ نک نے ہوپ بیسنگر کا نمبر ملایا اور رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "عام طور پر میں نے کبھی اپنے کسی مؤکل کو مایوس نہیں کیا۔"

"میں کبھی نہیں۔" ہوپ نے کہا۔ "کون بول رہا ہے؟"

"نک ویلوٹ۔ میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ مجھے اچانک چوٹ لگ گئی ہے، اس وقت ٹانگ پر پلاستر چڑھائے بیٹھا ہوں، میرا گھٹنا اتر گیا ہے۔"

"اوہ! بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔ چوٹ کیسے لگی؟"

"تہ خانے کی سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔" نک نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں کام نہیں کرسکوں گا۔ اس لیے معاہدہ منسوخ سمجھنا۔"

"کیا تم جلدی ٹھیک نہیں ہوسکتے؟"

"اگر میرے بس میں ہوتا تو ابھی ٹھیک ہوجاتا۔ لیکن ڈاکٹر کا خیال ہے کہ ٹھیک ہونے میں پندرہ بیس روز لگ جائیں گے۔"

"لیکن یہ تو بہت اہم کام ہے۔ ہمارا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔"

"میں مجبور ہوں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ تم کسی اور کی خدمات حاصل کرلو۔ ابھی تمہارے پاس کافی وقت ہے۔"

"نہیں ویلوٹ، یہ کام تمہارے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔"

"اس وقت تو میں بھی نہیں کرسکتا۔ ویسے سچ پوچھو تو تمہاری اس شرط کے بارے میں میرا ذہن صاف نہیں ہوا تھا کہ چوری کے بارے میں گھر والوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

"دیکھو مسٹر ویلوٹ۔" ہوپ نے کہا۔ "یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ کیا میں وہاں آکر تمہارے ساتھ بات کرسکتی ہوں؟"

"میرے گھر! میں عام طور......"

"پلیز مسٹر ویلوٹ۔"

نک گلوریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے اگر تم مصر ہو تو بے شک آجاؤ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا لیکن ایک منٹ۔ اس وقت تو بہت رات ہوچکی ہے تم کل صبح آجانا۔"

اگلی صبح ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر مس ہوپ، نک کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ اس مرتبہ اس کی مسکراہٹ غائب تھی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے نک کے گھٹنے کا جائزہ لیا۔

"کیا تمہیں بہت تکلیف محسوس ہورہی ہے؟"

"تکلیف اس وقت محسوس ہوتی ہے جب میں ہنستا ہوں۔" نک نے کہا۔ "بہرحال یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے، جہاں تک کام کا تعلق ہے وہ تم خود دیکھ سکتی ہو۔"

"کیا تم بیساکھیوں کے سہارے نہیں چل سکتے؟"

"بیساکھیوں کے سہارے تو چل سکتا ہوں لیکن بیساکھیوں کے سہارے بھنی ہوئی ٹرکی چوری کرنا بہت مشکل ہے۔"

"کام کو ملتوی نہیں کیا جاسکتا۔" ہوپ نے کہا۔ "اور تم سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔ دولت کے سہارے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"دولت کی بات نہیں ہے مس ہوپ۔ تم بھی بخوبی دیکھ سکتی ہو کہ اس وقت میں کام کے قابل نہیں ہوں۔"

ہوپ نے پرس کھولا۔ اندر سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکالا اور نک کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "اس میں پورے پچیس ہزار ڈالرز ہیں۔ میں تمہاری پوری فیس ایڈوانس دے رہی ہوں۔ اس کے علاوہ۔"

"فیس کی بات نہیں ہے مس ہوپ اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں زیادہ فیس کے لیے ڈراما کررہا ہوں تو یہ تمہاری......"

"اس کے علاوہ۔" ہوپ اسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کراتے ہوئے بولی۔ "اگر تم نے کام مکمل کرلیا تو تمہیں مزید نو لاکھ پچھتر ہزار ڈالر پیش کیے جائیں گے۔"

"نو لاکھ پچھتر ہزار ڈالرز۔" نک نے حیرت سے دہرایا اور تقریباً کھڑا ہوچلا تھا۔ "یعنی ٹرکی چرانے کا معاوضہ دس لاکھ ڈالرز۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

"تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے مسٹر ویلوٹ! میں نے دس لاکھ ڈالرز ہی کہا ہے۔ اگر تم کام مکمل نہ کرسکے تو پھر بھی نقصان میں نہیں رہوگے۔ پچیس ہزار ڈالرز بہرحال تمہارے ہوچکے ہیں۔"

نک حیرت سے اپنی پلاستر شدہ ٹانگ کو گھورتے ہوئے بولا۔ "اگر ہمیشہ ایسی آفر کی توقع ہو تو میں ہر معاہدے کے بعد اپنی ٹانگ توڑ سکتا ہوں۔"

"کیا میں بات پکی سمجھوں؟"

"اتنی بڑی آفر سن کر تو میں قبر سے بھی باہر آسکتا تھا۔ بات پکی سمجھو۔"

ہوپ نے شکریہ ادا کیا اور پردہ اٹھا کر رخصت ہوگئی۔

نک دو روز تک کوئی تدبیر سوچتا رہا۔ اتوار کی شام تک وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔

"کل ہم فلاڈلفیا جارہے ہیں۔" اس نے گلوریا سے کہا۔ "ابھی سے سامان پیک کرلو۔"

"اس حالت میں تمہارے لیے سفر کرنا بہت مشکل ہے۔ کیا تم نے معاہدہ منسوخ نہیں کردیا؟"

"دوبارہ کرلیا ہے۔ مجبوری کے باعث۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اس عورت پر لٹو ہوگئے ہو۔"

"اس پر نہیں۔ دس لاکھ ڈالرز پر۔"

"دس لاکھ ڈالرز!" گلوریا نے حیرانی سے کہا۔ "چوٹ تو تمہارے گھٹنے پر لگی تھی۔ دماغ پر کیسے اثر ہوگیا؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس عورت نے بھنی ہوئی ٹرکی چرانے کا معاوضہ واقعی دس لاکھ ڈالرز پیش کیا ہے۔ پچیس ہزار ڈالرز ایڈوانس دے گئی ہے۔"

"تعجب ہے۔ کیا وہ سونے کی ٹرکی ہے؟"

"اگر سونے کی بھی ہوتی تو دس لاکھ ڈالرز کی نہ ہوتی۔ معاملہ بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔ تم جلدی سے تیاری شروع کردو۔ تم کار چلانا میں پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤں گا۔"

اگلے روز موسم ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ نک اور گلوریا بذریعہ کار فلاڈلفیا پہنچ گئے اور ایک ایسے ہوٹل میں قیام کیا جو سیڈرک روز کے مکان سے قریب تھا۔ تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد دونوں کار میں بیٹھ کر سیڈرک کے مکان کو دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ وہ سفید رنگ کی ایک خوب صورت عمارت تھی اور دو میاں بیوی کی ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر نک نے ایک ٹائپ رائٹر کرائے پر لیا اور اس پر چند کاغذات ٹائپ کرلیے۔ پھر گلوریا کو اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

"ان کاغذات کی رو سے تم ایک فیشن میگزین کی نمائندہ ہو۔" اس نے کہا۔ "رسالے کا نام "سوشل اسٹائلز" ہے اور یہ ایک سوالنامہ ہے۔ تم ایسے وقت میں سیڈرک کے گھر جاؤ گی جب دونوں میاں بیوی باہر گئے ہوئے ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''تم ان کی ملازمہ سے بات کروگی۔ اس سوالنامے میں کچھ عمومی نوعیت کے سوالات ہیں۔ ان سوالات کی آڑ میں تم ملازمہ سے شکرانے کی پارٹی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروگی۔ اگر تم اس کوشش میں کامیاب ہوگئیں تو ہم دس لاکھ ڈالرز کے قریب پہنچ جائیں گے۔''

''ایسا نہ ہو کہ ملازمہ کو مجھ پر شک ہوجائے۔''

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم کتنی اچھی اداکاری کرتی ہو۔'' نک نے کہا۔ ''اور میں تمہیں اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا آسان طریقہ بتادیتا ہوں۔ تم یہ یقین کرلو کہ تم واقعی ایک فیشن میگزین کی نمائندہ ہو، سچ مچ سروے کررہی ہو۔ اداکاری میں خودبخود حقیقت کا رنگ بھر جائے گا۔''

اس روز گلوریا سارا دن ریہرسل کرتی رہی۔ منگل کی صبح وہ پوری تیاری کے ساتھ مسٹر سیڈرک کے گھر روانہ ہوگئی۔ نک ہوٹل میں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا اور یہ سب سے مشکل کام تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور گلوریا کے جانے کے تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوگئی تھی۔ نک نے اس سے قبل گلوریا کو کبھی اس قسم کے کام پر نہیں بھیجا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔ تاہم اس کے خدشات بے معنی ثابت ہوئے اور دوپہر کے وقت گلوریا مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

''معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب واپس آئی ہو۔'' نک نے کہا۔

''یقیناً کامیاب لوٹی ہوں۔'' گلوریا کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ سچ مچ کسی رسالے میں ملازمت کرلوں۔''

''اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' نک نے بے چینی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ کیا خبر لائی ہو؟''

''خبر نہیں، خبریں لائی ہوں لیکن ٹھہرو میں شروع سے بتاتی ہوں، جیسا کہ تم نے کہا تھا میں نے اپنی کار مکان کے صدر دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑی کردی اور انتظار کرنے لگی...... تقریباً سوا گھنٹے بعد ایک کار باہر نکلتی دکھائی دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سفید بالوں والا ایک صحت مند شخص بیٹھا تھا۔ پسنجر سیٹ پر ایک سنہری بالوں والی پُرکشش عورت بیٹھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مسٹر اور مسز سیڈرک تھے اور میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ ان کے جانے کے فوراً بعد میں اپنی کار سے باہر نکلی اور دروازے پر جا کر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد ایمیلیا نامی ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ شروع میں وہ مجھے لفٹ دینے پر تیار نہیں تھی لیکن جب میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ ڈالرز کا نوٹ رکھا تو وہ مجھے فوراً اپنے ساتھ کشادہ کچن میں لے گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ میرے ساتھ اتنی بے تکلف ہوگئی کہ مجھے سوالات کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس نے خود ہی سب کچھ بتانا شروع کردیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ باتیں اس کے سینے کا بوجھ بنی ہوئی تھیں اور وہ ہر صورت میں یہ بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ مختصر یہ کہ خاصی باتونی عورت نکلی۔''

''سو میں سے ننانوے عورتیں ایسی ہی نکلتی ہیں۔'' نک بڑبڑایا۔

''تم زیادتی کررہے ہو۔'' گلوریا برہمی سے بولی۔ ''میں تو باتونی نہیں ہوں۔''

''ہر عورت یہی کہتی ہے لیکن تم ایک فیصدی میں سے ہو۔ اچھا پھر کیا ہوا؟''

''کچن بڑا خوب صورت اور جدید تھا۔ خصوصاً مجھے جدید ترین اوون بہت پسند آیا۔''

''جدید ترین اوون؟''

''یہ اوون بالکل نئی چیز ہے۔'' ایمیلیا نے بتایا کہ ایک ماہ قبل جب یہ اوون باورچی خانے میں نصب کیا گیا تو وہ اس سے بہت ڈرتی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے۔''

''مسٹر سیڈرک کے بارے میں کیا بتایا؟''

''سیڈرک روز حال ہی میں یہاں منتقل ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس کا ٹیکساس میں قیام تھا۔ اس کے پاس تیل کے کنویں رہے ہے۔ اس کے علاوہ جائداد کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتا ہے۔ نیویارک میں اس کے پاس دو کثیر المنزلہ عمارتیں ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی کینیڈا میں بہت بڑی زمین ہے۔ ٹورنٹو میں جانکنس نامی شخص کے ساتھ کاروبار میں شراکت ہے اور وہ مہینے میں ایک مرتبہ کینیڈا جاتا ہے۔ اس کی بیوی کا نام سینڈی ہے۔ جوانی میں شو بزنس سے متعلق تھی۔ اب پینتالیس برس سے اوپر ہوچکی ہے اور بالوں کو رنگ لگاتی ہے۔''

''واقعی تم نے بہت کچھ معلوم کرلیا ہے۔'' نک نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ سینڈی کے بالوں کو رنگنے کا کام بھی ایمیلیا کو کرنا پڑتا ہوگا۔''

''یہ بات مجھے پوچھنے کا خیال نہیں آیا۔'' گلوریا نے کہا۔ ''مسٹر سیڈرک کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ بیٹا وکیل ہے۔ اس کے دو بچے ہیں جن کی عمریں بالترتیب چھ اور آٹھ سال ہیں۔ بیٹی اسکول میں شوقیہ پڑھاتی ہے اس کا شوہر ہنوز ایم اے کررہا ہے اور یہ سب لوگ شکرانے کی پارٹی میں شریک ہوں گے۔''

''خوب، خوب، تمہارا حافظہ کافی تیز ہے، اگرچہ مجھے کھانا پکانے کا کوئی تجربہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ٹرکی اوون میں بھونی جائے گی۔''

''تمہارا خیال بالکل صحیح ہے۔ ٹرکی اوون ہی میں بھونی جائے گی۔ ایمیلیا نے بتایا تھا کہ وہ ٹھیک بارہ بجے ٹرکی کو اوون میں پکنے کے لیے رکھ دے گی۔ مائیکرویو اوون میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔''

''صورتِ حال خاصی خوشگوار ہے۔'' نک نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ٹھیک بارہ بجے مس ہوپ کو فون کرکے بقیہ رقم کا انتظام کرنے کے لیے کہہ سکتا ہوں۔ پھر کیا ہوا؟''

''میں، آنے کی تیاری ہی کررہی تھی کہ مسٹر سیڈرک اور اس کی بیوی واپس آگئے۔''

''اوہ۔ کیا انہوں نے تمہیں دیکھا تھا؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اوون میں چھپ گئی تھی؟'' گلوریا نے کہا۔ ''وہ سیدھے باورچی خانے میں آئے تھے۔'' سینڈی خاصی خوش اخلاقی سے پیش آئی تھی، البتہ مسٹر سیڈرک کے ہونٹوں پر مجھے کوئی مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کرایا اور جلدی سے بہانہ کرکے وہاں سے نکل گئی۔''

''خوب...... اب ایک چھوٹا سا کام کرو۔ ایک کاغذ پنسل لو اور اس پر کچن کا خاکہ بنادو۔''

''کیا تم ان بیساکھیوں کے ساتھ وہاں پھدکتے ہوئے جاؤ گے؟''

''جب بات دس لاکھ ڈالرز کی ہو تو انسان بیساکھیوں سمیت بحرِ ظلمات میں بھی کود سکتا ہے۔''

گلوریا نے میز کے اوپر رکھا ہوا رف پیڈ اٹھایا اور کچن کا خاکہ بنا کر نک کے ہاتھ میں تھمادیا۔ ''یہ روشن، ہوادار اور جدید قسم کا کچن ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور یہ اس کے ساتھ چھوٹا سا اسٹور ہے۔''

''اب تمہیں ایک اور تکلیف کرنی پڑے گی۔ آج رات مجھے سیڈرک کے مکان تک پہنچانا ہوگا۔ میں دروازے کے تالے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''کیا تم ان بیساکھیوں کے ساتھ وہاں جاؤ گے؟''

''مجبوری ہے۔''

''لیکن یہ سراسر حماقت ہے۔''

''اس دنیا میں حماقتیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔ ویسے فکر نہیں کرو میں نے اس بے ساکھی کے ساتھ کافی تیز چلنا سیکھ لیا ہے۔ بلکہ کئی شعبدے بھی دکھا سکتا ہوں۔ تمہاری عدم موجودگی میں چلنے کی پریکٹس کرتا رہا ہوں۔ اب میں صرف ایک بے ساکھی کے سہارے چل سکتا ہوں۔''

گلوریا نے کندھے اچکائے۔ وہ جانتی تھی کہ نک جس کام کا فیصلہ کرلیتا تھا اسے انجام تک پہنچا کر دم لیتا تھا۔

رات کے سوا بارہ بجے گلوریا نے سیڈرک کے مکان کے قریب کار روکی اور نک کی طرف دیکھا۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی آسمان بادلوں کی وجہ سے تاریک تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گلی میں فاصلے فاصلے پر اسٹریٹ لیمپ لگے ہوئے تھے جن کے گرد پتنگے رقص کررہے تھے۔

''تم نے مکان میں کوئی کتا وغیرہ تو نہیں دیکھا؟'' نک نے پوچھا۔

''دن کے وقت تو کوئی کتا نظر نہیں آیا، ممکن ہے رات کے وقت......''

''فکر نہیں کرو میں نے کتے کا انتظام بھی سوچ رکھا ہے۔'' نک دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''میں چند منٹوں سے زیادہ نہیں لگاؤں گا۔ تم کار میں ہی انتظار کرو۔''

پھر وہ باہر نکلا، آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ بیساکھی بغل میں رکھی اور مکان کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ اگرچہ اس کی چال میں بہ ظاہر بے پروائی پائی جاتی تھی لیکن نظریں عقابی انداز میں اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں، چند لمحوں کے اندر وہ مکان کے عقبی دروازے کے سامنے پہنچ کر تالے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک عام تالا تھا اسے کھولنا کوئی خاص مشکل نہیں تھا لیکن چونکہ یہ کام دن کے وقت کرنا تھا اس لیے یہ خطرہ بہرحال موجود تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے، دوسرا خطرہ الارم کا تھا۔

تالے کا جائزہ لینے کے بعد وہ واپس کار میں پہنچ گیا۔

''میں اب تک سانس روکے بیٹھی تھی۔'' گلوریا اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں ڈر رہی تھی کہ کچھ ہو نہ جائے۔''

''سانس روکنا کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔ سانس ہمیشہ کے لیے بھی رک سکتا ہے، چلو واپس چلیں۔''

''کچھ بات بنی؟'' گلوریا کار کو گیئر میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''اب تمہیں ایک تکلیف اور کرنی پڑے گی کل بازار

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے چند چیزیں خریدنا پڑیں گی۔"

بدھ کی صبح گلوریا بازار سے مطلوبہ اشیا خرید لائی۔ ان میں دستانوں کی جوڑی، کینوس کا مضبوط تھیلا اور ایک دس پونڈ وزنی ٹرکی شامل تھی۔ نک ایک بیساکھی پر کمرے میں اچھل کود کرتا پھر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر کینوس کا تھیلا لٹک رہا تھا اور صاف کی ہوئی ٹرکی کونے میں رکھی تھی، نک ایک کونے سے اچھلتا ہوا دوسرے کونے تک جاتا اور ایک ہاتھ سے ٹرکی کو اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے کی کوشش کرتا۔ شروع شروع میں اسے دقت محسوس ہوئی لیکن بالآخر وہ اس کام میں ماہر ہو گیا۔

"یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔" اس نے کہا۔ "اب کسی ہوٹل میں چلیں۔"

"ڈنر کھانے کے لیے۔"

"نہیں میں یہ ٹرکی تیار کروانا چاہتا ہوں۔"

چند منٹوں کے اندر دونوں ایک قریبی ریستوران میں پہنچ گئے۔ نک ریستوران کے خانساماں کے پاس گیا اور کہا۔ "میں یہ ٹرکی روسٹ کروانا چاہتا ہوں۔"

"ہو جائے گی۔" خانساماں نے جواب دیا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔" نک نے کہا۔ "میں اسے کوئلے کی طرح سیاہ کروانا چاہتا ہوں۔"

خانساماں نے حیرت سے نک کی طرف دیکھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب۔"

"مطلب بالکل صاف ہے، تم اسے پوری طرح تیار کر کے اوون میں پکنے کے لیے رکھ دو اور اس وقت باہر نکالو جب یہ جل کر کوئلہ ہو چکی ہو۔ سیاہ ہو چکی ہو، یعنی کھانے کے قابل نہ رہی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب میری بات واضح ہو چکی ہے۔"

"معذرت چاہتا ہوں جناب۔ میں اس شاندار ٹرکی کا اتنا بھیانک حشر نہیں کر سکتا۔ میں خانساماں ہوں جلاد نہیں ہوں۔"

نک نے جیب سے سو ڈالرز کا نوٹ نکالا اور خانساماں کے ہاتھ پر رکھا اور کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟ دراصل میں ایک دوست کے ساتھ مذاق کرنا چاہتا ہوں۔"

خانساماں نے نوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو ڈالرز کا اصلی نوٹ ہے تو اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ "اتنے معاوضے میں تو میں آپ کو بھی روسٹ کر سکتا ہوں۔"

"فی الحال صرف ٹرکی۔" نک نے کہا۔ "کتنے بجے آئیں؟"

"روسٹ ساڑھے نو بجے تک ہو جائے گی لیکن چونکہ آپ جلی ہوئی چاہتے ہیں اس لیے ٹھیک دس بجے تشریف لائیں۔"

نک نے دستی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہیں جانے کے بجائے ڈائننگ ہال میں بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے کے بعد اس نے کافی منگوائی اور ویٹر سے کہہ کر میز پر فون منگوا لیا۔

"فون کس لیے؟" گلوریا نے پوچھا۔

"مس ہوپ کو فون کر رہا ہوں۔" وہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولا۔

رابطہ ملنے کے بعد اس نے ہوپ کو ساری پوزیشن بتائی اور کہا کہ اگلے روز ایک بجے تک مسروقہ ٹرکی اس کے قبضے میں ہو گی۔

"ونڈرفل، ونڈرفل۔" ہوپ کی پُرجوش آواز سنائی دی۔ "ہم کل علی الصباح فلاڈلفیا کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی تمہیں فون کریں گے۔ میں بہت خوش ہوں نک، مجھے یقین تھا کہ تم یہ کام کر لو گے۔"

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد نک نے کندھے اچکائے۔ یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ عورت ایک ٹرکی کے لیے اتنی بڑی رقم کیوں خرچ کر رہی ہے۔

اگلے روز موسم خوشگوار تھا۔ مطلع صاف ہو چکا تھا اور چاروں طرف چمکدار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ نک نے ملاحوں سے ملتا جلتا لباس پہن لیا اور کینوس کا تھیلا کندھے پر ڈال لیا۔ اب وہ کسی ایسے ملاح کے مانند معلوم ہوتا تھا جو زخمی ہونے کے باعث پیچھے رہ گیا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے ان کی کار سیڈرک کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ ڈرائیو وے میں دو کاریں کھڑی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ پارٹی میں شرکت کرنے والے مہمان پہنچ چکے تھے۔ گلوریا نے کار بغلی گلی میں کھڑی کر دی اور سوالیہ نظروں سے نک کو گھورنے لگی۔

"اب تمہیں ایک اور تکلیف کرنی پڑے گی۔" نک نے کہا۔

"کوئی نئی بات نہیں۔" گلوریا بڑبڑائی۔ "آج کل مجھے ہر قدم پر تکلیف کرنی پڑ رہی ہے۔"

"دس لاکھ ڈالرز بغیر تکلیف کے نہیں مل سکتے۔" نک نے کہا۔ "صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ ملازمہ اس وقت باورچی خانے میں کھانا پکا رہی ہو گی اور جیسا کہ اس نے بتایا تھا کہ ٹرکی اوون میں رکھ دی گئی ہو گی۔ اہل خانہ نشست گاہ میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہوں گے۔ ہم ایک ساتھ روانہ ہوں گے، تم سامنے کے دروازے پر جاؤ گی اور میں عقبی دروازے پر۔"

"میں سامنے کے دروازے پر جا کر کیا کروں گی؟"

"دروازے پر جا کر تم اطلاعی گھنٹی بجاؤ گی۔ توقع ہے کہ ملازمہ دروازہ کھولنے آئے گی۔ تم اس سے کہو گی کہ گزشتہ روز تمہارا طلائی بال پین کچن میں رہ گیا تھا۔"

"طلائی بال پین؟" گلوریا نے حیرانی سے کہا۔ "میرے پاس تو کوئی طلائی بال پین نہیں تھا۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن اس بہانے تم ملازمہ کو باتوں میں لگا سکتی ہو، اگر کوئی اور دروازہ کھولے تو تم اسے بھی یہی بات کہنا۔ ظاہر ہے یہ سن کر وہ ملازمہ کو آواز دے گا۔ تم نے اسے کم از کم پانچ منٹ باتوں میں لگائے رکھنا ہے۔ پانچ منٹ کے بعد یہ کہہ کر رخصت ہو جانا کہ شاید تم کسی اور گھر میں بال پین بھول گئی ہو اور ہاں زیادہ تیز نہیں چلنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پہلے پہنچ جاؤ۔"

دونوں کار سے باہر نکلے اور اپنے راستے پر ہو لیے۔ نک کے کندھے پر کینوس کا تھیلا لٹک رہا تھا جس میں اس نے جلی ہوئی ٹرکی رکھی تھی۔ اگرچہ اس نے عقبی دروازہ کھولنے کا پورا انتظام کر رکھا تھا لیکن اسے باڑ کے درمیان ایک چھوٹا سا راستہ نظر آیا جہاں سے مکان کے عقب میں جانا بہت آسان تھا۔ نک نے وہ راستہ اختیار کیا اور باڑ کی اوٹ میں چلتا ہوا کچن کے قریب پہنچ گیا تو مکان کے اندر سے بولنے کی ملی جلی آوازوں کے درمیان موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اتنے میں مکان کے عقبی حصے میں اطلاعی گھنٹی کی آواز گونجی۔ نک سمجھ گیا کہ گلوریا دروازے پر پہنچ گئی تھی۔

جالی کے دروازے سے ملازمہ کچن میں مصروف نظر آ رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس نے رومال سے ہاتھ صاف کیے اور مکان کے اندر غائب ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے نک کچن کے اندر تھا۔ داہنی طرف اوون نصب تھا۔ اس کے شیشے کے دروازے سے اندر رکھی ہوئی ٹرکی صاف نظر آ رہی تھی۔ نک نے کندھے سے کینوس کا تھیلا اتار کر فرش پر رکھا اس کے اندر سے تولیا نکالا جس میں جلی ہوئی ٹرکی لپٹی ہوئی تھی۔ ٹانگ پر چڑھے ہوئے پلاستر کی وجہ سے اسے کافی دقت پیش آ رہی تھی۔ تاہم وہ نپے تلے انداز میں کام کر رہا تھا۔ اس نے جلی ہوئی ٹرکی کو اوون میں رکھا اور اوون والی ٹرکی کو جو تقریباً بادامی رنگت اختیار کر چکی تھی۔ تولیے میں لپیٹ کر تھیلے میں ڈال لیا۔ اسی لمحے دوسری طرف کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"ارے یہ ایمیلیا کہاں مر گئی۔" آواز کسی عورت کی تھی۔

نک نے تھیلا اٹھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے جلدی کی اور بیساکھی کے ذریعے چلتا ہوا نیم تاریک اسٹور روم میں گھس گیا۔ اتنے میں کچن کا اندرونی دروازہ کھلا اور ایک سنہری بالوں کی عورت اندر آئی۔ نک نے دروازے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ سینڈی روز تھی۔ اس نے اوون کے اندر جھانک کر دیکھا اور زور سے چلائی۔

"سیڈرک جلدی سے یہاں آؤ۔ یہ...... یہ ٹرکی کا بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ جل کر کوئلہ ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ایمیلیا کی بچی ضرور کوئی کارنامہ کرے گی۔" اس کی تھیلے پر نظر نہیں پڑی۔

"کیا ہو گیا؟" نک کے کانوں میں ایک بھاری آواز آئی۔ "کیوں شور مچا رہی ہو؟" سینڈی نے دروازے کے قریب جا کر کہا۔

"یہاں تو آؤ۔"

نک کے لیے اتنی سی مہلت کافی تھی۔ اس نے تھیلے کو بیساکھی میں اڑا کر اندر کھینچ لیا اور جلدی سے پیچھے ہو گیا۔

"کیا ہو گیا ہے؟" بھاری آواز کچن میں پہنچ گئی۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ٹرکی جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ سارا قصور ایمیلیا کا ہے۔"

اتنے میں ایمیلیا بھی کچن میں پہنچ گئی۔ "میں صرف دو منٹ کے لیے دروازے تک گئی تھی۔ یہ ناممکن ہے، اتنی جلدی ٹرکی نہیں جل سکتی، آپ نے بھی گھنٹی کی آواز سنی ہو گی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" مسٹر سیڈرک نے کہا۔ "ٹرکی جل چکی ہے، سامنے نظر آ رہی ہے۔"

"اوہ میرے خدا یہ کیسے ہو گیا۔ ابھی ایک منٹ پہلے بالکل ٹھیک تھی، میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں۔ ضرور اس اوون میں کوئی خرابی ہے، میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ اوون ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ تو بڑی مصیبت ہو گئی۔" سیڈرک کی آواز آئی۔ "میرا خیال ہے کہ میں جلدی سے دوسری ٹرکی لے آتا ہوں، اگرچہ آج چھٹی ہے لیکن کلین سائڈ اسٹور ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔"

"بہت دیر ہو جائے گی۔" سینڈی نے کہا۔ "اگر یہ اوون خراب ہے تو دوسری ٹرکی بھی جل جائے گی۔ بہتری یہی ہے کہ ڈنر کے لیے کہیں باہر چلتے ہیں۔" پھر وہ ایمیلیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے مخاطب ہوئی۔ ”کل سب سے پہلے اوون والوں کو فون کرو اور یہ جلی ہوئی ٹرکی بھی انہیں دکھانے کے لیے رکھ لو۔ بڑی تعریفیں کرتے تھے اپنی اس نئی ایجاد کی۔“

”باقی چیزوں کا کیا کروں؟“ ایمیلیا نے بجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر لے جانا۔“ سینڈی نے کہا۔ ”اب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

نک اسٹور میں دبکا ہوا ساری گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کوئی اسٹور میں جھانک کر نہ دیکھ لے۔

”مسز روز۔“ ایمیلیا کی افسردہ سی آواز سنائی دی۔ ”مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے پتا نہیں یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں صرف دو تین منٹ کے لیے دروازے پر گئی تھی۔“

”خیر خیر، جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔“ مسٹر سیڈرک نے کہا۔ ”تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔“

”صفائی کرنے کے بعد گھر چلی جانا۔“ سینڈی نے کہا۔ ”ہم سب ہوٹل میں جا کر کھانا کھائیں گے۔“

ایمیلیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر دیا تھا تو نک تک آواز نہیں پہنچی تھی۔ لمحہ بھر کے بعد قدموں کے دور ہونے کی آواز سنائی دی۔ باورچی خانے میں صرف ایمیلیا رہ گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی صفائی کرنے لگی۔ نک کے کانوں میں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چیزوں کو اِدھر اُدھر رکھنے کی آوازوں کے ساتھ ایمیلیا کے بڑبڑانے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ نک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ باہر کیسے نکلے۔ اسٹور کا ایک ہی دروازہ تھا جو باورچی خانے میں کھلتا تھا اور وہاں سے وہ ایمیلیا کی نظر میں آئے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا پھر یہ بھی خطرہ تھا کہ ایمیلیا کسی کام سے اسٹور میں نہ پہنچ جائے۔ مکان کے اندر سے ملی جلی ہنوز مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اہلِ خانہ ابھی گھر کے اندر ہی تھے۔

وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہوپ شہر میں پہنچ چکی ہوگی اور اس کے ہوٹل میں فون کرنے والی ہوگی۔ اسٹور کی بیرونی جانب ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جو زیادہ اونچائی پر نہیں تھا۔ نک بہ آسانی اس روشن دان سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا روشن دان کے قریب گیا اور باہر جھانکا۔ تب اس کی نظریں گلوریا پر پڑیں وہ بڑی بے چینی کے ساتھ عمارت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نک نے بڑی مشکل سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ پہلے اس نے ٹرکی والا تھیلا باہر نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

پھر اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ الفاظ لکھ کر اسے باہر پھینک دیا۔

”میں فی الحال باہر نہیں آ سکتا۔ جلدی سے ہوٹل جاؤ اور ہوپ کے فون کا انتظار کرو، کام ہو گیا ہے۔“

گلوریا نے کاغذ اٹھا کر دیکھا اور جلدی سے واپس چلی گئی۔

نک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی پلاستر شدہ ٹانگ میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔ ایک بجے کے قریب کچن میں کسی کے داخل ہونے کی آواز آئی پھر سینڈی کی آواز سنائی دی۔

”ایملی ہم جا رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ہوٹل میں ہماری ریزرویشن دو بجے کی ہے لیکن ہم مہمانوں کو سیڈرک کی زمین دکھانا چاہتے ہیں۔ وہاں آج کل ڈیولپمنٹ کا کام ہو رہا ہے تم کام ختم کر کے چلی جانا۔“

”شکریہ مسز سینڈی۔“ ایمیلیا نے کہا۔ ”مجھے ٹرکی کے جلنے کا بہت افسوس ہے۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اب افسوس کرنے سے کیا حاصل۔“

چند لمحوں کے بعد نک نے دو کاروں کے اسٹارٹ ہونے اور روانہ ہونے کی آواز سنی۔ اس کے نصف گھنٹے بعد چند دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد مکان میں مکمل سناٹا چھا گیا۔

نک اٹھا اور احتیاطاً روشن دان سے باہر دیکھا۔ ایمیلیا عقبی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر کوئی ندامت نہیں تھی بلکہ وہ زیرِ لب گنگناتی جا رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد نک نے تھیلا کندھے پر ڈال لیا اور بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا ہال کمرے کی طرف بڑھا۔ سامنے کا دروازہ گلی کے قریب تھا اور وہاں سے نکلنا کسی خطرے کا باعث نہیں تھا۔ اسے اُمید تھی کہ گلوریا مس ہوپ کو اطلاع دے کر واپس آ چکی ہوگی۔ داخلی دروازے پر پہنچ کر جیسے ہی اس نے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ خود بخود گھومنا شروع ہو گیا۔ باہر سے کسی کے بولنے کی دبی دبی سی آواز بھی آئی۔ نک پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اگر اس کی ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ دوڑ کر کہیں چھپ جاتا لیکن بیساکھی کے سہارے اتنا تیز چلنا ناممکن تھا لہٰذا وہ کہیں چھپنے کے بجائے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

وہ مڑے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آئے۔ پہلی ہوپ تھی اور دوسرا ایک طویل القامت شخص تھا جسے نک نے پہلی مرتبہ دیکھا۔

”آہاہ...... نک ویلوٹ!“ ہوپ نے کہا۔ ”مجھے اُمید تھی کہ تم سے یہیں ملاقات ہوگی۔ اس سے ملو یہ میرا شریکِ کاروبار رونالڈ مائلز ہے۔“

نک اور رونالڈ نے ہاتھ ملایا۔

”اگر میں غلطی نہیں کر رہا مسٹر ویلوٹ تو غالباً اس تھیلے میں بھنی ہوئی ٹرکی ہے۔“ رونالڈ نے کہا۔

”تمہارا اندازہ بالکل صحیح ہے۔“ نک نے کہا۔ ”بہت عمدہ روسٹ کی گئی ہے کیا تم اسے یہاں بیٹھ کر کھانا پسند کرو گے یا کہیں اور؟“

”بڑا اچھا سوال کیا۔“ رونالڈ نے کہا۔ ”کیوں ہوپ؟“

ہوپ کے ہونٹوں پر خوشگوار مسکراہٹ پھیل گئی۔ نک سمجھ گیا کہ انہیں ٹرکی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ درحقیقت وہ اس خاص موقع پر اہلِ خانہ کو گھر سے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور اس مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

”تم لوگوں کے پاس اس مکان کی چابیاں بھی ہیں؟“ نک نے پوچھا۔

”چابیاں حاصل کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔“ ہوپ نے کہا۔ ”اس لیے یہ کام ہم نے خود ہی کر لیا تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ مسٹر سیڈرک اور اس کی فیملی کو وقتی طور پر مکان سے باہر بھیجنا چاہتے تھے۔“ نک نے کہا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام کم پیسوں میں بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی اور طریقہ اختیار کرکے۔“

”ہم نے ہر پہلو پر غور کر لیا تھا مسٹر ویلوٹ، ہم نہیں چاہتے تھے کہ مسٹر سیڈرک کو ذرا سا بھی شبہ ہو، خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تمہارے گھٹنے کا کیا حال ہے؟“

”کام چل رہا ہے۔“

”او کے مسٹر ویلوٹ۔“ ہوپ نے کہا۔ ”ذرا اطمینان سے بیٹھو، ہمیں ایک فون کا انتظار ہے۔“

رونالڈ گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ مسٹر ویلوٹ کا کام ختم ہو چکا ہے۔“

”مسٹر ویلوٹ ہمارے کام میں برابر کا شریک ہے۔ اس سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں۔“ پھر وہ قدرے توقف کرتے ہوئے بولی۔ ”کیوں نہ سینڈی روز کے بیڈ روم کا فون استعمال کیا جائے اس کے ساتھ اسپیکر منسلک ہے ہم تینوں بات سن سکیں گے۔“

”تم اس گھر کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔“ نک نے کہا۔

ہوپ نے مسکرا کر نک کی طرف دیکھا۔ بولی۔ ”یہ میرا بزنس ہے، جاننا ہی پڑتا ہے۔“

تینوں خواب گاہ میں پہنچ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ چھ سات منٹ کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔

”رونالڈ اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ ہوپ نے کہا اور ریسیور اٹھانے سے پہلے ایک بٹن دبا دیا۔ پھر اس نے ریسیور اٹھا کر استفسار کیا۔ اسپیکر پر ایک اجنبی آواز گونجی۔

”میں ٹورنٹو سے میک جانگسن بول رہا ہوں۔ کیا میں مسٹر سیڈرک سے بات کر سکتا ہوں؟“

نک کو یاد آیا کہ جانگسن سیڈرک کا پارٹنر تھا۔

”میں مسٹر سیڈرک کی بیٹی ہوں۔“ ہوپ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”ہم ابھی ابھی کھانے پر بیٹھے ہیں۔ ذرا ہولڈ کرو مسٹر جانگسن میں ڈیڈی کو بلاتی ہوں۔“

اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور رونالڈ کو اشارہ کیا۔ آخر الذکر دروازے سے باہر چلا گیا۔ پھر آواز پیدا کرتے ہوئے کمرے میں آیا اور ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”ہیلو میک!“ اس کی آواز بدلی ہوئی اور سیڈرک سے ملتی جلتی تھی۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”سوری سیڈرک۔ تمہیں کھانے کی میز سے اٹھنا پڑا۔ لیکن معاملہ ذرا ارجنٹ ہے۔ البرٹا میں جو ہماری آئل لینڈ ہے، اس کے پچاس لاکھ ڈالرز مل رہے ہیں۔ اگرچہ یہ آفر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن موجودہ حالات میں اس سے زیادہ قیمت ملنی مشکل ہے میں نے سوچا تم سے پوچھ لینا مناسب ہوگا۔ کیونکہ آئل لینڈ کے معاملے میں تمہاری رائے زیادہ صائب ہے۔“

”ایک دو روز سوچنا پڑے گا۔“ رونالڈ نے کہا۔

”سوچنے کی گنجائش نہیں ہے۔“ جانگسن کی آواز اسپیکر پر گونجی۔ ”پارٹی کی آفر آج کاروباری اوقات تک کے لیے ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ موجودہ حالات میں اس زمین کی یہی قیمت ہے۔ اگر کینیڈین گورنمنٹ اس زمین پر نجی سرمایہ کاری کی اجازت دے دے تو یہی زمین ڈھائی تین کروڑ ڈالرز میں بھی جا سکتی ہے۔“

”مستقبل کی باتیں چھوڑو۔ آج اگر ہم پچاس لاکھ ڈالرز کاروبار میں لگائیں تو دس سال بعد وہ دو ڈھائی کروڑ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بن جائیں گے۔"

"تو پھر بیچ ڈالیں؟"

رونالڈ نے جواب دینے میں تھوڑا سا تامل کیا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ سودا کرلو۔"

"دیکھ لو، بعد میں افسوس نہ ہو۔"

"سنو میک، ایک بات خوب یاد رکھو سودا کرتے وقت کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے اور جب سودا ہوجائے تو پھر بعد کی باتیں سوچنا بے کار ہیں۔"

"ٹھیک ہے سیڈرک اس معاملے میں تمہارا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوا۔ میں معاہدے پر دستخط کردیتا ہوں۔ ایک بار پھر معذرت کہ تمہیں کھانے کی میز سے اٹھنا پڑا۔"

"ہاہ، کوئی بات نہیں سناؤ کینیڈا کا موسم کیسا ہے؟"

"انتہائی سرد۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے صرف تین درجے زیادہ ہے اوکے سیڈرک۔"

"پھر تو وہاں ہر طرف برف ہی برف ہوگی۔" رونالڈ نے کہا۔

پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور فاتحانہ نظروں سے ہوپ کی طرف دیکھا۔ "کیسا رہا؟"

"ونڈرفل!" ہوپ نے کہا اور آگے بڑھ کر رونالڈ کو پیار کرلیا۔ "تم نے سیڈرک کی بڑی عمدہ نقل اتاری ہے۔"

"چھ ہفتوں سے سیڈرک کی ویڈیو ٹیپ سن سن کر پریکٹس کررہا تھا۔"

"اب تم اس ٹیپ کو ضائع کرسکتے ہو۔" ہوپ نے کہا پھر نک کی طرف مڑی۔ "تم دس لاکھ ڈالرز کے مالک بن چکے ہو مسٹر ویلیوٹ!"

"مجھے بھی یہی اُمید ہے۔" نک نے کہا۔

"ہمارا ایک شریک کاروبار اس وقت کینیڈا میں موجود ہے۔" رونالڈ نے کہا۔ "بلکہ اُمید ہے کہ اس وقت وہ مسٹر جانکسن کے ساتھ معاہدے کی تکمیل میں مصروف ہوگا۔ ہمارے پاس اس زمین کے لیے دو کروڑ بیس لاکھ کی آفر موجود ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ سیڈرک اس زمین کو کبھی اتنے کم داموں فروخت نہ کرتا۔"

"ظاہر ہے جب ہی تو ہمیں یہ سارا ڈراما کرنا پڑا۔"

"لیکن یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔"

"سودا ہونے کے بعد کچھ نہیں ہوسکتا۔" ہوپ نے کہا۔ "کم از کم سیڈرک کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ جانکسن کا قانونی پارٹنر نہیں ہے۔"

"اوکے مس ہوپ!" نک بیساکھی کے سہارے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "یہ رہی تمہاری ٹرکی۔ میری بقیہ فیس ادا کردو تاکہ میں جاؤں۔"

"بقیہ فیس تمہیں ایک ہفتے بعد مل جائے گی۔" ہوپ نے کہا۔

"لیکن......"

"فکر نہیں کرو، ہم دس لاکھ ڈالرز کی خاطر دو کروڑ ڈالر کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"

اسی لمحے نک کو کھڑکی سے باہر کسی یونیفارم کی جھلک نظر آئی وہ سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے تاہم اس نے ہوپ اور رونالڈ کو کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور جلدی سے عقبی دروازے کی طرف بڑھا، جیسے ہی اس نے دروازہ کھول کر قدم باہر رکھا، اس کے کانوں میں ایک کرخت آواز آئی۔

"تم دونوں خود کو زیرِ حراست سمجھو۔"

"اس مداخلت کا کیا مطلب ہے؟" نک کے کانوں میں ہوپ کی آواز آئی۔ "ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"اس بات کا فیصلہ ہیڈکوارٹر پہنچ کر کیا جائے گا۔" کرخت آواز نے کہا۔ "ہمیں ابھی ابھی ٹورنٹو سے کال موصول ہوئی ہے کہ مسٹر سیڈرک کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔"

نک اس سے زیادہ نہیں سن سکا اور اطمینان سے چلتا ہوا گلی میں پہنچ گیا۔ جہاں گلوریا کار میں اس کی منتظر تھی۔

"جلدی سے نکل چلو۔" نک کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"خیریت!"

"ہوپ اور اس کا ساتھی گرفتار ہوگئے ہیں۔"

گلوریا نے کار کو گیئر میں ڈالا اور چند گلیوں سے ہوتی ہوئی مین روڈ پر پہنچ گئی۔ نک نے اطمینان کا سانس لیا اور گلوریا کو شروع سے آخر تک ساری بات سناڈالی۔

"لیکن پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔" گلوریا نے پوچھا۔

"رونالڈ سے ایک چھوٹی سی حماقت ہوگئی تھی۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے جانکسن سے وہاں کے موسم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب میں بتایا تھا کہ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے تین درجے زیادہ تھا اس پر رونالڈ نے کہا کہ پھر تو وہاں ہر طرف برف ہی برف ہوگی اور یہی اس کی غلطی تھی کینیڈا میں درجۂ حرارت ناپنے کا ایک مختلف پیمانہ استعمال ہوتا ہے ان کے تین درجے ہمارے اڑتیس درجے فارن ہائٹ کے برابر ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ رونالڈ کے تبصرے نے جانکسن کو شبہے میں ڈال دیا تھا کیونکہ سیڈرک اکثر کینیڈا جاتا رہتا ہے اور وہاں کے پیمانے کو خوب سمجھتا ہوگا۔"

ایضاً

فیاض الرحمٰن قادری

کبھی کبھی واردات سوچے سمجھے بنا کسی غلطی کے مانند بھی سرزد ہوجاتی ہے مگر احساس ہونے تک تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے۔ پھر ایسی غلطیوں کے ازالے نہیں بلکہ تفتیش اور سزا تجویز ہوتی ہے۔ وہ بھی جب انہی گردشوں کا شکار ہوا تو احساس ہوا کہ ایک لمحے کی سوچ کی وہ گرفت کیسے تمام عمر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

مغرب سے درآمدہ......ایک مجرم کی کارگزاریاں

اپنے پارٹنر کو قتل کرنے کا خواب ایڈم کے لیے فی الحال ایک سہانے خواب کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لیکن یہ ایک ایسا خواب تھا جو وہ اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اس نے گھنٹوں بیکر کے لیے ایک مکمل قتل کے متعلق سوچا تھا۔ جب بھی کسی ہوائی جہاز کا حادثہ ہوتا ایڈم ریڈیو کی خبروں میں مرنے والوں کا نام سننے کے لیے اپنے کان لگا دیتا لیکن اس کی بدقسمتی سے جوزف بیکر کا نام ہلاک ہونے والوں میں کبھی نہ آسکا اور بیکر کو مردہ دیکھنے کی خواہش ایڈم کے دل میں روز بہ روز جڑ پکڑتی گئی۔

بیکر کے لیے ایڈم کی روز بہ روز بڑھتی ہوئی نفرت کسی ذاتی وجہ سے ہرگز نہیں تھی بلکہ یہ ایک خالص کاروباری مسئلہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ جوزف بیکر سے پارٹنر شپ کو ختم کر دینا یا کاروبار کو وقتی ترک کر دینا مسئلے کا حل قطعی نہیں تھا۔

اے بی ہوائی کمپنی قائم کرنے کا خیال بیکر ہی نے دیا تھا۔ اس کے پاس ایک طیارہ اور کچھ نقد رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ تھوڑے بہت کاروباری تعلقات بھی تھے جبکہ ایڈم کے پاس مہارت تھی۔ وہ ایک تجربے کار اور مشاق پائلٹ تھا۔ ایڈم نے اس شاندار تجویز کو سراہا اور دس ہزار ڈالرز کی رقم اکٹھی کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

اس کے علاوہ اسے کام بھی چاہیے تھا لیکن سب سے بڑی دشواری اس کی راہ میں یہ تھی کہ وہ حد سے زیادہ نڈر تھا کبھی کبھی بیوقوفی کی حد تک پرواز کے دوران خلاؤں میں اپنی بہادری کے مظاہرے دکھانے لگتا۔ اسی لیے ائرفورس والوں نے اسے ہٹا دیا اور اسے کسی نجی کمپنی میں بھی پائلٹ کی ملازمت نہیں مل سکی۔ پھر جب اس نے جوزف بیکر کا یہ منصوبہ سنا تو یہ اس کے دل کو بھا گیا اور اسے احساس ہو گیا کہ وہ اس شاندار منصوبے کے ذریعے صرف پانچ برسوں میں بے پناہ دولت مند بن سکتا ہے۔

پانچ برس دیکھتے دیکھتے گزر گئے اور بجائے اس کے کہ وہ منافع حاصل کرتا ابھی تک قرض ہی چکا رہا تھا۔ کمپنی کے گھاٹے میں جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیکر ایسا آدمی تھا جسے آسانی سے موم کیا جا سکتا تھا۔ اس نے کاروباری معاملات کو بہت آسانی سے سنبھال لیا تھا لیکن اس کی نرم دلی سے کمپنی کو نقصان ہونے لگا۔ ہر کاروباری ادارے کو تھوڑی بہت خوشامد کرنی پڑتی اور بیکر بہت ہی معمولی معاوضے پر اپنے جہاز کے ذریعے سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے راضی ہو جاتا لیکن کمپنی کی اس مالی خستہ حالی نے بیکر کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اس لیے کہ ضروریاتِ زندگی بہت سادہ تھیں۔ وہ ایک رومان پسند طبیعت کا آدمی تھا اور تنہا رہتا تھا جسے فطرت کے مناظر سے پیار ہو۔ اسے روپے پیسے کی زیادہ پروا نہیں ہوتی لیکن ایڈم کو یہ خستہ حالی بری طرح کھلنے لگی۔ اس کے بے پناہ اخراجات نے اسے روز بہ روز زیادہ سے زیادہ مقروض کر ڈالا تھا۔

کئی مرتبہ ایڈم نے اس مسئلے پر بیکر سے بات کی لیکن ہر بار بیکر کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ”دیکھو میں کاروبار اس لیے نہیں کر رہا کہ لوگوں کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دوں۔ میں یہ کبھی نہیں کر سکتا اگر تم کاروبار سے الگ ہونا چاہتے ہو تو الگ ہو سکتے ہو۔“

لیکن دس ہزار ڈالر کی واپسی سے ایڈم کا کوئی بھلا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اس کاروبار کے ذریعے دولت مند بننے کے لیے اپنے پانچ برس بھی ضائع کر دیے تھے۔ اسی لیے ایڈم، بیکر کا جواب سن کر خاموش ہو جاتا۔

جیسے جیسے ایڈم پر قرض کا بوجھ بڑھتا گیا۔ ویسے ویسے اس نے بیکر کی موت کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ ایک شام ایڈم نے شراکت داری کے معاہدے پر غور کیا۔ وہ ایسا طریقہ نکالنا چاہتا تھا جس کے ذریعے وہ کمپنی کے مالی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ شراکت داری کا معاہدہ بیکر ہی نے تیار کیا تھا اور اس وقت ایڈم نے اس پر توجہ دیے بغیر ہی دستخط کر دیے تھے اب معاہدے کی شرائط اسے اس طرح ازبر ہو گئی تھیں جیسے پرواز کے اصول۔

بے شمار باتوں کے علاوہ اس معاہدے میں دو باتیں بہت اہم تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر ایک شریک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا کمپنی کا مالک بن جائے گا۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ تھی کہ انتقال کی مختلف تشریح کی گئی تھی۔ ایک تشریح یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شریک غائب ہو جائے اور پچیس دنوں تک نظر نہ آئے تو بھی اسے مردہ تصور کیا جائے گا۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے بیکر نے بتایا تھا۔ ”دیکھو بعض اوقات جہاز اور اس کا عملہ خراب موسم کی وجہ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جہاز کو حادثہ پیش آتا ہے لیکن لوگوں کو پتا نہیں چل پاتا۔ اسی لیے پچیس دنوں کی شرط رکھی گئی ہے۔“

اس کے علاوہ ایک انشورنس پالیسی بھی تھی کہ اگر کوئی شریک غائب ہو گیا تو پچیس دنوں کے بعد دوسرے شریک کو ایک لاکھ ڈالرز مل جائیں گے۔

اس سے پہلے کبھی ایڈم نے بیکر کے قتل کے متعلق نہیں سوچا تھا لیکن اب اس معاہدے کو غور سے پڑھنے کے بعد وہ اپنی خواہش کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ایک دوپہر کو ایڈم چھوٹی سی پرواز کے بعد واپس آیا تو بیکر اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا، اس کا ایک پیغام رکھا ہوا تھا کہ وہ کچھ خریداری کے لیے شہر کی طرف جا رہا ہے، ایڈم کو اس بات کی فکر تھی کہ بیکر کے جانے کے بعد نہ جانے کتنے کاروباری اداروں کا فون آ چکا ہوگا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

”میں اے بی ائیر کمپنی سے بول رہا ہوں۔“ ایڈم نے کہا۔

”ہم لوگ کچھ سامان روانہ کرنا چاہتے ہیں۔“ کسی نے کہا۔

”کس جگہ؟“

”بین برج۔“

”بین برج۔“ ایڈم نے دہرایا پھر دیوار پر لگے ہوئے نقشے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھیں جناب! بین برج ملک کے بالکل شمالی کونے میں ہے، یہ جگہ چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے اور ان دنوں وہاں کا موسم بھی بہت خراب ہے۔“

”تم لوگ یہ کام کر سکتے ہو کہ نہیں؟“ آواز میں سختی تھی۔

”کیوں نہیں کر سکتے ...... ہمارا کام ہی یہی ہے۔“

”معاوضہ کتنا لو گے؟“

”بین برج تک آٹھ سو ڈالرز۔“ ایڈم نے جلدی سے کہا۔ وہ گاہکوں کے ساتھ نرمی اور معاوضہ لینے والی بیکر کی نصیحت کو اس وقت بھول گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس آواز نے کہا۔ ایڈم کو احساس ہوا کہ اس نے صرف آٹھ سو ڈالر بتا کر غلطی کی ہے، بہر حال وہ آٹھ سو ڈالرز کہہ چکا تھا۔ اس ایڈمی نے پھر کہا۔ ”لیکن وہ سامان کل اٹھانا ہوگا اور کل ہی پہنچانا ہے۔“

”کل سنیچر کا دن ہے جناب۔“ ایڈم نے جلدی سے کہا۔ اسے معاوضے میں اضافہ کرنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔ ”کل ہمارے یہاں چھٹی ہوتی ہے لیکن آپ کی خاطر یہ کام کرنا ہے۔ پائلٹ اوور ٹائم کے دو سو ڈالرز مزید لے گا۔“

ایڈم کی بات سن کر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ایڈم کو خدشہ ہوا کہ کہیں اس نے فون بند نہ کر دیا ہو لیکن کچھ دیر بعد اس آدمی کی آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے۔“

”بس تو جناب، اب آپ مجھے جلدی سے تفصیل بتا دیں۔“

بیکر تھوڑی دیر کے بعد ہی لوٹ آیا تھا۔ ”ہیلو، پرواز کیسی رہی؟“

”بہت اچھی! لیکن ہمیں زیادہ رقم نہیں مل سکی۔“

”معاوضہ تو ہم نے لیا ہے۔“

”ہاں معاوضہ تو لے ہی لیا ہے لیکن بہت معمولی معاوضہ ہے۔“

”وہ بے چارے اتنا ہی دے سکتے تھے۔“ بیکر نے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ اب ہم لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔“

ایڈم نے بیکر سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید اس کی غیر موجودگی میں کوئی فون آیا ہو لیکن اس نے بین برج والے معاملے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ بیکر نے کہا۔ ”میں دو دنوں تک تفریح کے موڈ میں ہوں۔ پہاڑوں پر جا کر اسکینگ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے برسوں سے تفریح نہیں کی۔“

”تم کب جا رہے ہو؟“ ایڈم نے پوچھا۔

”کل۔“ بیکر نے جواب دیا۔ ”طیارہ تو پرواز کے لیے تیار ہے نا؟“

”کیا تم طیارے پر جاؤ گے؟“ ایڈم ٹھٹکا گیا تھا۔

”یقیناً، بشرطیکہ یہ لائسنس ابھی تک کار آمد ہو۔“

ایڈم نے محسوس کیا کہ اب وہ بین برج والی بات چھپا نہیں سکتا اس لیے مجبوراً اس نے بیکر کو ساری بات بتا دی۔

”ٹھیک ہے، تم مجھے پہاڑوں پر اتارتے ہوئے چلے جانا۔“ بیکر نے کہا۔

WELCOME BOOK SHOP
SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بہت خوشی سے۔" ایڈم نے جواب دیا پھر وہ رات تک سوچتا رہا۔

دوسری صبح ایڈم مال لینے کی غرض سے کمپنی کے دین پر لیونکس برادرز کے یہاں پہنچ گیا۔ یہ لوگ تجہیز و تکفین کیا کرتے تھے۔ وہاں اس کی ملاقات چھوٹے لیونکس سے ہوئی جو خود چالیس برس سے کم کا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیونکس نے ایک بڑا سا گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔ "اپنی گاڑی کو اندر لے جاؤ۔"

ایڈم گاڑی کو گیٹ کے اندر لے گیا پھر گاڑی وہیں چھوڑ کر لیونکس کے دفتر آ گیا۔

لیونکس نے ایک کاغذ ایڈم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر ان لوگوں کے نام لکھے ہیں جن سے تمہاری ملاقات بین برج کے ائرپورٹ پر ہوگی۔" پھر اس نے ایک ہزار ڈالر کا ایک چیک ایڈم کو دے دیا "اور یہ رہا تمہارا معاوضہ۔"

"شکریہ۔" ایڈم نے بڑی احتیاط سے چیک کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی جناب۔" پھر اس نے کچھ رک کر لیونکس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جناب، کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کیا مال بھیج رہے ہیں؟"

"مال نہیں، وہ ایک لاش ہے۔" لیونکس نے کہا۔

"لاش!"

"ہاں مسز ہورشن کی لاش ہے، پچھلے دنوں اسپتال میں ایک آپریشن کے دوران اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی فیملی بین برج میں رہتی ہے۔ وہ لوگ لاش کو بین برج ہی میں دفن کرنا چاہتے ہیں اسی لیے لاش وہاں بھیجی جا رہی ہے۔ ایئرپورٹ پر تجہیز و تکفین کے ایک ادارے والے لاش کو آ کر لے جائیں گے اور قبرستان میں دفن کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ایڈم واپس جانے کے لیے مڑا لیکن لیونکس نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔ وہ پھر بول پڑا۔ "اگر میں اس عورت کا شوہر ہوتا تو اس کی موت کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کرتا۔" پھر اچانک وہ جیسے غصے میں بھر گیا تھا۔ "کفن دفن کا کام کرنے کے ناتے مجھے یہ بات نہیں کرنا چاہیے لیکن بے وقت کی موت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میرا ایک عرصے سے مردوں کے ساتھ ہی تعلق ہے، اس لیے میں یہ جانتا ہوں کہ اس عورت کو ابھی نہیں مرنا تھا۔ بہر حال یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔"

لیونکس اپنی بات ختم کر چکا تھا اسی لیے ایڈم دفتر سے باہر چل دیا۔

بیکر، ایڈم سے طیارے پر ہی ملا۔ حالانکہ بیکر چھوٹے قد کا آدمی تھا لیکن اس تابوت کو اٹھا کر طیارے کے اندر رکھنے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ بیکر نے بھی اپنا سامان طیارے پر لاد دیا اور ایڈم نے طیارے کا آخری جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اندر پہنچ کر ایڈم نے تمام آلات کی جانچ پڑتال کی اور اپنے اس پستول کو دیکھا جو اس کے پاس ائر فورس کے زمانے سے تھا۔ اب حفاظت کی غرض سے ہر وقت اس پستول کو اپنے ساتھ رکھنا ایڈم کی عادت بن گیا تھا۔

اس نے پستول کے چیمبر کو چیک کیا۔ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پستول کو سیٹ کے نیچے رکھتے ہوئے مڑ کر تابوت کی طرف دیکھا پھر بیکر پر نظر ڈالی۔ اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی اور اس کا دوران خون ایک دم تیز ہو گیا۔

"بین برج سے چند میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ہوائی پٹی ہے۔" بیکر نے ایڈم کو بتایا۔ "ایک مرتبہ اسے ایک کمپنی نے استعمال کیا تھا اور میری اطلاع کے مطابق یہ ابھی تک بہتر حالت میں ہے۔ آج کل اسے زیادہ تر کیمپ لگانے والے استعمال کرتے ہیں۔ تم مجھے وہاں اتار سکتے ہو۔ پھر میں اپنا سامان اٹھا کر کیمپنگ کے لیے پہاڑوں کی طرف نکل جاؤں گا۔"

طیارہ فضا میں پرواز کر چکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ایڈم کن آنکھیوں سے اپنے پستول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بیکر کی توجہ کسی دوسری طرف تھی۔

پرواز کے دوران وہ زیادہ تر خاموش ہی رہے تھے۔ بیکر نے ایک دو مرتبہ اسے بتایا کہ وہ کس طرح اپنی چھٹیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

بالآخر ہوائی پٹی نظر آنے لگی۔ بیکر نے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ ہوائی پٹی نظر آ رہی ہے۔"

"پہلے ہم اس کا جائزہ لیں گے۔" ایڈم نے طیارے کو نیچے لاتے ہوئے کہا۔ وہ ہوائی پٹی سے کچھ اوپر پرواز کرتا رہا۔ پھر اس نے طیارے کو اوپر اٹھا لیا۔

"مجھے تو یہ بہتر ہی حالت میں معلوم ہوتا ہے۔" بیکر نے کہا۔

"ہاں، لیکن تمہاری نظر کسی آدمی پر نہیں پڑی؟" ایڈم نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ ویران معلوم ہوتا ہے۔"

ایڈم چکر لگاتا رہا اسے اچانک ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی جنگی مہم پر طیارے کو لے کر بمباری کے لیے نکلا ہو

پھر اس نے رن وے پر طیارے کو اتار لیا۔ طیارہ کچھ دور تک دوڑتا رہا پھر رک گیا۔ بیکر اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ ایڈم کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ایڈم نے نشست کے نیچے ہاتھ کھسکا کر پستول تھام لیا۔ فیصلے کا لمحہ آ پہنچا تھا۔ یہ ایک مناسب ترین موقع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہچکچاہٹ سے کام لیا اور وقت ہاتھ سے نکل گیا تو ساری عمر پچھتانا پڑے گا۔ اس کا دوران خون پھر تیز ہو گیا۔ دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ بہ مشکل تمام اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔ "بیکر! اب جو قدم میں اٹھانے والا ہوں۔ اس پر مجھے تمام عمر افسوس رہے گا مگر کیا کروں حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہوں۔ مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ میں عرصے سے اس بارے میں پریشان ہوں۔ میرے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ اپنی تمام مشکلات اور پریشانیوں سے نجات حاصل کر لوں۔"

بیکر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں کیونکہ ایڈم کی باتیں اس کے پلے نہیں پڑی تھیں۔ اس نے ایڈم کو نشست کے نیچے سے پستول نکالتے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایڈم نے ہاتھ بلند کیا اور گولیاں اپنے پارٹنر کے سینے میں اتار دیں۔ وہ ایک منٹ تک ساکت بیٹھا رہا پھر اس نے حواس درست کیے اور ادھورے کام کو مکمل کرنے لگا۔ اس نے احتیاط سے تابوت کھولا اور مسز ہورشن کی لاش کو باہر نکال لیا پھر اس نے تابوت میں لگے ہوئے کشن اکھاڑ دیے اور بیکر کی لاش کو پشت کے بل لٹا دیا۔ کسی مشین کی سی مستعدی سے اس نے سارا خون صاف کیا اور خون آلود کپڑے بیکر کی لاش کے برابر ٹھونس دیے۔

کشن بیکر کی لاش پر ڈال کر ایڈم نے مسز ہورشن کی لاش کو واپس تابوت میں لٹا دیا۔ لاش ابھری ہوئی لگ رہی تھی، صاف محسوس ہوتا تھا کہ لاش کے نیچے کچھ ہے۔ مسز ہورشن کی لاش دوبارہ تابوت سے نکال کر اس نے بیکر کی لاش پر پڑے ہوئے کشن اٹھا لیے اور اطراف کے کشن بے دردی سے پھاڑنے لگا۔ ایڈم نے اس مرتبہ مسز ہورشن کے مردہ جسم کو لٹایا تو خاصا فرق محسوس ہوا۔ اب پہلے کی سی بات نہیں رہی تھی۔ ایک نظر ڈالنے سے کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایڈم نے ڈھکن مضبوطی سے تابوت پر جما دیا اور واپس پائلٹ کی سیٹ پر پہنچ گیا۔

ایڈم نے ایک مرتبہ پھر اپنے حواس درست کیے۔ طیارے کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے رن وے پر دوڑانے لگا۔

اچھی باتیں

☆ ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی جگہ کیوں ہے کہ ہم تمام رشتوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے۔

☆ جو کسی کی چھوٹی سی غلطی معاف نہیں کر سکتا، وہ کیسے یہ یقین کرے کہ خدا اس کے بڑے گناہ معاف کر دے۔

☆ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے لیے دل میں ایک قبرستان بھی بنا دیا جاتا ہے، جن میں اپنے محبوب کی ساری خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور ان پر کتبے بھی نہیں لگائے جاتے۔

☆ ہر زمین ایڑیاں رگڑنے کے لیے نہیں کیونکہ ہر زمین کے نیچے آب زم زم نہیں ہوتا۔

☆ اگر پہلے سفر کی صعوبتوں اور دکھوں کی وجہ سے پاؤں آبلہ پا اور وجود تھکاوٹ سے چور ہو تو کبھی دوسرے سفر کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے۔ منزل تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

چند ہی لمحوں بعد طیارہ فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ پانچ منٹ بعد اس نے ریڈیو پر بین برج کے ہوائی اڈے سے رابطہ قائم کر لیا۔

بعد کے حالات وہی رہے جس کا منصوبہ ایڈم نے ذہن میں بنا رکھا تھا۔ تدفین کمپنی کے آدمی ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ وہ عجلت میں معلوم ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو سے ایڈم کو معلوم ہوا کہ ٹیلی وژن پر ان کا پسندیدہ میچ آنے والا تھا اور وہ جلد از جلد مسز ہورشن کے تابوت کو دفنا کر اپنے گھروں کو پہنچ جانا چاہتے تھے۔

واپسی پر ایڈم نے بیکر کا کیمپنگ کا سامان نیچے پہاڑیوں میں گرانے کا فیصلہ کیا لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنا فیصلہ ملتوی کر دیا۔ اس کا یہ قدم خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ طیارے کو کسی اور سمت لے جا کر سامان دفن کر سکتا تھا۔

ایڈم کے دل و دماغ پر خوف کا غلبہ تھا، اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ بیکر کے قتل کا راز فاش ہو جائے گا اور وہ عمر بھر جیل میں مشقت کرتا رہے گا۔ سنیچر کو وہ ساری رات اسی فکر میں سو نہیں سکا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا اور وہسکی کی آدھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوتل چڑھا گیا۔ اتوار بھی اسی فکر اور پریشانی میں گزرا۔ شراب پی پی کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس نے بیکر کے بارے میں کئی ڈراؤنے خواب دیکھے۔ آخری ڈراؤنا خواب یہ تھا کہ بیکر دو پولیس والوں کو اسے گرفتار کرانے لایا تھا۔ سرخ سرخ خون اس کے سینے کے دو سوراخوں سے ابل رہا تھا اور کپڑے پسینے میں تربتر تھے۔ مسز ہورشن کی لاش بھی اسے خواب میں چلتی پھرتی دکھائی دی تھی۔

اتوار کی شب بھی بے آرام اور پریشان کن ثابت ہوئی۔ وہ خوف سے کانپتا رہا۔ پیر کی صبح اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دو اسپرین کی گولیاں نگلیں اور ایک دوسری ریاست کے مجوزہ دورے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو اس نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اس کا اعصابی تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ ہوائی جہاز میں دوسرا کوئی فرد موجود نہیں تھا اور وہ خود کو محفوظ تصور کر رہا تھا۔ زمین پر اس کے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا مگر ہزاروں فٹ اوپر اس کا بال بھی بیکا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ زمین پر خوف نے اس کا برا حال کر دیا تھا مگر فضا میں وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسے جنگ کے ایام یاد آ رہے تھے جب وہ اپنے بمبار طیارے میں دشمن کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہوتا تھا۔ چند گھنٹے بعد ایک بار میں اس کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اتنی شدید تھی کہ وہ کوشش کے باوجود سگریٹ نہیں سلگا سکا۔

پیر کی دوپہر ایڈم فارغ ہوا تو اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ طیارے کو واپس لے جا سکتا پھر اس پر تھکن بھی سوار تھی۔ اس نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کمرا لیا اور قریبی بار میں پہنچ کر جام پر جام چڑھا کر نشے میں دھت اور بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں پہنچا۔ کپڑوں اور جوتوں سمیت اپنے بستر پر گرا اور خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔

منگل کے روز ایڈم کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ گھر پہنچے گا تو پولیس حکام اس کے استقبال کو موجود ہوں گے اور پھر سوالات کا تکلیف دہ اور اذیت ناک سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس کا طیارہ رن وے پر اترا تو اس کا دل سینے میں دھڑدھڑانے لگا۔ جیسے ابھی باہر نکل آئے گا۔ اس کی کنپٹیوں پر دباؤ بتدریج بڑھنے لگا لیکن وہ گھر پہنچا تو کوئی بھی اس کا منتظر نہیں تھا۔ صورت حال ویسی ہی تھی، کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

بدھ کی صبح دفتر پہنچ کر ایڈم نے فیصلہ کیا کہ کسی کو بیکر کی گمشدگی سے مطلع کر دینا چاہیے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس کا دل ڈوب رہا تھا لیکن ایسا کرنا بے حد ضروری تھا۔ اس نے انتہائی دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا۔ اس نے شمال مشرق میں واقع فاریسٹ رینجر اسٹیشن کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ بیکر کسی جانب سے جنگل میں داخل ہوا تھا اور یہ کہ وہ پروگرام کے مطابق گھر نہیں پہنچا ہے۔ متعلقہ افسر نے ایڈم کو بتایا کہ اس طرف جنگل میں برفباری ہوئی ہے لہٰذا بیکر کی تلاش میں بے حد دشواری پیش آئے گی مگر وہ اس کے پارٹنر کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور اسے صورت حال سے باخبر رکھیں گے۔

ایڈم کی حالت اس وقت اور بھی غیر ہو گئی جب ایک پولیس افسر نے اسے فون کر کے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی۔ وہ اس سے چند سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ اس نے پولیس کو وہی کہانی سنا دی جو وہ فاریسٹ آفیسر کو سنا چکا تھا۔ چند روز بعد پولیس نے ایڈم کو فون کر کے بتایا کہ انہوں نے اس کی بیان کردہ کہانی کی تفتیش کی ہے اور انہیں اس کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ ایڈم کی جان میں جان آئی۔ لاش کے ملنے تک انہیں کسی گڑبڑ کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا اور اس امر کا ذرا سا بھی امکان نہیں تھا۔ ایڈم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور استدعا کی کہ انہیں کوئی نئی بات معلوم ہو تو اسے ضرور آگاہ کریں۔

تین ہفتے بعد ایڈم کا خوف کم ہونا شروع ہوا۔ پکڑے جانے کے خدشات دن بہ دن معدوم ہونے لگے۔ شمال مشرق میں زبردست برفباری ہوئی تھی جس کے نتیجے میں بیکر کی تلاش ختم کر دی گئی تھی۔ ایڈم کو یقین تھا کہ موسم بہار میں حالات معمول پر آ جائیں گے۔ اس نے انشورنس کمپنی سے ایک لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کیا اور ایک ہفتے میں چند رسمی کارروائیوں کے بعد رقم اسے ادا کر دی گئی۔ ایڈم کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اس نے معمولی مشاہرے پر ایک استقبالیہ کے لیے لیڈی کلرک کو ملازم رکھ لیا تاکہ وہ آرڈر وصول کرتی رہے۔ اس نے بیکر کی مقرر کردہ قیمتوں کو دوگنا کر دیا لیکن اس سے آرڈرز پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ دن بہ دن اس کا کام بڑھنے لگا۔ نوٹوں کی بارش ہونے لگی کمپنی کے اکاؤنٹ میں دھڑا دھڑ چیک جمع ہونے لگے۔ اس کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

بیکر کے قتل کا خیال جب بھی ایڈم کے ذہن کو پریشان کرتا وہ جنگ کے دنوں کے بارے میں سوچنے لگتا۔ ان دنوں اس نے سیکڑوں بم گرائے تھے اور ہزاروں افراد کو ہلاک کیا تھا۔ بیکر کو اس نے اپنی ضرورت کے تحت قتل کیا تھا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے یہ ٹھاٹ باٹ نہ ہوتے۔ اس کا کاروبار ترقی نہ کر رہا ہوتا۔ بیکر کے قتل کو اس نے ان

ہزاروں اموات میں شامل کر لیا تھا جو اس کی بمباری کے نتیجے میں ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اندر کے اس آدمی کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا جو اکثر اسے بیکر کے قتل پر لعنت ملامت کرتا تھا۔ اس نے اپنے دماغ سے جرم کے احساس کو مٹا دیا تھا اور اسی بنا پر اسے نیند بھی آنے لگی تھی، وہ سکون سے سونے لگا تھا ڈراؤنے خواب بھی اسے پریشان نہیں کرتے تھے۔ کھانا وہ پیٹ بھر کر کھانے لگا تھا، برسوں بعد اسے اتنا آرام اور سکون میسر آیا تھا۔

ایڈم ائرانسپورٹ کمپنی ترقی کے زینے طے کر رہی تھی۔ اسے علاقے کی سب سے بڑی کمپنی کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ ایڈم نے ایک نیا ہوائی جہاز خرید لیا تھا اور ایک تجربے کار ہواباز کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ خود بھی ہوائی جہاز چلاتا تھا کیونکہ فضائے بسیط میں اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ نئے سال کا آغاز ہوا تو ایڈم کو مقامی چیمبر آف کامرس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ وہ ذمے داریوں اور مصروفیتوں میں بیکر کے قتل کو تقریباً فراموش کر چکا تھا۔ اس بارے میں اس نے کئی دلیلیں اور تاویلیں گھڑ لی تھیں جن سے وہ خود کو بہلا لیا کرتا تھا۔ اس راز کو اس نے جنگ کی یادوں میں دفن کر دیا تھا۔

وہ بیکر کے خیال سے مکمل طور پر پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے ذہن کو کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ لوگ اکثر بیکر کا ذکر چھیڑ دیتے تھے اور یوں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا مگر اس عرصے میں اس نے اپنے دل و دماغ پر قابو پا لیا تھا۔ بہت جلد وہ اس منحوس خیال سے چھٹکارا حاصل کر لیتا تھا۔

ایک روز ایڈم صبح آرڈر چیک کرنے دفتر پہنچا تو استقبالیہ کلرک مسکرا کر بولی۔ ”جی ہاں۔ دو آرڈر موجود ہیں۔ ایک آرڈر سٹن کا ہے اور دوسرا بین برج کا۔“

ایڈم کا سر چکرا گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے بمشکل تمام اپنی حالت پر قابو پایا۔ بیکر کی موت کو ایک سال ہو چکا تھا اور اس دوران میں بین برج کا یہ پہلا آرڈر موصول ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ وہ بین برج کا کام خود کرنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”سٹن کا آرڈر میں نمٹاؤں گا۔ ہاورڈ کو تم میرے کمرے میں بھیج دو۔ وہ بین برج چلا جائے گا، مجھے اس سلسلے میں اس سے بات کرنا ہے۔“

پندرہ منٹ بعد پائلٹ ہاورڈ اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایڈم نے اسے بتا دیا کہ بین برج کا کام اسے نمٹانا پڑے گا۔

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ ہاورڈ نے کہا۔

اس روز سہ پہر کو ہاورڈ کے آنے سے پہلے ایڈم دفتر پہنچ چکا تھا۔ وہ مہینے بھر کے آرڈرز کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس مہینے تو اس نے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ تھوڑے عرصے میں اس نے بڑی تیزی سے کاروبار کو مستحکم کر لیا تھا اور وہ اس پر بجا طور پر ناز کرتا تھا۔ بیکر کو وہ دل و دماغ سے نکال چکا تھا، اسے معلوم تھا کہ بیکر کی موت کا خیال اسے پریشان نہیں کر سکتا۔

ہاورڈ جلد ہی لوٹ آیا۔ وہ نوجوان اور محنتی پائلٹ تھا۔ اس پر پورے طور پر بھروسا کیا جا سکتا تھا کمپنی کو ایسے ہی ذہین اور محنتی آدمی کی ضرورت تھی۔

”تمہارا دورہ کیسا رہا؟“ ایڈم نے پوچھا۔

”جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گا۔ آپ اس پر یقین نہیں کریں گے۔“ ہاورڈ نے کہا۔

”کیوں نہیں کروں گا؟ کیا خراب موسم میں پھنس گئے تھے؟“

”نہیں موسم تو بے حد خوشگوار تھا۔ بس سامان نے پریشان کر دیا تھا۔“

”تم وہاں کیا سامان لے کر گئے تھے؟“

”میں وہاں کوئی سامان لے کر نہیں گیا تھا لیکن وہاں سے جو کچھ میں لایا ہوں۔ آپ اس پر یقین نہیں کریں گے۔ کل صبح میں سب سے پہلے طیارے کے اندر جراثیم کش دوائیں چھڑکوں گا۔ موجودہ صورت میں تو میں ہوائی جہاز نہیں چلا سکتا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“ ایڈم نے جلدی سے کہا۔

”سال بھر پہلے ایک عورت کا انتقال آپریشن ٹیبل پر ہو گیا تھا۔ اب انہیں ڈاکٹر پر غفلت اور بے پروائی کے سلسلے ..... میں مقدمہ چلانے کا خیال آیا ہے۔ عورت کے ورثا نے عدالت سے لاش کے پوسٹ مارٹم کا حکم نامہ حاصل کر لیا ہے لہٰذا تابوت قبر سے نکال کر یہاں لانا پڑا۔ میں وہ تابوت ہی اسپتال پہنچا کر آ رہا ہوں۔ لاش کی سڑاند نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ ممکن ہے میں بیمار پڑ جاؤں۔“

لیکن ایڈم اس سے پہلے بیمار پڑ چکا تھا۔ وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور جسم کپکپا رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

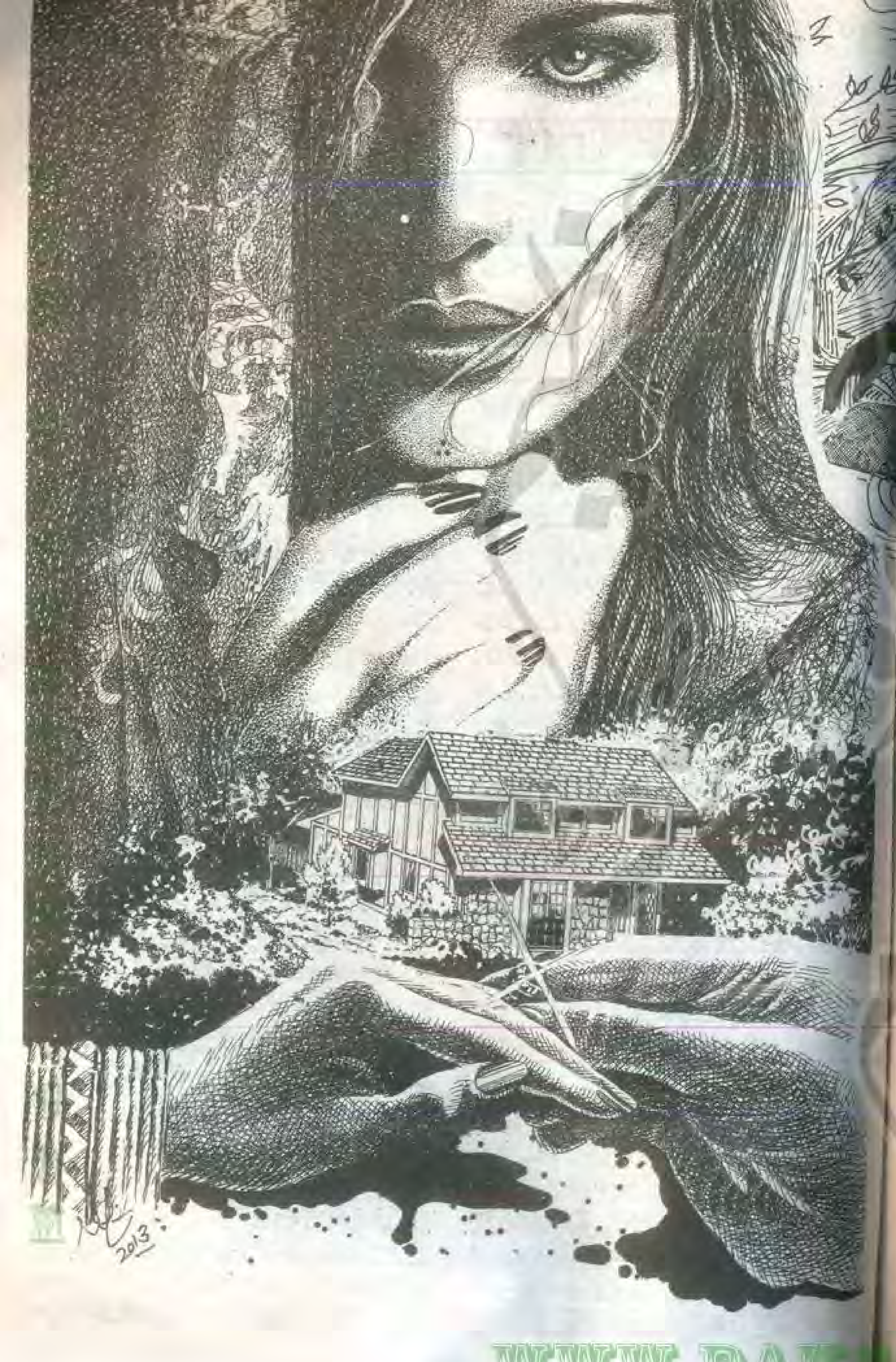

دولت کے پاؤں

عائشہ فاطمہ

وقت کی بساط پر انسان بادشاہ بھی بنتا ہے اور غلام بھی... مگر اس کے آنے اور جانے کی کوئی آہٹ نہیں ہوتی جس طرح چور کے پاؤں نہیں ہوتے مگر کہتے ہیں کہ دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی کھٹکا سنائی نہیں دیتا... وہ بھی زندگی کی لذتوں، رعنائیوں سے محروم تھا کہ اچانک چھپن کروڑ کی ایک چوتھائی اس کے ہاتھ لگ گئی... پھر تو وہی وقت اس کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا... محبت اس کی باندی، عشق اس کا غلام تھا اور وہ خود لفظوں کا ایسا جادوگر تھا کہ زمانے کی گردشیں تک تھم گئیں... وہ جس کو نظر بھر کر دیکھ لیتا، اس کے سحر سے آزادی ممکن نہ تھی پھر... وقت کا پنچھی تھوڑا اور آگے بڑھا اور اپنے پر پھیلا دیے... ایسے میں محبت جب باندی بن کر دل پر قابض ہو جائے تو دل دھڑکنا بھول جاتا ہے... اس کی تال میں بھی فرق آنے لگا تھا اور چال میں بھی... ایسے میں تھمنے والی گردشوں نے دوبارہ رقص شروع کیا اور اسے نظر بھر کر کسی کو دیکھنے کا موقع تک نہ دیا... بالآخر اس ساحر کے سارے منتر الٹے ہو گئے... چھپن کروڑ کی وہ ایک چوتھائی انہی گردشوں میں جانے کہاں گم ہو گئی... شاید اسی کو وقت کا پلٹنا کہتے ہیں پھر وہی آزاری... وہی بے زاری... مگر درمیان کا یہ وقفہ اسے زندگی کی حکایتوں سے روشناس کرا گیا۔

رمز بھری کائنات میں ایک ضمیر فروش...... خطاکار کی شوریدہ سری

WWW.PAKSOCIETY.COM

چور کے پاؤں ہوں نہ ہوں دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔

برسوں پہلے سنا ہوا یہ فقرہ نہ جانے کیوں اس وقت اس کے کانوں میں گونجنے لگا تھا حالانکہ نہ یہ کوئی موقع تھا نہ محل، وہ اس وقت ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا جہاں ہر طرف بچے تتلیوں کی طرح اڑتے پھر رہے تھے۔ کچھ پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہ وہ عورتیں تھیں جو بنچوں پر ادھر ادھر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں بچوں کی نگرانی پر لگی ہوئی تھیں۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ دور بیٹھا ایک نوجوان انہیں کس قدر شوق سے دیکھ رہا ہے۔ اس نوجوان کا نام عبدالرشید تھا۔ کرائے کی ٹیکسی چلاتا تھا اور کرائے کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ آٹھویں کلاس تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن سوچتا فلسفیوں کی طرح تھا۔

''چور کے پاؤں ہوں نہ ہوں دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔''

ایک مرتبہ پھر یہ فقرہ اس کے ذہن میں گونجا۔ پہلے تو اس نے اسے اپنی ذہنی اختراع سمجھا لیکن فوراً ہی مولوی برکت علی کا خیال آگیا۔ اسے یاد آیا، ایک مرتبہ مولوی صاحب نے یہ فقرہ اس کے سامنے دہرایا تھا۔ مولوی صاحب کا خیال آتے ہی بہت سی یادیں سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔ عجیب آدمی تھے وہ بھی۔ نئے زمانے میں رہتے ہوئے بھی سیکڑوں برس پہلے کی دنیا میں رہتے تھے۔ بجلی کی جگہ چراغ جلاتے تھے۔ گھر میں ریڈیو تک نہیں تھا۔ ان کے لیے مشہور تھا کہ وہ پچھلے دس برسوں میں گھر سے باہر نہیں نکلے۔ سودا سلف کون لاتا تھا، کھاتے پکاتے کیا تھے، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ گھر کیا تھا، دربار عام تھا جس کا جی چاہے آئے، بیٹھے، ان کی باتیں سنے چلا جائے۔ عبدالرشید کو یاد آیا۔ اس نے بھی اپنے ایک دوست کے ہمراہ ان کے دربار میں حاضری دی تھی لیکن چند حاضریوں کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مولوی صاحب کی باتیں سننے میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ روح کو سکون بھی ملتا ہے لیکن جسم کی تشنگی کا سامان مہیا نہیں ہوتا۔ باتیں وہیں رک جاتی ہیں، زمانہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی باتوں میں اثر ضرور تھا لیکن وہ زمانے کے ساتھ نہیں چل رہے تھے۔ اس لیے ان کے گھر سے باہر نکلتے ہی باتوں کا اثر ختم ہوجاتا تھا۔ عبدالرشید کو ان سے یہی اختلاف پیدا ہوا تھا کہ علم تو وہ ہے جو زمانے کے ساتھ چلنا سکھائے۔ بس وہ اتنا ہی سیکھ سکا تھا کہ سچ بولو اور صبر وقناعت اختیار کرو۔ وہ اب تک یہی کر رہا تھا۔ اس کے بہ قول وہ اسی لیے اتنا پیچھے تھا کہ ابھی تک کرائے کی ٹیکسی چلا رہا تھا۔ ایک ٹیکسی تک نصیب نہیں ہوسکی تھی۔

اس نے مولوی صاحب کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے سامنے بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کو گھورنا شروع کردیا۔ اسی وقت چند بچے دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک بچہ گر پڑا دوسرے بچے اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جس بچے نے کندھا مار کر گرایا تھا وہ سب سے آگے تھا۔ اس کا دھیان ایک مرتبہ پھر مولوی صاحب کی طرف چلا گیا۔ مولوی صاحب کے پاس گرے ہوئے بچے ہی تو آتے ہیں۔ جو بھاگ کر آگے نکل گئے وہ ان کے ہاتھ کہاں آنے والے۔ کامیاب تو وہ ہوتے ہیں جو پیچھے رہ جانے والوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے لیے رک نہیں جاتے۔ مولوی صاحب کی درس گاہ کا یہ قاعدہ نہ ہو لیکن دنیا کا تو یہی قاعدہ ہے۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سامنے بیٹھی ہوئی عورت کو گھورنا شروع کردیا تھا۔ اس کے قیمتی لباس پر نظر ڈالی۔ پھر اپنے میلے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ یہ فرق کیوں ہے؟ مولوی صاحب نے کہا تھا، یہ نظام قدرت ہے۔ میں اسے نہیں مانتا۔ قدرت اتنی بے درد نہیں ہوسکتی۔ یہ نظام تو انسان کا بنایا ہوا ہے۔ جو اس نظام کا حصہ بن جاتے ہیں وہ زرق برق لباس پہنتے ہیں جو اس سے باہر نکل جاتے ہیں میری طرح میلے کپڑے پہننے لگتے ہیں۔ مولوی صاحب اسی کو قناعت کہتے ہیں۔ قناعت کرنے والوں کی تو بیویاں بھی ان سے خوش نہیں رہتیں، وہ خود کیا خوش رہیں گے۔ اس لڑکی کے چہرے پر دیکھو کیسا اطمینان ہے۔ قناعت کرنے والے چہرے اتنے مطمئن کب ہوتے ہیں؟ اس لڑکی نے ایک مرتبہ بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ کیوں دیکھے صبر وقناعت کے پیکر کو۔

اس فقرے نے پھر شور مچایا۔ ''چور کے پاؤں ہوں نہ ہوں دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔'' میں اس لڑکی کا پرس اٹھا کر بھاگ جاؤں تو پاؤں میرے ہوئے دولت کے کہاں ہوئے۔ اگر مولوی صاحب سچے ہوتے تو یہ پرس خود بخود میرے پاس چل کر آگیا ہوتا۔

وہ اب ان سوچوں سے بے زار ہوچکا تھا۔ اس نے بچوں کو کھیلتے، عورتوں کو بیٹھے چھوڑا اور پارک سے باہر نکل آیا۔ باہر اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس نے بے دلی سے چابی گھمائی ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ایک طرف کو چل دیا۔ وہ ایک پوش علاقے سے گزر رہا تھا۔ ایسے علاقوں میں سواری ملنے

کے امکان تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہ جلد سے جلد ان بنگلوں کے درمیان سے گزر کر شاہراہ پر آنے کے لیے موڑ کاٹ رہا تھا کہ کسی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ یہ شخص شاید قریب کی کسی کوٹھی سے نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ عبدالرشید نے ٹیکسی اس کے قریب لے جاکر روک دی۔ وہ شخص اتنی جلدی میں تھا کہ کچھ کہے سنے بغیر پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''بڑے صاحب کہاں چلوں؟''

''نارتھ ناظم آباد اور ہاں ذرا جلدی کرو، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تیز چلاؤ۔''

اس شخص کی آواز کانپ رہی تھی۔ عبدالرشید نے سامنے لگے آئینے میں پیچھے دیکھا۔ وہ شخص پچھلی سیٹ پر تقریباً نیم دراز تھا۔ عبدالرشید کے دل میں شک کی آندھیاں چلنے لگیں۔ یہ آدمی کسی کا بریف کیس لے کر تو نہیں بھاگا ہے جو اتنا گھبرایا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ کہیں میں بھی نہ پھنس جاؤں۔ اس نے غیر شعوری طور پر ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دور جاکر اسے محسوس ہوا جیسے وہ کراہ رہا ہو۔ اس نے شیشے میں دیکھا۔ وہ آدمی سیٹ پر لیٹ گیا تھا۔ ''معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔'' اس نے سوچا ٹیکسی کو ایک سائڈ میں پارک کیا پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس آدمی کی آنکھیں بند تھیں اور اب کراہ بھی نہیں رہا تھا۔

''کیا مرگیا؟'' عبدالرشید کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نبض ٹٹولی۔ نبض کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ابھی زندہ ہے لیکن مر بھی سکتا ہے۔ پہلے اس نے سوچا، کیوں کسی بکھیڑے میں پڑے۔ بڑے میاں کو کسی ویرانے میں پھینک کر چلتا بنے۔ اسپتال لے گیا تو پولیس کیس بنتے دیر نہیں لگے گی۔ بریف کیس پر نظر پڑتے ہی اس کی نیت مزید ڈانواڈول ہونے لگی۔ ممکن ہے یہ بریف کیس نوٹوں سے بھرا ہوا ہو۔ میں بریف کیس رکھ لوں اور اس شخص کو کہیں پھینک دوں۔ وہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ایک ٹریفک سارجنٹ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے فوراً گیئر ڈالا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ ٹریفک سارجنٹ کچھ دیر اس کے پیچھے رہا اور پھر دوسری طرف مڑ گیا۔

سارجنٹ کے رخصت ہوتے ہی عبدالرشید کا دھیان پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے آدمی کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنی فطرت کے منافی سمجھا کہ کسی مرتے ہوئے آدمی کو کسی جگہ چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ کسی نے پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تو خوامخواہ پھنس جائے گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ اسے اسپتال تک پہنچا دیا جائے۔ قسمت ہوگی تو بچ جائے گا۔ رہا بریف کیس، وہ تو میری ٹیکسی میں پڑا ہے پڑا رہے گا۔ ہوسکتا ہے اس میں کوئی نقدی ہو، اسپتال قریب آگیا تھا۔ اس نے کچھ اور سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ٹیکسی لے کر سیدھا اسپتال پہنچا۔ کچھ لوگوں کی مدد سے بے ہوش آدمی کو اسٹریچر پر ڈالا اور ایمرجنسی میں پہنچ گیا۔

وہ کم پڑھا لکھا ضرور تھا لیکن مولوی برکت علی کی صحبت میں بیٹھا تھا اور پھر اتنے عرصے سے ڈرائیوری کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسپتال والے بال کی کھال نکالیں گے۔ یہ شخص مر گیا تو نہ جانے کتنے دن تھانے کے چکر لگانے پڑیں گے۔ وہ راستے ہی میں سوچ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

مریض کی حالت تشویش ناک تھی اس لیے جاتے ہی بیڈ مل گیا لیکن ابھی کاغذی کارروائی مکمل کرنی تھی۔ سرکاری اسپتال تھا اس لیے محض سو روپے کی پرچی بنوانی تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو روپے تو اس کے پاس تھے۔ وہ اتنی انسانی خدمت تو کر ہی سکتا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر گیا۔

''مریض کا نام؟''

''رئیس خاں۔'' اس نے پہلے سے سوچا ہوا فرضی نام بتادیا۔

''مریض کو لانے والے کا نام؟''

''بلقیس خاں۔''

''یہ کیسا نام ہے۔'' کلرک نے شرارت سے کہا۔

''ہم پٹھانوں میں ایسے ہی نام ہوتے ہیں۔''

''آپ کی اردو تو صاف ہے۔''

''میں کراچی میں پیدا ہوا ہوں۔''

''مریض سے آپ کا رشتہ کیا ہے۔''

''وہ میرے چچا ہیں۔''

''اس نے ضروری اندراجات کرائے اور وارڈ میں آگیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ بزرگ کی حالت اب کیسی ہے۔ نرس نے اسے دیکھتے ہی ایک پرچہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ انجکشن فوراً لے کر آیئے۔''

''کتنے تک کے ہوں گے۔''

''ذرا مہنگے ہیں، تین چار ہزار کے تو ہوں گے۔''

عبدالرشید نے پرچے پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ ''بیٹا رشید، اب آگیا بھاگنے کا وقت۔ ایک ساتھ اتنے پیسے تو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے، انجکشن

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہاں سے لاؤں گا۔'' وہ تقریباً بھاگتا ہوا اپنی ٹیکسی تک آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے بریف کیس کا خیال آیا، بریف کیس کھول کر تو دیکھوں۔ شاید اس میں اتنے پیسے ہوں کہ انجکشن آسکیں۔ یہ آخری نیکی بھی کر ہی دوں۔ انجکشن لے آؤں۔ شاید اس کی جان بچ جائے، اس نے ہاتھ بڑھا کر بریف کیس اٹھایا اور کھولا۔ اس نے گھبرا کر بریف کیس بند کر دیا کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ بریف کیس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ لاکھوں تو ہوں گے۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے، اتنے پیسوں میں چند انجکشن کیا میڈیکل اسٹور خرید سکتا ہوں لیکن کیوں خریدوں۔ اب تو اس شخص کو مر ہی جانا چاہیے۔ زندہ رہا تو میری تلاش شروع کر دے گا، دل کی تسلی کے لیے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جانے کس کے چھین کر لایا تھا اب میرے ہاتھ لگ گئے۔ شام سے گردش کرنے والا فقرہ ایک مرتبہ پھر ذہن میں گردش کرنے لگا۔

''چور کے پاؤں ہوں نہ ہوں دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔''

مولوی برکت کی کسی بات میں صداقت ہو نہ ہو یہ بات انہوں نے بالکل ٹھیک کہی تھی۔ دولت خود بخود چل کر میرے پاس آگئی ہے۔

اپنے ایک کمرے کے مکان کا تالا کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اس نے اردگرد کے مکانوں پر حقارت کی ایک نظر ڈالی اور گھر میں داخل ہوگیا۔ خوف زائل کرنے کے لیے اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی ٹی وی آن کر دیا۔ ٹی وی پر ایک بینک ڈکیتی کی خبر نشر ہو رہی تھی۔ ڈاکو لاکھوں روپے لوٹ کر فرار ہو گئے تھے۔

عبدالرشید کے ضمیر نے اسے تھپک تھپک کر لوری سنائی۔ ایک میں نے ہی کیا کسی کو لوٹا ہے۔ آج کل ہر طرف یہی لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ اگر بریف کیس میرے ہاتھ نہ لگا ہوتا کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا۔ اسے وہ بچہ یاد آگیا جو اس نے پارک میں دیکھا تھا۔ جسے کندھا مار کے دوسرے بچے آگے بڑھ گئے تھے۔ میں بھی ان بڑے میاں کو گرا کر آگے بڑھ آیا ہوں۔ دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے یہی ہوتا رہے گا۔ آج کل لاقانونیت اتنی ہے کہ کوئی نہیں پکڑا جاتا۔ مجھے بھی کوئی نہیں پکڑے گا۔ اب میں گرا ہوا بچہ نہیں کہ مرہم پٹی کے لیے مولوی برکت علی کے پاس جاؤں۔ اب تو میں اس دولت سے کوئی کاروبار کروں گا اور ٹھاٹ کی زندگی گزاروں گا۔ کاروبار کا خیال آتے ہی اسے بریف کیس یاد آیا۔ رقم گن کر تو دیکھوں کتنی ہے تاکہ کاروبار کا انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔ اس نے اطمینان کر لیا کہ دروازہ اچھی طرح بند ہے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح گرا دیے اور بریف کیس کھول کر رقم گننے بیٹھ گیا۔

گلشن کے علاقے میں کئی دن سے ایک بیکری پر ''سپر اسٹار'' کا بورڈ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا تھا۔ یہ بیکری نہایت شاندار پیمانے پر کھولی گئی تھی۔ مکمل ایئر کنڈیشنڈ، شیشوں کے دروازے، دروازے کے باہر دربان، صفائی کا مکمل انتظام، چند روز میں اس بیکری میں ملنے والی اشیا کی بھی دھوم مچ گئی۔ دور دور سے خریدار آنے لگے۔ گاڑیوں کی قطاریں لگنے لگیں۔

اس بیکری کے اوپر فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ بیکری کے مالک نے انہی فلیٹوں میں سے ایک فلیٹ اپنی رہائش کے لیے خرید لیا تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ بیکری کے مالک کا نام عبدالرشید تھا۔

بیکری رات ہی کو بند کر دینی پڑی تھی کیونکہ دوسرے دن ہڑتال کا اعلان ہوگیا تھا۔ ماحول بنانے کے لیے لڑکوں کی ٹولیاں سڑکوں پر نکل آئی تھیں۔ جلاؤ گھیراؤ شروع ہوگیا تھا۔ دکانوں کو زبردستی بند کرایا جا رہا تھا حالانکہ ہڑتال دوسرے دن تھی۔ اس کے ملازموں نے بھی جلدی جلدی شٹر گرائے اور بیکری بند کر دی۔ عبدالرشید بھی سیڑھیاں چڑھ کر فلیٹ پر آگیا۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا اور پھر اس ارادے سے سو گیا کہ کل بیکری بند رہے گی وہ دیر تک سوتا رہے گا۔

ایک نرم سی دستک سے اس کی نیند اچٹ گئی لیکن اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دستک پھر ہوئی۔ شاید ہڑتال ملتوی ہوگئی ہو۔ کوئی ملازم مجھے بلانے آیا ہو۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے دس بج رہے تھے۔ اتنی دیر میں تیسری مرتبہ دستک ہو چکی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس عورت...... عورت نہیں لڑکی کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی تھی جو اس وقت دروازے پر کھڑی تھی۔ لڑکی بھی ایسی جیسے روشنی نے لباس پہن لیا ہو۔ لوگوں کی زبان ہکلاتی ہے اس کا دل ہکلانے لگا تھا۔

''جی فرمائیے۔''

''آپ کی بیگم اندر ہیں؟''

''نہیں تو۔''

''اگر وہ نہ ہوں تو کیا میں اندر نہیں آسکتی؟''

''مناسب تو نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو......''

''میکے گئی ہوں گی آپ کی بیگم؟'' اس عورت یا لڑکی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''یہ فلیٹ کسی کی سسرال نہیں۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی ہے۔''

''اوہ! میں نے آپ کو خواہ مخواہ اداس کر دیا۔''

''کوئی بات نہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں ابھی تک آزاد ہوں۔''

''میرا نام نیلوفر ہے۔'' اس لڑکی نے اجازت لیے بغیر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ ایک ہفتہ پہلے ہی اس بلڈنگ میں آئے ہیں۔ آپ کے بالکل نیچے والا فلیٹ ہے۔''

عبدالرشید کو اب اس کی ذات میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ یہ غلط فہمی دور ہوگئی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور سے ملنے آئی ہے۔ اسے اچانک یاد آیا کہ وہ ابھی تک کنوارا ہے اور شاید یہ لڑکی بھی۔

''آپ کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟''

''کوئی نہیں۔ بس میں اور میرے شوہر۔''

یہ سننا تھا کہ عبدالرشید کو یوں لگا جیسے اس کے پاؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ جیسے وہ ابھی کھڑے کھڑے گر جائے گا، اس کے کنوارے ذہن نے نہ جانے کیسے کیسے منصوبے بنا لیے تھے۔ سب ہوائی قلعے مسمار ہوگئے۔

''آپ بیٹھیے، میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔'' کسی کو بھگانے کے لیے یہی ایک حربہ ہوتا ہے۔ عبدالرشید نے بھی یہی حربہ استعمال کیا۔

''آپ تو روز ہی بناتے ہوں گے۔ آج میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ آپ بتاتے جائیے گا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔''

عبدالرشید اس کی اس بے تکلفی پر حیران ہو رہا تھا بات یہ ہے کہ پرائی عورت کی بے تکلفی کسے بری لگتی ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ چائے بنانے کھڑا ہوگیا۔

''کیا کرتے ہیں آپ کے شوہر؟''

''آمدنی بڑھانے کے سوا سب کچھ کرتے ہیں۔ ایک دفتر میں کلرک تھے آج تک وہیں جمے ہوئے ہیں۔ آپ کی طرح ایک بیکری تک نہیں کھول سکے۔''

''آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ سپر اسٹار بیکری میری ہے؟''

''آخر آپ کی ہمسائی ہوں۔ بس یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ اب یہ بھی معلوم ہوگیا۔''

''آپ بڑی اچھی باتیں کرتی ہیں۔''

''اگر میرے شوہر کے سامنے آپ نے یہ بات کہہ دی تو وہ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا قرار دیں گے۔''

''کسی دن انہیں بھی لے کر آئیے۔ بات صاف ہوجائے گی۔''

''وہ کہیں آنے جانے کے قائل ہی نہیں۔ میں ہی ہوں جو ہمسایوں کی خبر گیری کرتی رہتی ہوں۔''

وہ اب چائے بنا چکی تھی۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ پھر وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ مجھے اچھے آدمی لگے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کبھی کبھی آجایا کروں؟''

''پڑوسیوں کا آنا کسے برا لگتا ہے۔ آپ روز آیا کریں۔''

''صرف پڑوسی؟'' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ چلی گئی لیکن بعض لوگ جانے کے بعد بھی موجود رہتے ہیں۔ وہ بھی ابھی تک وہیں موجود تھی لیکن عبدالرشید باتیں کرنا بھول گیا تھا۔ بس اس کی خوشبو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک حسین خواب دیکھا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ یہ خواب ٹوٹے۔ وہ بستر پر گر گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ خواب نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ بال تھے کہ ریشم کے لچھے، آنکھیں تھیں کہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ، چہرہ کیا تھا کہانیوں کی کتاب تھی۔ باتیں شکر میں ڈھلی۔ ہنسی پھلجھڑی، بے تکلفی ایسی کہ ابھی گلے میں بانہیں ڈال دے گی۔ صاف، کھوٹ سے پاک، بے باک، کیا وہ پھر آئے گی؟ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ شادی شدہ ہے۔ میں خیانت کا مرتکب ہو رہا ہوں اور وہ؟ وہ پڑھی لکھی عورت ہے۔ دو گھڑی مجھ سے ہنس کر بات کر لی تو میں سمجھ رہا ہوں وہ مجھ پر مرنے لگی۔ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ وہ مجھے کیا بنا گئی ہے۔ وہ اٹھا اور غسل خانے میں جا کر شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا۔

غسل کرنے کے بعد وہ جان بوجھ کر نیچے اترا کہ نیلوفر کے فلیٹ کے سامنے سے گزرے گا۔ اس کا دروازہ بند تھا لیکن وہ یہ سوچ کر خوش تھا کہ شاید وہ اسے دروازے کی اوٹ سے دیکھ رہی ہو۔ وہ نیچے اترا ضرور تھا لیکن کمپاؤنڈ سے باہر نہ جا سکا۔ باہر ٹائر جل رہے تھے۔ گاڑیوں پر پتھراؤ ہو رہا تھا۔ کئی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔ چوکیدار نے اسے بتایا کہ کچھ فاصلے پر دو گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا ہم کیسے لوگ ہیں۔ اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ غصہ کہیں کا ہوتا ہے، اتارتے کہیں ہیں۔ زندہ قومیں اپنے اثاثوں کی حفاظت کرتی ہیں اور ہم انہیں سڑکوں پر لٹا دیتے ہیں۔ ہم کسی کو دے تو کیا سکتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں، ہمیں تو مانگنا بھی نہیں آتا۔ یہ بے صبری ہے یا بے حسی؟

وہ کچھ دیر مین گیٹ سے باہر جھانک جھانک کر دیکھتا رہا لیکن جب پولیس نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تو چوکیدار نے دروازہ بند کر دیا۔ بلڈنگ کے بہت سے لوگ نیچے اتر آئے تھے۔ وہ ان میں نیلوفر کے شوہر کو تلاش کرتا ہوا اپنی سیڑھیوں تک آ گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر نیلوفر کے فلیٹ کے سامنے سے گزرا۔ دروازہ اب بھی بند تھا۔

بیکری اگر کھلی ہوتی تو اس کا دل بہل جاتا۔ حالات ایسے تھے کہ گھر میں بند ہو گیا تھا۔ نیلوفر کے انتظار کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ آ جائے۔ اسی امید سے کھیلتے ہوئے شام ہو گئی۔ اب اسے یہ فکر ہونے لگی تھی کہ ہوٹل تو سارے بند ہوں گے، آج رات کا کھانا وہ کہاں کھائے گا۔ ایک خیال نے اس کے دل میں سر ابھارا کیوں نا نیلوفر کے گھر چلا جائے۔ کھانے کا وقت ہوگا تو شاید وہ کھانے کے لیے پوچھ لے۔ اسے اپنی حالت پر ہنسی بھی آئی غصہ بھی۔ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کتنا گر جاتا ہے۔ اس کے شوہر سے اگر تعارف ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ وہ گھر میں اکیلی تو نہیں رہتی کہ دندناتا ہوا چلا جاؤں۔ ڈبل روٹی رکھی ہے۔ مکھن بھی ہے، جیل بھی پڑی ہوگی۔ ذرا بھوک اور چمکنے دو، کھا لوں گا۔ دل بہلانے کے لیے اس نے ٹی وی کھول دیا تھا۔ وحشت ناک خبریں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

اسی مانوس دستک نے اس کے کان کھڑے کر دیے۔ اسے معلوم تھا کون آیا ہے۔ اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور دروازے پر پہنچ گیا۔ وہی ہوا جس کی امید تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

''اچھے دن آتے ہیں یہ تو سنا تھا، اچھی راتیں بھی آتی ہیں یہ اب دیکھ رہا ہوں۔'' عبدالرشید نے کہا اور نیلوفر کو اندر آنے کے لیے جگہ دے دی۔

''میں نے سوچا شہر میں اندھیرا ہے، تمام ہوٹل بند پڑے ہیں۔ آپ نے کھانا تو کھایا نہیں ہوگا۔ میں کھانا لے آئی ہوں۔''

''نیلوفر، ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گی؟''

''کہیے۔''

''انسان کو وہ کام کرنا چاہیے جس پر وہ ہمیشہ عمل کر سکے۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔ ہڑتالیں بھی آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کب تک میرے لیے کھانا لے کر آتی رہیں گی۔ آپ کے ہاتھ کی عادت پڑ گئی تو بازار کا کھانا پسند بھی نہیں آئے گا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آئندہ آپ کے لیے کھانا لے کر نہیں آؤں گی۔ بس آج برداشت کر لیں۔''

''آپ برا مان گئیں؟'' عبدالرشید نے اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''نہیں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ آپ مرد ہیں اور میں عورت اور ہم دونوں غیر ہیں۔''

عبدالرشید نے دیکھا، نیلوفر کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر آ گئے ہیں۔

''آپ کھانا کھائیں، میں ذرا آپ کا گھر دیکھ لوں۔''

وہ سمجھا تھا کہ وہ کمروں کو دیکھ بھال کر لوٹ آئے گی لیکن اس نے بیڈشیٹ کی شکنیں درست کیں، تکیوں کو اپنی جگہوں پر رکھا۔ کھڑکیوں کے پردے درست کرتی رہی۔ باورچی خانے میں جا کر جو دو چار کپ تھے انہیں دھویا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

عبدالرشید اب تک ان دو ملاقاتوں کو ہمدردی کی ملاقاتیں سمجھ رہا تھا لیکن اب اسے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی تھی۔ اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے؟ یہ محرومیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ انسان زندگی بھر ان محرومیوں کے خانوں میں رنگ بھرنے میں مشغول رہتا ہے۔ یہ بے چاری بھی یہی کر رہی ہے۔ میں اس کی تصویروں میں رنگ بھرنے کا ذریعہ بن گیا ہوں۔

وہ کھانا کھا چکا تو اس نے برتن سمیٹے۔ کچھ دیر باتیں کرتی رہی اور پھر اچھی نیند کی دعا دے کر رخصت ہو گئی۔

اس کی دعا کے باوجود عبدالرشید کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں ہے لیکن اس کی وجہ کیا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ نیلوفر سے جب بھی ملے گا، اس سے زیادہ اس کے شوہر کے بارے میں چھان بین کرے گا۔ شوہر کو سمجھنے کے بعد نیلوفر بھی اچھی طرح سمجھ میں آ سکے گی۔

جب آدمی کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے تو اطمینان کی چاندنی اس کے قدموں میں بکھر جاتی ہے۔ عبدالرشید بھی اپنی منزل متعین کر چکا تھا۔ اب اسے اس کے شوہر کی سراغ رسانی کرنی تھی۔ یہ اطمینان ہوتے ہی وہ نیند کی وادی میں چلا گیا۔

وہ لاکھ بے پروا سہی، بزنس کے معاملے میں بہت کنجوس تھا۔ ہر کام ملازموں پر چھوڑ دیا تھا لیکن کیش کاؤنٹر خود

ہی سنبھالتا تھا۔ اسی لیے وہ ٹھیک نو بجے دکان پر پہنچ جاتا تھا۔

اس دن اسے یہ شک تھا کہ ایک دن پہلے اتنا جلاؤ گھیراؤ ہوا ہے۔ لوگ ڈر کے مارے باہر بھی نکلے ہوں گے یا نہیں لیکن جب وہ نیچے اترا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ سڑکیں آباد تھیں۔ لوگ اسی طرح چل پھر رہے تھے۔ قوم واقعی بے حس ہو گئی ہے۔ کسی کو کسی کی پروا ہی نہیں۔

ملازم دکان کھول ہی رہے تھے کہ وہ پہنچ گیا۔ ملازموں نے صفائی ستھرائی کر لی تو وہ اندر داخل ہوا اور کاؤنٹر سنبھال لیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ بے چین ہے۔ اس بے چینی کا سبب بھی اسے معلوم تھا لیکن کاؤنٹر چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا البتہ آج اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ وہ ملازموں کی طرح کاؤنٹر پر کیوں بیٹھا رہتا ہے اگر کم از کم آدھے دن کے لیے کوئی بھروسے کا آدمی رکھ لیتا تو دوپہر کو گھر جا سکتا تھا سو پہلے کوئی انتظار کرنے والا نہیں تھا لیکن اب تو نیلوفر ہے۔ اس سے مل کر کتنے دکھ دور ہو جاتے ہیں۔ اس نے دوپہر تک کا وقت بڑی مشکل سے گزارا اور پھر اس کی بے چینی نے اسے بیٹھنے نہیں دیا۔ اس نے ایک ملازم کو چند ہدایات دے کر کاؤنٹر پر بٹھایا اور خود فلیٹوں کی طرف چل دیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بالکونی میں کھڑی ہے۔ اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ میں آنے والا ہوں۔ یہ اتفاق ہے یا کیا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جسے نظر انداز کرتا ہوا وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ جان بوجھ کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے دیکھ کر ملنے ضرور آئے گی۔ وہی ہوا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ بے دھڑک اندر آ گئی۔

''آپ تو دوپہر میں آتے نہیں تھے۔ سچ بتایئے میرے لیے آئے ہیں نا؟''

''ہاں تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔''

''کیجیے۔'' وہ اس طرح پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی جیسے گھر کی بالکونی ہو۔

''تمہیں اپنے شوہر سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''

''نفرت ہوتی تو ساتھ کیسے رہتی؟''

''کوئی تو بات ہے، تم ان کا تذکرہ تک سننا گوارا نہیں کرتیں۔''

''آپ ان سے مل کر دیکھ لیجیے پھر کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''تمہاری شادی کو کتنے سال ہوئے ہیں؟''

''ایک سال ہو گیا۔''

''بس اتنی سی قید سے گھبرا گئیں۔''

''کوشش کر رہی ہوں کہ رہائی مل جائے ورنہ اسی قید کی عادت ہو جائے گی۔ وہ عمر میں مجھ سے بیس سال بڑے ہیں۔ میں نے بی اے پاس کیا ہے اور وہ محض آٹھویں کلاس تک پڑھے ہوئے ہیں۔ ایک دفتر میں چپراسی ہیں۔ میرے والدین نے کچھ زمین میرے نام کر دی تھی اس کی آمدنی سے گھر چلتا ہے ورنہ گھر چلنا بھی دوبھر ہو جاتا۔''

''تمہارے ماں باپ نے ایسی بے جوڑ شادی کر ہی کیوں دی تھی؟''

''گاؤں میں اسی طرح کی شادیاں ہوتی ہیں۔ میں اپنی محرومیاں آپ سے مل کر دور کر لیتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ مت نکال لینا کہ میں بدکردار ہوں۔'' اس نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اتنا روئی کہ اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

کسی خوب صورت لڑکی کی زبان سے شوہر کی برائی کتنا ہی ناپسندیدہ فعل سہی لیکن اگر یہ برائی کسی اجنبی مرد کے سامنے کی جائے تو یہی برائی اس اجنبی کی تعریف بن جاتی ہے۔ تعریف سے صرف عورتیں ہی نہیں مرد بھی خوش ہوتے ہیں۔ اکثر مرد جب عورتوں کے سامنے اپنی بیویوں کی برائیاں کرتے ہیں تو دراصل دوسری عورت کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں، کم از کم ان کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ چاہے دوسروں پر اس کا اثر کچھ ہی مرتب ہو۔ لیکن بعض وہ بھی تو ہوتے ہیں جو یہ برائی کرنے میں سچے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی سچی ہو۔

عبدالرشید کے دل میں اس سے ہمدردی اور اپنے آپ پر غرور کا جذبہ ایک ساتھ پیدا ہوا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کا قد بڑھ گیا ہے۔ اس کے شوہر سے ملنے کا اشتیاق شدید ہو گیا۔ اس نے نیلوفر سے وعدہ لے لیا کہ وہ شام کی چائے پر اپنے شوہر کو ساتھ لے کر آئے گی۔

اس کا شوہر اس کے ساتھ آیا تھا۔ عمر بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ بال کچھ اڑنے والے تھے کچھ اڑ چکے تھے۔ رنگ بہت پکا اور قد چھوٹا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ نیلوفر اس کی برائی ڈھنگ سے نہیں کر سکی تھی۔ اگر اس کے پاس الفاظ ہوتے تو اور بہتر نقشہ کھینچ سکتی تھی۔

اس کے شوہر سے ملنے کے بعد عبدالرشید کے دل میں نیلوفر کی طرف سے ہمدردی کے وہ جذبات پیدا ہو گئے جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ابھی تک وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی دانست میں یک طرفہ محبت کر رہی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ بھی اسی جذبے سے سرشار ہے تو اس کے احساسات شدت اختیار کر گئے۔ وہ جو ایک پردہ سا درمیان میں تھا وہ بھی ہٹ گیا۔ عبدالرشید کے گھر میں اس کی آمد بڑھ گئی۔ فلیٹ کی ایک چابی اس کے پاس رہنے لگی تھی۔ اسے جب موقع ملتا گھر کی صفائی کرتی، عبدالرشید کے کپڑے دھوتی، انہیں استری کر کے وارڈ روب میں رکھتی۔ وہ ہوتا تو اس کے لیے چائے بناتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے گھر سے زیادہ وہ اس کے گھر میں رہتی ہے۔ یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ وہ اس کے گھر بھی جانے لگا۔ اس کے شوہر کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ بے چارہ یا تو ادھر ادھر ہو جاتا یا لاتعلقی سے ان کی باتیں سنتا رہتا۔

اتنی قربت کے باوجود نیلوفر نے اتنا موقع نہیں دیا کہ عبدالرشید کی مردانہ عیاری مزید قربت کا بہانہ ڈھونڈتی، نیلوفر کے کردار کی یہی برتری تھی جس نے عبدالرشید کے دل میں اس کی عظمت کا سکہ جما دیا تھا اور وہ دل سے اس کی عزت کرنے لگا تھا۔

کوئی پرندہ کتنا ہی خوش ہو پنجرہ تو پنجرہ ہی ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلتا رہا تو نیلوفر نے پر پھیلانے کو جگہ ڈھونڈی۔

''ہم ایک فلیٹ سے دوسرے فلیٹ میں کب تک بند ہوتے رہیں گے؟''

''میں سمجھا نہیں نیلوفر۔''

''اتنی بڑی دنیا ہے۔ ہم کہیں گھومنے بھی تو جا سکتے ہیں۔''

''تم نے کبھی مجھے اس کی اجازت ہی نہیں دی۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔ نیچے گاڑی کھڑی ہے۔''

''نہیں، ابھی نہیں، کئی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ آپ گاڑی لے کر باہر نکلیں۔ میں کچھ دیر بعد سڑک پر آ جاؤں گی۔'' یہ پہلا موقع تھا جب اس نے کسی کی پروا کی تھی۔ یہ اس کے دل میں چھپے ہوئے چور کا تقاضا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب وہ عبدالرشید کو کسی اور نظر سے دیکھ رہی تھی۔

عبدالرشید نیچے اترا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے باہر سڑک پر آ گیا اور کچھ دور جا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے بیک مرر سے دیکھا۔ وہ اپارٹمنٹ سے نکلی اور نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی گاڑی تک آ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا اور اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھے آج ایسا مالک مل گیا ہے جو اڑنے کی اجازت بھی دے سکتا ہے۔'' وہ آنکھیں بند کیے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ ''سگنل پر گاڑی رکتی ہے تو کوئی نہ کوئی فقیر آ جاتا ہے۔ وہ دعا دیتا ہے، اللہ تمہاری جوڑی سلامت رکھے۔ کتنا مزہ آئے گا جب وہ یہ دعا دے گا۔''

عبدالرشید اسے لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔ جگہ جگہ رک کر آئسکریم کھاتے رہے، بوتلیں پیتے رہے، اسی سیر سپاٹے میں شام ہونے لگی۔

''تم اپنے شوہر سے کہہ کر آئی ہو؟''

''نہیں تو۔''

''وہ آئے گا تو پریشان نہیں ہوگا؟''

''آپ کو اس کی فکر کیوں ہو گئی؟''

''بھئی شوہر ہے تمہارا۔ تم پر پابندی لگا دی تو میں تو مارا جاؤں گا۔''

''اس بھیگی بلی میں اتنی ہمت نہیں ہے۔''

اس دن کے سیر سپاٹے کے بعد وہ واپس آئے تو عبدالرشید بیکری چلا گیا اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس دن کے بعد سے گھر کی ملاقاتیں باہر ہونے لگیں۔

عبدالرشید کو شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ یا تو اس کے شوہر کو سب کچھ معلوم ہے لیکن ڈرتا ہے۔ بیوی کو روک نہیں سکتا یا پھر دونوں ملے ہوئے ہیں۔ دونوں کی نظر میری دولت پر ہے۔ اگر ایسا ہے تو جب تک وہ میرے اختیار میں ہے اسے نہیں تو اس کی مصروفیات کو تو خرید سکتا ہوں۔

''دن بھر تمہاری مصروفیات کیا ہوتی ہیں؟'' عبدالرشید نے اس سے پوچھا۔

''آپ کے بارے میں سوچنا۔''

''میں نے اپنی بیکری کی ایک شاخ ناظم آباد میں قائم کی ہے۔ میں آج کل وہیں بیٹھتا ہوں لیکن تمہاری وجہ سے پوری توجہ نہیں دے پا رہا ہوں۔''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب میرے لیے آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔''

''ارے نہیں۔ پوری بات تو سنو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں تم میرے ساتھ بیکری چلا کرو۔''

''تاکہ میرا شوہر مجھے بالکل ہی گھر سے نکال دے۔''

''تم وہاں ملازمت کرو گی۔ میں تمہیں باقاعدہ تنخواہ دوں گا۔ جب تمہارے شوہر کے ہاتھ میں چار پیسے آئیں گے تو وہ تمہاری غیر حاضری برداشت کر لے گا۔ فلیٹ والوں کو بھی معلوم ہوگا کہ تم میری بیکری پر ملازمت کرتی ہو۔

انہیں بھی میرے ساتھ تمہارے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ تیار ہو گئی اور اس کے ساتھ باقاعدگی سے بیکری جانے لگی۔

دن رات کی اس قربت نے اس کی حوصلہ افزائی کی، اس کی خواہشات محدود سے لامحدود ہونے لگیں۔ ہو سکتا ہے یہ خیال اس کے دل میں پہلے سے ہو لیکن یہ قربت اس کے دل کی بات زبان پر لے آئی۔

''آپ مجھے رہائی کیوں نہیں دلا دیتے؟'' نیلوفر نے عبدالرشید سے کہا۔

''تم میری قید میں کب ہو۔ چاہو تو آج نوکری چھوڑ دو۔''

''یہی تو بات ہے کہ میں آپ کی قید میں نہیں ہوں۔ میں تو اپنے شوہر کی بات کر رہی تھی۔ کاش! میں آپ کی قید میں ہوتی۔''

اب کسی وضاحت کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے بات صاف کر دی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے رہائی کی بات کر رہی تھی۔

''نیلوفر! تم اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہو۔ یہ بتاؤ تم میرے بارے میں جانتی کیا ہو؟''

''وہ سب کچھ جسے جاننا ضروری ہے۔ میں آپ کو کتاب کی طرح پڑھتی رہی ہوں۔ آپ کے بارے میں ایک ایک بات جان گئی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ میرے بارے میں نہ جانتے ہوں۔ میرے گھر والوں سے ملنا ہے تو میرے ساتھ فیصل آباد چلیں۔''

''تم پھر غلط سمجھیں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ تمہارا شوہر اتنی آسانی سے تمہیں آزاد کر دے گا؟''

''یہ آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔ میں اسے تیار کر لوں گی۔''

اس نے اتنی آسانی سے کہہ دیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو لیکن عبدالرشید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے لگا جیسے جدائی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس کا شوہر اتنی آسانی سے اسے آزاد نہیں کرے گا۔ نہ جانے کیا ہنگامہ کھڑا کر دے۔ یہ عورت اپنی دیوانگی میں نہ جانے کیا قدم اٹھا بیٹھے۔

اس رات وہ بیکری سے واپس آ کر بستر پر لیٹا تو نیند ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ دن بھر ہونے والی باتیں اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ذرا دل کو ٹٹولا تو دل نے کہہ دیا جو نیلوفر چاہتی ہے وہی وہ بھی چاہتا ہے۔ نیلوفر ہرگز اس آدمی کے لائق نہیں۔ اسے تو میرے ساتھ ہونا چاہیے۔ سوال پھر

اگر دکھتے ہوئے دانت اکھاڑ دینے کا نام علاج ہے تو دکھتے ہوئے سر، آنکھ، کان اور ناک کے بارے میں کیا خیال ہے

آپریشن کی ضرورت نہیں

گردہ، مثانہ، پتہ کی پتھریوں، ہر قسم کی گلٹیوں، رسولیوں، بواسیر، موتیا، ہرنیا اپنڈے سائیٹس، ٹانسلز اور پراسٹیٹ کے

مردوں میں چھاتیوں کا بڑھنا، زنانہ و مردانہ بانجھ پن، عورتوں کے چہرے پر بال، بالوں کا گرنا، قبل از وقت سفید ہونا، چھائیاں زدہ چہرہ، ایام کی بے قاعدگی، خون کی نالیوں کا بند ہونا، اعضاء کا سن ہونا، ریڑھ کے مہروں کا بے قاعدہ ہونا، بچے کا مٹی کھانا، بستر پر پیشاب کا نکل جانا، قد کا چھوٹا رہ جانا، انڈر گروتھ اور گروتھ، جوڑوں کے درد

پیدائشی گونگا بہرا، آنکھ کا ٹیڑھا پن قابل علاج ہیں

شوگر، دمہ، بلڈ پریشر، شیزوفرینا، آئیوٹیزم قابل علاج ہیں۔ ہیپاٹائٹس، ڈائیلائیسز سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

بائی پاس کو اب بائے بائے کر دیں
گینگرین سے اعضاء کٹوانے کی ضرورت نہیں

ہومیو پروفیسر ڈاکٹر نیاز اکمل
فرید ہومیو پیتھک کلینک اینڈ ریسرچ سنٹر
صبح 11 تا دن 2 بجے
شام 5 تا رات 9 بجے
وی، آئی پی صرافہ مارکیٹ، چوک صادق آباد، راولپنڈی
r.niazakmal@gmail.com | 0323-5193267

یہی تھا کہ کیا اس کا شوہر اسے چھوڑنے پر تیار ہو جائے گا؟ وہ بستر پر لیٹے لیٹے ضدی بچے کی طرح مچل گیا۔ میں اس کے شوہر کو قتل کر دوں گا۔ کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے میں نیلوفر کو آزاد کرا لوں گا۔

رات کیسی بھی ہو گزرتی ضرور ہے۔ یہ رات بھی گزر گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیکری جاتی تھی لیکن عبدالرشید آج اتنا بے تاب تھا کہ اس کے آنے کا انتظار کیے بغیر ہی اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ اس کے شوہر نے کھولا تھا۔ عبدالرشید کو وہ اس وقت ایک ایسے دیو کی طرح نظر آ رہا تھا جس نے نیلوفر پری کو اندھیرے غار میں قید کر رکھا ہو۔

''ابھی تو بیکری جانے میں بہت دیر ہے۔'' نیلوفر کے شوہر نے کہا۔

''مجھے چائے بنانی ہے اور چائے کی پتی ہے نہیں۔ میں نے سوچا نیلوفر سے لے آؤں۔''

''آپ کو چائے بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ نیلوفر اٹھ گئی ہے وہ بنا لے گی۔ آیئے، اندر آ جایئے۔''

عبدالرشید تو یہی چاہتا تھا۔ اس نے تکلفاً بھی انکار نہیں کیا اور دعوت قبول کر لی۔ نیلوفر کے شوہر کی عادت تھی کہ سامنے آنے سے کتراتا تھا۔ ادھر ادھر ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

موقع ملتے ہی اس نے نیلوفر سے سرگوشی کی۔

''کوئی بات کی تم نے اپنے شوہر سے؟''

''آپ مجھے اپنی قید میں لینے کو تیار ہیں؟''

''میں تو کب کا تمہارا قیدی ہوں۔''

''اگر آپ تیار ہیں تو میں بات کرتی ہوں۔''

''کیا بات کرو گی؟''

''طلاق مانگنے کے سوا کیا بات ہو سکتی ہے؟''

''وہ مان جائے گا؟''

''میں نے کہا نا یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

اس نے اتنی آسانی سے کہہ دیا تھا جیسے پہلے ہی کوئی بات ہو چکی ہو۔ عبدالرشید کو بھی بے وجہ قرار آ گیا۔ دونوں تیار ہوئے اور بیکری چلے گئے۔

زندگی پھر اپنی ڈگر پر آ گئی۔ دونوں بیکری پر ساتھ جاتے رہے۔ رات کا کھانا ساتھ کھاتے رہے۔ عبدالرشید جان بوجھ کر اب کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ نیلوفر نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ عبدالرشید کو تعجب ہو رہا تھا کہ نیلوفر جیسی جلد باز عورت طلاق کے معاملے پر ٹھہری ہوئی کیوں ہے۔ آخر ایک دن عبدالرشید نے پوچھ ہی لیا۔

''آخر تم بات کیوں نہیں کرتیں۔ تم تو کہہ رہی تھیں خود نمٹ لو گی۔''

''آپ خود سوچیں طلاق مانگنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے مظہر کو غصہ دلانا ہوگا اور آپ جانتے ہیں اسے غصہ دلانا کتنا مشکل کام ہے۔ میں کچھ بھی کہہ لیتی ہوں اسے غصہ آتا ہی نہیں۔''

''اسے تو کبھی غصہ آئے گا ہی نہیں تو کیا ہم......''

''آپ فکر کیوں کرتے ہیں، میں کوشش میں لگی ہوئی ہوں۔''

''میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔''

''آپ کی یہ بے چینی مجھے اچھی لگی ہے۔ اب میں مزید کوشش کروں گی۔''

''اس کا مطلب ہے تم میری آتش شوق کو بھڑکا رہی تھیں۔''

''یہی سمجھ لو۔'' نیلوفر نے ایک ادائے خاص سے کہا۔

دو دن مشکل سے گزرے تھے کہ وہ گھبرائی ہوئی آئی۔ یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس جیسی لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہایت غیر معمولی بات تھی۔

''خیر تو ہے، آج تم بہت گھبرائی ہوئی ہو؟''

''چھوڑیے، کیا کریں گے پوچھ کر۔''

''پھر بھی کچھ تو کہو۔''

''ایک گھٹیا آدمی سے جو توقع کی جا سکتی تھی وہی ہوا۔''

''کون گھٹیا آدمی۔''

''میرا شوہر اور کون۔''

''کیا طلاق دینے پر تیار نہیں؟''

''انکار کر دیتا تو مجھے خوشی ہوتی کہ مجھ سے محبت کرتا ہے، مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس نے تو میری قیمت لگا دی ہے۔ کہتا ہے پانچ لاکھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دو، میں طلاق دے دوں گا۔ مجھے گھن آ رہی ہے کہ میں اب تک ایسے گندے آدمی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اب بھلا بتاؤ پانچ لاکھ روپے میرے پاس کہاں ہیں جو اس کے ہاتھ پر رکھ دوں۔''

اس کے پاس واقعی پانچ لاکھ کہاں ہو سکتے تھے۔ یوں بھی وہ اپنے لیے نہیں عبدالرشید کے لیے طلاق کی طلب گار ہوئی تھی۔ رقم کا بندوبست عبدالرشید ہی کو کرنا تھا۔

''پانچ لاکھ کوئی بڑی رقم نہیں۔ رقم میں دیتا ہوں، مار دو لے جا کر منہ پر اور ہاں طلاق تحریری لینا۔ ایسے لالچی آدمی کا کیا بھروسا کب مکر جائے۔''

نیلوفر پھول کی طرح کھل گئی۔ ''اب دیکھو میں اسے کیسا ذلیل کرتی ہوں۔''

عبدالرشید نے اسی وقت ایک آدمی کو بینک بھیجا اور پانچ لاکھ نیلوفر کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''یہ نوٹ لو اور جاؤ اپنی رہائی خرید لو۔''

''میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔'' نیلوفر نے فرط جذبات سے عبدالرشید کے ہاتھ چوم لیے۔

عبدالرشید نے اسے اس کے فلیٹ پر چھوڑا اور خود اپنے فلیٹ پر آ گیا۔

دوسرے دن وہ بیکری جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ معمول یہی تھا کہ وہ نیچے اترنے سے پہلے نیلوفر کو اپنے فلیٹ سے لیتا تھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بیکری روانہ ہو جاتے تھے۔ ابھی وہ اپنے فلیٹ سے نکلا نہیں تھا کہ نیلوفر خود آ گئی۔

''کیا ہوا رقم دے دی اسے؟'' عبدالرشید نے پوچھا۔

''میں یہ بتانے آئی ہوں کہ ہم فیصل آباد جا رہے ہیں۔''

''اور طلاق؟''

''وہ کہتا ہے فیصل آباد جا کر میرے گھر والوں کے سامنے مجھے طلاق دے گا۔''

''وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ تم سے پانچ لاکھ کی رقم ہتھیا لے گا اور طلاق بھی نہیں دے گا۔''

''میں اتنی پاگل نہیں ہوں۔ رقم میرے پاس ہے، یہ رقم اس وقت تک اس کے حوالے نہیں کروں گی جب تک وہ مجھے طلاق نہیں دے دیتا۔''

''روانگی کب ہے؟''

''آج رات، علی الصباح۔''

''کب تک لوٹ آؤ گی؟''

''زیادہ سے زیادہ چار دن لگیں گے۔''

''فیصل آباد کا ایڈریس ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دو۔''

''وہ کیوں؟ آپ کو شک ہے کہ میں لوٹ کر نہیں آؤں گی؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تم وہاں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ میرے پاس ایڈریس ہوگا تو میں تمہیں تلاش تو کر لوں گا۔''

اس نے ایڈریس لکھ کر دے دیا۔

وہ بیکری چلا گیا۔ دوپہر کے وقت اس کے دل میں نیلوفر کی یادوں نے شور مچانا شروع کیا۔ وہ اب بیکری پر بھی اس کے ساتھ رہنے کا عادی بن گیا تھا۔ آج اسے اپنی دکان کسی اور کی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بہت ضبط کرتا رہا پھر یہ سوچ کر اٹھ گیا کہ وہ کل تو فیصل آباد چلی جائے گی۔ اس وقت گھر پر ہو گی۔ شاید اس کا شوہر دفتر گیا ہوا ہو۔ چل کر کچھ دیر اس سے باتیں کر لی جائیں۔

اسے اتنی جلدی تھی کہ گاڑی کو ہوائی جہاز بنا کر وہ اپنی بلڈنگ تک پہنچ گیا۔ وہ ان دنوں ناظم آباد والی برانچ پر بیٹھ رہا تھا اس لیے آنے میں جتنی دیر لگی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس نے گاڑی پارک کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا زینہ چڑھ گیا۔ اس کے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے صفائی ستھرائی کے لیے وہ اس کے فلیٹ پر چلی گئی ہو۔ وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا۔ دروازہ اسی طرح بند تھا جس طرح وہ بند کر کے گیا تھا۔ اس نے چابی گھمائی اور اندر چلا گیا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ جا چکی ہے، رات سے پہلے، صبح ہوئے بغیر۔ وہ کتنی بھی جلدی میں تھی مجھ سے مل کر تو جاتی۔ مجھے اطلاع تو کرتی۔ وہ دونوں گئے ہیں یا فرار ہوئے ہیں۔ اب سمجھنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ وہ دونوں ملے ہوئے تھے۔ پانچ لاکھ ہاتھ میں آتے ہی اس کی نیت بدل گئی ہو گی۔ ''نیلوفر، تم نے اپنی قیمت بہت کم لگائی، صرف پانچ لاکھ۔''

اس کی عقل یہی سب باتیں سوچ رہی تھی لیکن دل ان باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ یہی کہے جا رہا تھا کہ اس نے تمہیں کسی جذباتی صدمے سے بچانے کے لیے اچانک چلے جانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ جھوٹ سچ تو اس وقت ظاہر ہوگا جب چار دن گزر جائیں گے اور وہ نہیں آئے گی۔

وہ دیر تک خود کو تسلیاں دیتا رہا اور پھر اکیلا گھر اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ وہ پھر باہر نکلا اور نیلوفر کے دروازے پر پڑے ہوئے تالے کو دیکھتا ہوا نیچے اتر گیا۔

وہ پھر بیکری کی طرف جا رہا تھا۔

اسے چار دن گزرنے کا انتظار تھا۔ کبھی اندیشوں کے اندھیرے اسے گھیر لیتے کبھی اس سے ملنے کی خوشی چاندنی بن کر اس کے فلیٹ میں پھیل جاتی تھی۔

چار دن گزر گئے پانچویں دن نے قدم رکھا تو اس کے اندیشے جوان ہو گئے۔ وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟ عبدالرشید تم فیصل آباد کے سفر کو صدر یا بوہری بازار تک کا سفر سمجھ رہے ہو۔ وہ چار دن کا کہہ کر ضرور گئی تھی لیکن ایک آدھ دن اوپر ہو سکتا ہے۔

انتظار کا دکھ جھیلتے ایک ہفتہ ہو گیا۔ اب طرح طرح کے اندیشے ستانے لگے۔ وہ کسی مصیبت میں نہ گھر گئی ہو۔ دونوں میاں بیوی نے اس کے ساتھ کوئی کھیل نہ کھیلا ہو۔ یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

باتیں محض سوچنے کی حد تک تھیں۔ دل کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی کشمکش میں ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ اس کے صبر نے دیوانگی کا روپ دھار لیا، آنکھیں اسے دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ جب وہ نہیں تو کچھ دیکھنے کو تیار نہیں تھیں۔ یہ بھی نہیں کہ کپڑے بدلے کتنے دن ہو گئے۔ شیو بنائے کتنے دن گزر گئے۔ بیکری کا نظام اس کے ملازموں نے سنبھالا ہوا تھا۔ ان کی وفاداری کام آ رہی تھی ورنہ کاروبار بھی ہاتھ سے گیا تھا۔ نیلوفر کا جادو تھا کہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

ایک روز اچانک اس کی آنکھوں نے اسے راستہ دکھایا۔ ”مجھے فیصل آباد جانا چاہیے۔“ اسے اپنی کم عقلی پر غصہ آنے لگا۔ یہ راستہ پہلے کیوں نہیں سوجھا۔ اتنے دن خوامخواہ ضائع ہو گئے۔ مجھے تو پانچویں دن ہی سوار ہو جانا چاہیے تھا۔ بیمار کو قرار آ گیا۔ ایسی ڈھارس بندھی جیسے نیلوفر کا بلاوا آ گیا ہو۔

وہ فیصل آباد روانہ ہو گیا۔ نیلوفر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایڈریس اس کی جیب میں تھا۔ یہی چراغ تھا، یہی منزل، یہی ٹھکانا۔

وہ قدیم طرز کا خستہ حال سا مکان تھا۔ عبدالرشید نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی کنڈی کھڑکائی۔ ایک بوڑھا سا آدمی باہر نکلا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ نیلوفر کا باپ ہے البتہ اس آدمی نے ضرور پوچھا۔

”کیا بات ہے پتر۔ کس سے ملنا ہے؟“

”فضل دین آپ ہی ہیں۔“

”نہیں پتر میرا نام تو خیر دین ہے۔“

”کیا یہ فضل دین کا مکان نہیں؟“

”اس کا مکان کبھی ہوتا تھا۔ اب تو یہ مکان میں نے خرید لیا ہے۔“

”اس کی بیٹی نے تو مجھے نہیں بتایا بلکہ ایک مہینے پہلے ہی یہ ایڈریس اس نے مجھے دیا تھا۔“

”وہی بیٹی جو کراچی میں رہتی ہے؟“

”ہاں وہی۔“

”اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اس کے باپ نے مکان بیچ دیا ہے۔ وہ خود اپنے گھر والے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ پھر لوٹ گئی۔“

”آپ مجھے بتا سکتے ہیں وہ کہاں گئی ہو گی؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا کہہ رہی تھی پنڈی میں اس کا کوئی چچا رہتا ہے وہاں جائے گی۔ خون سفید ہو گئے ہیں پتر۔ بھلا بتاؤ بیٹی کو بتائے بغیر ہی باپ نے مکان بیچ دیا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں حصہ نہ مانگ لے۔“

”بابا جی، آپ بتا سکتے ہیں پنڈی میں اس کا چاچا کہاں رہتا ہے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ وہ بس اتنا کہہ رہی تھی کہ پنڈی جائے گی۔“

اس اطلاع کے بعد وہ وہاں رک کر کیا کرتا۔ بوڑھا آدمی اسے چائے پانی کے لیے پوچھتا رہ گیا مگر اس نے دروازہ چھوڑ دیا۔ اب اسے پنڈی جانا تھا لیکن اس حال میں کہ نہ منزل کی خبر تھی نہ ٹھکانے کا علم۔ بس اتنا معلوم تھا کہ اس کی نیلوفر پنڈی میں ہے۔ ہزاروں گھروں میں وہ اسے کہاں ڈھونڈے گا، یہ سوچنے کی اسے فرصت کہاں تھی۔ گھر تو گھر اس کے چاچا کا نام تک اسے نہیں معلوم تھا۔ خصوصاً اس حال میں کہ اس سے پہلے اس نے پنڈی شہر دیکھا تک نہیں تھا۔

راولپنڈی کے اسٹیشن پر اترنے کے بعد حیران ہونا فطری امر تھا۔ سڑکیں ہر طرف جا رہی تھیں، وہ کس طرف جائے؟ وہ ایک سڑک پر چلتا رہا۔ اس سڑک نے اسے ایک جگہ پہنچا دیا جہاں ہر طرف مکان کھڑے تھے۔ وہ بھی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”یہاں کوئی فضل دین رہتے ہیں، ان کی بیٹی کا نام نیلوفر ہے۔“

”پتا نہیں جی۔“

”یہاں کوئی فضل دین رہتے ہیں؟“

”ایڈریس ہے آپ کے پاس؟“

”نہیں تو۔“

”اس طرح تو ملنا بہت مشکل ہے۔“

”یہاں کوئی فضل دین رہتے ہیں؟“

”بہت سے ہوں گے، مکان نمبر بتاؤ۔“

”وہ تو مجھے نہیں معلوم۔“

”پھر تو بہت مشکل ہے۔“

چند لوگوں سے پوچھنے کے بعد پوچھنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ بس دروازے تکتا پھر رہا تھا کہ شاید اس کی کہیں جھلک نظر آ جائے۔

صبح سے شام ہو گئی۔ ایک محلے سے دوسرے محلے کی خاک چھانتا پھرا۔ شام ہوئی تو ایک ہوٹل میں جا کر پڑ گیا۔ صبح ہوئی تو پھر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

تلاش پھر ادھوری رہ گئی۔ شام پھر آ گئی۔

تلاش جاری رہی۔ کہیں رک کر چائے پی لیتا۔ بھوک

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگی تو کھانا کھا لیتا۔ دیوانگی میں کوئی کسر باقی رہ گئی تھی تو وہ اب پوری ہو گئی۔ محلے ختم ہوئے تو بازاروں میں گھومنے لگا کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائے۔ اخباروں میں اشتہار دے دیا پھر اسے یقین ہو گیا کہ یا تو وہ ملنا نہیں چاہتی یا اس شہر میں ہے ہی نہیں۔

اس کا حلیہ اب بالکل پاگلوں والا تھا لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس شہر میں رہا تو واقعی پاگل ہو جائے گا۔ اس سے پہلے کہ ہوٹل والے مجھے پاگل قرار دے کر ہوٹل سے باہر نکال دیں میں خود ہی ہوٹل چھوڑ دوں۔

اس نے پنڈی شہر کی رونقوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

مایوسی کفر ہے لیکن اسے اس کفر کا شکار ہونا پڑا۔ اب نیلوفر مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ اس لیے کہ اس کی محبت ایک ڈراما تھی۔ اس نے شوہر کے ساتھ مل کر مجھ سے پانچ لاکھ ہتھیا لیے اور غائب ہو گئی۔ کیا خبر اس نے کراچی چھوڑا ہی نہ ہو یا فیصل آباد آنے کے فوراً بعد کراچی چلی گئی ہو۔ اپنا فلیٹ بیچ کر رفوچکر ہو گئی ہو۔ کراچی کا خیال آتے ہی اسے اپنا کاروبار یاد آیا۔ وہ انتظام تو کر آیا تھا لیکن پھر بھی کسی کا کیا بھروسا۔ اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کوئی قبضہ بھی کر سکتا تھا۔ اسے کراچی جانا چاہیے۔

وہ پنڈی سے لاہور آیا۔ کوئی لاہور جائے اور داتا دربار نہ جائے، یہ ممکن ہی نہیں۔ وہ حاضری کے لیے داتا دربار گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے فقیروں میں ایک فقیر کا اور اضافہ ہو گیا۔

”داتا صاحب، میں بہت ٹھوکریں کھا چکا یا تو نیلوفر کو مجھ سے ملا دیں یا اس کی یاد میرے دل سے نکال دیں۔“

وہ بار بار یہی دعا مانگتا رہا اور پھر جیسے نیلوفر کی یاد اس کے دل سے نکل گئی۔ کسی بے وفا کے لیے میں اپنی زندگی کیوں خراب کروں، مجھے کراچی جانا ہے، اپنا کاروبار دیکھنا ہے۔

وہ ٹرین میں بیٹھ گیا۔

سب کچھ وہی تھا۔ لان میں بچے کھیل رہے تھے۔ دھول میں اٹی اس کی گاڑی اسی طرح پارکنگ میں کھڑی تھی۔ وہ سب کچھ نظر انداز کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ پہلی منزل پر پہنچ کر اس کی نظریں خود بخود نیلوفر کے فلیٹ پر جم گئیں۔ اس کے فلیٹ پر اب بھی تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اسے اگر آنا ہوتا تو اب تک آ چکی ہوتی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ کیسی شاطر عورت تھی وہ۔ تالے میں چابی گھماتے ہوئے اس نے سوچا۔ گھر کے فرش پر دھول جمی ہوئی تھی لیکن اسے اپنے دل کی میل صاف کرنی تھی۔ اس نے وارڈ روب سے کپڑے نکالے اور غسل خانے میں گھس گیا۔ رگڑ رگڑ کر شیو بنایا، خوب اچھی طرح غسل کیا اور چمکتا ہوا باہر نکل آیا۔ اب اسے اپنی بیکریوں کی طرف جانا تھا۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے پہلے ایک بیکری پر پہنچا پھر دوسری پر۔ تقریباً ایک ماہ کی غیر حاضری کے باوجود اس کا کاروبار اسی طرح جما ہوا تھا۔ دو تین دن حساب کتاب چیک کرنے اور ملازموں کو تنخواہیں وغیرہ دینے میں لگ گئے۔

وہ رات گئے بیکری سے اٹھتا۔ پھر یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرتا۔ فلیٹ پر آتا اور آنکھیں بند کر کے پڑ جاتا۔ صبح جاتے وقت ایک نظر نیلوفر کے فلیٹ پر ڈال لیتا۔ دل کے کسی کونے میں اب بھی نیلوفر کی یاد چھپی بیٹھی تھی۔ وہ اس پودے کو جوان ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس بلڈنگ اور اس فلیٹ سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں جو ہر وقت اسے گھیرے رہتی تھیں۔ بلڈنگ کے لوگ بھی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نیلوفر غائب تھی اور وہ رات کے کسی حصے میں گھر آتا تھا صبح ہوتے ہی نکل جاتا تھا۔ بہت سوں کو شک تھا کہ نیلوفر کو اسی نے غائب کیا ہے۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ یہ فلیٹ خالی کر دے۔ پہلے یہی سوچا تھا کہ اس فلیٹ کو بیچ کر دوسرا فلیٹ خرید لے گا، اس علاقے سے دور، نیلوفر کی آنکھوں سے اوجھل۔ اسٹیٹ ایجنٹ سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ فلیٹ فروخت کرنا چاہتا ہے لیکن نیلوفر کے جادو کا توڑ ابھی تک نہیں ہوا تھا نہ جانے وہ کب چلی آتی۔ اس کے پاس اس فلیٹ کی چابی ہے۔ اگر وہ میرے بستر کی چادریں تبدیل کرنے آئی تو اسے کتنی مایوسی ہو گی۔ وہ کتنی پریشان ہو گی۔ وہ بھی تو یہی سمجھے گی کہ میں اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہوں۔ فریب ہی سہی اسے یہ فریب کھانے دو۔ میں نہیں میرا فلیٹ تو اس کی دسترس میں ہو گا۔ وہ یہ سمجھتی تو رہے گی کہ میں یہیں کہیں ہوں، کسی وقت لوٹ آؤں گا۔ یہ نہ ہو کہ وہ لوٹ کر آئے اور اس فلیٹ میں کسی اور کو دیکھ کر واقعی ہمیشہ کے لیے اپنا فلیٹ بھی چھوڑ جائے۔

اس نے صرف اپنے کپڑے ساتھ لیے اور فلیٹ کو تالا لگا دیا۔

ناظم آباد والی برانچ اس کی توجہ کی مستحق تھی۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ ناظم آباد ہی کا علاقہ اپنی رہائش کے لیے منتخب کر لے۔ اکیلے آدمی کو پاؤں پھیلانے کی جگہ

ہی تو چاہیے ہوتی ہے۔ یہاں بھی اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔

اسے یہاں رہتے ہوئے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی اپنے فلیٹ پر نہیں گیا تھا۔ نیلوفر کی یاد اب بالکل ہی دل سے محو ہوگئی تھی۔

اب اسے گلشن والے فلیٹ سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ فلیٹ خالی پڑا تھا، کرائے تک پر نہیں چڑھایا تھا۔

نئی بیکری سے متعلق کچھ کاغذات پرانے فلیٹ میں پڑے تھے اور اب اچانک ان کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ وہ ان کاغذات کو لینے گلشن گیا۔ بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی اسے نیلوفر کی یاد آگئی۔ اس کے خالی فلیٹ کے سامنے سے گزرنے کے خیال ہی سے اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے فلیٹ پر جانے کے لیے دوسرا زینہ استعمال کیا تاکہ نیلوفر کے فلیٹ کے سامنے سے نہ گزرے۔

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اسے لگا جیسے کوئی اس کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ فرش پر گرد کا نام نہیں تھا، جیسے کسی نے ابھی ابھی جھاڑو دی ہو۔ بستر پر بچھی چادریں بے نشان تھیں۔ جو دروازہ چھ مہینے بعد کھلا ہو وہ اتنا صاف ستھرا کیسے ہوسکتا ہے۔ کچن میں گیا تو برتن دھلے رکھے تھے۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور ہوگیا۔ کہیں اس گھر میں آسیب تو نہیں؟ وہ بھاگتا ہوا وارڈروب کے قریب گیا جہاں وہ کاغذات رکھے تھے جن کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ وارڈروب کے قریب ہی ایک میز رکھی تھی۔ اس نے دیکھا اس میز پر خاکی رنگ کا ایک لفافہ رکھا ہے۔ لفافے کا پیٹ پھولا ہوا تھا جیسے اس میں بہت سے کاغذات ٹھونسے گئے ہوں۔ اس نے لفافہ اٹھالیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ لفافے میں ہزار ہزار کے نوٹ ہیں، یہ پورے پانچ لاکھ روپے تھے۔ اتنی رقم کس نے یہاں رکھ دی۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لے کر سوچ رہا تھا پھر جیسے اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ اس نے نیلوفر کو، طلاق طلب کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے دیے تھے۔ یہ نوٹ وہی تو یہاں رکھ کر نہیں گئی۔ تو کیا وہ آگئی؟ وہ بھاگتا ہوا فلیٹ سے نکلا اور نیلوفر کے فلیٹ کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ اندر ہے۔ ابھی اس نے دستک نہیں دی تھی کہ دروازہ کھلا، نیلوفر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''آئیے نا، باہر کیوں کھڑے ہیں۔''

''نیلوفر، میں خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت میں تم ہی ہو۔''

''تمہیں تعجب کیوں ہو رہا ہے۔ میں تو صبح کی آئی ہوئی ہوں۔ بیکری جان بوجھ کر نہیں آئی کہ آپ رات میں آئیں گے تو آپ کو اچانک خوشی ملے گی۔ اچھا ہوا آپ جلدی آگئے۔'' اس نے عبدالرشید کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر گھسیٹ لیا۔

''نیلوفر، یہ لفافہ کیسا ہے؟''

''اس میں وہ پانچ لاکھ روپے ہیں جو آپ نے مجھے طلاق لینے کے لیے دیے تھے۔''

''یہ تم مجھے واپس کر رہی ہو۔ کیا تمہاری محبت دم توڑ گئی۔ کیا تم نے ارادہ بدل دیا؟''

''اب طلاق کی ضرورت نہیں رہی۔ جس سے طلاق لینی تھی وہ اس دنیا ہی میں نہیں رہا۔ میں بغیر پیسے دیے ہی آزاد ہوگئی۔''

''تمہارے شوہر کا انتقال ہوگیا...... مگر کیسے؟''

''یہ ایک لمبی داستان ہے۔ آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

وہ چائے بنا رہی تھی اور عبدالرشید دل ہی دل میں اس کی ہوشیاری پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ چاہتی تو مجھے خط لکھ سکتی تھی۔ اب کسی وجہ سے واپس آگئی اور پکڑی گئی تو مجھے سنانے کے لیے کوئی داستان تراش رہی ہے لیکن اس نے پانچ لاکھ روپے کیوں واپس کردیے؟

''لیجیے چائے آگئی، چائے پیجیے۔''

''تم کچھ بتانے والی تھیں۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بپتا سنانے لگی۔

''میں فیصل آباد پہنچی تو میرا باپ مکان بیچ کر پنڈی چلا گیا تھا، اپنے بھائی کے پاس۔ میں بھی پنڈی چلی گئی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں اپنے شوہر سے طلاق لینے آئی ہوں تو وہ مجھ پر بہت بگڑے۔ میرا میاں بھی یہاں تو کہہ کر گیا تھا کہ طلاق دیدے گا لیکن وہاں جاکر مکر گیا۔ میرے گھر والوں کے سامنے اس نے مجھ پر بدکاری کا الزام لگایا اور کہہ دیا کہ میں کسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں اس لیے طلاق مانگ رہی ہوں۔ میرے ابا نے کہہ دیا کہ مجھے طلاق نہیں ہونے دیں گے۔ مجھے ایک کمرے میں بند کردیا گیا۔''

''تم مجھے خط تو لکھ سکتی تھیں۔''

''وہی تو بتا رہی ہوں۔ مجھ پر ایسی سخت پابندیاں تھیں کہ خط تک نہیں لکھ سکتی تھی۔ خط لکھتی بھی تو ڈاک خانے تک کون لے کر جاتا۔ ایک مہینے بعد میرے اعصاب

جواب دے گئے۔ میں نے ابا سے کہہ دیا کہ اچھا میں طلاق نہیں مانگتی، مجھے مظہر کے ساتھ کراچی جانے دو۔ انہیں خطرہ تھا لہٰذا انہوں نے مجھے کراچی نہیں آنے دیا اور کہا کہ مظہر جاکر فلیٹ بیچ آئے گا تم پنڈی میں رہو۔ معمولی سی نوکری ہے وہ بھی چھوڑ دے گا۔ فلیٹ بیچ کر جو رقم ہاتھ میں آئے گی اس سے پنڈی میں کوئی کاروبار کرلے گا۔ ابھی مظہر کراچی آنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا۔ اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد مجھے عدت کے نام پر کمرے میں بند کردیا گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میری اتنی نگرانی کیوں کی جا رہی تھی۔ میرا کزن مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسے شک تھا کہ میں کراچی بھاگ جاؤں گی۔ اس نے گھر والوں کے ساتھ مل کر میرے کمرے میں تالا ڈال دیا۔ کھانا پانی مجھے وہیں مل جاتا تھا۔ جب عدت کے دن پورے ہوگئے تو ابا اور چچا میرے پاس آئے اور مجھے شادی کے لیے مجبور کرنے لگے۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے شادی پر ہامی بھرلی تاکہ پابندیوں میں کچھ نرمی آجائے۔ وہی ہوا، مجھے کمرے سے نکلنے اور سب کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ بس یہی وقت تھا جب میں زنجیریں توڑ سکتی تھی۔ اب آپ کو خط لکھنا فضول تھا۔ اب تو آپ تک پہنچنا تھا۔ میں نے ایک دوسرے کزن کے آگے ہاتھ جوڑ لیے کہ وہ کسی طرح مجھے اسٹیشن تک پہنچا دے۔ اس کے دل میں رحم آیا۔ وہ ویگن چلاتا تھا۔ اس نے مجھے لاہور پہنچا دیا اور میں ٹرین میں بیٹھ کر کراچی آگئی۔ آتے ہی آپ سے ملنے آپ کے فلیٹ پر گئی۔ آپ نہیں تھے بلکہ فلیٹ کی حالت بتا رہی تھی کہ آپ کئی دن سے یہاں نہیں ہیں۔ میں نے صفائی کی اور فلیٹ بند کرکے آگئی۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ آپ رات تک آتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ نہ آتے تو میں کل صبح بیکری پر آپ سے ملنے آتی۔''

وہ خود پر گزرے ہوئے حالات سنا رہی تھی اور عبدالرشید کا ذہن اندھیرے میں اجالے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ سچی ہے یا جھوٹی لیکن وہ ان پانچ لاکھ کو کیسے جھٹلاتا جو وہ لفافے میں بند کرکے اس کے فلیٹ میں چھوڑ آئی تھی۔ اگر وہ جھوٹی ہوتی تو رقم واپس کیوں کرتی۔ پانچ لاکھ کی رقم معمولی تو نہیں ہوتی۔ اگر رقم اینٹھنے کے لیے اس نے ڈراما رچایا ہوتا تو رقم واپس کیوں کرتی۔

''کیا سوچنے لگے۔ اب میں پوچھوں گی کہ اتنے دن میں آپ کی محبت دم توڑ گئی؟ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔ اگر آپ کی قید میرے لیے نہیں ہے تو میں فیصل آباد چلی جاؤں گی۔ آپ کو الزام نہیں دوں گی۔''

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ میری خاطر تم نے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔''

''یہ خوشی نہیں ہے کہ مجھے رہائی مل گئی؟''

''میں بہت جلد تم سے شادی کرلوں گا۔''

''ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں آج ہی یہاں پہنچی ہوں۔ کل پرسوں تک کوئی نہ کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آجائے گا۔ اب ہمارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ تم مجھے کہیں اور لے چلو۔'' عبدالرشید نے اسے ساتھ لیا اور ناظم آباد والے فلیٹ پر لے آیا۔ یہیں اس کے ملازموں کی موجودگی میں اس کا نکاح ہوگیا۔ اب اسے اس کے گھر والوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اس سے شادی کرچکا تھا۔ معلوم نہیں فیصل آباد سے کوئی اسے ڈھونڈنے آیا یا نہیں۔

اسے نیلوفر ایسی راس آئی کہ ایک سال کے اندر اندر اس کی بیکری کی شاخیں شہر میں جابجا قائم ہوگئیں۔ اس کی آمدنی اتنی ہوگئی کہ اس کا شمار بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا۔ اس نے رہائش بھی بدل لی تھی۔ اب وہ ڈیفنس میں ہزار گز کی کوٹھی میں رہ رہا تھا۔ وہاں نوکروں کی فوج نیلوفر کی خدمت کے لیے موجود تھی۔ وہ جب چائے پینے کے لیے لان میں نیلوفر کے ساتھ بیٹھتا تو اکثر اس کی قسمت کو اپنی خوش بختی ٹھہراتا تھا۔ اس دن بھی وہ یہ قصہ لے بیٹھا تھا۔

''نیلوفر، یہ جو کچھ ہے تمہاری قسمت سے مجھے ملا ہے ورنہ میں کیا تھا، ایک معمولی سا بیکری والا۔''

''وہ تو تم اب بھی ہو۔'' نیلوفر مسکرا کر کہتی۔

''میں اب بھی بیکری والا ہوں لیکن میں نے بیکری کو انڈسٹری بنا دیا ہے۔ پورے شہر میں برانچیں قائم ہیں۔ ہر طرف سپر اسٹار کی دھوم ہے۔ یہ سب تمہاری بدولت ہی تو ہوا ہے۔ کہاں وہ گلشن کا معمولی سا فلیٹ کہاں یہ کوٹھی۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو میں اب تک گلشن کے فلیٹ میں رہ رہا ہوتا۔''

''اب یہ نہ ہو کہ دولت آگئی تو مجھے زندگی سے نکال دیں۔''

''یہ تو سوچنا بھی مت۔ میں تمہارا پہلا شوہر نہیں ہوں کہ آسانی سے چھوڑ دوں گا۔''

''ارے مردوں کا کوئی بھروسا نہیں اور پھر دولت

WWW.PAKSOCIETY.COM

مند مرد، گاڑیوں کی طرح عورتیں بدلتے ہیں۔“
”میں ان میں سے نہیں ہوں۔“
ہاں، اگر ایسا سوچا بھی تو اپنی اور آپ کی جان ایک کردوں گی۔“
”اچھا فرض کرو میں نے کسی اور لڑکی کو پسند کرلیا تو کیا کرو گی؟“
”کرنا کیا ہے۔ آپ کو سمجھاؤں گی، مان گئے تو ٹھیک ورنہ خاموشی سے فیصل آباد چلی جاؤں گی۔“
”بڑی جلدی ہتھیار ڈال دو گی؟“
”میں نے آپ سے صرف شادی ہی نہیں کی ہے، آپ سے محبت بھی کی ہے۔ محبت تو دور رہ کر بھی کرتی رہوں گی۔ شادی رہے نہ رہے۔ میری محبت کا تقاضا ہوگا کہ آپ خوش رہیں۔“ وہ باتیں تو خوش رہنے اور خوش رکھنے کی کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں ساون بھادوں برسا رہی تھیں۔ عبدالرشید نے چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ دیا۔
”ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم اتنی سنجیدہ ہوگئیں۔“
”اندازہ کرلو، تمہارے مذاق نے میری یہ حالت کردی اگر تم سنجیدہ ہوگئے تو مجھ پر کیا بیت جائے گی۔“
”اچھا چلو تیار ہو جاؤ کہیں باہر چلتے ہیں۔ ماحول کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگیا۔“
پھر پہلے کی طرح نیلوفر چہکنے لگی۔

☆☆☆

شہربانو کو ڈیفنس کے اس بینک میں آئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔ کچھ تو اس بینک میں کام بہت تھا دوسرے وہ یہاں نئی تھی۔ کام سمجھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ کسی مسئلے میں الجھی ہوئی تھی کہ اچانک بینک کے پرسکون ماحول میں شور سا مچ گیا۔ ایک زنانہ، ایک مردانہ آواز آپس میں گتھم گتھا تھیں۔ اس نے فائلوں سے سر اٹھا کر دیکھا، ایک عورت کیش کاؤنٹر پر کھڑی کلرک سے جھگڑ رہی تھی۔ شہربانو نے فائلوں پر دوبارہ آنکھیں رکھ دیں۔ اچانک اسے یاد آیا کہ جھگڑنے والی عورت کو اس نے کہیں دیکھا ہے۔ اس کا لہجہ بھی کچھ شناسا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ گردن اٹھا کر دیکھا۔ ”ارے، یہ تو شاید نیلوفر ہے جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی، فیصل آباد میں۔ یہ یہاں کیسے؟ وہ اپنی سیٹ سے اٹھی اور اس کے پاس پہنچ گئی۔
”تم نیلوفر ہو؟“
”ہاں ہوں۔ تمہیں اس سے مطلب؟“ نیلوفر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا سارا غصہ رفوچکر ہوگیا۔ وہ بھی اسے پہچان چکی تھی۔
”شہربانو تم...... یہاں؟“
”ہاں میں اسی بینک میں کام کرتی ہوں۔“
”یار اس آدمی کو سمجھاؤ۔ اسے عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔“
”انہیں تو منیجر صاحب دیکھ لیں گے۔ تم میرے پاس آؤ۔“ وہ اسے سمجھا بجھا کر اپنی سیٹ پر لے آئی۔ نیلوفر اب اس کلرک کو بھول چکی تھی اور شہربانو کی خیروعافیت معلوم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔
”تم لوگ تو فیصل آباد سے ایسے غائب ہوئے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ خط نہ رسید۔“
”ہاں یار، والد صاحب کا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ انہوں نے کراچی کی ٹھان لی۔ آتے وقت تجھ سے ملی بھی نہیں تھی۔ اتنے عرصے بعد اب مل رہی ہوں۔ کتنا حسین اتفاق ہے اور تو بتا، تو فیصل آباد سے کراچی کیسے آگئی؟“
”بذریعہ شادی۔“
”تو نے شادی بھی کرلی؟“
”اس میں اتنی حیرت کی بات کیا ہے۔“
”ابھی میری نہیں ہوئی نا اس لیے حیرت ہو رہی ہے کہ تجھ جیسی صورتوں کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔“
”جناب، نہ صرف شادی ہوئی ہے بلکہ کرنے والے نے بڑی خوشامد سے کی ہے۔“
”بے چارے کو کم نظر آتا ہوگا۔“
”انگور کھٹے ہوں تو بندہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔“
”بائی داوے دلہا بھائی کرتے کیا ہیں۔ اسی بینک میں اکاؤنٹ ہے، اس سے تو لگتا ہے اسامی موٹی ہوگی۔“
”بہت مشہور آدمی ہیں۔ سپر اسٹار بیکری کا نام سنا ہوگا اس کے مالک ہیں۔“
”دھت ترے کی۔ کوئی اور نہیں ملا تھا، شادی بھی کی تو بیکری والے سے۔“
”بس یار، جلدی میں جو مل گیا۔ ویسے آج کل دولت کا زمانہ ہے اور ان کے پاس دولت ہے۔“
”عشق وشق کا چکر تھا؟“
”ایسا ویسا۔ بڑے معرکے کا عشق چلا تھا۔ کبھی فرصت سے بیٹھے گی تو بتاؤں گی۔“
”کہاں رہتی ہے جلدی سے ایڈریس لکھ کردے، آؤں گی ضرور۔“

نیلوفر نے اپنا کارڈ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”فون کر کے آنا میں اکثر سیر سپاٹے کے لیے گھر سے باہر ہی ہوتی ہوں۔“ نیلوفر کے جانے کے بعد شہربانو پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نیلوفر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا کالج کا زمانہ یاد آرہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں یہ بھی طے کرچکی تھی کہ نیلوفر کا گھر ڈیفنس ہی میں تو ہے، کسی دن بینک سے اٹھ کر اس کے گھر ضرور جائے گی۔
وہ گھر گئی تو اس کی ماں بخار میں جل رہی تھی۔ اسے فوراً انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا۔ پھر یہ بیماری اتنی طویل ہوگئی کہ اسے بینک سے پورے پندرہ دن کی چھٹی لینی پڑی۔ اسے نیلوفر سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا کہ وہ اس کے گھر ضرور آئے گی لیکن ماں کی بیماری میں ایسی لگی کہ جا ہی نہیں سکی۔ فون کرسکتی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ وہ امی کا سنے گی تو کہیں خود نہ چلی آئے۔ وہ چاہتی تھی پہلے وہ اس کے گھر جائے۔
سپر اسٹار بیکری کے بارے میں بھی سوچتی رہی کہ اس نے یہ بیکری کہاں دیکھی ہے۔ نیلوفر کہہ تو رہی تھی کہ ایک شاخ ناظم آباد میں بھی ہے لیکن کہاں ہے یہ یاد نہیں آرہا تھا پھر تھک ہار کر اس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ اسے بیکری کا کیا کرنا ہے، اسے تو نیلوفر کے گھر جانا تھا۔ گھر کا ایڈریس اس کے پاس تھا۔
پندرہ دن بعد جب وہ بینک گئی تو جاتے ہی بینک منیجر نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ چھٹی کرنے پر منیجر صاحب اسے ڈانٹ پلائیں گے لیکن منیجر صاحب کا موڈ تو ضرورت سے زیادہ خوش گوار تھا۔
”مس بانو آپ کو معلوم تو ہوگیا ہوگا کہ اشرف صاحب کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ کل اس سلسلے میں انہیں پارٹی دی جارہی ہے۔“
”نہیں، سر ابھی تو مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔“
”آپ چھٹی پر تھیں اس لیے آپ کو معلوم نہیں ہوسکا۔ بہرحال کل پارٹی ہے۔“
”اچھا سر، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“
”خوشی کی بات تو ہے لیکن کچھ ہاتھ آپ کو بھی بٹانا ہے۔“
”میں حاضر ہوں سر!“
”آپ ناظم آباد میں رہتی ہیں ناں؟“
”جی ہاں۔“
”وہاں سپر اسٹار بیکری ہے اور آپ کے گھر کے قریب ہی ہے، آپ نے دیکھی تو ہوگی؟“
”جی نہیں، کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ نام ضرور سنا ہے۔“
”پتا میں آپ کو سمجھا دوں گا۔ وہاں کی پیسٹریاں اور پیٹیس بہت مشہور ہیں۔ آپ کل بینک آتے ہوئے پیسٹریاں اور پیٹیس لیتی آئیے گا۔ ٹیکسی سے آجائیے گا، پیسے بینک دے گا۔“
”سر، میں نے بیکری دیکھی نہیں ہے۔“
”میں بتا تو رہا ہوں۔“ انہوں نے جو پتا سمجھایا اس کے مطابق اس بیکری کو اس کے گھر کے بالکل بیک پر کسی جگہ ہونا چاہیے تھا۔ اس نے ہامی بھرلی۔
وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھی تو اس کے ذہن میں سپر اسٹار کا نام گونج رہا تھا۔ چلو اس بہانے نیلوفر کے میاں کو بھی دیکھ لوں گی۔ پتا تو چلے اس نے کیا دیکھ کر بیکری والے سے شادی کی ہے۔
وہ صبح گھر سے نکلی اور بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر اس کے قدم خود بہ خود رک گئے۔ وہ تو سمجھ رہی تھی جیسی عام بیکریاں ہوتی ہیں وہ بھی ہوگی، معمولی سی دکان پر بیکری کا بورڈ لگا ہوگا لیکن اس کی تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ شیشے کا تاج محل تھا جس پر سپر اسٹار بیکری کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے قدم آگے بڑھائے تو الیکٹرانک دروازہ خود بہ خود کھل گیا۔ کھڑے ہوئے دربان نے گردن خم کرکے تعظیم کی۔ اسے خود بہ خود اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ شیشوں کے شوکیسوں کے عقب میں باوردی ملازم تیار کھڑے تھے۔ اس نے چند لمحوں تک خوشبو میں بسی بیکری میں کھڑے ہوکر گہرے گہرے سانس لیے۔ نیلوفر واقعی خوش قسمت ہے جو ایسی شاندار بیکری کے مالک سے شادی کی ہے۔ وہ ایک کاؤنٹر پر گئی اور پیسٹریوں کا آرڈر دیا۔ دوسرے کاؤنٹر پر پیٹیس کا آرڈر دیا۔
”میڈم، آپ کیش کاؤنٹر پر پے منٹ کردیں۔ آپ کے دونوں آرڈر وہیں پہنچ جائیں گے۔“
وہ کاؤنٹر پر پہنچی تو کسی خودکار نظام کے تحت کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو معلوم ہوچکا تھا کہ اس نے کتنے کی خریداری کی ہے۔ اس نے پے منٹ کی، اس کا سامان کاؤنٹر پر پہنچ چکا تھا۔
”میڈم، سامان زیادہ ہے، آپ کہیں تو میرا ملازم یہ سامان آپ کی گاڑی میں رکھ آئے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

''نہیں شکریہ۔ میں اپنا کام خود کرنے کی عادی ہوں۔'' وہ سامان اٹھا کر چلنے ہی والی تھی کہ کسی کا فون آگیا۔ وہ شخص فون پر بات کرنے لگا۔

''جی میں عبدالرشید بول رہا ہوں۔'' شہربانو کے قدم اچانک رک گئے۔ نیلوفر نے اپنے میاں کا یہی نام بتایا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ ملازم نہیں، اس بیکری کا مالک ہے۔

''جی ہاں بھائی، میں ہی مالک ہوں اس بیکری کا ،آپ فرمائیں تو۔'' شہربانو نے پلٹ کر دیکھا۔ پہلے تو اس نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر نیلوفر کی قسمت پر رشک ہوا۔ پہلے اس نے سوچا وہ اپنا تعارف کروائے، اسے بتائے کہ وہ اس کی بیوی کی نہایت گہری دوست ہے لیکن پھر اس نے سوچا ایسے کیا فائدہ۔ وہ گھر جائے گی تو کھل کر ملاقات ہوگی۔ وہ بیکری سے باہر نکل آئی۔

عبدالرشید میں نہ جانے ایسی کیا کشش تھی کہ دوسرے دن اس کے قدم پھر اسی بیکری کی طرف اٹھ گئے۔ اس مرتبہ اسے خریداری سے زیادہ عبدالرشید کو اچھی طرح دیکھنے کی طلب تھی۔ شیشے کا دروازہ پھر کھلا۔ دربان نے تعظیم کی۔ وہ خاصی دیر تک بیکری میں گھوم پھر کر مختلف چیزیں دیکھتی رہی۔ وقفے وقفے سے کاؤنٹر کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی پھر کچھ سامان خرید کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔ ایک دلفریب مسکراہٹ نے پھر اس کا استقبال کیا۔ اس نے پیسے ادا کیے اور مسکراہٹ کے جواب میں مسکراہٹ چھوڑ کر بیکری سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ حیران تو اسے ہونا ہی تھا کہ اس کی یہ حالت کیوں ہے۔ وہ اس طرح پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے کوئی قیمتی چیز اندر رہ گئی ہو۔

اب اسے نیلوفر کے گھر جانے کی جلدی تھی یا یوں کہیے کہ عبدالرشید سے تفصیلی ملاقات کی جلدی تھی۔ کوئی اس کے اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''عبدالرشید سے جلدی ملو۔'' وہ آج تک کسی مرد سے یوں متاثر نہیں ہوئی تھی پھر عبدالرشید میں ایسا کیا تھا۔ وہ لالچی بھی نہیں تھی جو دولت کی کشش اسے کھینچ رہی ہو۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس کی سہیلی کا شوہر ہے۔ اس کے باوجود وہ بے قرار ہوگئی تھی۔ وہ نیلوفر کے گھر کسی بھی وقت جاسکتی تھی لیکن ایسے وقت جانا چاہتی تھی جب عبدالرشید بھی گھر پر ہو مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ گھر پر کس وقت ہوتا ہے۔ بیکری تو صبح سے رات تک کھلی رہتی تھی۔ تو وہ کیا رات ہی کو گھر جاتا ہوگا۔ وہ فون کر کے نیلوفر سے پوچھ سکتی تھی لیکن حجاب مانع تھا۔ وہ کہے گی مجھ سے ملنے آرہی ہو یا میرے میاں سے۔ وہ کئی دن اسی حجاب کا شکار رہی لیکن پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فون کر ہی بیٹھی۔ نیلوفر نے اسے بتایا کہ وہ دوپہر کے بعد گھر آجاتے ہیں اور پھر رات میں چلے جاتے ہیں۔ شہربانو کو یاد آیا وہ دو مرتبہ بیکری گئی ہے اور دونوں مرتبہ صبح کا وقت تھا۔ اس کا مطلب ہے بینک سے چھٹی کے بعد نیلوفر کے گھر جایا جائے۔ اس نے نیلوفر کو فون پر بتا دیا کہ کل آرہی ہے۔

وہ اس دن بینک سے جلدی اٹھ گئی۔ بینک کے قریب ہی نیلوفر کا گھر تھا۔ بہ مشکل پندرہ منٹ میں وہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ نیلوفر اسے دیکھ کر نہال ہوگئی۔ یہ احساس بھی تھا کہ اس کی پرانی دوست اس کے گھر آئی ہے اور یہ فخر بھی کہ اتنے شاندار گھر میں آئی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ میں نے بیکری والے سے شادی ضرور کی ہے لیکن اس کے پاس دولت کتنی ہے۔

شہربانو کی آنکھیں برابر عبدالرشید کو تلاش کر رہی تھیں۔ کوئی دو کمرے کا مکان نہیں تھا کہ وہ اسے چلتا پھرتا نظر آجاتا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا، اس نے پوچھ ہی لیا۔

''اپنے میاں سے کیا پردہ کرواؤ گی۔ انہیں بھی تو بلاؤ، دیکھیں تو سہی بیکری والے ہوتے کیسے ہیں؟''

''ذرا اندیدے واقع ہوئے ہیں اس لیے سوچ رہی تھی کہ نہ ہی بلاؤں تو اچھا ہے۔''

''میں کوئی پیسٹری ہوں جو لے جا کر اپنی بیکری میں سجا لیں گے۔''

''ان کا کوئی بھروسا بھی نہیں ہے۔'' نیلوفر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''چلو تم کہتی ہو تو بلا لیتی ہوں۔'' وہ شاید اس سے زیادہ بے چین تھا۔ بلائے بغیر ہی آگیا اور اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔

''میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

''ارے یہ بڑی چھپی رستم ہیں۔ ناظم آباد میں رہتی ہیں۔ آئی ہوں گی کسی دن آپ کی بیکری میں۔'' نیلوفر نے کہا۔

''بیکری کے علاوہ بھی کسی جگہ دیکھا ہے۔''

''میں بینک میں کام کرتی ہوں۔ شاید وہاں دیکھا ہو۔''

''کس بینک میں ہیں آپ؟''

''میں ڈیفنس کے بینک میں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایک اکاؤنٹ ہمارا اس بینک میں بھی ہے۔ شاید بینک میں ہی دیکھا ہوگا۔"

اس بحث و تکرار میں نیلوفر خاموش نہ رہ سکی۔ "آپ بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ پولیس والوں کی طرح تفتیش کررہے ہیں۔ میری سہیلی اتنے دن بعد مجھے ملی ہے، کچھ مجھے بھی باتیں کرنے دیں۔"

"بھئی میں تو ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کررہا تھا تاکہ آئندہ باتیں کرنے میں آسانی ہو۔ اب دیکھیے سب باتیں معلوم ہوگئیں۔"

"میں آپ کو ویسے ہی سب کچھ بتادیتی۔ شناسائی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"شناسائی ہوجائے تو باتیں کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اب معلوم ہوگیا کہ یہ آپ کی گہری سہیلی ہیں لہٰذا میرا بھی حق بن گیا کہ میں ان سے باتیں کروں۔"

تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ تینوں اس طرح گھل مل کر باتیں کررہے تھے جیسے برسوں کے شناسا ہوں۔ شہر بانو دیکھ رہی تھی کہ عبدالرشید نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ باتیں بھی خوب صورت کرتا ہے۔ اس کا دل لگا ہوا تھا۔ پیاس تھی کہ کم ہونے میں نہ آتی تھی۔ جی چاہتا تھا عمر گزر جائے اور باتیں کم نہ ہوں۔ وہ ظاہر یہی کررہی تھی کہ نیلوفر کی محبت میں بیٹھی ہوئی ہے لیکن حقیقت یہی تھی کہ عبدالرشید کی کشش اسے یہاں روکے ہوئے تھی لیکن کبھی نہ کبھی تو اٹھنا ہی تھا۔ اب اندھیرا بھی ہونے لگا تھا۔ یہاں تو رکشا ٹیکسی کا ملنا بھی محال ہوگا، وہ سوچ رہی تھی۔

وہ اٹھنے لگی تو نیلوفر نے اسے روک لیا۔ "کچھ دیر ٹھہر جاؤ، رشید کو بھی بیکری جانا ہے۔ ناظم آباد ہی تو جارہے ہیں تمہیں چھوڑتے ہوئے چلے جائیں گے۔"

"نہیں نیلوفر، ان کے ساتھ جاتی کیا اچھی لگوں گی۔ میں چلی جاؤں گی کسی طرح بھی۔"

"ڈرائیور بھی تو ساتھ ہوگا۔ گھبراتی کیوں ہو، ویسے بھی رشید نہ صرف باتوں بلکہ دل کے بھی برے نہیں۔"

"میرے دلہا بھائی ہیں ان کے ساتھ تو میں اکیلی بھی جاسکتی ہوں۔"

"ابھی تو دم نکل رہا تھا۔"

رشید تیار ہوکر آگیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی نکال لی تھی۔ شہر بانو نے پھر آنے کا وعدہ کیا اور نیلوفر سے گلے مل کر رخصت ہوگئی۔

عجیب بات یہ تھی کہ عبدالرشید راستے بھر خاموش رہا تھا۔ شاید ڈرائیور کی موجودگی کا خیال ہو۔ نیلوفر کے گھر سے آنے کے بعد شہر بانو اداس ہوگئی تھی۔ وہ جن راستوں کی مسافر نہیں تھی انہی راستوں پر چلنے کی تیاری کررہی تھی۔ اداسی کا یہی سبب تھا۔ اسے رہ رہ کر نیلوفر کا خیال آرہا تھا۔ وہ بے چاری کتنے صاف دل سے ملی ہے اور میں اس کے شوہر میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ یہ جرم نہیں تو اور کیا ہے۔ بات کھل گئی تو اتنی اچھی سہیلی بھی ہاتھ سے جائے گی۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ میں دل پر پتھر رکھ لوں گی اور اب اس کے شوہر سے نہیں ملوں گی۔ ملنا کیا ہے، نیلوفر کے گھر جانے سے گریز کروں گی یا پھر کوشش کروں گی کہ ایسے وقت جاؤں جب اس کا شوہر گھر پر نہ ہو۔ اس نے طے کرلیا کہ اب وہ نیلوفر کے گھر نہیں جائے گی۔

وہ اپنے عہد پر سختی سے قائم تھی۔ ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ وہ نہ تو نیلوفر کے گھر گئی تھی اور نہ اسے فون کیا تھا۔ بار بار اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے ارادے پر قائم نہیں رہ سکے گی لیکن سختی سے جمی ہوئی تھی۔ خیال آتا بھی تھا تو جھٹک دیتی تھی۔

پیاسا کنویں کے پاس نہ جائے لیکن کنواں خود چل کر آجائے تو کیا، کیا جائے۔ عبدالرشید خود چل کر اس کے بینک آگیا۔ اسے ایک چیک جمع کروانا تھا۔ کم از کم وہ کہہ یہی رہا تھا حالانکہ یہ کام اس کے ملازم کرتے ہوں گے۔ جب وہ آہی گیا تھا تو یہ بے مروتی تھی کہ وہ اس سے بات نہ کرتی۔ چیک جمع ہونے کے بعد بھی وہ اس کے سامنے بیٹھا رہا۔ شہر بانو کوشش کررہی تھی کہ باتوں کا رخ زیادہ سے زیادہ نیلوفر کی جانب رہے۔ "آپ گھر سے نکلے تو وہ کیا کررہی تھی۔ آپ گھر پر نہیں ہوتے تو وہ کیا کرتی ہے؟" پھر کالج کے زمانے کی باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ وہ شاید جان بوجھ کر ایسے وقت آیا تھا کہ لنچ کا ٹائم قریب تھا۔

"باتوں سے پیٹ بھرتی رہیں گی یا کہیں باہر چل کر مجھے لنچ بھی کرائیں گی۔ مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک تو نہیں کیا جاتا۔"

"آپ کیا کھائیں گے یہیں منگوا لیتے ہیں۔"

"یہاں کیا اچھا لگے گا۔ چلیں کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"دیر ہوجائے گی میرے پاس کام بہت ہے۔"

"آپ کی میزبانی کرکے مجھے خوشی ہوگی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ سب کی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی خاموشی سے اپنا بیگ اٹھایا اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی بینک سے باہر آگئی۔

باہر چم چم کرتی شاندار گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھی تو اس کی گردن خود بخود تن گئی۔ گھر میں غربت کا راج رہا تھا۔ ٹیکسی میں بھی کبھی کبھی کا بیٹھنا ہوتا تھا اور اب ایسی شاندار گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بھی عبدالرشید کے ساتھ۔ اسے پھر نیلوفر کا خیال آگیا۔ زندگی تو وہ ہے جو نیلوفر گزار رہی ہے۔ میں تو کچھ دیر کے لیے اس گاڑی میں بیٹھی ہوں، اتر جاؤں گی۔ وہ اسی گاڑی میں گھومتی ہوگی۔ ایسی ایسی کئی گاڑیاں ہوں گی اس کے پاس۔

وہ اس کے ساتھ قالین پر چلتی ہوئی ہوٹل کے ایک نیم تاریک حصے میں جاکر بیٹھ گئی۔ عبدالرشید کی مردانگی نے ایک جواز تلاش کیا۔

"آپ کی اور نیلوفر کی دوستی کیسے ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے آپ دونوں کا مزاج تو بالکل مختلف ہے۔ آپ اتنی شوخ اور وہ......"

"وہ تو بہت ہنسنے بولنے والی ہے، میں تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"وہ صرف دوسروں کے سامنے ہنستی بولتی ہے۔ گھر میں تو وہ اس طرح رہتی ہے جیسے زبردستی رہنا پڑ رہا ہو۔"

"کمال ہے! حالانکہ آپ نے اسے وہ سب کچھ دیا ہوا ہے جس کی کسی لڑکی کو تمنا ہوسکتی ہے۔"

"میں تو اسے اپنی قسمت ہی کہتا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اتنی دیر میں کھانا آگیا۔ کچھ دیر کے لیے باتوں میں وقفہ آگیا۔ دو چار لقموں کے بعد پھر باتیں چھڑ گئیں۔

"یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نیلوفر کی مجھ سے دوسری شادی ہے۔" عبدالرشید نے کہا اور شہر بانو کا منہ چلتے چلتے رک گیا۔

"یہ خبر آپ کے کسی دشمن نے آپ تک پہنچائی ہوگی۔"

"میں نیلوفر سے کنفرم کرچکا ہوں۔"

"چلیں یہ کوئی ایسی بات نہیں اگر مزاج ملتے ہوں۔"

"مزاجوں ہی کا تو رونا ہے۔" عبدالرشید نے کہا۔ "میں بھی پہلی ملاقات میں کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ آپ کھانا کھائیں۔"

وہ یہ باتیں سن کر خوف زدہ سی ہوگئی تھی۔ کھانا ضرور کھا رہی تھی لیکن سوچ رہی تھی، ہر شخص اندر سے کتنا دکھی ہے یہ تو قریب جاکر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب اسی کو دیکھو جو میرے سامنے بیٹھا ہے، اتنا مالدار ہوتے ہوئے بھی کتنا مفلس ہے۔ جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملی تھی تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے اندر کتنے دکھ بھرے ہوئے ہیں۔ اسے عبدالرشید سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ عبدالرشید کی باتوں کا جادو اثر دکھا چکا تھا۔ عبدالرشید یہی چاہتا تھا، وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ بینک سے اٹھ کر آئی تھی۔ واپس بھی جانا تھا۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ عبدالرشید نے اسے بینک کے دروازے پر چھوڑا اور چلا گیا۔

شہر بانو کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ عبدالرشید کے ساتھ بیٹھی کھانا کھارہی تھی۔ ایک وہ وقت تھا جب وہ اس کی بیکری میں پہلی مرتبہ گئی تھی اور یہ آرزو کررہی تھی کہ اس سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جائے یا وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ ضد کرکے اسے اپنے ساتھ لنچ پر لے گیا تھا۔ جو باتیں اس نے نیلوفر کے بارے میں کیں وہ بھی بڑی حوصلہ افزا تھیں۔ وہ اپنی بیوی سے خوش نہیں۔ ایسے مرد دل کے معاملات میں بڑے آسان ہوجاتے ہیں لیکن نیلوفر......؟ اسے پھر نیلوفر کا خیال آگیا۔ وہ اس سے خوش ہو نہ ہو بہرحال وہ اس کی امانت ہے۔ تو میں کون سا ڈاکا ڈال رہی ہوں۔ دوستی تو کسی سے بھی رکھی جاسکتی ہے۔ عبدالرشید میرا کچھ نہ بنے دوست تو بن سکتا ہے۔ اس نے بھی تو مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ یہ تک بتادیا کہ نیلوفر کی اس سے دوسری شادی ہے۔ میں اس کے راز کو راز رکھوں گی۔ دوستی رکھنے میں کیا حرج ہے۔ اس سے آگے میں ایک قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ اس کے لیے مجھے نیلوفر کے گھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں عبدالرشید سے باہر بھی تو مل سکتی ہوں۔

دوسرے دن وہ بینک جانے کے لیے گھر سے نکلی تو پہلے اس کی بیکری پہنچ گئی۔ صبح کے وقت وہ بیکری پر ہی ہوتا تھا۔ اس وقت بھی کاؤنٹر پر موجود تھا۔

"آپ اس وقت یہاں، کیا آج بینک کی چھٹی ہے؟"

"بینک ہی تو جارہی تھی۔ سوچا لنچ کے لیے کچھ پیٹیس ہی خرید لوں۔"

"آپ فون کردیتیں۔ میں پہنچا دیتا۔ اب تو یہی ہوسکتا ہے کہ آپ بینک جائیں، میں لنچ کے لیے آپ کو لینے آجاؤں گا۔"

"شرط یہ ہے کہ آج کا لنچ میری طرف سے ہوگا۔"

"چلیے منظور لیکن اس کے بعد جتنے لنچ ہوں گے وہ میری طرف سے ہوں گے۔"

"سارے لنچ میں کھا جاؤں گی تو آپ کی بیگم تو سوکھ کر کانٹا ہوجائیں گی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میں لنچ اس کے ساتھ کرتا بھی نہیں تھا۔ اکیلا کرتا تھا، اب آپ آگئیں۔''

بینک میں لنچ ٹائم ہوا تو عبدالرشید کی نئے ماڈل کی کار بینک کے سامنے آکر رک گئی۔ شہربانو باہر نکلی گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی ہوٹل کی جانب روانہ ہوگئی۔

ان ملاقاتوں کا سلسلہ دراز تر ہوتا چلا گیا۔ لنچ سے گزر کر بات ڈنر تک پہنچ گئی۔ مصروفیات کا بہانہ دونوں طرف تھا۔ نیلوفر کو بھی معلوم تھا کہ اس کے شوہر کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں، شہربانو نے بھی ماں سے کہہ دیا تھا کہ بینک میں کام بہت ہے اسی لیے دیر سے آنا ہوتا ہے۔

ان ملاقاتوں نے عبدالرشید کے بہت سے راز اس پر ظاہر کردیے تھے۔ سب سے حیران کن انکشاف یہ تھا کہ وہ شراب پیتا ہے یہ انکشاف بھی شاید کسی مصلحت کے تحت خود اس نے شہربانو کے سامنے کیا تھا۔

''آپ شراب پیتے ہیں؟''

''صرف اس لیے کہ اس کے سہارے کچھ دیر کے لیے میں اپنے ماضی سے باتیں کرلیتا ہوں۔''

''ماضی تو سب ہی کو عزیز ہوتا ہے لیکن سب شراب تو نہیں پیتے۔''

''سب کا ماضی بھی میری طرح نہیں ہوتا۔''

''ایسا کیا ہے آپ کے ماضی میں۔ کیا مجھ پر اعتماد کرکے بتاؤ گے نہیں۔''

''کبھی موقع دو گی تو ضرور بتاؤں گا۔ مجھے تو سہارے کی ضرورت ہے۔ شراب نہ سہی تم سہی۔''

''اتنی بات تو نیلوفر کو بھی معلوم ہوگی۔ میں اس سے پوچھ لوں گی۔''

''اسے معلوم ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔ میں اس سے باتیں کرکے دل ہلکا کرلیتا۔''

''کمال ہے! آپ نے اس سے چھپایا ہوا ہے اور مجھے بتانے کو تیار ہیں!''

''وہ میرے اتنے قریب کبھی آئی ہی نہیں کہ اسے بتاتا۔ اس نے تو کبھی یہ تک نہیں پوچھا کہ میں کیوں پیتا ہوں۔ وہ کبھی پوچھتی تو شاید بتا بھی دیتا کہ کیوں پیتا ہوں۔''

''آپ کی کہانی واقعی بہت دکھ بھری ہے۔ بیوی ہوتے ہوئے بھی آپ کوئی اور سہارا تلاش کررہے ہیں۔''

''بعض باتیں بیوی سے نہیں، دوستوں سے کہی جاتی ہیں اور تم میری دوست ہو۔''

''دوست سمجھتے ہو تو بتاتے کیوں نہیں؟''

''کہا نا کہ کسی مناسب وقت بتادوں گا تاکہ جو پھانس دل میں اٹکی ہوئی ہے وہ نکل جائے۔''

شہربانو کو تشویش ہوگئی تھی کہ آخر وہ کیا بات ہے جسے وہ سب سے چھپاتا رہا ہے اور مجھے بتانے کو تیار ہے لیکن نہ جانے کس مناسب موقعے کی تلاش میں ہے۔ وہ اس کا دل جیتنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ رہنے لگی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اس پر اعتبار کرنے لگے۔

عبدالرشید کا احساس جرم اسے پریشان کرتا رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا اگر وہ کسی کے سامنے اعتراف جرم کرلے گا تو اس کے دل کو قرار آجائے گا۔ یہ اعتراف ایسا تھا کہ کسی کو اس سے نفرت بھی ہوسکتی تھی۔ یہی سوچ کر اس نے ابھی تک نیلوفر کو رازدار نہیں بنایا تھا۔ وہ اسے دیوتا سمجھتی تھی۔ اس اعتراف کے بعد نہ جانے کیا سمجھے۔ شہربانو کا کیا ہے، اسے اگر نفرت ہو بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ دوستی ختم کردے گی۔ اس کے ساتھ زندگی تو نہیں گزارنی۔ اس انکشاف سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں ہوگا اس لیے محض قصہ سمجھ کر سن لے گی۔

اس نے شہربانو کو فون کرکے بیکری بلوایا تھا۔ بینک کی چھٹی کا وقت تھا۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور ناظم آباد آگئی۔ عبدالرشید اسے دیکھتے ہی کاؤنٹر سے نکل آیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے شیشے کا ایک دروازہ تھا۔ وہ اسے لے کر دروازے کے اس طرف چلا گیا۔ یہاں ایک اور دروازہ تھا۔ اس دروازے کو پار کیا تو سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی تھیں۔ شہربانو دل میں خائف ہوئی لیکن وہ عبدالرشید کی شرافت کو کئی بار آزما چکی تھی اس لیے مطمئن تھی۔ اسے اپنے آپ پر بھی اعتماد تھا۔

یہ سیڑھیاں اسے بیکری کے تہ خانے میں لے آئیں جہاں ایک بڑا ہال کمرا تھا، بہترین فرنیچر سے آراستہ۔ یہ کمرا دراصل اس کا بار روم تھا۔ اس نے اے۔ سی آن کیا۔

''یہاں مخصوص دوست ہی آسکتے ہیں یا چند کاروباری لوگ یہاں آئے ہیں۔''

''میں خود کو کیا سمجھوں۔ دوست یا کاروباری لوگ؟''

''ان دونوں طبقوں سے الگ۔ ان سب سے ماورا کیونکہ تم ایک لڑکی ہو اور یہاں آج تک کوئی لڑکی نہیں آئی۔''

''آپ یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس تنہائی کے باوجود تم میری دوست ہی رہو گی۔''

وہ باتیں کرتا ہوا فریج تک گیا اور کولڈ ڈرنک نکال کر

اس کے سامنے رکھ دی۔ پھر ڈیپ فریزر سے اسکاچ کی بوتل نکال کرلے آیا۔

''یہ آپ کیا کررہے ہیں؟''

''شراب پی رہا ہوں۔ اپنے دوستوں سے میں کوئی عیب چھپانے کا قائل نہیں۔''

''اگر آپ کو یہ شوق کرنا ہے تو میں جارہی ہوں۔ اسے پینے کے بعد کوئی ہوش میں نہیں رہتا۔ آپ بھی نہیں رہیں گے۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو۔ میں اتنی نہیں پیتا کہ ہوش ہی کھودوں۔''

''پینے سے پہلے سب یہی کہتے ہیں۔ آپ کا آفس میں نے دیکھ لیا۔ بس اب چلیے۔''

''ابھی تو ماضی کے کئی دفتر آپ کے سامنے کھولنے ہیں۔ میں جس آگ میں جل رہا ہوں اسے بجھانا ہے۔ بڑی مشکل سے تو ایک بااعتماد دوست ملا ہے۔ یہ موقع کیسے ضائع کردوں۔''

''شراب پیے بغیر بھی تو آپ اپنی یادداشت کو آواز دے سکتے ہیں۔''

''یاد تو مجھے سب ہے لیکن یہ نہیں پیوں گا تو کہنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں گا۔''

اتنی دیر میں وہ شراب کو گلاس میں انڈیل چکا تھا۔ اب اسے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ خود اٹھ کر بھاگ سکتی تھی لیکن وہ کہہ چکا تھا کہ ماضی کی کچھ باتیں ہیں جو وہ اسے بتائے گا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو برداشت کرنا تھا۔ یہ دیکھ چکی تھی کہ کوئی دروازہ لاک نہیں۔ پاؤں پھسلا تو وہ گرنے سے پہلے اٹھ کر بھاگ کھڑی ہوگی۔

''تم نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ میرے پاس اتنی دولت آئی کہاں سے؟''

''مجھے آپ کی دولت سے کیا سروکار، پھر کیوں پوچھتی۔''

''نہیں، ایک بات ہے۔ شاید یہ سوچتی ہو کہ یہ دولت میرے باپ نے میرے لیے چھوڑی ہوگی۔''

''ضروری تو نہیں۔ آپ نے اپنی محنت سے دولت کمائی ہوگی۔''

''محنت سے روٹی کمائی جاتی ہے، دولت نہیں۔ دولت کمانے کے لیے بھی دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس وہ دولت کہاں سے آئی جس سے دولت کمائی۔''

وہ اب تک دو گلاس خالی کرچکا تھا۔ نشہ گہرا نہیں ہوا تھا لیکن زبان میں لکنت آنے لگی تھی۔ شہربانو کو یہ فکر ہو رہی تھی کہ نشہ زیادہ ہوگیا تو وہ کہانی ادھوری چھوڑ کر سو جائے گا۔ ابھی تک وہ تمہید ہی باندھ رہا ہے، کہانی میں تو داخل ہی نہیں ہوا۔

''پھر یہ دولت آئی کہاں سے؟''

''یہی تو اصل سوال ہے۔ میرے والدین تو بچپن ہی میں مرکھپ گئے تھے۔ بہن بھائی کوئی تھا نہیں۔ مسجد کے امام صاحب تھے، انہوں نے مجھے بیٹا بنالیا۔ ان کا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ بھی مرگئے تو میں نے مسجد اور شہر دونوں چھوڑ دیے۔ ان کے پاس رہ کر میں نے آٹھویں کلاس تک پڑھا تھا۔ کچھ دینی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک برائی مجھ سے ہضم نہیں ہوتی، اس کم بخت شراب کے علاوہ۔'' اس نے چوتھا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

''بس اب آپ نہیں پئیں گے۔ پہلے اپنی بات ختم کرلیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا، میں کراچی آگیا۔ فٹ پاتھوں پر سوتا رہا۔ یہاں ایک ٹیکسی والا میرا دوست بن گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سکھادی۔ اسی کے توسط سے ٹیکسی کرائے پر لے کر چلانے لگا۔ ایک روز میں ٹیکسی لے کر نکلا ہوا تھا کہ ایک باریش، عمر دراز آدمی میری ٹیکسی میں بیٹھا۔ راستے میں اسے دل کا دورہ پڑا۔ انسانیت کا تقاضا تھا کہ میں اسے اسپتال لے کر جاؤں۔ میں اسے اسپتال لے گیا۔ اسپتال والوں نے ایک مہنگا سا انجکشن لکھ کر دے دیا کہ یہ لے آؤ۔ میرے پاس اتنے پیسے کہاں تھے، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ وہ آدمی جب میری ٹیکسی میں بیٹھا تو اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا جو ابھی تک ٹیکسی میں پڑا تھا۔ میں نے وہ بریف کیس کھول کر دیکھا تو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے دل میں بے ایمانی آگئی۔ میں اس کے پیسوں میں سے ایک کیا دس انجکشن لاکر دے سکتا تھا اور اس کی جان بچ سکتی تھی لیکن مجھے خوف ہوا کہ پکڑا نہ جاؤں۔ میں نے اس آدمی کو موت وزیست کی کشمکش میں چھوڑا اور گھر چلا آیا۔ وہ آدمی بچ نہیں سکا ہوگا، مرگیا ہوگا۔ میں نے دولت کی خاطر اس آدمی کو قتل کردیا۔ میں قاتل ہوں، میں نے اس کی دولت سے کاروبار شروع کیا اور آج کروڑوں میں کھیل رہا ہوں لیکن وہ آدمی مرگیا۔ اگر زندہ بھی ہوگا تو مفلسی کی زندگی گزار رہا ہوگا۔ مجھے اس وقت تو احساس نہیں ہوا تھا لیکن آج مجھے اس آدمی کا خیال آتا ہے تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ دولت مجھے زہر لگنے لگتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بات کسے بتاؤں کہ میں قاتل ہوں۔"

"اس آدمی کا نام کیا تھا؟"

"میں نے اس کے بریف کیس پر اس کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا لیکن اب یاد نہیں رہا۔"

"وہ بریف کیس ہے تمہارے پاس؟"

"وہ تو میں نے ثبوت مٹانے کے لیے اسی وقت نذر آتش کر دیا تھا۔"

"کہیں وہ نام ناصر مرزا تو نہیں تھا؟"

"شاید...... شاید۔ یہی نام تھا...... ناصر مرزا، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کوئی صدیوں پرانی بات تھوڑی ہے۔ یہ قصہ تو بہت مشہور ہوا تھا۔ اخباروں میں بھی آیا تھا۔ مجھے نام یاد رہ گیا۔ وہ آدمی زندہ نہیں بچا تھا، مر گیا تھا۔"

"اسے تو مرنا ہی تھا۔ دولت کسی کو جینے نہیں دیتی۔"

"آپ نے یہ تو سوچا ہوگا کہ اس کے بعد اس کی بیوی بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی؟"

"خیال تو آیا تھا لیکن یہ خیال بھی آیا تھا کہ دولت کے پاؤں ہوتے ہیں، وہ سفر کرتی ہے۔ آج یہ میرے پاس ہے، کل تم اس کی مالک ہوگی۔ نیلوفر کو تو میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا۔"

"مجھے آپ کی دولت سے نہیں آپ سے پیار ہے۔" شہر بانو نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ "مجھے آپ مل جائیں، میں سمجھوں گی دو جہاں مل گئے۔"

شراب میں شراب ملی تو نشہ دوبالا ہو گیا۔ "تم کہتی ہو تو آج سے نیلوفر آؤٹ۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔"

"آؤ اب چلیں۔ بہت رات ہو گئی۔"

"جانے کی باتیں تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ آج ہم یہیں رہیں گے۔" اس نے شہر بانو کو اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن خود صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اب شہر بانو کا وہاں رکنا فضول تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھیں اور اوپر بیکری میں آ گئی۔ اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کو اس کی حالت کے بارے میں بتایا اور خود بیکری سے باہر نکل آئی۔ جو انکشاف اس پر ہو چکا تھا اس کے بعد اسے گھر تک جانا مشکل ہو رہا تھا لیکن ابھی اسے اس سے بھی زیادہ مشکل مراحل سے گزرنا تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھتی رہی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ آج برسوں بعد اس کے باپ کا قاتل اسے مل گیا تھا۔ اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب اس کا باپ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ایک اسپتال کے مردہ خانے سے اس کی لاش ملی تھی۔ وہ بریف کیس غائب تھا جس میں وہ اپنا مکان بیچ کر رقم لا رہے تھے۔ ان کے اپنے اصول تھے۔ وہ بینک وغیرہ کے قائل نہیں تھے اسی لیے انہوں نے نقد رقم وصول کی تھی۔ یہ ان کی بے احتیاطی ہی تو تھی کہ اتنی بڑی رقم اکیلے لے کر آ رہے تھے۔ اسپتال والوں سے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ کوئی شخص انہیں اسپتال چھوڑ گیا تھا۔ وہ کون تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ رقم لوٹنے والا وہی شخص تھا یا وہ اسپتال آنے سے پہلے لٹ چکے تھے۔ اب تک تو وہ صبر کر چکی تھی لیکن عبدالرشید کے اعتراف کے بعد اسے باپ بھی یاد آنے لگا، اس کی دولت بھی۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ میرے باپ کی دولت پر عیش کرے۔ باپ تو واپس نہیں آ سکتا لیکن میں اپنی دولت وصول کر کے رہوں گی۔

وہ رات بھر جاگ کر سوچتی رہی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ کمزور سی لڑکی تھی۔ اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتی تھی حتیٰ کہ ماں کو بھی نہیں۔ اب اسے نیلوفر کا لحاظ بھی نہیں کرنا تھا۔ وہ میرے باپ کی دولت پر پل رہی ہے۔ میں اسے بھی نہیں جینے دوں گی۔

صبح جب وہ بینک جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو فیصلہ کر چکی تھی کہ اب اسے ایک ایک پائی وصول کرنے کے لیے کیا کرنا ہے۔ بینک پہنچ کر بھی وہ اپنے منصوبے کو ٹھونک بجا کر دیکھتی رہی۔ لنچ ٹائم کے فوراً بعد اس نے منیجر سے چھٹی لی اور عبدالرشید کے گھر پہنچ گئی۔ دوپہر کا وقت تھا، نیلوفر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ عبدالرشید بھی دوپہر کی نیند پوری کر رہا تھا کہ شہر بانو کی آمد کی اطلاع ملی۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اس وقت اس سے ملاقات نہ کرتی لیکن یہ تو شہر بانو تھی، وہ اس سے ملاقات کے لیے باہر نکل آئی۔

"تم تو کہہ رہی تھیں دوپہر کے بعد رشید صاحب گھر پر ہوتے ہیں۔"

"تو میں نے یہ کب کہا کہ نہیں ہوتے۔"

"تو بلاؤ انہیں، کچھ باتیں ہی ہو جائیں۔"

"اچھا جی تو تم ان سے ملنے آئی ہو؟"

"تو اور کیا۔ منہ دھو رکھو، تم سے ملنے کون آتا ہے۔"

"میں جا رہی ہوں، وہ سو رہے ہیں۔ ان کے اٹھنے تک یہاں بیٹھ کر انتظار کرو۔"

"اری بیٹھ تو۔ جب تک وہ نہیں آ جاتے تجھ سے ہی باتیں کر لوں گی۔"

بات مذاق کی تھی مذاق میں ٹل گئی۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ معلوم ہوا رشید جاگ گیا ہے۔ ایک ملازم ادھر سے گزرا تھا جس سے نیلوفر نے معلوم کیا اور اس نے بتایا کہ صاحب اٹھ گئے ہیں۔

شہر بانو کو معلوم تھا کہ نیلوفر کا بیڈ روم کدھر ہے۔ اس نے اپنے منصوبے کی پہلی چال چلی۔ اس نے نیلوفر سے ایکسکیوز کیا اور نیلوفر کے بیڈ روم میں گھس گئی۔ نیلوفر وہیں بیٹھی رہ گئی۔ رشید بھی گھبرا گیا۔

"یہاں کیوں آ گئیں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم آئی ہوئی ہو۔ میں خود ہی آ رہا تھا۔"

"میں وہاں آ گئی جہاں مجھے ہونا چاہیے تھا۔ نیلوفر وہاں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔"

"یہ کسی اور وقت کی بات ہے۔ اس وقت تو یہ ہے کہ نیلوفر کیا سوچے گی؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ کیا سوچے گی۔"

بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور نیلوفر اندر آ گئی۔ اسے بھی شہر بانو کی اس حرکت پر حیرت تو ہوئی تھی لیکن یہ ایسی قابل اعتراض بات بھی نہیں تھی کہ وہ کوئی طوفان کھڑا کر دیتی۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بھی شہر بانو نے ساری توجہ عبدالرشید پر مرکوز رکھی۔ نیلوفر کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتی رہی اور عبدالرشید سے ہنسی مذاق پر تلی رہی۔ ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی رہی کہ نیلوفر کو شک نہ بھی ہوتا ہو تو ہو جائے۔ جب عبدالرشید کے بیکری جانے کا وقت ہوا تو وہ اس سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ ناظم آباد تو جا رہے ہیں، مجھے بھی چھوڑ دیجیے گا۔"

"اس میں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو جا ہی اسی طرف رہا ہوں۔"

"لیکن ایک شرط ہے۔ گاڑی آپ چلائیں گے ڈرائیور نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"ڈرائیور کی موجودگی میں آپ سے کیا فری ہو سکوں گی۔"

نیلوفر اس تقاضے کو مذاق سمجھ رہی تھی لیکن اس نے دیکھا کہ عبدالرشید نے واقعی ڈرائیور کو منع کر دیا۔ شہر بانو، عبدالرشید کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ نیلوفر کو جلانے پر تلی ہوئی ہے۔

اب اس نے نیلوفر کے گھر کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ نیلوفر کے دماغ میں آخر کب تک شک کی آندھیاں نہ چلتیں۔ شہر بانو یہی چاہتی تھی۔ وہ اس کی بے بسی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔

وہ گھر کی چار دیواری میں عبدالرشید سے ایک حد تک ہی فری ہو سکتی تھی جبکہ اسے پاؤں پھیلانے کے لیے بڑی زمین درکار تھی۔ اس نے پاؤں پھیلا دیے۔ زمین خود بخود پھیل گئی۔ اب وہ ہر قید سے آزاد، دفتر اور بیکری کی حدود سے بے نیاز عبدالرشید سے ملاقاتیں کر رہی تھی۔ دونوں رسوائیوں سے بے خبر آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ عبدالرشید کے پاس وسائل کی کمی نہیں تھی۔ عبدالرشید کو یہ نئی دنیا ایسی راس آئی کہ تمام کاروبار ملازموں کے ہاتھ میں دے کر شہر بانو کی دنیا میں گم ہو گیا۔ اب وہ ہر جگہ شہر بانو کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا۔ رات گئے گھر پہنچتا اور نیلوفر کی طرف سے کروٹ بدل کر سو جاتا۔ نیلوفر جیسی ہوشیار عورت اس تبدیلی کو محسوس کر رہی تھی۔ شہر بانو کی طرف سے اس کے دل میں شک بھی آ گیا تھا لیکن وہ کسی مناسب موقع اور ٹھوس ثبوت کی تلاش میں تھی۔

"ڈرائیور، گاڑی نکالو۔"

"جی بیگم صاحب۔"

"ناظم آباد والی برانچ چلو۔"

وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ عبدالرشید اس وقت وہاں ہے یا نہیں۔ اس وقت اسے وہاں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور واپس چلی آئی۔

دوسرے دن اس نے پھر یہی کیا۔ عبدالرشید اس سے بیکری کا کہہ کر گیا تھا لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ کاروبار کی طرف سے غافل ہو کر کس کے ساتھ رہتا ہے۔ یقیناً شہر بانو کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ عبدالرشید نے اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن اب وہ اس سے جھوٹ بولنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اب اس کا ڈرائیور فارغ بیٹھا تھا، وہ خود گاڑی چلانے لگا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی بات ہے جو وہ ڈرائیور سے چھپانا چاہتا ہے۔

وہ کسی ثبوت کی تلاش میں تھی لیکن عبدالرشید معاملات محبت اتنی خوب صورتی سے چلا رہا تھا کہ کوئی ثبوت ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اب اس نے مالک کی بیوی ہونے کا رول ادا کیا۔ اس نے بیکری کے ایک پرانے ملازم کو طلب کیا۔ یہ ملازم وہ تھا جو عبدالرشید کی غیر موجودگی میں کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عبدالرشید اس پر بہت اعتماد کرتا ہے۔ نیلوفر نے اسے ملازمت سے نکال دینے کی دھمکی دی۔

"باری صاحب، اگر آپ کو ملازمت سے نکال دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

جائے تو کیسا رہے گا؟"

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ فاقوں مر جاؤں گا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرا قصور بتائے بغیر ملازمت سے نہ نکالیں۔"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم خیانت کے مرتکب ہوئے ہو۔"

"میں نے تو کبھی ایک پیسا ادھر ادھر نہیں کیا۔"

"خیانت صرف پیسوں کی ہی نہیں ہوتی۔"

"مجھ سے اور کون سی خیانت سرزد ہوگئی؟"

"تم نے میری خیانت کی ہے۔"

"آپ کی خیانت؟"

"ایک لڑکی میرے حق پر ڈاکا ڈال رہی ہے اور تم نے اب تک مجھے خبردار نہیں کیا۔ بیکری میں ڈاکا پڑ رہا ہے اور تم خاموش ہو۔"

نیلوفر نے اندھیرے میں تیر پھینکا تھا لیکن نشانے پر لگا۔ ملازم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔

"بولتے کیوں نہیں، کیا اس خاموشی کو تمہارا جرم تصور کروں؟"

"آپ غالباً شہر بانو کی بات کر رہی ہیں۔"

"اوہ! تمہیں تو نام بھی معلوم ہے۔"

"نام کیوں نہ معلوم ہوگا۔ وہ لڑکی باقاعدگی سے بیکری کے تہ خانے میں آتی ہے، صاحب اور وہ گھومنے بھی ساتھ جاتے ہیں۔"

"کیا میں اس بیکری کی مالک نہیں؟"

"بالکل ہیں۔"

"پھر اب تک مجھے تم نے بتایا کیوں نہیں؟"

"اگر آپ کو بتا دیتا تو صاحب مجھے نوکری سے نکال دیتے۔ اب آپ نکال دیں۔"

"تم مجھے سب بتاؤ کہ تم نے کیا، کیا دیکھا اور ایک کام یہ کرو کہ جب وہ لڑکی تہ خانے میں آئے تو مجھے فون کر کے بتاؤ۔"

"بہت بہتر...... لیکن میرا نام نہ آنے پائے۔"

"تمہارا نام نہیں آئے گا۔ میں یہی کہوں گی کہ میں اچانک آ گئی تھی۔"

اس حقیقت پر یقین آ جانے کے بعد وہ اتنی طیش میں آئی کہ صبر نہ کر سکی۔ اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ ملازم اطلاع دے گا۔ اس نے فون کر کے شہر بانو کو بلا لیا۔

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے کہ تم کیا کھیل، کھیل رہی ہو۔"

"کون سا کھیل میری جان۔"

"شہر بانو، تم میری دوست ہو کر میرے شوہر پر ڈاکا ڈال رہی ہو۔"

"یہ سوال تو تمہیں اپنے شوہر سے کرنا چاہیے کہ وہ لٹنے کو کیوں تیار ہے۔"

"ان سے تو میں پوچھ ہی لوں گی لیکن تم بھی تو میری دوستی کا دم بھرتی تھیں۔ کیا دوست ہوتے ہوئے تمہیں یہ حرکت زیب دیتی ہے؟"

"میں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ تمہارے شوہر نے مجھے ورغلایا ہے۔"

"تم کوئی بچی نہیں ہو۔"

"جو کچھ پوچھنا ہے اپنے شوہر سے پوچھو۔ میں تمہیں جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔"

"شہر بانو، مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"مجھے بھی تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم مجھ پر شک کرو گی۔"

"شک نہیں، میں پوری تحقیق کر چکی ہوں۔"

"جب تحقیق ہو گئی ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"شاید اس لیے کہ اب بھی تمہارے دل میں تھوڑا سا ایمان باقی ہو۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔ رشید بھی تمہارا پہلا شوہر نہیں ہے۔ تم نے شوہر کے ہوتے ہوئے رشید پر قبضہ کیا تھا، میں تو پھر کنواری ہوں۔"

شہر بانو نے نیلوفر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے خاموش ہو جانے ہی میں مصلحت سمجھی۔ جب اپنا ہی دہی کھٹا ہو تو کسی سے کیا کہا جائے۔ اب جو کچھ پوچھنا ہے، رشید سے پوچھوں گی۔

اس نے یہ شوق بھی پورا کر لیا۔ رشید سے اس کی زوردار جنگ ہوئی۔ رشید پر شہر بانو کا ایسا رنگ چڑھا ہوا تھا کہ نیلوفر کا ہر رنگ پھیکا پڑ گیا۔ رشید نے بھی وہی بات کہی جو شہر بانو کہہ چکی تھی۔

"تم نے اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے مجھ پر جال پھینکا تھا۔ میں اگر تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور لڑکی کی طرف دیکھ رہا ہوں تو کون سی انوکھی بات کر رہا ہوں۔"

یہ طعنہ ایسا تھا کہ نیلوفر کو چپ ہونا پڑا۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ نشہ پیار سے اترے گا۔ غلطی میری تھی کہ میں رشید کی طرف سے غافل ہو گئی۔ اس پر کامل بھروسا کرنے لگی۔ اب میں اس پر اتنی توجہ دوں گی کہ وہ شہر بانو کو بھول جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس نے دیر کر دی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ وہ دونوں بہت آگے جا چکے ہیں۔

رشید اس دن گھر آیا تو نیلوفر اسی روپ میں ظاہر ہوئی جس روپ میں شادی سے پہلے ظاہر ہوتی تھی۔ آنکھیں بچھاؤں یا پلکوں کا شامیانہ کروں۔ رشید کو قطعی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ شہر بانو اسے بتا چکی تھی کہ نیلوفر نے اس سے کیا سوال جواب کیے ہیں۔

"رشید، آج کہیں باہر کھانا کھائیں گے۔"

"کیوں، کیا خانساماں چھٹی پر ہے؟"

"اسے منع کر دیتے ہیں کہ آج وہ صرف اپنے لیے اور ملازموں کے لیے کھانا پکائے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے فضول خرچی کی۔ ویسے بھی کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے۔"

نیلوفر طے کر چکی تھی کہ اب وہ اس سے لڑے گی نہیں۔ اس نے اس کے حکم پر سر جھکا دیا۔

"آپ شاید تھک گئے ہیں۔ آپ کے سر میں تیل ڈال دوں؟"

"اس کام کے لیے بہت سے نوکر ہیں۔ تم اپنی انگلیاں کیوں دکھاتی ہو۔"

"رشید آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ اب میری خدمت بھی آپ کو بری لگ رہی ہے۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ ڈسٹرب مت کرنا۔"

نیلوفر خاموشی سے اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

اس کے بعد بھی وہ کوشش کرتی رہی کہ وہ راہ راست پر آ جائے لیکن نیلوفر اس کے دل سے اتر چکی تھی۔ اس کی قربت اب اسے کھٹکنے لگی تھی۔ شہر بانو بھی بات کھل جانے کے بعد ایسی بے باک ہو گئی تھی کہ دندناتی ہوئی گھر میں داخل ہوتی اور رشید کے بیڈروم میں گھس جاتی۔ رشید کی حمایت اسے حاصل تھی لہٰذا نیلوفر کی حیثیت نوکرانیوں کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ بیکری میں بھی شہر بانو کا حکم چل رہا تھا۔ ہر برانچ کا کنٹرول شہر بانو کے ہاتھ میں تھا۔ عبدالرشید اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ شہر بانو نے ایک منصوبے کے تحت رشید کو شراب میں گم کر دیا تھا۔ اسے اتنا ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ دیکھتا کہ کاروباری معاملات کس طرف جا رہے ہیں۔

نیلوفر لڑتے لڑتے تنگ آ چکی تھی۔ پانی جب اس کے سر سے اونچا ہونے لگا تو اس نے گھر چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب جو وہ کرنے والی تھی وہ گھر میں رہ کر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کرائے پر گھر لیا اور وہاں منتقل ہو گئی۔ عبدالرشید فکرمند ضرور ہوا تھا لیکن یہ سوچ کر مطمئن بھی ہو گیا کہ کیا کرے گی، تھک

غلطی

تقریر کرنے سے پہلے سیاسی رہنما نے عوام سے درخواست کی۔ بہنو! اور بھائیو! اگر میری تقریر میں کوئی غلطی ہو تو میرے سیکریٹری کو معاف کر دیجیے گا۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

ہار کر پھر واپس آ جائے گی۔ وہ تو اس وقت فکرمند ہوا جب عدالت کا نوٹس اس کے نام آیا۔ نیلوفر نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ اس کا شوہر ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے اور اسے گھر لے کر آتا ہے۔

یہ صورت حال شہر بانو کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ مقدمے کی نوعیت ایسی تھی کہ شہر بانو کا ملوث ہونا لازمی تھا۔ اپنی رسوائی اپنے سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ یہ ایسا موقع بھی تھا کہ وہ رشید پر اپنی اہمیت ظاہر کرے۔ اس پر ثابت کرے کہ اگر وہ اس کے ساتھ نہ رہی تو وہ بھری دنیا میں اکیلا رہ جائے گا۔ اس نے رشید سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ وہ فون کر کر کے تھک چکا تھا مگر وہ اس سے ملنے سے گریزاں تھی۔ آخر وہ ایک دن اس کے بینک میں آ دھمکا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔

"اس مشکل وقت میں تم بھی میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

"میری پوزیشن بہت کمزور ہے رشید۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا نام سماعتوں کی زینت ہے۔"

"تم بدنامی سے کیوں ڈرتی ہو جبکہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہاری بدنامی اپنی جھولی میں ڈالوں گا۔"

"مجھے اس معاملے سے دور رکھیں۔"

"تمہارے بغیر میرا کیس مضبوط نہیں ہوگا۔ نیلوفر تمہارا نام عدالت میں ضرور لے گی۔"

"کہہ دینا کہ آپ اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتے۔"

"میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں عدالت میں جا کر ان تمام واقعات سے لاعلمی ظاہر کرنی ہوگی۔"

"میرے کہنے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ نیلوفر آپ کی بیوی ہے۔ اس کی بات سب مانیں گے۔"

"میں نے شہر کے مہنگے ترین وکیل کا انتخاب کیا ہے۔ تم ایک دفعہ اس سے مل لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرا

وکیل تمہیں صاف بچالے جائے گا۔ تمہارے کردار پر ایک حرف نہیں آئے گا۔"

شہربانو نے سوچا وہ انکار کردے۔ رشید تباہی کے جس دہانے کی طرف جارہا ہے، اس پر جانے دے، اس کا مقصد پورا ہوچکا ہے۔ اس نے اس کی گھریلو زندگی تباہ کردی ہے۔ اب وہ لوٹ جائے لیکن اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو آواز آئی کہ "ابھی تو انتقام کی پہلی قسط وصول ہوئی ہے۔ ابھی تو سفر کا آغاز ہے۔ میں اسے وہاں تک پہنچا کر دم لوں گی جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔"

مقدمے میں جس لڑکی کا ذکر بار بار آرہا تھا وہ شہربانو تھی لہٰذا اسے بھی پیش ہونا پڑا۔ وکیل کی ہدایت کے مطابق اس نے تمام باتوں سے انکار کیا۔ صرف اتنا بتایا کہ وہ نیلوفر کی دوست ہے۔ اس کے اصرار پر ہی اس کے گھر گئی تھی۔ پھر دو چار مرتبہ مزید گئی۔ نیلوفر کے رشتے سے عبدالرشید اس کا بہنوئی ہے لہٰذا دو چار ملاقاتیں اس سے بھی ہوگئیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ناجائز تعلقات رکھنا اس پر بہتان ہے وہ اس کا سختی سے انکار کرتی ہے بلکہ ہتک عزت کے دعوے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

عبدالرشید نے یہ موقف اختیار کیا کہ نیلوفر خود اچھے کردار کی نہیں ہے۔ اس نے دولت کی خاطر اپنے شوہر کی موجودگی کے باوجود مجھے اپنی محبت میں پھانسا تھا اور اس سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر اس کا شوہر اچانک مرگیا یا اس نے خود ماردیا اور بھاگ کر میرے پاس آگئی اور مجھ سے شادی کرلی۔ اب یہ میری باقی دولت پر بھی قابض ہونا چاہتی ہے اس لیے ایک معصوم لڑکی پر بہتان رکھ کر مجھ سے چھٹکارا چاہتی ہے تاکہ جو کچھ میں نے اس کے نام کیا ہے، وہ ہتھیالے۔

عبدالرشید پانی کی طرح دولت لٹا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیلوفر مقدمہ ہار گئی۔ نیلوفر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ اپنے وکیل کے ذریعے رشید سے معافی کی طلب گار ہوئی۔ عبدالرشید تو پگھل بھی جاتا لیکن شہربانو کو یہ کیسے منظور ہوتا کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اسے نیلوفر سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن عبدالرشید کو وہ چین سے نہیں رہنے دے سکتی تھی۔ عبدالرشید نے جب اپنی دولت مند زندگی کا آغاز کیا تھا، نیلوفر اس کی زندگی میں نہیں تھی تو اب بھی کیوں رہے۔ شہربانو نے اسے بھڑکایا کہ وہ نیلوفر کو طلاق دیدے۔

"میں اسے طلاق دے دوں تو بیکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ایک بیکری میں نے اس کے نام کررکھی ہے۔"

"اگر ایک بیکری دے کر جان چھوٹتی ہے تو چھڑالو۔"

"تم نے تو ایسے کہہ دیا جیسے یہ ایک بیکری نہیں کیک کا ایک ٹکڑا ہو۔ سب سے زیادہ چلنے والی بیکری ہے جو میں نے اس کے نام کی ہوئی ہے۔"

"میں تم سے شادی اسی وقت کروں گی جب تم نیلوفر کو طلاق دوگے۔ اب بیکری بچالو یا مجھے اپنالو۔"

"میں تمہیں نہیں کھوسکتا۔"

"تو بیکری کی پروا مت کرو۔ میں کم آمدنی میں بھی تمہارے ساتھ گزارہ کرلوں گی۔"

"تم ایک مرتبہ نیلوفر کو میرے پاس آنے دو۔ میں کسی ترکیب سے بیکری اپنے نام کرالوں گا۔"

"وہ بہت شاطر عورت ہے بیکری تمہارے نام نہیں کرے گی۔"

"اگر نہیں کرے گی تو میں اس وقت طلاق دے دوں گا۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ میرے رشتے آرہے ہیں۔ میں شادی پر مجبور کردی جاؤں گی۔"

"ان رشتوں کو ٹالتی رہو۔ میں بہت جلد تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔"

"مجھے یہ خوش خبری ابھی چاہیے۔"

"پاگل ہوگئی ہو۔ یہ بیکری چلی گئی تو میری آدھی آمدنی چلی جائے گی۔"

"کئی برانچیں اور بھی تو ہیں۔"

"وہ تو برائے نام ہیں، ان کی آمدنی ہی کیا ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں، ہم دونوں مل کر ان برانچوں کو ترقی دیں گے۔"

"مجھے تم سے اختلاف ہے، میرا تجربہ کہہ رہا ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔"

"پھر تم کاروبار کرتے رہو، مجھ سے محبت کا دعویٰ مت کرو۔"

"ایسا مت کہو شہربانو۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"نیلوفر کو تو چھوڑ نہیں سکتے اور کیا کریں گے۔"

"مجھے کچھ سوچنے کا موقع تو دو، شاید کوئی راہ نکل آئے۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"دل کے معاملات عقل سے حل نہیں ہوتے۔ اگر آپ مجھ سے محبت کررہے ہوتے تو سوچنے کے لیے وقت نہ مانگتے۔"

دونوں میں بحث ہوتی رہی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ

عبدالرشید اپنی بیوی کو طلاق دیدے گا۔ شہربانو اس خوشگوار دن کا انتظار کرنے لگی۔

عبدالرشید اپنی بیکری سے ہاتھ دھونے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا لیکن شہربانو کو گنوانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ بیکری بھی ہاتھ میں رہے اور وہ نیلوفر کو طلاق بھی دیدے۔ پھر بھی اس نے ایک کوشش کی۔ وہ نیلوفر سے ملا اور اسے پیشکش کی کہ اگر وہ بیکری سے دست بردار ہوجائے تو وہ اسے معاف کرسکتا ہے۔ اس کے خلاف مقدمہ بھی واپس لے سکتا ہے اور اسے طلاق بھی نہیں دے گا۔ نیلوفر شاید اپنی ساری کشتیاں جلا چکی تھی۔ وہ بیکری حوالے کرنے پر تیار نہیں تھی۔

"رشید، اگر تم مخلص ہوتے تو بیکری حوالے کرنے کی شرط نہ رکھتے۔ میں تم سے معافی کی طلب گار ہوئی تھی، مجھے معاف کردیتے کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں سچی ہوں۔ تم شہربانو سے شادی کرکے رہوگے۔ میری معافی تمہیں یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ میں نے تم سے صرف شادی نہیں کی تھی، محبت بھی کی تھی اور یہ میری بددعا ہے کہ میری محبت کو ٹھکرا کر تم کہیں کے نہ رہوگے۔ وہ عورت تمہیں تباہ کردے گی۔ میری محبت کی قدر تمہیں اس وقت ہوگی۔ تم مجھے ڈھونڈوگے اور میں نہیں ملوں گی۔ کبھی مجھے ڈھونڈنے نکلو تو یہ میرے چچا کا ایڈریس ہے۔" اس نے ایک کاغذ پر لکھ کردے دیا۔

"تم جب ملوگی نہیں تو ڈھونڈوں گا کیوں؟"

"یہ تو معلوم ہوجائے گا کہ میں وہاں نہیں تو کہاں ہوں۔"

اس کے بعد بھی وہ کوشش کرتا رہا کہ نیلوفر سے کوئی ڈیل ہوجائے لیکن وہ بیکری حوالے کرنے کو تیار نہیں ہوئی۔ ادھر شہربانو کے تقاضے بڑھتے جارہے تھے۔ وہ شہربانو کو طلاق دینے پر تیار ہوگیا۔ ہاتھ سے بیکری بھی گئی اور مہر کی رقم بھی ادا کرنی پڑی۔

نیلوفر کو طلاق دینے کے بعد اس نے شہربانو سے شادی کے لیے کہا لیکن شہربانو کا منصوبہ ابھی ادھورا تھا۔ ابھی چار برانچیں اور تھیں۔ عبدالرشید کا عالی شان بنگلا تھا۔ اس کا بھی حساب کرنا تھا۔ ان رسوائیوں کا حساب کرنا تھا جو اس راستے میں اسے ملی تھیں۔ بینک میں اس کی رسوائی ہوئی تھی۔ اخباروں نے اس کے نام کو اتنا اچھالا تھا کہ رشتہ داروں نے طعنے دے دے کر اس کا کلیجا چھلنی کردیا تھا۔ اس نے کسی کو حقیقت نہیں بتائی تھی کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے۔ وہ لڑکی تھی، ان رسوائیوں نے اس کا مستقبل تاریک کردیا تھا لیکن انتقام کی آگ اسے کچھ دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔

"میں آپ سے شادی کرتو لوں لیکن اس سے پہلے میں یہ چاہتی ہوں کہ جو نقصان آپ کا ہوا ہے پہلے اس کا ازالہ کردوں۔"

"یہ کام تم شادی کے بعد بھی کرسکتی ہو۔"

"شادی کے بعد اگر کروں گی تو اس میں میرا مفاد وابستہ ہوگا۔ میں آپ کو اسی پوزیشن پر لانا چاہتی ہوں جس پر آپ تھے۔ اس کے بعد شادی کرلوں گی۔"

"یہ تمہاری عجیب منطق ہے۔ تم شادی کے لیے اتنی جلدی کررہی تھیں۔ نہ جانے اس "ازالے" میں کتنا وقت لگ جائے۔"

"بہت جلد سب کچھ ہوجائے گا۔ بس جو میں کہتی جاؤں، وہ آپ کرتے جائیں۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ بینک سے قرض لے کر اپنی دیگر برانچوں کو ترقی دیں اور ان سے جو آمدنی ہو اس سے قرض اتار دیں۔"

"دیکھو یہ کاروبار ہے۔ کیا خبر ان برانچوں سے اتنی آمدنی نہ ہو کہ بینک کا قرض اتارا جاسکے۔ میں مقروض بھی ہوجاؤں اور ترقی بھی نہ ہو۔"

"یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ انتظام آپ میرے ہاتھ میں دیجیے گا۔ پھر دیکھیے گا کیسے ترقی نہیں ہوتی۔ چار کی جگہ آٹھ برانچیں اور کھل جائیں گی۔"

"بینک سے قرض ملے گا کیسے؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دیں، میں بینک میں ہوں۔ میری کوششوں اور تعلقات سے قرض مل جائے گا۔"

وہ تیار ہوگیا۔

شہربانو نے اس کی شراب نوشی سے فائدہ اٹھایا۔ اسے ہوش میں آنے ہی نہیں دیتی تھی کہ وہ کچھ سوچتا یا آنکھیں کھول کر دیکھتا۔

شہربانو نے اسے بینک سے قرض دلا دیا۔ اس نے وعدے کے مطابق چاروں برانچوں کا انتظام بھی خود سنبھال لیا۔ اس نے بینک سے ملنے والی رقم کا معمولی سا حصہ ان برانچوں پر خرچ کیا، باقی اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادیا۔ عبدالرشید کو خوش خبری سناتی رہتی تھی کہ آمدنی خوب ہورہی ہے اور وہ بینکوں کی قسطیں برابر ادا کررہی ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ قسطیں ادا نہیں کررہی تھی۔

انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ بیکری کی وہ برانچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروخت ہو رہی ہے جو نیلوفر کے نام تھی۔ اس نے اسے فروخت کرنے کے لیے اشتہار دیا تھا۔ شہر بانو بھاگی ہوئی عبدالرشید کے پاس آئی۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔

”تم اچھے موقعے پر آئیں۔ یہ کم بخت چیز ایسی ہے کہ اکیلے حلق سے نہیں اترتی۔ پینے کا مزہ تو اب آئے گا۔“

”آج میں بھی اتنی خوش ہوں کہ شراب پینے کو جی چاہتا ہے۔“

”تو پیو۔ سچ مزہ آجائے گا۔“

”ابھی نہیں، بس شادی ہونے دو۔“

”اسی لیے تو کہتا ہوں شادی کرلو۔“

”اس وقت تو شادی سے بھی زیادہ مزیدار خبر لائی ہوں۔“

”ایسی کیا خبر ہے؟“

”نیلوفر بیکری بیچ رہی ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”تم وہ بیکری خرید لو۔“

”وہ بیکری خریدنا مذاق ہے۔ اتنی رقم کہاں ہے میرے پاس۔“

”اتنی بڑی کوٹھی جس میں تم رہ رہے ہو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے۔ اسے فروخت کرکے بیکری خرید لو۔ رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لو۔ وہ چلتی ہوئی بیکری ہے۔ اس کی آمدنی سے ہم بینک کا سارا قرض اتار سکتے ہیں۔ بعد میں اس سے اچھی کوٹھی بنالیں گے۔“

یہ بات عبدالرشید کی سمجھ میں آگئی۔ شہر بانو نے ایک فرضی گاہک نیلوفر کے پاس بھیجا اور کچھ رقم بیعانہ کے طور پر دے کر ایگریمنٹ کرلیا۔ باقی رقم ایک مہینے بعد ادا کرنے کا وعدہ کرلیا۔

ایک مہینے میں کوشش کرکے کوٹھی کا سودا کرلیا۔ عبدالرشید کو اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ پوچھتا کوٹھی کتنے کی بکی، بیکری اور فلیٹ کتنے کا خریدا اور کتنی رقم باقی بچی؟

شہر بانو بینک کی قسطیں ادا نہیں کر رہی تھی۔ بینک کی طرف سے نوٹس آتے رہے جنہیں وہ چھپاتی رہی۔ اتنی بڑی رقم پر سود کی رقم تیزی سے بڑھتی رہی۔ عبدالرشید، شہر بانو کا شکر گزار تھا کہ اس کی وجہ سے چار بیکریاں بچ گئیں، کچھ دن میں بینک کا قرض بھی اتر جائے گا۔ اس کا صلہ وہ شہر بانو سے شادی کی صورت میں دینا چاہتا تھا۔ اس کا اصرار بڑھنے لگا تھا لیکن شہر بانو ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ اب اس نے یہ عذر تراش لیا تھا کہ بینک کا قرض بس اترنے ہی والا ہے، اس کے بعد وہ شادی کرلے گی۔ یہ وعدہ اس نے اس لیے کرلیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ بینک کا قرض کبھی نہیں اتر سکے گا۔

عبدالرشید شراب میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ان بیکریوں کی آمدنی میں بڑے پیمانے پر خرد برد کر رہی تھی لہٰذا عبدالرشید کے بینک اکاؤنٹس بھی تقریباً خالی تھے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ اور کار کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔

بینک نے جب قرض کی وصولی کے لیے قانونی چارہ جوئی کی اور عدالت کا نوٹس عبدالرشید کے نام آیا تو اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ اس نے گاڑی نکالی اور شہر بانو کے گھر پہنچ گیا۔

”عدالت کی طرف سے مجھے نوٹس ملا ہے کہ بینک کی قسطیں ادا نہیں ہوئی ہیں حالانکہ تم تو قسطیں ادا کرتی رہی ہو۔ یہ دیکھو، یہ نوٹس آیا ہے۔“

”میں کیا کروں یہ نوٹس دیکھ کر۔“

”تم اس کا جواب دو۔ عدالت کو ثبوت دو کہ تم قسطیں ادا کرتی رہی ہو۔“

”میں کس حساب سے جواب دوں۔ قرض تم نے لیا ہے یا میں نے۔ اگر ذمے داری میری ہوتی تو نوٹس میرے نام آتا۔“

”تم نے قسطیں ادا کی ہوں گی تو رسیدیں تمہارے پاس ہوں گی۔ وہ رسیدیں مجھے دو تاکہ میں عدالت میں پیش کردوں۔“

”میرے پاس رسیدیں کیوں ہوں گی۔“

”اس لیے کہ حساب کتاب تمہارے ہاتھ میں تھا۔“

”حساب کتاب میرے ہاتھ میں کیوں ہونے لگا تھا۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم نے مجھے ملازم رکھا تھا؟“

”شہر بانو مجھے معلوم ہے تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں تو تمہیں جانتی تک نہیں۔“

”میں تو تمہیں جانتا ہوں، تم میری دوست ہو۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”تم شہر بانو کو جانتے ہوگے مجھے نہیں جانتے۔ تمہیں آج تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میں کون ہوں۔“

”کون ہو تم؟“

”اگر تمہیں دل کا دورہ نہ پڑے تو سنو۔ میں اسی آدمی کی بیٹی ہوں جس کو تم نے اسپتال پہنچایا تھا۔ جو دولت ہونے کے باوجود ایک انجکشن نہ ملنے کی وجہ سے مر گیا تھا کیونکہ تم اس

کا بریف کیس لے کر بھاگ گئے تھے جس میں اس کی جمع پونجی تھی۔ اسی دولت سے تم نے دولت کمائی تھی، عیش کرتے رہے تھے۔ میں نے وہ دولت سود سمیت وصول کرلی ہے۔ اب تم اسی طرح مفلس ہو جیسے پہلے تھے۔“

”شہر بانو! میں تمہارا مجرم ہوں۔ مجھے معاف کردو۔ مجھے اس وقت بچالو۔ میں زندگی بھر تمہاری غلامی کروں گا۔“

”تم میرے نہیں میرے باپ کے مجرم ہو۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ وہی تمہیں معاف کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس جانے کی تیاری کرو۔“

”شہر بانو، ایسا مت کہو۔ میں نے تمہاری خاطر اپنی بیوی کو طلاق دی ہے۔“

”میں نے بھی کئی عذاب جھیلے ہیں۔ رسوائیوں کے کئی صحرا طے کیے ہیں۔ حساب برابر ہوگیا۔“

”میں تمہیں عدالت میں لے کر جاؤں گا۔“

”کس جرم میں؟ میں تمہاری ملازم نہیں تھی کہ غبن کا الزام لگاؤ گے۔“

”میں نے تم پر بھروسا کیا تھا۔“

”یہ بات تم جانتے ہو یا میں۔ ثابت کیسے کروگے؟“

”میرے ملازم میری گواہی دیں گے۔“

”میں ان سب کو خرید لوں گی۔“

”یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ میرے پاس اب بھی بہت دولت ہے۔“

”میں تمہارے اکاؤنٹ خالی کرچکی ہوں۔ یقین نہ آئے تو جاکر دیکھ لو۔“

وہ گڑگڑانے پر اتر آیا۔ محبت کی بھیک مانگتا رہا لیکن وہ تو جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ اس نے اس پتھر سے سر ٹکرایا اور لہولہان ہوکر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہر بانو کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ اس شخص سے میں نے کبھی محبت کی تھی۔ شاید اب بھی کرتی ہوں لیکن اس خوب صورت چہرے کے پیچھے ایسا بھیانک چہرہ چھپا ہوگا یہ معلوم نہیں تھا۔

عبدالرشید نے بھی یہ رات شراب سے باتیں کرتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوئی تو بینک چلا گیا۔ شہر بانو کی دھمکی اسے اب تک یاد تھی۔ ”میں تمہارے اکاؤنٹ خالی کرچکی ہوں۔ یقین نہ آئے تو جاکر دیکھ لو۔“

اس کی دھمکی سچ نکلی۔ اس کے اکاؤنٹ میں چند ہزار روپے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک سال سے کوئی رقم جمع ہی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر منیجر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھا جھولتا رہا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی اور محسوس کیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ فلیٹ پر آتے ہی پھر شراب پینے بیٹھ گیا۔ ایک صرف شراب ہی رہ گئی تھی جو اسے سہارا دے رہی تھی۔ شراب کے نشے نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ آنکھ کھلی تو اس کی قسمت کی طرح اس کے کمرے میں بھی اندھیرا اپھیل گیا تھا۔ اٹھ کر بجلی کا سوئچ آن کیا۔ میں وہ کون سا بٹن دباؤں کہ قسمت کا اندھیرا دور ہو۔ کوئی ایک بیکری بیچ کر بینک کا قرض اتارا جاسکتا ہے۔ یہ فلیٹ بھی اگر بک جائے تو حرج نہیں۔ میں کرائے پر رہ سکتا ہوں۔ وہ مشورہ لینے اپنے وکیل کے پاس پہنچ گیا۔

”اتنی جلدی ہتھیار کیوں پھینکتے ہو۔“ وکیل نے کہا۔ ”میں شہر بانو کو عدالت میں گھسیٹ لوں گا۔ اسے مجبور کردوں گا کہ وہ اقرار جرم کرلے۔ تم صاف بچ جاؤ گے، قرض وہ ادا کرے گی۔“

عبدالرشید تو چاہتا ہی یہ تھا کہ شہر بانو کی بے وفائی کی سزا اسے ملے۔ وہ فوراً تیار ہوگیا۔

اس کا وکیل شہر بانو سے بھی واقف تھا۔ جانتا تھا کہ وہ دھوکا دہی میں پھنس جائے گی لیکن اگر اس سے بھی رقم اینٹھ لی جائے تو وہ بچ بھی سکتی ہے۔ اس کے دل میں بے ایمانی آگئی۔ عبدالرشید سے بھی رقم سمیٹی جائے اور شہر بانو سے بھی۔ فیصلہ پھر کسی کے بھی حق میں ہو۔ وہ اسی وقت شہر بانو کے پاس پہنچ گیا اور مقدمے کی ایسی بھیانک تصویر دکھائی کہ وہ ڈر گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے وکیل کو ایک بڑی رقم کی پیشکش کردی۔

”وکیل صاحب، اب میں اور زیادہ بدنام ہونا نہیں چاہتی۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”اور اسی لیے میں تمہیں بھاری فیس دینے کو تیار ہوں۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ رشید کے پاس اس کا فلیٹ بھی نہ رہے۔ وہ دربدر ہوجائے۔“

”مجھے آپ بتاسکتی ہیں کہ آپ عبدالرشید سے اتنی نالاں کیوں ہیں؟ یہ صرف فراڈ کا معاملہ نہیں ہے، اس کے پیچھے آپ کا غصہ بھی ہے۔ آپ مجھے بتائیں، ممکن ہے کیس میں مدد ملے۔“

شہر بانو نے وکیل کو عبدالرشید کا اصل چہرہ دکھا دیا۔

”اب میں آپ کا وکیل نہیں آپ کا سرپرست ہوں۔ اب میں نہیں قدرت عبدالرشید کو سزا دلائے گی۔ اب

WWW.PAKSOCIETY.COM

جو میں کہوں اس پر عمل کرتی رہیں۔“

”میں جو کہوں گی آپ کے حکم کے مطابق کہوں گی۔“

”آپ کو کچھ رقم میری فیس کے علاوہ بھی خرچ کرنی ہوگی۔“

”میں تیار ہوں لیکن کس لیے؟“

”ان بیکریوں کے ملازمین خریدنے ہوں گے جو گواہی دیں گے کہ انہوں نے آپ کو ان بیکریوں میں آتے جاتے یا انتظامی معاملات میں دخل دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”یہ انتظام تو عبدالرشید بھی کرسکتا ہے۔ اس نے بھی ان ملازموں کو خرید لیا تو؟“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے یہ مشورہ نہیں دوں گا۔ میں نے تو اسے ایسے سبز باغ دکھائے ہیں کہ آپ عدالت میں آئیں اور آپ کو سزا ہوگی۔“

”میں اپنی عزت بچانے کے لیے اس رقم کا بندوبست کردوں گی۔“

”بس تو پھر جیسا میں کہوں ویسا کرتی جائیں۔“

کیس کی سماعت شروع ہوئی۔ دو پیشیوں کے بعد عدالت نے شہر بانو کو طلب کرلیا۔ بینک کے وکیل نے جرح شروع کی۔ اس نے وہی کہا جو اس کے وکیل نے اسے سمجھا دیا تھا۔ تیسری چوتھی پیشی پر بیکری کے چند گواہ پیش ہوئے جنہوں نے شہر بانو کو پہچاننے سے ہی انکار کردیا جبکہ عبدالرشید اپنے بیان میں کہہ چکا تھا کہ سارے معاملات شہر بانو دیکھ رہی تھی۔

کئی مزید سماعتوں کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ شہر بانو کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔ وہ ملزم کی بیوی نیلوفر کی دوست تھی۔ ملزم کی بیوی پہلے بھی اس لڑکی پر شک کر چکی تھی جو غلط ثابت ہوا تھا۔ ملزم نے اپنے معاملے میں بھی اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کی۔

اسی مقدمے کے دوران وکیل کے کہنے پر شہر بانو نے ایک درخواست دائر کردی کہ ملزم عبدالرشید نے اس کی توہین کی ہے لہٰذا ہتک عزت کا مقدمہ چلایا جائے اور بیس لاکھ روپے بہ طور ہرجانہ ملزم سے دلایا جائے۔

عدالت نے یہ درخواست قبول کرلی۔ یہ ثابت ہوچکا تھا کہ اس نے اپنا جرم شہر بانو کے سر تھوپنے کی کوشش کی ہے لہٰذا عدالت نے فیصلہ سنا دیا کہ ملزم کی جائداد نیلام کرکے بینک اپنا قرض وصول کرلے۔ نیز یہ کہ ملزم مس شہر بانو کو بیس لاکھ روپے بہ طور ہرجانہ ادا کرے۔ عدم ادائیگی پر اسے دو سال کے لیے جیل بھیج دیا جائے۔

اس کی بیکریاں فروخت کرکے بینک نے اپنا قرض وصول کرلیا۔ شہر بانو کو تاوان ادا کرنا تھا لہٰذا اسے اپنا فلیٹ بیچنا پڑا۔ گاڑی اس نے مقدمے کے اخراجات اٹھانے کے لیے پہلے ہی بیچ دی تھی۔

اب وہ واقعی وہاں آگیا تھا جہاں شہر بانو اسے پہنچانا چاہتی تھی۔ اس کے سر پر اب کوئی چھت نہیں تھی۔ اس نے دو راتیں اسی پارک میں گزار دیں جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ یہی وہ پارک تھا جہاں سے اٹھ کر وہ نکلا تھا اور پھر اسے وہ شخص ملا تھا جس کا بریف کیس اس کے ہاتھ لگا تھا۔

اس پارک میں بیٹھ کر اسے ایک مرتبہ پھر مولوی برکت علی کی یاد آگئی جنہیں وہ عیش کے زمانے میں بھول چکا تھا۔ مولوی برکت علی ٹھیک کہتے تھے کہ چور کے پاؤں ہوں نہ ہوں دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔ اس نے کھلے دل سے سوچا، دولت خود چل کر میرے پاس آئی تھی اور خود چل کر چلی گئی۔ اس شہر نے جو کچھ مجھے دیا تھا، سب چھین لیا۔ یہ شہر ہے ہی بے وفا۔ بے وفائی پر اسے شہر بانو یاد آگئی۔ پھر اپنا خیال آیا۔ اگر شہر بانو نے مجھ سے بے وفائی کی تو میں خود بھی تو مجرم ہوں۔ میں نے بھی تو نیلوفر سے بے وفائی کی ہے۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ اس نے مجھے اپنے چچا کا ایڈریس بھی تو دیا تھا۔ محلے کا نام مجھے اب تک یاد ہے۔ اس کے چچا کا نام بھی یاد ہے۔ مکان نمبر بھول گیا ہوں پھر بھی مکان تو مل ہی جائے گا۔ چھوٹے شہروں میں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں اس کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگ لوں گا۔ اسے تیار کروں گا کہ وہ کسی سے حلالہ کرکے دوبارہ مجھ سے شادی کرلے۔ اگر نہیں بھی مانی تو مجھے معاف تو کردے گی۔ میں آرام سے مر تو سکوں گا۔ اس کے ساتھ ایک اٹیچی کیس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے تیسرے دن شہر چھوڑ دیا۔

راستے بھر اس کی امیدیں اسے سہارا دے کر اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

وہ پنڈی کے راجا بازار سے گزر کر نیلوفر کے گھر کی طرف جارہا تھا کہ اس نے ایک دکان پر بورڈ لگا دیکھا۔ ”سپر اسٹار بیکری“ (کراچی والی) اس نے تانگے والے سے کہا۔ ”بھائی ذرا یہاں روکو تو۔“ تانگا رک گیا۔ وہ تانگے سے کودا اور بھاگتا ہوا بیکری میں داخل ہوگیا۔ وہ سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا۔

”تم مالک ہو اس بیکری کے؟“

”نہیں جی، میں تو ملازم ہوں یہاں۔“

”پھر مالک کون ہے۔“

”چودھری حشمت دین۔“

عبدالرشید کا منہ لٹک گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا یہ آدمی جواب میں کہے گا، اس بیکری کی مالک نیلوفر ہے۔ وہ واپس ہو رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ حشمت دین سے ملا تو جائے۔ ان سے پوچھوں تو کہ اس نے اس بیکری کا نام سپر اسٹار کیوں رکھا کیونکہ یہ نام رجسٹرڈ تھا۔

”میں چودھری صاحب سے مل سکتا ہوں؟“

”وہ تو جی شام کو یہاں آتے ہیں۔“

”تم مجھے ان کا پتا دے سکتے ہو۔“

”کیوں نہیں، یقیناً آپ ان کے دوست ہوں گے۔“

”ہاں میں کراچی سے آیا ہوں۔“

اس آدمی نے پتا لکھ کر دے دیا۔ یہ پتا اسی محلے کا تھا جہاں نیلوفر کے چچا رہتے تھے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا، اس نے سوچا، چودھری حشمت سے نیلوفر کے چچا کا بھی پوچھ لوں گا۔

اس کے پاس چونکہ مکان نمبر موجود تھا اس لیے مکان ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ مکان پر لگی تختی دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس تختی پر نیلوفر کے چچا کا نام لکھا ہوا تھا۔ ”کیا مجھے بیکری والے نے غلط پتا دیا ہے یا قسمت مجھے خود نیلوفر سے ملوانے لے آئی ہے۔“

اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان آدمی باہر آیا۔ عبدالرشید نے نیلوفر کے چچا کے بارے میں پوچھا۔

”وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“

”کب آئیں گے؟“

”انہیں تو کوئی پندرہ دن لگ جائیں گے۔ زمینوں پر گئے ہیں۔ آپ کو کیا کام ہے ان سے، مجھے بتائیں۔“

”مجھے ان سے نہیں نیلوفر سے کام ہے۔“

”آپ ہیں کون؟“

”میرا نام عبدالرشید ہے۔ کراچی سے آیا ہوں۔“

”میں نے پوچھا، نیلوفر سے آپ کو کام کیا ہے؟“

”اس کا مجھ پر ایک قرض ہے وہ لوٹانے آیا ہوں۔ آپ اسے بس یہ بتادیں کہ عبدالرشید آیا ہے۔“

”مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ کون ہیں لیکن آپ کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ میں نے نیلوفر سے شادی کرلی ہے، اب وہ آپ سے نہیں مل سکتی۔“

”تم اسے طلاق دے دو۔ میں اس سے شادی کرنے آیا ہوں۔“

اسی وقت ایک زوردار تھپڑ رشید کے منہ پر پڑا۔ رشید نے بھی جواب دینا چاہا اور دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ محلے کے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ سب نے مل کر بیچ بچاؤ کرایا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ وہ ایک پاگل ہے۔ پاگلوں سے کیا جھگڑنا۔ عبدالرشید اس وقت جو باتیں کررہا تھا وہ کوئی پاگل ہی کرسکتا تھا۔ محلے والے اسے پاگل قرار دے رہے تھے تو ٹھیک ہی کررہے تھے۔

کسی نے پولیس کو بلا لیا تھا۔ پولیس آگئی اور عبدالرشید کو پکڑ کر لے جانے لگی۔ عبدالرشید آگے چل رہا تھا لیکن پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھ لیتا تھا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ اسے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ وہ نیلوفر ہی تھی جو چھت پر کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر بے قابو ہوگیا۔ پولیس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور نیلوفر کو پکارنے لگا۔ پولیس والوں نے اسے مارنا شروع کردیا اور مارتے ہوئے تھانے لے گئے۔ انہیں بھی یقین ہوگیا تھا کہ یہ کوئی پاگل شخص ہے، اسے تھانے میں رکھ کر کیا کریں گے۔ اس کی جیب میں کچھ رقم تھی وہ نکال لی اور اسے چھوڑ دیا۔

وہ تھانے سے نکلا اور جس طرف منہ اٹھا چل دیا۔

پنڈی شہر کی رونقیں پیچھے رہ گئیں۔ وہ اس وقت مری روڈ پر چل رہا تھا۔ پھر کسی کشش نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ امام بری کا مزار سامنے تھا۔ وہ مزار کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ فقیروں کی بھیڑ میں ایک اور فقیر کا اضافہ ہوگیا۔ اس نے اپنی جوتیاں بغل میں دبائیں اور مزار کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ گھنٹوں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ”میری کھوٹی قسمت کرو کھری، امام بری۔“

وہ کئی دن تک اس مزار پر فقیر بنا بیٹھا رہا۔ اس کا شیو بڑھ گیا تھا، کپڑے میلے ہوگئے تھے۔ کوئی دیکھتا تو فقیر ہی کہتا۔

وہ مزار سے نکل رہا تھا کہ کسی نے اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔

مزار سے نکل کر سوچ رہا تھا کہ اب کدھر جائے۔ میں جی بھر کر ایک مرتبہ نیلوفر کو دیکھ لوں پھر جس طرف منہ ہوگا اس طرف چلا جاؤں گا۔ اس کے قدم پھر پنڈی شہر کی طرف اٹھ گئے۔

راجا بازار میں واقع سپر اسٹار بیکری کے سامنے ایک فقیر آکر بیٹھ گیا تھا۔ آنے جانے والے اس کی طرف سکے اچھالتے رہتے تھے۔ بیکری کے لوگ کچھ کھانے کے لیے دے دیتے تھے۔

وہ بے ضرر سا فقیر ہر وقت بیکری پر آنکھیں جمائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیٹھا رہتا تھا۔ وہ جب سے یہاں آکر بیٹھا تھا، بیکری کی سیل میں اضافہ ہوگیا تھا۔ بیکری کے لوگوں کا اس لیے بھی اس پر اعتقاد ہوگیا تھا۔

ایک دن نیلوفر اپنے شوہر کے ساتھ بیکری پر آئی۔ اس کا شوہر اتر کر بیکری میں چلا گیا۔ وہ فقیر بھاگتا ہوا آیا اور گاڑی کے پاس آکر کھڑکی میں منہ ڈال دیا۔

"نیلوفر، میں عبدالرشید ہوں۔"

"کیوں مجھے بھی پریشان کرتے ہو خود بھی پریشان ہوتے ہو۔ کراچی کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"چلا جاؤں گا۔ میں تو تم سے معافی مانگنے آیا تھا۔ مجھے معاف کردو۔"

"میں نے تمہیں معاف کیا۔" نیلوفر نے کہا اور سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا شوہر گاڑی کی طرف آرہا تھا اس لیے رشید کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ سو روپے کا نوٹ پرزے کرکے ہوا میں اچھال دیا۔

اس کی مراد پوری ہوگئی تھی۔ اس نے نیلوفر کو قریب سے دیکھ لیا تھا۔ اس نے معاف بھی کردیا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ وہ کراچی چلا جائے، اسے اب کراچی جانا تھا۔

بیکری والوں نے دیکھا کہ وہ فقیر اچانک غائب ہوگیا ہے۔

عبدالرشید کراچی آگیا۔

وہ بغیر ٹکٹ سفر کررہا تھا لیکن راستے بھر کسی نے اس سے پوچھا تک نہیں۔ کینٹ اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ اسٹیشن پر اتر کر باہر نکلا تو بھی کسی نے فقیر یا پاگل سمجھ کر ٹکٹ کا نہیں پوچھا۔ وہ باہر آگیا۔ جانا پہچانا شہر اس کے سامنے تھا لیکن پھر بھی وہ ان سڑکوں کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں یونہی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کہ ایک آدمی اس کے قریب آیا۔

"صاحب، یہ آپ ہی ہیں نا۔ کیا حالت بنالی ہے آپ نے؟"

رشید نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر پہچان لیا۔ یہ نواز تھا، کبھی اس کا ملازم تھا اور آج اس سے اچھے کپڑے پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رشید نے سوچا پہچاننے سے انکار کردے، کہہ دے کہ وہ اسے نہیں پہچانتا۔ بے وفاؤں کے ہجوم میں ایک وفادار ملا تھا جو ابھی تک اسے "صاحب" کہہ کر پکار رہا تھا۔ وہ کیسے نہ پہچانتا۔

"ہاں نواز، میں ہی بدنصیب عبدالرشید ہوں۔"

"آپ نے یہ کیا حالت بنالی اپنی۔"

"زندہ ہوں یہی بہت ہے۔ بے وفائی کے ایسے داغ اٹھا کر کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔"

"وفا کرنے والے اب بھی موجود ہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیے۔"

اس کی غیرت نے پھر طمانچہ رسید کیا۔ سوچا، انکار کردے۔ اپنے ملازم کا احسان اٹھاتے کیا اچھا لگے گا لیکن پھر اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہوگیا۔

"صاحب، بیکری کی نوکری ختم ہونے کے بعد ٹیکسی چلانے لگا ہوں۔ اللہ نے بڑی برکت دی ہے۔" وہ باتیں کرتا ہوا اپنی ٹیکسی تک آگیا۔ رشید دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"تم مجھے ایک کمرا کہیں دلادو گے؟"

"صاحب، دلانے کی کیا بات ہے۔ میرے گھر میں ایک کمرا فالتو ہے، آپ کا نمک کھایا ہے، کیا میں اتنی خدمت نہیں کرسکتا۔"

نواز پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن سمجھدار تھا۔ اس نے گھر جا کر بھی اس سے نہیں پوچھا کہ اس پر کیا بیت گئی اور اب وہ کیا کرے گا؟

تیسرے دن جب رشید کی حالت کچھ سنبھلی تو اس نے پوچھا۔

"صاحب، جو کچھ آپ پر گزری اس کا مجھے علم ہے لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"نواز، کچھ بھی نہیں ہوا۔ چور کے پاؤں ہوں نہ ہوں، دولت کے پاؤں ضرور ہوتے ہیں۔ یہ ہرجائی کسی کے پاس نہیں ٹکتی۔"

"ہاں، یہ تو ہے صاحب۔"

"نواز، تم مجھے کرائے کی ٹیکسی دلا سکتے ہو؟ بیٹھے بیٹھے تنگ آگیا ہوں۔"

"صاحب، آپ ٹیکسی چلائیں گے؟"

"ہاں۔"

نواز نے اسے کرائے پر ٹیکسی دلادی۔

شہر بانو بینک سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر عبدالرشید پر پڑی۔ وہ پسنجر اتار کر اپنی ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔

یہ خوشی کی آخری قسط تھی جو شہر بانو نے وصول کی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ عبدالرشید کو اسی جگہ پہنچادے جہاں سے وہ چلا تھا۔

رشید اس وقت وہیں کھڑا تھا۔

شہر بانو نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چل دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM